امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں

1776 سے 2003 تک

مائیکل بی اورن
ترجمہ: توقیر عباس

فہرست

تاریخ وار

1776----1800

1776۔امریکہ کی آزادی کا اعلان۔اس کے ساتھ ہی برطانوی بحری بیڑے کا تحفظ ختم۔بربری قزاقوں کا تنہا مقابلہ۔

1777۔مراکش نے امریکہ کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔

1784۔بوسٹن بحری جہاز بیٹسی پر مراکشی قزاقوں کا قبضہ

1785۔جان لیمب پہلے امریکی سفارتی مشن پر مشرق وسطے گیا۔

1785۔شمالی افریقہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فلاڈیلفیا میں گانگریس کے ارکان کا اجلاس ہوا تا کہ دستور تیار کیا جائے۔

1788۔جان لیڈیارڈ، پہلا امریکی مصر پہنچا۔

1794۔امریکی کانگریس نے بحریہ بنانے کی منظوری دی۔تا کہ الجزائری قزاقوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔

1801--1900

1801۔طرابلس نے امریکہ کے خلاف جنگ چھیڑ دی

1803۔طرابلس نے امریکی جہاز فلاڈیلفیا پر قبضہ کرلیا۔اوراس کا عملہ گرفتار کرلیا۔

1804۔امریکی فوج نے طرابلس کی بندرگاہ پر فلاڈیلفیا جہاز کو آگ لگادی۔

1805۔ولیم ایٹن ،،بحریہ اور کرائے کے فوجیوں نے شمالی افریقی ساحل ڈارنا پر حملہ کردیا۔جیفرسن نے طرابلس کے ساتھ علیحدہ بات چیت کی۔

1815۔امریکی جہازوں پر حملے بند کرانے کے لئے جیمز میڈیسن نے الجزائر،طرابلس اور تونس جنگی جہاز بھیجے۔

1819۔لیوی پارسن اور پلینی فسک پہلے عیسائی مشنری بوسٹن سے روانہ ہوئے۔

1821۔یونان میں آزادی کی جنگ شروع ہوگئی۔امریکہ کو سوچنا پڑ گیا کہ عثمانی سلطنت میں وہ جمہوریت کا ساتھ دے یا اپنے تجارتی مفادات کا خیال کرے۔

1923۔پلینی فسک نے مشرق وسطے میں پہلا امریکی اسکول کھولا۔

1830۔صدر اینڈریو جیکسن نے امریکہ اور سلطنت عثانیہ کے درمیان پہلا معاہدہ کیا۔

1831۔مشرق وسطے میں پہلا امریکی سفیر ڈیوڈ پورٹر استنبول پہنچا۔

1832۔واشنگٹن ارون نے الحمرا کے نام سے ہسپانیہ کی کہانیاں لکھیں۔ امریکہ نے مسقط سے تجارتی معاہدہ کیا۔

1835۔امریکی سیاح جان لائیڈ اسٹیفن اسکندریہ پہنچا۔

1837۔ایڈورڈ رابنسن نے بائبل کا تحقیقی مرکز قائم کیا۔

1837۔امریکی پادری ہیریٹ لیورمور فلسطین روانہ ہوئی۔

1840۔مشرق وسطے کا پہلا بحری جہاز سلطانہ امریکہ پہنچا۔

1842۔سائرس ہیملن نے استنبول کے نواح میں ایک اسکول کھولا جو بعد میں رابرٹ کالج بن گیا۔

1844۔امریکی سفارت کار وارڈر کریسن فلسطین روانہ ہوا۔

1848۔ولیم فرانسس پہلا مہم جو تھا جس نے بحیرہ موت سے دریائے اردن تک کا سفر کیا۔

1951۔کلورنڈا مائینر نے یہودیوں کو حکمرانی کا فن سکھانے کے لئے فلسطین میں ایک اسکول کھولا۔

1856۔ ناول نگار ہرمن میلول نے مشرق وسطے کا سفر کیا۔

1858۔امریکہ نے ڈکینسن کالونی پر عرب حملے میں قید کئے جانے والے امریکیوں کے لئے انصاف حاصل کرنے کی غرض سے سفارت کار ایڈون ڈی لیون کو جافہ بھیجا۔سابق غلام ڈیوڈ ڈور نے مشرق وسطے کا سفرنامہ لکھا۔

1862۔ڈینیل بلس نے عرب دنیا کی پہلی جدید یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔یہ شامی پروٹسٹنٹ کالج تھا جسے بعد میں امریکن یونیورسٹی بیروت کا نام دیا گیا۔

1863۔صدر لنکن نے میکسکو میں مصری فوجوں کی موجودگی پر احتجاج کیا۔

1865۔صدر لنکن کے قتل کی سازش میں ملوث جان سورات کو مصر سے گرفتار کیا گیا۔

1866۔فلسطین میں اپنی کالونی بنانے کے لئے امریکہ نے 156 امریکی رضا کار بھرتی کئے۔

1867۔مارک ٹوین نے مشرق وسطے کا سفر کیا۔اور The Innocents Abroad کے نام سے اپنے تاثرات تحریر کئے۔

1868۔ مصری رہنما اسماعیل نے امریکی خانہ جنگی کے سابق فوجی بھرتی کئے ،اپنی فوج کو جدید بنایا۔اور امریکہ سے بہتر تعلقات قائم کئے۔

1872۔جنرل ولیم شرمن اور رالف والڈو ایمرسن نے مشرق وسطے کا دورہ کیا۔

1878۔سابق صدر یولیسیس گرانٹ نے مشرق وسطے کا دورہ کیا۔

1880۔قلوبطرہ کی نیڈل۔قدیم آثار، نیویارک کے سنٹرل پارک میں ایستادہ کی گئی۔

1881۔ سیفرڈ خاندان نے یروشلم میں اپنی کالونی بنائی۔

1882۔ اسکندریہ پر برطانیہ کی بمباری کے بعد امریکی فوجی بھی وہاں پہنچ گئے۔شاعرا یما لیزرڈ نے امریکی صیہونیت کا آغاز کیا۔

1883۔سیموئل بنجمن کی سربراہی میں پہلا سرکاری وفد ایران پہنچا۔

1888۔لبنانی شاعر اور سیاسی کارکن امین ریحانی امریکہ پہنچا۔

1890۔سیموئیل زویمر، پہلا مغربی مشنری، جو عرب علاقوں کے اندر تک گیا،مشرق وسطے روانہ ہوا۔

1891۔ولیم بلیکسٹن نے فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنے کے لئے امریکی صدر بنجامن ہیریسن کو قائل کیا۔

1893۔مشرق وسطے کے بارے میں شکاگو میں ہونے والی نمائش میں ہزاروں امریکیوں نے حصہ لیا۔

1896۔ترکی کے مظالم سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لئے کلارا بارٹن ترکی پہنچی۔

1897۔سوئٹزرلینڈ کے شہر بیسل میں پہلی صیہونی کانفرنس ہوئی جس میں چار امریکیوں نے شرکت کی،

1900....1945

1901۔ترکی کے خلاف بغاوت کے لئے رقم جمع کرنے کی غرض سے امریکی مشنری ایلن سٹون

کو بلغاریہ میں مقامی عیسائیوں نے اغوا کر لیا۔

1902۔بحریہ کے امریکی ماہر ایلفریڈ میہن نے مشرق وسطے کی اصطلاح وضع کی۔

1904۔ مراکش کے سردار نے امریکی باشندے لون پرڈیکیرس کو اغوا کر لیا۔

1906۔الجزیرہ کانفرنس میں تھیڈور روزویلٹ نے شمالی افریقہ کے حقوق کے بارے میں تنازعہ حل کرایا۔

1909۔امریکی محکمہ خارجہ میں مشرق وسطے کا شعبہ قائم کیا گیا۔

1909۔امریکی مشنری ہاورڈ باسکرویل اس وقت قتل ہو گیا جب وہ ایرانی کسانوں کی بغاوت کی قیادت کرر ہا تھا۔

1910۔تھیڈور روزویلٹ نے مشرق وسطے کا دورہ کیا۔

1912۔ہینریٹا شولڈ نے حداسہ میں عورتوں کی صیہونی تنظیم قائم کی۔

1915۔ترکی میں امریکی سفیر ہنری مورگنتھا نے آرمینیا کے مظلوموں کی مدد کرنے کی کوشش کی۔

امریکی جہازوں نے فلسطین سے یہودیوں اور بیروت سے عیسائی مبلغوں کو باہر نکالا۔

1917۔لوئی برانڈیس نے امریکی صدر وڈرو ولسن کو بالفور اعلان منظور کرنے پر آمادہ کیا۔

برطانیہ نے فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کے لئے کوشش کرنے کا عہد کیا۔

1918۔صدر وڈرو ولسن نے مشرق وسطے کی اقوام کی حق خود اختیاری کا وعدہ کیا۔

1919۔صدر وڈرو ولسن نے پیرس امن کانفرنس میں مشرق وسطے کی خودمختاری کے لئے کوشش کی۔

1921۔روڈالف والنٹینو نے ''شیخ آف عربی'' کے نام سے مشرق وسطے کی داستان پر مبنی پہلی فلم بنائی۔گولڈا میئر وسکانسن سے فلسطین روانہ ہوئیں۔

1923۔خلیل جبران کی کتاب ''دی پرافٹ'' شائع ہوئی۔

1924۔امریکی اور یورپی کمپنیوں نے عراق پیٹرولیم کمپنی قائم کی۔صحافی لو ویل ٹامس نے کتاب With lawrence in Arabia شائع کی۔امریکہ نے فلسطین پر برطانوی تولیت تسلیم کرلی۔

1928۔مشرق وسطے میں تیل کی تلاش کے لئے علاقے مختص کرنے کا معاہدہ کیا گیا۔

1931۔چارلس کرین کی ابن سعود سے ملاقات۔سعودی عرب کے ساتھ امریکی تعلقات کا آغاز۔

1932۔امریکی انجینئر کارل ٹوئچل نے پانی اور تیل کے ذخائر معلوم کرنے کے لئے جزیرہ نما عرب کا سروے کیا۔

1933۔سعودی عرب نے امریکی کمپنیوں کو تیل کی تلاش کی اجازت دی،۔

1938۔والٹر لوڈر نے فلسطین کی یہودی آبادی کے لئے آبپاشی کا نظام وضع کیا۔

1938۔امریکی انجنیر وں نے سعودی عرب کے علاقے دمام میں تیل تلاش کرلیا۔

1939۔ امریکی یہودیوں نے برطانیہ کے اس قرطاس ابیض کے خلاف احتجاج کیا جس میں فلسطین جانے والے یہودیوں کی تعداد پر پابندی لگائی گئی تھی۔

1942۔شمالی افریقہ پر حملے میں امریکہ پیش پیش تھا۔نیو یارک کے بالٹی مور ہوٹل میں صیہونی یہودی جمع ہوئے اورانہوں نے فلسطین میں آزاد یہودی ریاست قائم کرنے کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔

1943۔امریکہ نے برطانیہ کے ساتھ مل کر فرانس کو لبنان کی آزادی کا احترام کرنے پر مجبور کیا۔

1945۔روزویلٹ کی سعودی رہنماؤں سے ملاقات۔دونوں ملکوں کی دوستی کا آغاز۔ٹرومین کی حکومت نے فرانس کو شام سے فوجیں نکالنے اور لبیا پر سوویت روس کا اثر روکنے پر مجبور کیا۔

1946 اوراس کے بعد

1946۔امریکہ نے اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر سوویت یونین کو ایران سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر مجبور کیا۔

1947۔صدر ٹرومین نے یونان اور ترکی کو سوویت یونین کے حملے سے بچانے کے لئے اپنی پالیسی کا اعلان کیا۔امریکہ نے دوسری بتیس اقوام کے ساتھ فلسطین کو دو عرب اور یہودی ریاستوں میں تقسیم کرنے کے لئے اقوامتحدہ کی قرار کے حق میں ووٹ دیا۔

1948۔اس قرارداد کی منظوری کے گیارہ منٹ بعد امریکہ نے عملی طور پر اسرائیل کو تسلیم کرلیا۔

1952۔امریکی سی آئی اے نے مصر میں حکومت پر قبضے کے لئے جمال عبدالناصر اور ان کے ساتھیوں کی مدد کی۔

1953۔امریکہ نے ایران میں مصدق کی حکومت کا خاتمہ کرایا۔

1955۔سوویت یونین کے خلاف معاہدہ ءبغداد عمل میں آیا۔

1956۔نہر سوئیز کا بحران۔امریکہ اور سوویت روس نے فرانس، برطانیہ اور اسرائیل کو مصر سے اپنی فوجیں نکالنے پر مجبور کیا۔اور نہر سوئیز کو قومی ملکیت میں لئے جانے کی حمایت کی۔

1957۔صدر آئزن ہاور نے سوویت یونین کے خلاف مشرق وسطے کے دفاع کے بارے میں اپنی پالیسی کا اعلان کیا۔

1958۔مغرب کی حامی حکومت کے دفاع کے لئے امریکی فوجیں لبنان میں اتریں۔

1961۔صدر کینیڈی نے جمال ناصر کے ساتھ خط وکتابت کا آغاز کیا۔

1962۔کینیڈی کی حکومت نے اسرائیل کو ہاک لڑاکا طیارے دینے کی منظوری دی۔فلم لارنس آف عربیا ریلیز ہوئی۔

1967۔ چھ دن کی جنگ میں امریکہ نے عرب فوجوں کے خلاف اسرائیل کی فتح میں مدد کی۔اور مغربی کنارے،غزہ،یروشلم، سینا اور جولان کی پہاڑیوں پر اسرائیلی قبضے میں بھی اس کی مدد کی۔ صدر جانسن کی حکومت نے امن مذاکرات شروع کرائے۔

1969۔امریکی وزیر خارجہ ولیم روجرز نے عرب اسرائیلی امن سے متعلق اقوام متحدہ کی قرارداد کے بارے میں اپنے منصوبے کا اعلان کیا۔

1970۔سیاہ ستمبر کے بعد پی ایل او نے اردن میں اختیارات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

1973۔مصر اور شام نے اچانک اسرائیل پر حملہ کیا تو امریکہ نے طیاروں کے ذریعے بھاری تعداد میں اسرائیل کو جنگی سامان پہنچایا۔سعودی عرب نے امریکہ کو تیل کی فراہمی بند کردی۔

1974۔ ہنری کسنجر کی کوششوں سے وادیء سینا سے مصری اور اسرائیلی فوجیں دور ہٹ گئیں۔

1979۔صدر کارٹر نے مصر اور اسرائیل کے درمیان امن معاہدہ کے لئے ثالثی کی۔ایران میں انقلاب کے بعد باون امریکیوں کو یرغمال بنالیا گیا۔

1980۔امریکی یرغمالیوں کو چھڑانے کی کوشش ناکام ہوگئی۔

1981۔امریکی جیٹ طیاروں نے خلیج سدرا میں لبیا کے دو طیاروں کو مار گرایا۔صدر ریگن نے عراقی نیوکلیرری ایکٹر پر اسرائیلی حملے کی مذمت کی۔

1983۔حزب اللہ کے خودکش حملے میں دوسو اکتالیس امریکی فوجی مارے گئے۔

1984۔امریکہ نے لبنان سے اپنی فوجیں واپس بلالیں۔ بیروت میں سی آئی کے سربراہ ولیم بکلی کو اغوا کرلیا گیا۔

1986۔ برلن کے نائٹ کلب میں امریکی فوجیوں پر حملہ۔صدر ریگن نے لبیا پر بمباری کرادی۔

1986۔امریکہ اور ایران کے درمیان اسلحہ کی فراہمی کے خفیہ معاہدہ پر ہنگامہ۔اس وقت ریگن کی حکومت تھی۔

1987۔فلسطین میں انتفاضہ کا آغاز۔

1990۔عراق نے کوویت پر حملہ کردیا۔

1991۔امریکہ اور مغرب کی فوجوں نے کویت خالی کرالیا۔لیکن صدام حسین کو عراق میں رہنے دیا۔

1993۔ ناروے میں فلسطین اور اسرائیل کے درمیان معاہدہ ہوا۔امریکی ایوان صدر میں اس پر دستخط ہوئے۔

1996۔سعودی عرب کے خبار ٹاور میں امریکیوں پر حملہ ہوا اور انیس امریکی مارے گئے۔

1998۔صدر کلنٹن نے فلسطن اور اسرائیل میں عارضی معاہدہ کرایا۔امریکہ نے سوڈان پر بمباری کی۔

2000۔یمنی ساحل کے نزدیک امریکی بحری جہاز یو ایس ایس کول پر خودکش حملہ۔ سترہ فوجی مارے گئے۔

2001۔القاعدہ نے نیویارک۔پینسلوینیا،اورورجینیا پر حملہ کیا۔تین ہزار کے قریب لوگ مارے گئے۔

2002۔امریکہ نے افغانستان پر حملہ کردیا۔

2003۔امریکہ نے عراق پر حملہ کردیا۔

تعارف

ماضی کی بازیافت

بہت کم امریکی جان لڈیارڈ کے نام سے آشنا ہیں۔اس نے مشرق وسطیٰ کے ساتھ امریکی تعلقات میں جو خدمات انجام دیں انہیں کم سراہا گیا ہے۔تاہم 1991 کی گلف وار اور نائن الیون سے امریکیوں میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں یہ آشنائی بہت زیادہ بڑھی ہے۔ پندرہ برس پہلے کتنے لوگ جہاد کے معانی سے یا القاعدہ، شریعت اور وہابی جیسے الفاظ سے آشنا تھے؟ کتنے لوگ بہائیوں ایرانیوں، عربوں اور سنی اور شیعہ مسلمانوں سے واقف تھے؟ مشرق وسطیٰ کے قصبوں کے نام فلوجہ اور جینن جیسے قصبوں کے نام سے اپنی مرکزی مغربی شہروں کی نسبت سے آج امریکی بہت آشنا ہیں۔مشرق وسطیٰ کے لئے بڑھتی آشنائی کا جو مظاہرہ امریکی کرتے ہیں وہ اس بات کا عکاس ہے کہ یہ خطہ ان کی زندگیوں میں شامل ہو چکا ہے۔امریکہ بہت حد تک ......وجودی طور پر مشرق وسطیٰ میں دخیل ہے۔اخلاقی اور مذہبی تضادات دائم دہشت گردانہ خطرات اور قابل اعتماد تیل کے ذرائع میڈیا میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور قومی ایجنڈے پر چھائے ہوئے ہیں۔ لاکھوں امریکیوں کے لئے مذہب کا سرچشمہ مشرق وسطیٰ ڈر اور خوف کا باعث بن چکا ہے۔مزید یہ کہ ایشیائی سبزوں نے جو امریکی دستوں کی تکان اور کمزوری چھپا رکھی تھی اب وہ عرب کے بھورے پیلے رنگوں میں چمک اٹھے اور عربی زبان نے روسی کو انٹیلی جنس سروسز کی زبان کے طور پر بے دخل کر دیا۔زیادہ ٹھوس طریقے سے جنوبی امریکہ، افریقہ، یورپ یا فوری بعد شمالی کوریا یا حتیٰ کہ چائنہ کی نسبت مشرق وسطیٰ یو۔ایس کے شہریوں کی سکیورٹی کے لئے یا اس کے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ اثرات مرتب کرتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی بہت اہمیت کے باوجود امریکی اپنے ملک کی زرخیزی اور علاقے میں کثیر الجہات تاریخ سے بہت حد تک بے خبر رہے ہیں۔ان کی اکثریت اس بات پر یقین کرتی ہے کہ امریکہ مشرق وسطیٰ میں دوسری جنگ عظیم کے فوری بعد اور عرب اسرائیل تنازعے کھڑے ہونے یا سعودی تیل نکالنے کے لئے دخیل ہوا کئی لوگ ہر بات پر ردِعمل ظاہر کریں گے کہ خطے کے ساتھ تعلقات فیزیکلی بہت بعید اور دور دراز کے ہیں۔..........یعنی ایسا خطہ جو پینتیس سو کلومیٹر دور اور الگ تھلگ ہے۔ نیویارک سے قریب ترین وسطی مشرق کا شہر مراکش میں سدی افنی ہے جس نے امریکی نیوی کی تخلیق اور قانون سازی کے ڈرافٹ کی تیاری پر بہت اثرات ڈالے۔کئی لوگ یہ جان کر بہت حیران ہوں گے کہ امریکی اور مشرق وسطیٰ کے لوگ نا صرف تیل کے میدانوں اور جنگی میدانوں میں متصادم ہوئے بلکہ فنون لطیفہ، تعلیم اور فلاحی کام کے شعبوں میں بھی باہم مل چکے ہیں۔امریکہ نے پہلی جدید یونیورسٹیز مشرق وسطی میں قائم کی تھیں اور امریکی قومی ترانہ اور مجسمہ، امریکہ میں مشرق وسطیٰ کے تجربات سے اخذ کیا گیا۔مشرق وسطیٰ میں امریکی تاریخ سے کم علمی کی وجہ متعلقہ موضوع پر کسی جامع کتاب کی عدم دستیابی ہے۔جبکہ برطانوی شہری خطے میں اپنے ملک کی تاریخ پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔الزبتھ منرو کی کتاب Britain's Moment in the Middle East کا مطالعہ کر سکتے ہیں یا ولیم روگر لوئس کی کئی دیگر کتب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ امریکیوں کو بددل کرنے والی اور مشکل کتب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ بربری جنگوں پر بہت کتب لکھی گئی ہیں جو امریکہ اور مشرق وسطیٰ کا پہلا تصادم ہے اور پوسٹ ورلڈ وار اول پر امریکی پالیسیوں پر بہت کتب ہیں لیکن امریکی ملٹری کی مشرقی وسطیٰ میں مداخلت پر یا ڈیکالونائزیشن کے عمل میں امریکی کردار پر کوئی ایک کتاب بھی دستیاب نہیں۔امریکہ اور فلسطین کے حوالے سے امریکی پالیسی پر کتابیات کی فہرست کئی صفحات کو محیط ہے لیکن مشرق وسطیٰ میں امریکی ادبی روایت پر کوئی کام موجود نہیں اور نہ ہی امریکی اور مشرق وسطیٰ کے معاشی انضمام پر جو 1776ء میں ہوا کوئی کتاب نہیں ہے۔ بہت سے ماہرین اور علماء امریکہ کے مشرق وسطیٰ کی تاریخ کے وسیع اور کشادہ پہلوؤں کی چھان بین پر ڈیوڈ افنی کو مناسب سمجھتے ہیں ڈیوڈ افنی نے کتاب Pioneer East میں جو 1967ء میں شائع ہوئی اٹھارہویں صدی کے آخر انیسویں صدی کی ابتداء میں امریکیوں کے کام، سفر، تبلیغ کو بہت رنگین انداز میں بیان کیا۔

دو سال کے بعد جیمز اے فیلڈ نے ڈیوڈ اٹنی کے مشہور زمانہ سروے میں سنجیدہ اضافے کئے۔ جون ڈینوونے American Interest and Policies in the Middle East شائع کی۔

ڈینوو کے بعد جوزف ایل گبریئل کی اولین کتاب Protestant Diplomacy and the Near East Missionary Influence on American Policy سب سے بہتر مطالعہ تھا۔ ٹومس بائرن کی کتاب Diplomatic Relations with Middle East تیس برس پہلے شائع ہوئی۔ اس وقت سے تاریخ دانوں نے پوسٹ ورلڈ وار دوم اور مشرق وسطیٰ کے ساتھ امریکہ کے سیاسی جنگی تعلقات پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ George Lenczowski کی American Presidents and the Middle East سٹیون ایل سپیگل کی The Other Arab-Israeli Conflict اور ولیم بی کی Peace Process اس قسم کی کتابوں کی بہترین مثال ہیں۔ لیکن ابتدائی سطح پر امریکہ کی مشرق وسطیٰ پالیسی پر محکمہ خارجہ کے اثرات کا معائنہ اور جائزہ لیتی ہے۔ اس کے باوجود امریکہ کے مشرق وسطیٰ کے ساتھ صدیوں پرانے فوجی معاشی اور ثقافتی تعلق کے حوالے سے چھان بین اور جائزے کی کمی ہے۔ کسی بھی کتاب یا مطالعہ میں اس تاریخ کے موجودہ عنوانات اور خیالات کو پہچاننے یا ان کا تجزیہ کرنے کے لئے کوئی لائحہ عمل کا طریقہ کار دینے کی سعی نہیں کی گئی نہ ہی امریکہ کی آج تک مشرق وسطیٰ میں مداخلت یا شمولیت کی کوئی ادارہ جاتی اور فوجی، معاشی، اور ثقافتی تاریخ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ ایسی تاریخ جو علماء، فضلا اور عام قاری کی رسائی میں ہوں۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ اس کتاب کا لکھا جانا کئی چیلنجز کو دعوت دیتا ہے ان میں سے ایک تو اس سوال کا جواب دینا بھی چیلنج ہے کہ مشرق وسطیٰ کہاں ہے؟ اگرچہ مشرق وسطیٰ کی اصطلاح عالمی طور پر تسلیم شدہ ہے لیکن حقیقت میں اس کی علاقائی سرحدوں پر کوئی اجماع نہیں ہے بہت سے علماء مراکش، تنزانیا اور الجزائر کو مشرق وسطیٰ ممالک سمجھتے ہیں جبکہ دیگر علماء شمالی افریقہ کو ایک جدا کائی سمجھتے ہیں۔ کچھ یونیورسٹیز میں دی مشرق وسطیرن سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ میں افغانستان اور پاکستان کو شامل نہیں کیا جاتا۔ جبکہ دیگر پروگراموں میں جنوب مغربی ایشیاء کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ علاقے سے متعلق تعین قدر پر اختلاف اس بات کو مزید عمیق کر دیتا ہے جب کوئی شخص تاریخ کے مطالعے سے دامن چھڑاتا ہے۔ مؤرخ اٹھارویں صدی کے مشرق وسطیٰ کے مباحث میں عثمانی بلغاریہ اور یونان کو اکٹھا کرنے پر یا ان صوبوں کا جدا اور غیر واضح Near East کے صوبے ہونے پر اختلاف کرتے ہیں۔

اور کچھ 1902ء سے پہلے مشرق وسطیٰ کے وجود سے بھی انکار کرتے ہیں جب اس اصطلاح کو پہلی بار برتا گیا۔

یہ کتاب مشرق وسطیٰ سے بطور خطہ کے اس طرح معاملہ کر کے ان مسائل کو حل کرتی ہے جن سے امریکی کبھی بہت آشنا تھے۔ یہ خطہ خاص طور پر اہل مغرب کے لئے اورینٹ کہلاتا تھا۔ مشرق کا یہ حصہ بیسویں صدی سے پہلے اناطولیہ سے جنوبی افریقہ اور مصر تک اور سعودی عرب سے خلیج فارس تک کے وسیع علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔

عثمانی سلطنت کے یورپ اور سینٹرل ایشیا کے خطے بھی اسی میں شامل ہیں۔ اگرچہ یہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ان علاقوں کی مرکزیت کم ہوئی ہے۔ یہ علاقے امریکہ کے خیال میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے جیسے ان کی مشترکہ تہذیب ملبوسات میں اشتراک اور مماثلت، فنون دستکاری، مذہبی عقائد اور حکومتی طرز اور نمونے مشترک تھے حتی کہ آج امریکی لیبیا، تنزانیا اور لبنان کو ایران اور فلسطین کے ساتھ ایک ہی جغرافیائی اور سیاسی فریم ورک کا حصہ سمجھتے ہیں جسے وہ مشرقِ وسطیٰ کہتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کی حد بندی کے بعد اگلا کام سٹڈی سٹرکچر کا خاکہ تیار کرنا ہے۔ یہاں بھی بنیادی سوال پیدا ہوتے ہیں کہ کیا مشرق وسطیٰ میں امریکی تاریخ کے تمام ادوار پر برابر توجہ دینا چاہیے یا صرف ان ادوار پر توجہ کی ضرورت ہے جن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس تناظر سے الگ ایک بات اور کہ یہ کتاب آئزن ہاور کے حوالے سے 1956 Suez Crisis ء کی پالیسی یا 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ کے حوالے سے نکسن کے مؤقف سے کی گئی تحقیق میں کیا اضافہ کر سکتی ہے۔ متن، جو امریکہ، مشرق وسطیٰ کے دو صدیوں کے تعلقات کی از سرِ نو تعمیر کے لئے غیر سفارتی دستاویزات پر انحصار کرتا ہے، کس طرح آخر تیس سال کے باہمی تعاون اور تعلقات کی دستاویز تیار کر سکتا ہے جبکہ اس دور کی تمام دستاویزات عوامی رسائی میں نہیں ہیں۔

اِن تمام سوالات کے جوابات اس کتاب میں پوشیدہ ہیں۔ اس کتاب کے پہلے چھ ابواب میں امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے تعلقات کی اٹھارہویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے وسط تک کی تفصیل موجود ہے۔ آخری حصے میں سرد جنگ کے زمانے سے عراقی جنگ تک کے ساٹھ سالہ دورانیے کے واقعات کا جائزہ شامل ہے۔ پوری کتاب میں مشرق وسطیٰ میں امریکی شمولیت

کے مرکزی مقاصد اور نکات پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے اور مرکزی موضوعات پر توجہ کی گئی ہے جس
سے متن مربوط اور خوبصورت ہوتا گیا ہے۔

اِن موضوعات میں جو زیادہ ٹھوس موضوع ہے وہ طاقت واقتدار کا ہے۔ طاقت سے مراد
امریکہ کی مشرق وسطیٰ میں مختلف طرح سے فوج، سفارت اور معاش میں دلچسپی ہے۔ پاور 1815ء
میں صدر میڈیلین کے الجزائر کے خلاف جنگی جہاز بھیجنے کے فیصلے کی وضاحت کرتی ہے۔ اور
1863ء میں صدر لنکن کی مصر کو میکسیکو میں مداخلت کرنے سے روکنے کی کاوشوں کی وضاحت بھی
کرتی ہے۔ لیکن امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں اپنے شہریوں کی حفاظت کے لئے طاقت کا استعمال
بھی کیا جو وہاں کم تعداد میں ہونے کی وجہ سے خطرے میں تھے۔ جب 1844ء میں بحری جہاز
یو۔ایس۔ایس نے امریکی مشنریوں کو بچایا جب وہ لبنان میں خطرے میں تھے یا جب بحری جہاز
نے یہودی پناہ گزینوں کو پہلی جنگ عظیم میں فلسطین میں چھوڑ دیا، اس وقت طاقت، محض سیاسی یا
معاشی دلچسپی کے طور پر کام نہیں کر رہی تھی جبکہ اس وقت طاقت امریکی ایمان کی مدد کر رہی تھی۔

عقیدہ، دوسرا موضوع ہے۔ جو مشرق وسطیٰ کے حوالے سے امریکی رویوں اور پالیسیوں
کی تشکیل میں مذہب کے اثرات کی دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ، دوسری جنگ عظیم کے بعد خطے
میں امریکی تعلقات کے رستوں کا تعین کرنے میں کیتھولک اور یہودیوں نے اہم کردار ادا کیا لیکن
پروٹسٹنٹ وہاں زور آور تھے۔ پہلے پروٹسٹنٹ مشنری 1819ء میں بوسٹن سے مشرق وسطیٰ روانہ
ہوئے۔ ان کا مقصد فلسطین میں یہودی تسلط قائم کروانے، آرتھوڈاکسی عیسائیوں، عربی بولنے
والے عیسائیوں اور دروزیوں کو بچانے کا تھا۔ امریکہ کے لئے ایمان تو سیکولر اور تمدنی جہت رکھتا
تھا۔ جو امریکیوں پر اپنے جمہوری اور حب الوطنی کے نظریات کو باہر پھیلانے پر زور دیتا تھا۔ لیکن
مشنری دوبارہ یہودی ریاست قائم کرنے اور لوگوں کو عیسائی بنانے میں ناکام ہو گئے۔ لیکن وہ ترکی اور
عرب دنیا میں پہلی جدید یونیورسٹی بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے طلبا کے اذہان میں قومی
شناخت اور فخر پیدا کر کے مشرق وسطیٰ میں نئی طاقتیں پیدا کر لیں اور اس خطے کی پالیسیز تبدیل کر دیں۔

تیسرا موضوع داستانی خیال کا ہے۔ مشرق وسطیٰ کا خیال ہمیشہ سے امریکیوں کے لئے مسحور
کن رہا ہے اونٹ، صحرا، مینار اور فرعونوں کے مقبرے ہمیشہ سے انہیں لبھاتے رہے ہیں۔ بائبل
سے اخذ کردہ اس خطے کے رومانوی تصورات اس کے ساتھ صحراؤں کی تصاویر، دلکشی کا باعث ہیں

اور بائبل روایتی طور پر امریکہ میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ الف لیلیٰ، جو عربی
کہانیوں کا مجموعہ ہے، اس نے بھی مشرق وسطیٰ کو جنسی مہک سے بھر دیا۔ اس قسم کے دل فریب
تصورات اور مثالوں سے متاثر ہو کر انیسویں صدی میں امریکیوں کی ایک بڑی تعداد نے مشرق
وسطیٰ کا رخ کیا اور واضح طور پر انہوں نے اپنی تحریروں میں اس کے لینڈ سکیپ کی تصویر کشی کی، بعد
میں جب کتابوں کی جگہ فلم اور ریکارڈنگز نے لی تو مشرقِ وسطیٰ کے بنیادی تصورات، ہولی وڈ اور
میوزک میں رجحان پا گئے۔ ایسی بدمستیوں نے اس، خطے کے بارے میں عوامی تصورات پر بھی اثر
ڈالا اور حکومتی پالیسی پر بھی اثر ڈالا۔ یہ بھی بتایا جائے گا کہ اسی فنٹاسی نے پریذیڈنٹ پولک کے
دریائے جورڈن کی طرف نیول مہم جوئی کے فیصلے میں کردار ادا کیا۔ اور 1856ء میں کانگریس کی
طرف سے مصر سے برآمد کی گئی اونٹنیوں سے کیمل کارٹس بنانے کے کانگریسی بل میں بھی فنٹاسی
نے کردار ادا کیا۔

ان موضوعات میں کوئی ایک موضوع بھی ایسا نہیں جو مشرق وسطیٰ کے ساتھ امریکی دِلچسپی
سے خالی ہو۔ یورپی ممالک نے بھی مشرق وسطیٰ کی پالیسیوں میں طاقت، عقیدے اور فینٹاسی کے
عناصر شامل کئے اور ابھی تک اس طرز پر، امریکہ کی مشرق وسطیٰ میں شمولیت اور ان کے درمیان
باہمی حرکی تعامل امریکہ کے لئے بہت نادر اور منفرد ہے۔ جو باہمی مکالمے سے خارج نہیں ہے۔

اِن موضوعات کا مطالعہ مشرق وسطیٰ کے ساتھ امریکی تعلقات کی تاریخ از سر نو استوار کر
کے اس کتاب کا مقصد گہرائی میں جا کر، امریکہ کے ماضی کے مرکزی حصہ کی فہم پیدا کرتا ہے۔ یہ
کتاب وہ سیاق وسباق بھی مہیا کرتی ہے جس سے اس خطے میں موجودہ امریکی کردار کا تجزیہ ممکن
ہے۔ امریکہ کی عراق، ایران، اور فلسطینی اسرائیلی جھگڑے کی پالیسیاں، امریکی ریاستوں اور ان
سے باہر بہت متنازعہ ہیں۔ اس کتاب کا مقصد کسی کی وکالت نہیں اور نہ ہی کسی خاص قسم کے راستے
کا تعین کرنا مقصود ہے۔ اس کے بجائے ان ممالک کے مشترکہ ورثے کی صراحت ہے جن میں،
میں رہتا ہوں، میں یکساں طور پر امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کا احترام کرتا ہوں۔

حصہ اول

امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے ابتدائی رابطے:

خطرناک اور سنگین خطرہ

1776ء میں اچانک امریکی اپنے پیروں پہ کھڑے ہوگئے، نئی دنیا کے تاجروں نے چھوٹی بڑی کشتیوں میں سمندر پار کیا تو وہ تاریخ کی مضبوط ترین نیوی کی حفاظت میں تھے۔ لیکن وہ حفاظت انقلاب برپا ہونے کی وجہ سے راتوں رات ختم ہوگئی۔ مضبوط برطانوی بحریہ کا محکمہ جو امریکہ کی ڈھال تھا اب ان کا بدترین دشمن تھا۔ امریکیوں کا چونکہ کوئی باقاعدہ نیوی سسٹم نہیں تھا جو ان کا دفاع کرتا۔ چنانچہ جونہی امریکیوں نے لنگر اٹھائے۔ اان کے جہاز خطرے کی زد پہ تھے اور وہ کھلے سمندر میں بے یارو مددگار تھے۔

نیوی کی عدم قابلیت کی وجہ سے نہ صرف خود امریکی خطرے میں پڑ گئے بلکہ ان کے لئے ملکی بچاؤ بھی مشکل ہوگیا۔ امریکیوں نے مشرقی سواحِل کی طرف توجہ مرکوز کی جہاں قدرتی بندرگاہیں تھیں اور جہاز بنانے کے لئے عمدہ لکڑی بھی دستیاب تھی۔ اٹھارہویں صدی کا امریکہ بہت حد تک سمندری تجارت والی قوم بن کرا بھرا۔ جس کا انحصار بیرونی تجارت پر تھا۔ اس کی معیشت پر ہلکی سی ضرب بھی اس نوزائیدہ امریکہ کو تباہ کرسکتی تھی جو اپنی آزادی کے بچاؤ کے لئے جدوجہد اور دوالیہ سے بچنے کی کوشش کررہا تھا۔ برِاعظمی دستوں نے مسلح اور تربیت یافتہ برطانوی فوج سے جنگ کی۔ اس لئے سابق کالونیاں بحری تجارت پر متوجہ ہوگئیں۔ ان میں سے ایک جنوب سے ویسٹ انڈیز تک پہنچ گئی۔ اور ایک دوسرا راستہ جو کم خطرناک نہ تھا وہ بحرِاوقیانوس سے مشرق کی جانب بحرروم کے نیلے پانیوں کی بندرگاہوں تک پھیلا ہوا تھا۔

بحیرہ روم جوراک آف جبرالٹر سے بحیرہ روم کے مشرقی جزائر تک پھیلے ہوئے علاقہ میں ایسا تھا جو

پوری طرح یورپی تسلط سے آزاد تھا۔ جہاں سے من چلے امریکی بلا روک ٹوک اپنی قسمت سنوار سکتے تھے۔ اگرچہ شمالی امریکہ سے بحیرہ روم کا سفر بہت خوشگوار نہ تھا۔ تقریباً سخت سردی میں چھ دن کا سفر تھا اور جہازوں میں غلاظت کی نکاسی کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور منافع تکالیف سے زیادہ تھا۔ مقامی تاجر لوبیا، کشمش، انجیر کا نئی دنیا کی ضروریات جیسے لکڑی، تمباکو اور چینی کے تبادلے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ تیزی سے پھیلنے والا ایک اور کاروبار شراب سازی (رم) جس کا نام بوسٹن پارٹی کولر تھا جو نئے انگلینڈ کے تاجروں نے شروع کیا تھا اور اس کا تبادلہ ترکی کی افیون سے کیا جاتا تھا اور یہ افیون بعد میں کینٹن Canton، چائنہ اپنے ملک میں ادویہ کے سلسلے میں لے جاتے تھے۔ 1770ء تک ایک اندازے کے مطابق بحیرہ روم میں ایک سو امریکی بحری جہاز چلتے تھے، ایک برطانوی تاجر کی یہ بات مشہور ہے جہاں جانا چاہو جاؤ شاید کہیں کوئی اچھی بندرگاہ ملے۔ لیکن امریکی، انگلینڈ کا ایک باشندہ ضرور ملے گا جو مقامی تاجروں کے ساتھ سخت قسم کا سودا کررہا ہوگا۔

انقلاب سے پہلے، امریکہ کو بحیرہ روم میں مشرقِ وسطی کی جانب سے خطرہ ہوتا تھا۔ عربی بولنے والے قزاق خود کو مجاہدین کہتے تھے اور یہ اسلامی جنگ کے جنگجو تھے جو مغربی جہازوں میں سفر کرتے اور شکار کرتے تھے۔ اور امریکہ کے جہاز قبضے میں کرلیتے تھے اور ان کے عملے کو اپنا غلام بنا لیتے تھے۔ امریکی ابتدائی جہازران کو قزاق کہتے تھے یہ قزاق مراکش کی آزاد ریاست سے سفر کا آغاز کرتے تھے اور عثمانی سلطنت کے علاقوں طرابلس، تیونس، الجزائر اور مشرقِ وسطی کے اس علاقے جسے مجموعی طور پر مغرب کہا جاتا ہے تک آزادی سے گھومتے تھے۔ لیکن اس علاقے کا ایک مختلف نام تھا جسے بربری کہا جاتا تھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں بربر کا علاقہ امریکہ کے لئے بھیانک ڈر تھا۔ جن لوگوں کو قزاقوں نے اغوا کیا ان میں ناول نگار میگل ڈی سروینٹیز بھی تھا۔ جس نے پہلے ڈرامے کی بنیاد اسی پر رکھی تھی۔ اغوا شدگان کو بطور غلام بیچ دیا جاتا تھا، جہاں مہلک کام اور کانوں میں مشقت لی جاتی تھی۔ یورپی خواتین کی اجلی رنگت اور صاف خدوخال کے باعث، ان کی حرم میں خاص قیمت ملتی تھی۔ جہاں سے نجات اور رہائی ناممکن تھی۔ مسز ماریا مارٹن برطانوی شہری تھی۔ اسے الجزائری قزاقوں نے پکڑ لیا اور باندھ دیا اس کی کڑی نگرانی ہوتی تھی اور اندھیری کوٹھڑی میں اسے باندھ کر رکھا جاتا تھا کیونکہ اس نے محض داشتہ بننے سے انکار کردیا تھا۔ مایوسی کے عالم میں کچھ قیدیوں نے

اسلام قبول کرلیا (ترک بن گئے) کچھ اپنے سلاطین کے مشیر اور طبیب بن گئے یا انہوں نے بحری فوج میں دستہ کے طور پر شمولیت کر لی۔ کچھ قیدی بے چینی سے گھر والوں کی طرف سے تاوان کے بدلے رہائی کا انتظار کرتے رہے کیونکہ کچھ لوگ یہ رقم ادا کرنے کے قابل تھے۔

شمالی افریقہ کے قزاق اگرچہ اصولی طور پر یورپ کے خلاف تھے تاہم اکثر اوقات نیو ورلڈ کے لوگ انکا شکار بنتے تھے۔ کاغذات کے مطابق پہلا حملہ 1625ء میں ہوا جس میں مراکشی قزاقوں نے شمالی امریکہ کی کالونیوں سے چلنے والے جہاز پر قبضہ کرلیا۔ بیس سال بعد کیمبرج کے ملاحوں نے الجزائر کے حملے کو پسپا کر دیا لیکن 1678ء میں الجائریوں نے امریکی ریاست میساچوسٹس کے دوسرے جہاز اور ورجینیا کی بیس کشتیوں کو قبضے میں لے لیا۔ 390 انگریزوں کا تاوان ادا کر کے 1680ء میں رہا کروایا گیا۔ ان میں سے گیارہ نیو انگلینڈ اور نیویارک کے باسی تھے۔

میساچوسٹس کے گورنر سائمن بریڈسٹریٹ کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہم پہلے ہی سے پانچ یا چھ بار کشتیاں کھو چکے تھے جو قزاقوں نے لوٹی تھیں اور ہمارے کئی باشندے ان کے درمیان بہت خستہ اور قابل رحم زندگیاں گزار رہے ہیں۔ ان باشندوں میں جوشوا بھی شامل تھا۔ جو بوسٹن کا تاجر تھا جس نے بہت مصائب دکھ اور تکالیف برداشت کیں۔ اس سے مشقت کروائی جاتی تھی بیماری کا شکار ہوا اور اسے اکثر مارا پیٹا جاتا تھا۔ پورے سات سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا جو اپنی رہائی کے موقع پر خوشی کے باعث روتا رہا۔ خدا کی حمد وثناء اور اس کے رحم وکرم کی تعریف کرتا رہا۔

اٹھارہویں صدی میں نیو ورلڈ کے خلاف قزاقوں کے حملے کبھی بھی سست نہ پڑے جب امریکی کشتیاں برطانوی بحریہ کی حفاظت میں آئیں تو کچھ حملے کم ہوئے کیونکہ برطانوی بحریہ جدید اسلحے سے لیس تھی۔ اور ایک مستولی جہاز اور کشتیوں پر بھی 20 گولے اور کئی سو مسلح آدمی ہوتے تھے اور الجائری کسی بھی حملے سے پہلے دوبار سوچتے تھے کہ اس جہاز یا تاجر پر حملہ کریں یا نہ کریں جس کی حفاظت برٹش رائل نیوی کر رہی ہے۔ جس کے ایک جہاز پر کم از کم 850 ملاح اور کئی سو گنیں ہوتی ہیں۔ چونکہ برطانیہ کے لئے شمالی افریقہ کی حیثیت محض مکھی جتنی تھی اور نہ ہی یہ کوئی وسیع علاقہ تھا اس لئے قزاقوں کی مزاحمت کے بجائے برطانیہ نے سالانہ اقساط دینا شروع کر دیں تا کہ ان کے پیسے کی حفاظت رہے۔ بربری ان پر اب حملے نہیں کرتے تھے لیکن قزاقوں نے کمزوروں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر لی جن میں پرتگال، ڈنمارک اور سپین شامل تھے۔ امریکی جہازوں کی حفاظت کا

بندوبست اس وقت تک رہا جب 1776ء میں آزادی کا اعلان ہوا، امریکی تاجر نہ صرف قزاقوں کا نشانہ بننے لگے بلکہ برطانوی بحریہ کا ہدف بھی بننے لگے۔ جو کبھی ان کی حفاظت کرتے تھے۔ دی پیچ ورک کانٹینینٹل نیوی ان چیلنجز کا مقابلہ نہ کرسکی۔ جون پال جونز کی قیادت اور فرانسیسی جنگجوؤں کی مدد کے باوجود کچھ نہ ہوسکا وقت گزرنے کے ساتھ 1783ء میں جنگ کا اختتام ہوا امریکہ کے زیادہ تر جنگی جہاز یا تباہ ہوگئے یا بک گئے یا چلے گئے۔ امریکہ بمشکل اپنی سمندری سرحد کی دفاع کے قابل تھا۔ اور یہی حال اس کی سمندری تجارت کا تھا۔ پئرس لانگ نیوہیمپشائر کے نمائندے نے کانٹینینٹل کانگریس کے اجلاس میں رونا روتے ہوئے کہا ''موجودہ حالات میں ہم اس قابل نہیں کسی قوم سے جنگ کرسکیں خاص طور پر الجائر کے ساتھ، جس کے پاس نو بڑے بحری جنگی جہاز اور پچاس گن بوٹس ہیں جو یونائٹڈ سٹیس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ برطانوی امیر شیفیلڈ جو امریکی آزادی کے سخت مخالفین میں تھا، اس نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ امریکی بربریوں سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے اور وہ اپنی نیوی قائم نہیں کر سکتے۔

امریکہ کا جوابی حملہ

شیفیلڈ کے پاس اس بات پر اترانے کے لئے وجوہ بھی تھیں۔ نیشنل نیوی کا قیام مضبوط مرکزی حکومت کے ساتھ ممکن تھا۔ جس کا ملک میں فقدان تھا۔ آرٹیکل آف کنفیڈریشن کے تحت ڈھیلے انداز میں جڑی ہوئی ریاستیں نیشنل ٹیکسز بھی نہیں لگا سکتی تھیں اور مزید یہ کہ ملک گیر ملٹری فورس کا قیام بھی مشکل تھا خاص بات یہ تھی کہ آرٹیکل محض امن کے دورانیے کے لئے نیوی قائم کرنے پر زور دیتا تھا۔ جبکہ کہ تحریری انداز میں کنفیڈریشن کسی بھی ریاست کو جو قزاقوں کے ہاتھوں تنگ ہو ذاتی دفاع کے لئے جنگی بیڑے بنانے کی اجازت دیتا تھا لیکن عملی طور پر کوئی بھی ریاست بربریوں کے خلاف ضروری مسلح قوت قائم کرنے کے قابل نہ تھی۔ مزید یہ کہ امریکہ نارتھ افریقہ کے خلاف صرف اس وقت جنگ کرسکتا تھا جب تیرہ ریاستوں میں سے نو ریاستیں اس پر راضی ہوں ہر ریاست اپنی حاکمیت اور آزادی کو استعمال کرنے کا حق رکھتی تھی۔

امریکی اپنے استحقاق کو ختم کرنے میں ہچکچاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عالمی معاملات میں دنیا کے سامنے مشترکہ محاذ قائم کرنے میں ان کے آپس کے اختلاف کا دباؤ بہت تھا۔ جارج

واشنگٹن نے سب کو خبردار کیا کہ وہ قوم جو محض اپنے مفاد سے جڑی ہو، اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور کوئی قوم پوری اقوام سے زیادہ، کم بھروسے والی نہیں ہے، غیر ملکی مداخلت کے ڈر سے کئی امریکی نیوی قائم کرنے کی مخالفت کرتے تھے جو یورپی بیڑوں سے جھگڑ سکے اور پھر ان کی گنوں کا رخ نوزائیدہ جمہوری اداروں کی طرف ہو جائے۔ یورپی نیوی سے جھڑپ میں بچ نکلنے والے امریکی سمندر میں جانے والی یا سفر کرنے والی قوت کے معاملے میں بہت چوکنے تھے چاہے ان کی اپنی قوت ہی کیوں نہ ہو۔ اس وقت معاشی حالت بھی قابلِ غور تھی۔ جنگی جہاز یا بیڑہ بنانا خاصا مہنگا پڑتا تھا جنگی قرض میں دبے ہونے کی وجہ سے یونائٹڈ سٹیٹس کا محکمہ خزانہ اس بوجھ کو مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

توپ بردار کشتیوں اور انہیں بنانے کا اختیار نہ ہونے کے سبب نے امریکہ کو یورپی سیاست میں اپنے اختلاف پر قابو پانے پر مجبور کر دیا اور اپنے انقلابی جہادیوں کو فرانسیسیوں سے اپیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ Franco-American Treaty of Amity and Commerce کا معاہدہ 1979ء میں ہوا اس کے مطابق فرانس کو اپنے سرکاری ذرائع سے بربری ریاستوں کے تشدد، تعاقب حملوں سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو اس کے شہریوں، مال اور تجارت سے نجات دلوانا تھی۔ لیکن فرانسیسی تاجر اپنی بحر الکاہلی تجارت کو زیادہ بڑھانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اور مارسیل، نیس اور طولون کی جنوبی بندرگاہوں پر امریکی مقابلے کے اثر سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہمیں انہیں (امریکیوں) کو بحر الکاہل میں تحفظ دینے کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہے، فرانس نے اس درخواست کو نظر انداز کر دیا۔

فرانس کے امریکہ کو تنہا چھوڑنے کے بعد، امریکی قزاقوں کا آسان شکار بن گئے۔ ستمبر 1783ء میں الجزائر کے ایک مستولی جہاز کے بارے میں کہا جاتا ہے اس نے ایک امریکی سرکاری جہاز کو ہراساں کرنے کی کوشش کی جو امریکہ سے برطانیہ کی طرف امن مذاکرات کے لئے جا رہا تھا۔ کاش یہ الجائری نہ ہوتے تو انگلینڈ دیکھنے والا ہوتا۔ یہ فرینکلن کے الفاظ تھے۔ اسی قسم کی ایک اور بات بھی مشہور تھی کہ برطانیہ خفیہ طور پر قزاقوں کو رقمیں دے رہا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ شمالی افریقہ کو برطانیہ یا کسی دوسرے یورپی ملک سے کسی قسم کی تھپکی کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ امریکی بحری جہازوں پر حملے کریں۔ جواب بے یار و مددگار تنہا اور دفاع کے قابل نہیں تھے اور ان کے پاس

تاوان ادا کرنے کی رقم بھی نہیں تھی۔

شمالی افریقہ کو بنا کسی سزا یا مار پیٹ کے ڈر کے، 1784ء میں بٹسی نامی جہاز پر حملہ کرنے کی وجہ سے خبردار کیا گیا۔ تین سوٹن وزنی مستولی جہاز، بوسٹن سے جزیرہ ٹینرین کی طرف جا رہا تھا۔ جو شمالی افریقہ سے 100 سو میل کے فاصلے پر تھا۔ جب اس کا سامنا ایک انجان جہاز سے ہوا جس کے دونوں طرف کے پتواروں کی مدد سے جہاز امریکی جہاز کے قریب آ لگا اور اس کا بالائی کنارہ اس کے بھاری جہاز کو چھونے لگا، بڑے تحمل سے ان لوگوں نے تلواریں منہ میں دبائی ہوئی تھیں اور پستول پہلو میں اڑسے ہوئے تھے۔ جس طرح ایک امریکی اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے ان قزاقوں کے سینے ننگے تھے، سروں پر پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں اور پتلونیں پہنی ہوئی تھیں اور وہ تاجروں کے عرشے پر دندناتے ہوئے داخل ہوئے۔ ایک اور عینی شاہد کا کہنا ہے کہ انہوں نے ہمیں آگے بڑھنے کو کہا اور مختلف زبانوں میں ہمیں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی کہ اگر حکم نہ مانا گیا تو وہ ہمیں ذبح کر دیں گے۔ ملاحوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور ان کو باندھنے اور بند کرنے سے پہلے ان کے تمام سامان کو قبضے میں کر لیا۔ اور اس کے بعد غلاموں کی منڈی مارکو کی جانب چل دیئے۔

بٹسی کے قبضے کے تین ماہ بعد دو اور امریکی جہاز ڈوفن اور ماریا اغوا کر لئے گئے۔ اس بار الجیری باشندوں کا کام تھا۔ اکیس امریکی ملاحوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لوگوں کے ہجوم کے سامنے پیدل چلاتے ہوئے شاہی دربار میں حسن کے سامنے پیش کیا گیا جس نے ان قیدیوں کے چہرے پر تھوک دیا، اور کہا "اب میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے عیسائی کتو! اب تم پتھر کھاؤ گے" ایک سترہ سالہ ملاح اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انہیں ایک اندھے گڑھے میں پھینک دیا گیا جو مکمل طور پر تاریک تھا جہاں قیدی چار چار ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ سوتے تھے۔ صرف چند لوگوں کے پاس پھٹے ہوئے کمبل تھے جو شدید سردی میں بچاؤ کے کام آتے تھے۔ سترہ سالہ جیمز کیتھ کارٹ لینڈر کے مطابق ان کی روز کی خوراک تقریباً پندرہ اونس روٹی کے ٹکڑے تھے۔ ہلکی سی مزاحمت پر ان کے پاؤں کے تلووں پر ڈنڈے مارے جاتے تھے اور لوہے کے راڈ سے بدن پر ضربیں لگائیں جاتی تھیں۔ لعنت ہو دو بار لعنت ہو ان الجائری لوگوں پر کیونکہ بحری قزاقوں نے ہماری تجارت سے جنگ شروع کر رکھی ہے یہ بات غصے کے عالم میں ڈیکلریشن آف انڈیپینڈنس کے گلوکار ور جینیا پٹریاٹ رچرڈ ہنری لی نے غصے کے عالم میں کہی تھی۔ سیکرٹری برائے امور خارجہ

جون جے نے خبردار کیا کہ بربری شیطانیت نہ صرف امریکہ کی تجارت کو خطرے سے دوچار کر سکتی ہے بلکہ امریکہ کی اس کمزوری کا یورپ کی حاسِد قوتوں کو بھی اشارہ دے سکتی ہے ۔ غیر رسمی اختیارات کی امریکی جہازوں پر قزاقی حملوں کی خبروں نے بھی پریشانی پیدا کی کہ الجیری چھ اور آٹھ جہازوں کے دستوں کی صورت میں سمندر کے مختلف حصوں میں سفر کر رہے ہیں اور خود کو زیادہ سے زیادہ علاقوں تک مغربی جزیروں تک وسعت دے رہے ہیں۔ از حد پریشان جون پال نے دوسروں کو پرسکون رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ تاہم اس جارحیت کے باوجود ریاستوں نے ایک بار بھی ان قزاقوں کے خلاف کچھ کرنے کا نہیں سوچا بجز اس کے صرف ورجینیا کے تین یہودیوں کو ملک بدر کر دیا ان پر جنوبی افریقہ کی جاسوسی کا الزام تھا اور امریکہ مکمل طور پر غیر فعال رہا۔

یونائیٹڈ سٹیٹس نے ابھی آزادی حاصل کی تھی کہ اسے مشرق وسطیٰ کی جانب سے شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ بٹسی، ڈوفن اور ماریا نامی جہازوں کے اغواء اور قبضے کی اولین مثالیں ہیں۔ تاہم بعد میں بھی امریکہ کو اپنے خطے میں ان خطرات کا سامنا رہا۔ اس بربر کے بحران کی وجہ سے امریکہ میں فطرت، پہچان، اور صلاحیت جیسے بنیادی سوال اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیا ریاستیں اگر انفرادی طور پر خطرے کا سامنا کریں تو اپنی بقاء قائم رکھ پائیں گی۔ یا انہیں مئوثر دفاع کی مشترکہ کوشش کے لئے مل جانا چاہیے۔ یا امریکی یورپ نقل کرتے ہوئے قزاقوں کو رشوت دیا کریں گے۔ یا کیا وہ انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے ان کے ساتھ جنگ کریں گے؟ اگرچہ ان سوالوں کے جواب آج واضح نظر آتے ہیں لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر میں یہ سب کچھ کسی بھی صاف شفاف جواب سے بعید بات تھی۔ شیفلڈ نے طنز کرتے ہوئے کہا تھا امریکی ریاستوں کو ایک قوم کے طور پر کام کرنے پر تیار کرنا کوئی آسان معاملہ نہ ہوگا۔ امریکہ مفاہمت نہیں کر سکتا۔

معصومیت یا آزادی:

شیفیلڈ کو غلط ثابت کرنے سے پہلے امریکہ اولیں طور پر اپنی قوم کی قانون سازی اور کردار پر سخت قسم کے مباحث میں الجھ گیا۔ اس مباحثہ میں سب سے زیادہ بولنے والا ورجینیا کا سابقہ گورنر اور اعلانِ آزادی کا تشکیل کنندہ تھا۔ وہ ایک بڑا زمیندار تھا جو پیرس کے مشرق میں کبھی نہیں گیا تھا اور نہ اس نے کبھی کوئی جنگ لڑی تھی۔ تاہم ٹامس جیفرسن نے اس بات پر زور دیا کہ وہ

مشرق وسطیٰ کو سمجھ چکا ہے اور طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنے ملک کی طرح، اور یورپی ریاست کی طرح ناخوشگوار لیکن بحری تجارت کا بھوکا، قومی اتحاد کا خواہش مند، لیکن تشخص کو تحفظ دینے والا ٹامس جیفرسن طبقاتی تضادات کا شکار تھا کہ اس نے آدمی کو حقوق دیئے لیکن کالوں اور مقامی امریکیوں کو حقوق دینے سے انکار کر دیا۔ اصل میں جیفرسن ملبوس کا خیال رکھنے والا لیکن گندا فضول اور بھینچے ہوئے لبوں کا مالک تھا۔ اس نے خود کو گوروں کا رہنما اور آدمی ہونے کا دعوی کیا۔ جیفرسن کے سوانح نگاروں کو اس میں قدامت، عقیدہ انسانی مساوات، جمہوریت پسندی، شکم پرستی، فرانس کے خونی انقلاب کے لئے اس کی محبت اور جنگ سے نفرت جیسے حیران کن تضادات ملے جنہوں نے سوانح نگاروں کو حیران کر دیا۔ جوزف ایلیز مشہور مورخ نے جیفرسن کو بہت گہرا اور خالی آدمی کے مجموعے کا نام دیا جس نے بہت پڑھا لیکن غیر محتاط طریقے سے، دوسرے کے معاملے میں گہری نظر رکھنا لیکن اپنے معاملے میں خود کو دھوکہ دینا۔

کچھ معاملات میں بربری قزاقوں کی نسبت بہت غیر محتاط تھا۔ افریقی اور امریکی غلام رکھنے والا آقا ان میں سیلی ہمنگ بھی شامل تھا۔ جسے جنسی طور پر فائدے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس خیال کی تائید نہیں کرتا تھا کہ افریقیوں کے قبضے میں امریکی گورے ہوں یا ان کے حرموں میں امریکی گوری عورتوں سے تشدد کیا جائے۔ اس نے قرآن بھی پڑھ رکھا تھا اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں بہت سی کتابیں بھی پڑھ رکھی تھیں۔ اس نے خود سے عربی سیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ خود اس خطے اور اس کے بڑے مذہب کو اپنی دنیا کے لئے خطرناک سمجھتا تھا اور بے مقصد بھی۔

جیفرسن ایک نقطے پر متصل ڈٹا رہا کہ قابل فخر اور بہادر امریکی ایک دن بحری جہاز اور لڑا کا آدمی تیار کر لیں گے اور قزاقوں کو رشوت نہیں دیں گے۔ اس خاص قسم کے مزاج میں جیفرسن کو یقین تھا کہ یہی آزادانہ رویہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کی کردار سازی کرے گا۔ اس قسم کا انداز کسی بھی طرح پیسے دینے سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ جیفرسن امید کرتا تھا بربریوں کو پرامن رکھنے کے لئے کچھ دینے کے بجائے انہیں سبق دیا جائے گا اور امریکہ اپنی معیشت بچالے گا اور ظالم قوتوں کو سخت قسم کا پیغام دیا جائے گا۔ اس سے یورپ میں ہماری عزت بڑھے گی اور عزت فائدے کی ضامن ہے۔

1784ء میں جیفرسن کو فرانس میں سفیر نامزد کر دیا گیا اور کئی یورپی درباروں میں اسے اپنا

نمائندہ نامزد کیا۔ اس نے سب سے پہلے اس بات کی سفارت کی کہ امریکہ بربریوں کے خلاف سپین، پرتگال، ڈنمارک، سویڈن، نیپلز اور فرانس کے ساتھ اسحاق کر کے لڑنا چاہتا ہے۔ مشترکہ بحری فوجیں، یکساں طور پر نارتھ افریقہ کے ساحل کے ساتھ مستقل موجود رہیں گی۔ اور ان علاقوں کے مکینوں پر اس بات کے لئے زور دیا جائے گا کہ وہ قزاقی ترک کر کے فارمنگ شروع کریں۔ یونائیٹڈ سٹیٹس کے اس اقدام پر یورپی ردِعمل کے بارے میں وہ غیر یقینی تھا۔ اس نے فرانس کے نمائندے سے مدد کی درخواست کی جو امریکی انقلاب میں پہلے بھی امداد دے چکا تھا۔ اس نے حسبِ توقع اس منصوبے کو شروع کر دیا لیکن اس کا ردعمل واضح طور پر نفی میں تھا۔ جبکہ دیگر مملکتوں نے اس میں دلچسپی ظاہر کی لیکن بحری جہاز دینے سے انکار کر دیا اور بربریوں کو بیسہ دیتے رہے۔ فرانس نے مکمل طور پر اس مفاہمت سے انکار کر دیا۔ جیفرسن کے لئے، اسکی اپنی تجویز پر یونائیٹڈ سٹیٹس کا ردِعمل بہت مایوس کن تھا۔ کانگریس نے سختی سے جیفرسن کے مطابق جن دو لاکھ ڈالرز کی ضرورت تھی دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے ستر لاکھ ڈالر مختص کئے، سکیرٹری جے کے الفاظ میں یہ ڈالر درباروں کا اثر و رسوخ خریدنے کے لئے تھے جہاں رشوت اور بد دیانتی کا دور تھا۔ جیفرسن بہت مایوس اور شکست خوردہ تھا، وقار اور دولت کی شدید طلب جس کے بارے میں جیفرسن کا خیال تھا کہ امریکیوں کو بربریوں کے آگے یورپی انداز میں جھکنے سے آزاد کر دے گی۔ اس کام کے لئے ناکافی تھے۔ مزید برآں اپنے ملک کے لوگوں کو ایک قوم کے طور پر عمل کرنے کے لئے قائل کرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنا دفاع کر سکیں۔ جیفرسن نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا امریکیوں کو اب مچھلی کا سامان ڈھونڈنا چاہیے اور ان لوگوں میں سے کسی کو یہ بات محسوس کرنا چاہیے۔ لیکن جیفرسن بڑی بے بسی سے الجائریوں کو رشوت کی پیشکش ہوتے دیکھتا رہا۔

اس رقم کی ادائیگی کے لئے جان لیمب کو منتخب کیا گیا جو تاجر تھا اس کا کوئی سفارتی تجربہ نہیں تھا لیکن وہ بحرالکاہل میں تجارت کے سلسلے میں بہت کام کر چکا تھا۔ جیفرسن اس بات پر پریشان تھا کہ جان لیمب کا سلیقہ اس کام کے لئے موزوں نہیں تھا پھر جیفرسن خود کو دیکھتے ہوئے امید رکھتا تھا کہ جان لیمب بحر حال ذیشعور ہے جس کے پاس لین دین اور سودے بازی کی کافی صلاحیتیں ہیں۔ لیمپ کی غیر موزونیت دھیرے دھیرے ظاہر ہوئی جس لمحے وہ الجائرز میں پہنچا، یہ 1786ء اور فروری کا مہینہ تھا۔ جان کو لیمپ فرنچ کونسل جین بپتستی ڈی کرس نے جس نے یونائیٹڈ

سٹیٹس کی امداد کی نفی کی گمراہ کیا اور خفیہ طور پر حسن بے کو اطلاع دے دی۔ یوں لیمب ایک بھی آدمی کو رہا کرانے میں ناکام رہا۔ اسے مزید تاوان دینے کی ایک فہرست دی گئی جس میں جنرل واشنگٹن کا ایک پورٹریٹ بھی تھا جس کی حسن بے بہت تعریف کرتا تھا۔ ڈوفن نامی جہاز کے کپتان رچرڈ او برائن جو اس واقعے کا عینی شاہد ہے کا کہنا ہے کہ مجھے امید تھی کہ اب دوبارہ کبھی جان لیمب کو گھوڑوں اور گدھوں کی خرید و فروخت کرتے بَر بَر میں کبھی نہیں دیکھوں گا۔

امریکہ کا پہلا سفارتی قدم ناکامی سے دوچار ہو چکا تھا لیکن الجزائر میں ناکامی، امریکہ کو دوسری بربری ریاستوں سے معاہدے کرنے سے نہ روک پائی۔ حقیقت میں جب لیمب، حسن بے کے سامنے خود کو ذلیل کر رہا تھا اس دوران ایک اور امریکی آج کے لیبیا کے ایک بڑے شہر طرابلس Tripoly میں مذاکرات کر رہا تھا۔ یہ موقع اس وقت آیا جب طرابلس کے پاشا کے سرکاری نمائندے عبدالرحمٰن الاجر نے جون آدم کی مہمان نوازی کی پیشکش کی۔ جون آدم امریکہ کا برطانیہ میں سفیر تھا۔ آدم ابتداء میں تو اس میزبانی کی پیشکش قبول کرنے سے ہچکچایا کہ اسے خوف تھا کہ ابتدا میں گفتگو یقیناً خراج کے گرد گھومے گی لیکن بحرالکاہل میں امریکی تجارت کو درپیش خطرات کے سبب وہ تیار ہو گیا کہ اس وقت کم از کم نارتھ افریقہ کی ایک ریاست کے ساتھ امن قائم ہونا چاہیے۔

ایڈم کی نظروں میں عبدالرحمٰن الاجر ایک دیو اور خلائی مخلوق کی طرح تھا ایسی چیز جو وبا اور جنگ مسلط کرنے اور پھیلانے والا ہو۔ جب یہ پہلا مشاہدہ ختم ہوا تب بطور ایلچی اپنے مہمان کو خوش آمدید کہا اور اسکی حقے اور تیز کافی سے خدمت کی، عبدالرحمٰن نے اٹلی، ہسپینی اور فرانسیسی زبانوں کے ملغوبے میں آدم سے اس کے نوزائیدہ ملک امریکہ بارے میں پوچھا۔ سفیر نے بڑی خوش دلی سے اپنی حکومت، اپنے لوگوں، اپنی قوم و موسم اور وہاں کی سرزمین کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ عبدالرحمٰن کے منہ سے صرف ایک لفظ بہت اچھے نکلا، اور پھر بنا کسی توقف کے اس نے امریکہ کو طرابلس کا دشمن قرار دیا۔ آدم یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ بربر ریاستیں بحرالکاہل کی حکمران اور سلطان تھیں اور عبدالرحمٰن نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کوئی قوم ان سے معاہدے کے بغیر بحرالکاہل میں جہازرانی نہیں کر سکتی۔ اور یہ امن تیس ہزار ٹکوں کے عوض قائم ہوا اور اس کے ساتھ مزید تیس ہزار ٹکے اس کے انعام کے بھی ادا کئے۔ اتنی ہی رقم تقریباً تونس کے لئے درکار تھی۔ حساب عبدالرحمٰن الاجر کا تھا اس نے مزید کہا کہ اس سے دوگنی رقم مراکش اور الجزائر سے

مصالحت کے لئے درکار ہوگی پوری رقم ایک ملین ڈالر تھی جو تقریباً امریکہ کے سالانہ بجٹ کا دسواں حصہ بنتی تھی۔

کانگریس کے وقار سے مفاہمت بہت مشکل ہوگئی اُن مفروضات کو پڑھ کر جو کانفرنس میں شرکت کے لئے ہوئیں ''آدم نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے کہا'' انہیں نیویارک تھیٹر کے بارے میں لکھنا مناسب ہوگا۔ اپنے غرور اور تکبر کے لئے مشہور سفیر کو عبدالرحمٰن کی بدتمیزی پر بہت غصہ آیا جو اس نے نیا جنم لیتی ریاست امریکہ کے لئے کی۔ اس نے اس معاملے پر بہت غصے کا اظہار کیا کہ عیسائیت نے تمام جہاز ران اور ملاح بزدل پیدا کئے ہیں۔ اور وہ ظلم جو محسوس نہیں ہو رہا تھا اس کا جواب دینے کے پس منظر پر غم کا اظہار کیا۔ اپنے عوام کی زندگیوں کی پروا کیوں ہو، جو سیب کے ایک درخت کو پکڑے چمٹے ہوئے ہیں۔ آدم نے جیفرسن کی رائے میں سب کو شریک کیا کہ امریکی وقار صرف قزاقوں کی مزاحمت کرنے سے بحال ہوگا۔ لیکن اس نے عملی جنگ میں معاشی عمل کے بارے میں شک وشبہ کرنا جاری رکھا۔ امریکہ بحری جہازوں کے نقصان کا تخمینہ بڑھتے ہوئے انشورنس کے ریٹ اور بڑھتے ہوئے امریکی قرضوں پر بات کرتے ہوئے آدم نے یہ نتیجہ نکالا کہ سالانہ ایک ملین پاؤنڈز کا نقصان کرنے کے بجائے دو لاکھ پاؤنڈ ادا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ آدم یہ عہد کرنے میں سرکش تھا کہ ہمیں کسی بھی طرح بربری ریاستوں سے اس وقت تک جنگ نہیں کرنا چاہیے جب تک ہم انہیں ہمیشہ کے لئے مار بھگانے کا ارادہ نہ کرلیں لیکن بحری قزاقوں کے ساتھ جنگ کے لئے وہ خوف زدہ تھا کہ یہ کام ہمارے لوگوں کو برداشت کرنا مشکل ہوگا۔

جیفرسن نے اکیلے آدم کے مزاج کو سمجھنے کے بجائے امریکی عوام کے مزاج کو سمجھنے کو ترجیح دی اور اسے یقین تھا کہ امریکی لوگ اگر انہیں مناسب ساز وسامان اور اختیار دیں تو یہ نارتھ افریقہ کے خلاف ضرور لڑیں گے۔ تاہم سیاستدان ہونے کے ناطے جیفرسن نے امریکہ کے ساتھ قزاقی اور لوٹ مار کے مسئلے کو بات چیت کے ذریعے سفارت کارانہ طریقے سے حل کرنے کے امکان کو ختم نہ کیا۔ اس کا موقع ملنا بھی چاہیے تھا۔ پس جیفرسن مارچ 1786ء میں لندن میں آدم سے آملا تاکہ امکانی تباہ کن عالمی جنگ کو روکا جائے اور طرابلس سے میل ملاقات اور مفاہمت ہو۔

عبدالرحمٰن کے سامنے، امریکیوں نے دوبارہ یگانگت اور انسیت کا اظہار کیا۔ جو وہ دنیا کی دوسری قوموں بشمول طرابلس کے لئے محسوس کرتے تھے۔ امریکہ کے لوگ خون بہانے کے مخالف

تھے انہوں نے مزید آخر میں کہا کہ قابلِ قبول شرائط پر وہ طرابلس کے ساتھ ہمیشہ دوستی کے معاہدے کے لئے تیار ہیں۔ عبدالرحمٰن الاجراُن کی تمام باتیں بہت غور سے سنتا رہا جب اس کے بولنے کی باری آئی تو اس نے دوبارہ ایک ملین ڈالر کا مطالبہ کیا۔ اُس نے اس وقت اپنے عقیدے کا اظہار کیا کہ امریکہ کو اس سے ایک دن روشناس ہونا پڑے گا اور ان دونوں بنیاد گزاروں کو غصے اور مایوسی کے عالم میں چھوڑ کر چل دیا۔

ایڈم اس کے بارے میں کافی سن چکا تھا۔ نارتھ افریقہ کے لوگ ہوس اور لالچ کا شکار ہیں۔ اس نے یہ نتیجہ نکالا، ان کے ساتھ گفت وشنید کرنا ان کی اشتہا بڑھانا یا انہیں تنگ کرنا ہے اور یہ بات امریکہ کے لئے شرم کا باعث تھی۔

جنگ کے لئے امریکہ کی رضامندی ہرگز قابلِ اعتبار نہ تھی اور آدم اس بات پر قائم تھا کہ رشوت، امریکہ کے لئے بہتر کام ہے۔ جیفرسن نے بھی اس سے ملتا جلتا نتیجہ نکالا کہ اس کام کے لئے فرشتہ ہو، کہ وہ طرابلس کے باشندوں کے ساتھ امن قائم کرنے کے لئے کچھ نہیں کرسکے، اور اس نے مزید زرقم دینے کی مخالفت کی۔ لیکن جیفرسن بھی اس بات کا یقین دلانے کے لئے بہت مصر تھا کہ امریکیوں کو اپنے وقار اور فلاح کے لئے مسلح ہونا ہوگا اور بربریوں کے ساتھ امن، فقط جنگ کے ذریعے سے حاصل ہوگا۔

کانگریس، انقلاب کے بعد کے اثرات پر ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی وہ جنگ سے گریز چاہتی تھی اور جون 1786ء میں جیفرسن بشمول آدم اور فرینکلن کو مراکش کے ساتھ امن مذاکرات کی ہدایات دیں۔ اس سلطنت کے حاکم سدی محمد بن عبداللہ نے دعویٰ کیا وہ پہلا سلطان ہے جس نے امریکی آزادی کو تسلیم کیا اور پہلا مسلمان رہنما ہے جس نے اس نوزائیدہ جمہوریت کے ساتھ معاہدہ کیا۔ اگرچہ کانگریس نے لیت ولعل سے کام لیا اور سلطان کو ناراض کرنے کا سبب بنی۔ بدلے میں مراکش کے باشندوں نے امریکی جہاز پکڑنے شروع کردیئے۔ اس کا آغاز انہوں نے اکتوبر 1784ء میں بٹسی پر قبضے سے کیا۔ اس واقعے نے امریکیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ازاں بعد، جیفرسن، آدم اور فرینکلن سلطان کے غیض وغضب کو روکنے کے لئے روانہ ہوئے۔ بیس ہزار ڈالر کے تحفے کے بدلے میں مذاکرات کنندگان سے بٹسی کو محفوظ طور پر واگزار کرایا اور امن دوستی اور جہازوں کے سگنل کا معاہدہ کیا۔ پس امریکہ کی سفارتی تاریخ میں طویل مدتی

معاہدوں کا آغاز ہوا اور یہ پہلا معاہدہ عربی میں تحریر ہوا جس پر اسلامی تاریخ درج تھی (رمضان، 1200 ہجری) اس معاہدے کے تحت امریکہ نے طنجہ میں اپنا سفارت خانہ قائم کیا۔

مذاکرات کنندگان میں شامل ہونے کے باوجود جیفرسن کو خوف تھا کہ مراکش کے ساتھ معاہدہ بے معنی ہے جب تک امریکہ کے پاس عوامی خزانے اور عوامی قوت کی کمی ہے جو اس معاہدے کی تعمیل کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ نتیجہ اس نے نارتھ افریقہ کے ساتھ تمام مذاکرات اور گفت وشنید ختم کردی، جب تک امریکہ ضروری اقدامات نہیں کرلیتا۔ اور جس سے فیڈرل حکومت میں کمزوری کا نظریہ درست نہیں ہو جاتا۔ درمیانی عرصے میں بربری ریاستوں نے مراکش کے طریقہ کو اپنانے کے لئے تیزی دکھائی جس سے وہ امریکہ سے بہت سی سہولتیں لے سکتے تھے۔ جونہی بٹسی کو آزاد کیا اسے دوبارہ تونس والوں نے قبضے میں لے لیا اور اس کا نام سرکاری طور پر تبدیل کرکے مشوودہ رکھ دیا۔

ان رسوائیوں نے جیفرسن پر بہت بوجھ ڈالا لیکن اس کے ساتھ جارج واشنگٹن بھی شدید بوجھ تلے دبا ہوا تھا جو اس وقت بہت زیادہ قابل عزت شخص تھا۔ 1776ء میں اس نے اپنے ملک کی کمزوری دور کرنے کی کوشش کی تھی اب واشنگٹن نے بہت ذلت محسوس کی کہ اہل مغرب ان قزاقوں کو خراج دینے لگے ہیں۔ جبکہ اس سے آدھی رقم جو ان قزاقوں کو دی جاتی ہے استعمال کرکے ان قزاقوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ جیفرسن کی طرح واشنگٹن بھی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ امریکی بلیک میل ہونے کے بجائے ان کا مقابلہ کرنا پسند کریں گے۔ لیکن ابھی تک ان کے پاس لڑنے کے لئے جنگی جہاز نہیں ہیں کاش ہمارے پاس نیوی ہوتی تو ہم انہیں انسان بنا دیتے ہمیشہ کے لئے کچل دیتے۔ واشنگٹن نے اپنے پرانے ساتھی لے فائے سے کہا۔

ابھی تک حقیقت یہی تھی کہ امریکہ کے پاس نیوی نہیں تھی۔ حتی کہ ایسا قانونی ذریعہ بھی نہیں تھا جس سے نیوی قائم کر سکتے۔ بنجمن رسل نے جو Sentinel کا ایڈیٹر تھا جان آدم کو لکھا "حکومت کے قومی نظام کے بغیر، ہم جلد دیگر اقوام کا شکار ہو جائیں گے"۔ کیپٹن اوبرائن نے ان دو برسوں کو یاد کرتے ہوئے جو اس نے اور ڈافن اور ماریا کے ارکان کے ساتھ الجزائر کی جیل میں گزارے تھے لکھا کہ ہمارے مصائب بیان سے باہر ہیں اس سے قوم میں غصے اور بے عزتی کا احساس پھیلا۔ ڈیوڈ ہیمفرے جو جنرل واشنگٹن کا ساتھی، سفارت کار اور شاعر بھی تھا اس نے اس بیزاری کو درج

ذیل شعری ٹکڑے میں بیان کیا:

> "See what dark prospect interrupts our joy what arm presumtuous dare our trade annoy Great God! the rovers who infest thy waves have seiz'd our ships and made our freemen slaves"

نارتھ افریقہ میں قیدی ملاحوں کے خوفناک خیال اور امریکی بحری جہازوں کو خطرے میں ڈالنے کے خیال کے تحت، تیرہ ریاستوں میں سے بارہ ریاستوں کے نمائندے فلاڈلفیا میں مئی 1787ء میں جمع ہوئے۔ ان کا مقصد آرٹیکل آف کنفیڈریشن کو تبدیل کرکے مزید مرکزیت کے لئے غور وفکر کرنا تھا تاکہ اس کمزوری کو دور کیا جائے جس نے امریکہ کو بربری ریاستوں کے ہاتھوں مغلوب کرر کھا ہے۔

واشنگٹن نے اس مجلسِ قانون ساز کا اعزازی چیئرمین ہونے کے ناطے سے نمائندگان پر زور دیا کہ الجزائر کے لوگوں کے بارے میں گفتگو سے پرہیز کیا جائے جب تک ہمیں اتحاد اور اکٹھا ہونے کی قوت اور فکر نہیں مل جاتی۔ اس پر مزید غور کرکے ہم اسے بہتر استعمال کرنے کی حالت میں نہیں آجاتے۔ یہ درخواست انقلاب کے بہت معزز ہیرو کی جانب سے تھی اس لئے اسے آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس اجلاس کے تمام نمائندے بربری ریاستوں کے ذکر سے گریز کرتے رہے لیکن ایک تجارتی قوم کے فرد ہونے کے ناطے سے وہ تجارت کی حفاظت کے لئے ضروری نیوی قائم کرنے کے سوال کو کیسے نظرانداز کر سکتے تھے۔

جیمز میڈیسن جو ایک کوتاہ قامت ورجینیا کا افسر تھا جو اس اسمبلی کا اہم ترین شریک کار خیال کیا گیا وہاں موجود لوگوں کے لئے بار بار بولتا رہا جو ایک مضبوط نیوی قائم کرنے کے خیال سے خوفزدہ تھے۔ تاہم اسے امریکہ کی نیول پاور کے لئے اہم ضرورت تسلیم تھی۔ کمزوری ہماری مزید ذلت کرے گی۔ اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا ان خطرات سے بچنے کا بہترین راستہ نیوی کا قیام ہے۔ اس اجلاس میں اگرچہ امریکن فیڈریشن اور مشرق وسطیٰ ریاستوں کے درمیان تعلق کو بہت کم اہمیت دی گئی۔ لیکن تجویز کردہ آئینی شق پر بہت غور کیا گیا۔ تھامس تھیچر نے میساچوسٹس کے اجلاس کی یاددہانی کروائی کہ الجزائر میں ہمارے ملاحوں کی غلامی اس بات کے لئے کافی ہے کہ ہمیں ایک جنرل گورنمنٹ کی ضرورت ہے۔ سارجنٹ نے کہا کہ یہ سوچنا بلاجواز ہے کہ امریکہ اس غیر موثر

آرٹیکل آف کنفیڈریشن کے تحت چلتا رہے گا اور پھر بھی ان سمندروں میں قزاقوں اور لوٹ مار سے اپنا دفاع کرلے گا۔اس قانون سازی کے لئے مدد کرو کہ اس سے ایسا لائحہ عمل بنے کہ ہم نیوانگلینڈ اور امریکہ سے باہر تک اپنی تجارت کی حفاظت کرسکیں۔ ہیوولیمسنز جو ایک فزیشن اور ماہر فلکیات تھا نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس ایسا کیا ہے کہ ہم بحری قزاقوں کے اپنے ساحلوں پر اترنے سے اور اپنے شہریوں کو غلام بنانے سے روک سکیں۔کن ٹکی کے اٹارنی جنرل نے سوال پوچھا کیا الجیری ہمارے جہازوں پر قبضہ نہیں کرتے کیا وہ ہمارے جہازوں اور تجارت کو تباہ نہیں کرتے اور انہیں کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں ہوتی اس کا صرف ایک جواب تھا اور ولیمسن اور نکولس کا حتمی موقف اتحاد تھا۔

ایسی طاقت وروجوہ ان لوگوں کی دلچسپی اور سروکار کو کم نہ کرسکیں جو مرکزی کی طاقت کے پھیلاؤ سے ابھی تک ڈرتے تھے۔ بہت مباحث شدت اختیار کر گئے اور تلخ ہوگئے۔قانون سازی کے طے شدہ تحفظ میں۔میڈیسن، نیویارک کے جان جے اور الیگزینڈر ھیملٹن کے ساتھ مل گیا اور مضامین کا ایک پورا سلسلہ لکھا۔ جو بعد میں ایک مجموعے فیڈرلسٹ پیپرز کے نام سے شائع ہوا۔انہوں نے بھی جنگی جہازوں اور تجارتی جہازوں کے درمیان ضروری تعلق پر زور دیا۔''اگر ہمارا مطلب تجارت پسند عوام کہلانا ہے تو ہمیں جلد از جلد بحری فوج کے قیام کے لئے کوشش کرنا چاہیے'' ھیملٹن جو تجارتی ذہن حقیقت پسند آدمی تھا اس نے (فیڈرلسٹ نمبر 24) کی شق قائم رکھتے ہوئے اور شق نمبر 11 کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے کہا کہ ہم ایک مناسب حد تک کی بحریہ کے محکمے کے بغیر کچھ نہیں۔امریکی ذہین لوگ تاجر اور ماہر جہازرانوں کے گلے کٹتے رہیں گے اور یہ ضائع ہوتے رہیں گے۔ خاص طور پر نارتھ افریقہ کی جانب سے خطرہ کا حوالہ دیتے ہوئے میڈیسن نے (شق نمبر 41) کی تصدیق کی اور کہا کہ صرف ریاستوں کے اتحاد سے قزاقوں اور بربریوں کی جانب سے تباہ کن مطالبوں سے قوم کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ساتھ باہر جتنا برا سلوک ہوگا ہم اس قدر متحد ہوں گے۔گویا اس سیکرٹری نے قزاقوں کے حملے کو خوش آمدید کہا اور خوشگوار سمجھا جو ان امریکی ریاستوں کو متحد ہونے پر مجبور کر دیتے اور یہ تونس اور طرابلس کے قزاقوں اور ڈاکوؤں کے خلاف بھرپور عمل کرتے۔

ایک زیادہ تخیلاتی کوشش، مشرق وسطی کے خلاف پیٹر مارکو نے قائم کی۔ پیٹر مارکو کو پیار

سے پئر دی پوئٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔آکسفورڈ سے گریجوایٹ تھا۔ مارکو فلاڈلفیا کے اہم شاعر اور بڑے پبلشرز کے طور پر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ نیوی قائم کرنے کی شق کے تصدیقی اور توثیقی مباحث کی شروعات اس نے 1787ء میں دی الجیرئین سپائی کے نام سے پنسلوانیا میں کتاب شائع کی جو فیڈرلسٹ پراپیگنڈے کا طنزیہ فن پارہ تھا۔ اس فن پارے میں مارکو نے خود کو ایک جاسوس کے طور پر پیش کیا جسے الجزائر نے امریکہ کے دفاعی نظام کی جاسوسی کے لئے بھیجا ہے۔ اس میں مارکو نے یونائیٹڈ سٹیٹس کے مہیا کردہ سیاسی اور معاشی آزادیوں کی تعریف کی تھی۔لیکن بعد میں قومی یگانگت کے نہ ہونے کا تمسخر اڑایا ہے کہ عدم یگانگت و اتحاد اور دھڑوں کے باعث تباہ ہوئی ریاستیں بنا کسی خطرے کے غارت کی جاسکتی ہیں۔اور ان کے جواں مرد اور عورتیں فتح کر کے قیدی بنائے جاسکتے ہیں۔امریکہ کو تیزی سے تباہ کرنے کے لئے مارکو کے پاس جاسوس تھا جو روھڈ آئی لینڈ پر تیزی سے قبضہ کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ یہ وہ ریاست ہے جس نے اجلاس کا بائیکات کیا اور اس کی زمین کو الجیرین آپریشنز کا گڑھ بنا دیا ہے۔

دی فیڈرلسٹ پیپرز اور دی الجیرین سپائی جیسی کتاب نے مرکزیت پسندوں کی خاصی مدد کی۔اس قانون کو 4 مارچ 1789ء میں سرکاری طور پر اپنا لیا گیا۔اور کانگریس کو اتنی طاقت مل گئی کہ اس نے جنگ کا اعلان کر دیا اور نیوی قائم رکھنے اور قائم کرنے کی قوت بھی کانگریس کو مل گئی۔ مشرق وسطیٰ کے خطرے نے امریکہ کو صحیح معنوں میں ریاست ھائے متحدہ امریکہ بنانے میں ٹھوس کردار ادا کیا۔یعنی اسے ایسی اور مضبوط قوم بنا دیا جو نہ صرف اپنی سرزمین پر اپنے ساحلوں کی اور دیگر ملکوں کے ساتھ سمندر کے ذریعے تجارتی سرگرمیوں کا دفاع کرسکتی تھی۔ بلاواسطہ طور پر کہہ سکتے ہیں کہ الجزائر کا ظالم حسن بے اس قانون کا بانی مبانی اور بنیاد گزار رہے۔ یہ بات امریکی سفارت کے تاریخ دان تھامس بیلی نے لکھی ہے۔آیا امریکی، اپنی تازہ قائم کردہ فیڈرل پاور کو استعمال کر کے جنگ کرسکیں گے یا نہیں یہ قبل از وقت سوال تھا۔عوام کی طرف زبانی طور پر اتنی بڑی نیوی قائم کرنے کے نظریہ پر اعتراض ہوتے رہے اور بیرونی جنگ و جدل میں شامل ہونے اور اسے برداشت کرنے پر اعتراض ہوتے رہے۔اور کچھ لوگ تو ہر حال میں ہتھیار اٹھانے کے آرزومند تھے اور بربریوں کی طرف پیش قدمی کو ترجیح دیتے تھے۔

عدم صلاحیت اور غصہ:

نیویارک میں اپنے کشادہ دفتر کے فرش پر چلتے ہوئے جیفرسن قوت حاصل کرنے کے لئے امریکیوں کے اشتیاق سے کھیلتا رہا۔ 1789ء کے آخر میں پیرس سے رخصت ہونے کے بعد اس نے وزیرِ خارجہ کے طور پر حکم نامہ قبول کر لیا۔ یہ ایسا عہدہ تھا جس میں اسکی 3500 ڈالر سالانہ تنخواہ تھی اور پانچ اسسٹنٹ بھی ملے اور اسکی ابتدائی ذمہ داری بربری بحران کو حل کرنا تھا۔ اس ترقی کی وجہ سے اس کا لہجہ بھی قزاقوں کے بارے میں تھوڑا بدل گیا۔ اس نے ان قزاقوں کو سمندری کتے اور قانونی حیلہ جو لٹیرے کہا۔ جیفرسن، امریکہ کے ان خاص قسم کے لوگوں میں شامل تھا جو مشرق وسطیٰ کے خطے کو غیر آئینی اور جہالت کی آماج گاہ سمجھتے تھے۔ جو ان کی جمہوریت اور روشن خیالی کے بالکل متضاد تھا۔ یقینی طور پر اس کے ذہن میں مسلم مقدس جنگجو تھے جن کا جھکاؤ امریکیوں کو غلام بنانے کی طرف تھا۔ یہ سب جنگجو مال اور دولت کے بجائے لوہے کے گولوں کے حق دار تھے۔ لیکن امریکیوں کی اکثریت ابھی تک طاقت کے استعمال کی مخالف تھی۔ جیفرسن کے پاس سوائے اس کے اور کوئی متبادل راستہ نہ تھا کہ وہ نارتھ افریقہ کے ساتھ مذاکرات کرتا رہے اور اور قیدی چھڑواتا رہے۔

میتھارین کے سینٹ جان جو فرنچ آرڈر کے ممبرز تھے انہوں نے اپنی زندگیاں عیسائی غلاموں کو رہا کروانے کے وقف کر دیں۔ جفیرسن نے الجزائر کو خراج دینے اور ساتھ غیر واضح طور پر مختلف اوقات میں رقوم دینے کی پیشکش کی۔ لیکن سلطان نے اسے رد کر دیا جب فرانس انقلابی مجاز شخصیات نے ان میتھاڈسٹ پادریوں کو کچل دیا تو جیفرسن کے پاس درمیانی رابطے کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ کئی ماہ گزر گئے جن کے دوران میں اسے امریکی قیدیوں کی طرف سے شدید غصے بھرے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں کئی تو وبائی اور مہلک امراض میں مبتلا تھے۔ جیفرسن نے اس وقت محسوس کیا کہ ہمارے قیدیوں کی مشکلات شدید ہیں اور امریکی پالیسی ابھی غیر واضح ہے جو بربریوں سے جنگ کرنے کے لئے قانونی ذرائع اختیار کر رہی ہے لیکن ابھی تک انہیں استعمال کرنے پر راضی نہیں۔ اور اپنی کمزوری اور غصے کے درمیان معلق ہے۔

آخر کار مایوس جیفرسن نے دسمبر 1790ء میں امریکہ کو جنگ کرنے کی تجویز دی۔ ہمارے شہریوں کی رہائی کا ربط اصل میں بحر الکاہل میں ہماری تجارتی آزادی ہے۔ اس نے کانگریس میں

وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ دونوں کی خرابی اور انتشار کا سبب یکساں ہے اور ایک چیز کے لئے کئے گئے اقدامات دوسری کو بھی فائدہ دیں گے۔ اس نے مزید کہا کہ کانگریس کو اپنے دفاع کا حق ہے یوں اس نے امریکی پالیسی بھی واضح کر دی، الجزائر کے پاشا کی طرف بھیجے گئے نمائندوں کو نکال کر ابگریکٹوز کی طرف سے دفاع کا حق ہے، اس نے اس بات پر تاسف کا اظہار کیا لیکن سینٹ نے اس بار بھی جیفرسن کی جنگ کے لئے اٹھنے والی آواز کو رد کر دیا۔ اس کے بجائے انہوں نے خراج اور تاوان کے ایک لاکھ چالیس ہزار 1,40,000 ڈالر کی خطیر قرم مہیا کر دی۔ اور اسے دینے کے ذمہ داری وزیرِ خارجہ کو دے دی۔

جیفرسن نے بادلِ نخواستہ خود کو مجتمع کیا اور رقم کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ یہ کبھی بربریوں سے امن نہیں خرید پائے گا۔ اس شخص کا نام جان پال تھا یہ پہلا امریکی افسر تھا جس نے انقلاب کا جھنڈا سب سے پہلے اٹھایا تھا اس کی بطور بحری کپتان کافی شہرت تھی۔ جنگ آزادی کے دوران اس کی بہادرانہ خدمات کو تسلیم کر کے جیفرسن، اسے روسی نیوی میں کمیشن لینے سے روک چکا تھا۔ جان پال عثمانی ترکوں کے پہلے بھی کافی فتوحات حاصل کر چکا تھا۔ اور اس کے ذہن میں مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں کے لئے شدید مخالفت تھی۔ صرف قزاقوں کے خلاف جنگ کر کے امریکی عظیم قوم بن سکتے ہیں۔ جو آزادی کے صحیح حق دار ہوں۔ جان نے اس بات کو قائم رکھا۔ جیفرسن نے اسے پچیس ہزار ڈالر کی معمولی رقم دے کر الجزائر بھیجا۔ جیفرسن کو یقین تھا کہ الجزائر کا سلطان اس رقم کو ٹھکرا دے گا۔ کانگریس، جو بحر الکاہل میں متصل نیوی کے لئے مناسب فنڈ دینے کی بات ٹھکرا چکی تھی لیکن اب وہ دے دی گئی۔ جان پال جونز، آدھا درجن جہازوں کے ساتھ ان قزاقوں کی تجارت مکمل طور پر تباہ کر دے گا۔ وزیر خارجہ نے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا کہ ان سب کو کاٹ کر سکھ کا کھانا کھائے گا۔ جیفرسن نے ساتھ اپنی ہدایات پیرس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے جونز کو بھیج دیں۔ لیکن یہ ہدایات دیر سے پہنچی پینتالیس سالہ کیپٹن جونز کسی پُراسرار بیماری کا شکار ہو کر مر چکا تھا۔

جیفرسن کا اگلا ایلچی تھامس بارکلے تھا جو مراکش کے ساتھ مذاکرات پر شدید آزردہ تھا۔ اسے جلد از جلد لزبن پہنچنے کو کہا اس سے پہلے وہ کسی بیماری کا شکار ہوتا۔ ایک تیسرا ایلچی ہمفرے کو بھیجا گیا یاد رہے یہ وہی جنگجو شاعر ہے جس نے نوحہ لکھا تھا (جو لوگ لہروں کو زہریلا کرتے ہیں

اور ہمارے آزاد لوگوں کو اپنا غلام بناتے ہیں) ہیمفرے جیسے ہی جبرالٹر پہنچا اسے معلوم ہوا کہ الجائیریوں نے ان کے بیس اور بحری جہاز پکڑ لئے ہیں اس کے ساتھ مزید 119 ملاحوں کو قیدی کر لیا ہے ڈوفن اور ماریا کے قیدیوں کی رہائی کی التجا کرنا کوئی دانشمندانہ بات محسوس نہیں ہوتی تھی جب کہ الجائیری دیگر لوگوں کو گھات لگا کر پکڑ رہے تھے سو ہیمفرے نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔

آزادی کے ٹھیک پندرہ برس بعد بھی یونائیٹڈ سٹیٹس کو بربری قزاقوں کی طرف سے تباہ کن خطرات کا سامنا تھا کچھ امریکی تاجروں نے خود کو راہداری کے اجازت ناموں تک محدود کر لیا جو الجائیری قزاق تاوان اور خراج دینے والے ملکوں کو جاری کرتے تھے۔ کچھ تاجروں کو ڈچ اور سپینی جنگی جہاز بھاری کرایوں پر لینے پر مجبور کیا جاتا تھا جو انہیں بحیرہ روم کے پار تک بحفاظت لے جاتے تھے۔ خطرہ اس قدر سخت تھا کہ سیکرٹری خزانہ الیگزنڈر ہیملٹن نے نہایت پریشانی سے کہا ''ان حالات میں الجائیریوں کے سامنے جو ہماری حالت ہے یہ دانشمندانہ بات نہیں ہو سکتی کہ ہم جہاز میں بٹھا کر جان جے کو برطانیہ پہنچا سکیں۔

بربری معاملات پر عمومی رائے بدل رہی تھی امریکی عوام اب اغوا کے خطرات اور جہاز رانی کے لئے انشورنس کے آسمان سے باتیں کرتے ریٹس سے اور اس پر مستزاد امریکی ذلت سے بیزار ہو رہے تھے جارج واشنگٹن نے بطور صدر کے حلف اٹھاتے ہوئے کہا کہ وہ الجزائیر میں بدقسمت قیدیوں کی رہائی کے لئے ہر ممکن قوت استعمال کرے گا اس نے یورپ میں ہونیوالی تازہ ترین جنگ جو یورپ اور انقلابی فرانس اور برطانیہ کے درمیان ہو رہی تھی میں دلچسپی ظاہر کی۔ اور امریکی ساحلوں کے قریب دیگر جنگی جہازوں کی موجودگی سے متعلق بھی اپنے خدشات ظاہر کئے کہ ''اگر ہم ذلت سے بچنا چاہتے ہیں ہمیں ان کی مدافعت کے قابل ہونا چاہیئے'' واشنگٹن نے دسمبر 1793 میں کانگریس کو کہا۔ صدر سے متفق ہوتے ہوئے کانگریس نے نیوی کی تخلیق پر مباحثہ شروع کیا۔

وہ نمائندے جو خیال کرتے تھے جنگی جہازوں کی تعمیر بہت مہنگی اور امن اور آزادی کے لئے خطرناک ہے انہوں نے اس بحث کی مخالفت کی۔ جارجیا کے ابراہم بالڈون نے دلیل دی کہ صرف رشوت سے ہی الجائیریوں سے امن کا سودا ہو سکتا ہے۔ جب کہ ورجینیا کے جان نکولس نے اس بات کی توثیق کی اور کہا ''ہم سمندر میں الجائیریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے''۔ نیوجرسی کے ابراہم

کلارک نے نیوی کے لئے سیکرٹری کی ضرورت اور دفتر میں دیگر بہت سے آدمیوں کی بھرتی کی ضرورت کا حوالہ دیا اور خبردار کیا کہ مشترکہ یورپی قوتیں امریکی بیڑے کو جنگ کا بہتر بہانہ سمجھیں گی''۔ کلارک نے امریکی خطرات اور اخراجات کم کرنے اور قزاقوں سے لڑنے کے لئے پرتگال کو کرائے پر لینے کی تجویز دی۔

اس قسم کی بزدلانہ باتیں میری لینڈ جان سمتھ کے لئے بہت تلخ اور پچھلے ادوار کی جمہوری حکومت کے قواعد کے لئے ناکافی تھیں میری لینڈ کے ایک اور باشندے ولیم وینز مرے کا کہنا تھا قزاق اب تک امریکہ کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں جب سے انقلابی جنگ ختم ہوئی ہے اور ان قزاقوں نے امریکہ کیلئے سوائے جنگ کے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ ماساچوسٹ کے فشر ایمی نے جو آزادانہ تجارت کا ماہر تھا خاص طور پر اس بدشگونی اور نحوست کا ذکر کیا کہ ''ہماری تجارت خاتمے کے قریب ہے جب تک ضروری سازوسامان اور اسلحہ سے لیس نہیں ہو جاتے اور ہم توقع کر سکتے ہیں کہ الجیری قزاق بہت جلد امریکی ساحلوں تک پہنچ جائیں گے۔

بات معاشی اور جنگی باتوں سے نکل کر مضبوط مرکزی حکومت کے شدید مخالفین کے برخلاف بدنما محرکات کو سامنے لاتے ہوئے آئینی جہت کی طرف چل نکلی۔ جیفرسن نے حیران کن حد تک پالیسی میں تبدیلی کے باوجود فیڈرل حکومت کے لئے اپنے تحفظات کا اظہار کیا اور بربریوں سے مردانہ وار جنگ کی پرانی خواہش کو رد کرتے ہوئے جہاز سازی کی مخالفت کی، حتی کہ جیفرسن کے ساتھی اور مداح نے بھی پوچھ لیا کہ کیا جہاز سازی کے لئے اتنی لکڑی موجود ہے کہ اس مقصد کی تکمیل ہو سکے۔ دوسری طرف فیڈرلسٹ لیڈر جان آدم نے جو ہمیشہ امریکی لوگوں کی قزاقوں کے خلاف لڑنے کی رضا مندی کو مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا، نے بہت حیران کن طریقے سے اس منصوبے کی حمایت کی۔ فیصلے کی اصل وجہ نہ سیاسی اور نہ معاشی تھی بلکہ نفسیاتی تھی کانگریس کے ممبران کی اکثریت فیڈرل ازم کے خلاف اپنے احساسات رکھنے کے باوجود بربریوں کے ہاتھوں اپنی ذلت برداشت نہیں کر سکتے تھے پچاس اور انتالیس ووٹوں کے فرق سے قانون پاس ہو گیا اس میں یہ شرط عائد تھی کہ جہازوں کی تعمیر اس لمحے روک دی جائے گی جب الجزائر کے ساتھ امن کا معاہدہ ہو جائے گا۔

27 مارچ 1794ء چھ جنگی جہازوں کی تعمیر کے لئے 688888.82 ڈالر کے بل کی منظوری

دی یہ جہاز الجزائیری قزاقوں سے یونائیٹڈ سٹیٹس کی تجارت کی حفاظت کے لئے کافی تھے جن پر زیادہ سے زیادہ چوالیس گنیں نصب تھیں جو یورپی جہازوں پر نصب گنوں کی تعداد کا بمشکل نصف تھیں لیکن یہ جنگی جہاز لچکیلے خوفناک اور قزاقوں سے لڑائی کے لئے بہت مثالی تھے۔

نیوی کی تخلیق عمل میں آ چکی تھی یہ تخلیق بہت سے جھگڑے لیکن پروقار طریقے سے ہوئی جس کا مقصد لہروں پر حکمرانی نہیں بلکہ ان کی آزادی تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ نیوی کے ابھرنے اور پوری طرح قائم ہونے کا عمل سست روی کا شکار تھا جنگی جہازوں کی تعمیر کا عمل ریاستی معاہدوں کے جھگڑوں کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ گیا اور تیزی سے اس کا بجٹ بڑھانا پڑا امریکہ کے وہ رہنما جو رقوم کی حفاظت کے فرانسیسی مطالبے پر چیخ پڑے ''کہ دفاع کے لئے ملین ڈالرز کا خرچہ لیکن خراج کے لئے ایک پائی تک نہیں دینے کو'' ابھی بھی نارتھ افریقہ کو تاوان کی کسی نہ کسی صورت میں ادائیگی پر راضی نظر آتے تھے اسی دوران میں قیدیوں کے خطوط امریکہ پہنچ گئے اور اخبارات کی زینت بننے لگے۔ سیموئل کالڈر جو، جے نامی جہاز کا مالک تھا اس نے لکھا تھا کہ ہمیں الجزائر میں زنجیروں میں باندھ کر بھوکا اور ننگا لایا گیا تھا اس حالت کے قائم رہنے کی صورت میں ہم موت کو ترجیح دیں گے اور اسے خوش آمدید کہیں گے۔ ایک اور جہاز کے کپتان ولیم پن روز نے پوچھا تھا ''ہمارے یہ سیاستدان کیا کر سکتے ہیں'' اس نے واضح طور پر خبردار کیا تھا کہ اس کے جہاز کے عملے کی فوری موت۔ امریکی کردار پر بدنما داغ بن جائے گی۔

حکومت پر ایک بار پھر زور دیا گیا کہ وہ کہیں سے رقم کا بندوبست کرے، پہلے ڈچ حکومت نے قرض کا وعدہ کیا بعد میں اپنے وعدے سے مکر گئی کلیساؤں اور ریلیوں کے ذریعے رقم جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔ آخرکار 1795ء کے سرما میں ڈیوڈ ہیمفرے کو ایک بار پھر حکم دیا گیا کہ وہ ایک بار پھر الجزائر کے سلطان کو پرامن کرنے اور خراج دینے کی کوشش کرے اور امن مذاکرات کرنے کی کوشش کرے۔

خوبصورت ناک اور عمدہ تراشے ہوئے ابرو اور حساس نظر آنے والا ہیمفرے خوبصورت لباس میں پرتگال کے درباری کی طرح نظر آتا تھا جہاں وہ امریکی وزیر کے طور پر خدمات انجام دے چکا تھا۔ ہیمفرے کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مغرب میں سفارت کے فرائض اور مشرق وسطیٰ میں سفارتکاری کے درمیان بہت کم مشابہت ہے، حسن بے بہت کھردرا ضدی اور غصیلا شخص

تھا۔ اس نے ہیمفرے جیسے امریکی شخص کا تمسخر اڑاتے ہوئے اور کسی اخلاقی ڈر کے بغیر کہا ''اگر مجھے ہر شخص کے ساتھ امن قائم کرنا ہے تو مجھے ان قزاقوں کا اچار ڈالنا ہے وہ یقینی طور پر میرا سر قلم کر دیں گے'' یرغمالیوں کی رہائی کے بدلے دو ملین ڈالر کا خراج مانگتے ہوئے، کوئی اخلاقی خوف مزاحم نہ ہو سکا، اس نے امریکہ سے دو جنگی جہاز ہر ایک پر کم از کم تیس گنیں نصب ہوں لینے پر اصرار کیا کہ تب کہیں امن مذاکرات بارآور ہوں گے۔

اپنی خوبصورت شخصیت کے باوجود ہیمفرے لین دین کا ماہر تھا اس نے حسن سے مطالبہ میں کمی کروالی اور 5 ستمبر 1795ء میں امن اور دوستی کی دستاویز پر دستخط کروا لئے۔ یہ معاہدہ ابھی امریکی فتح سے بہت دور تھا اس کے شرط نامے کے تحت امریکہ کو ابھی دو جنگی جہاز، چار مختلف اقسام کی چائے کے پچیس صندوق، چھ کوئینٹل صاف چینی کچھ بہترین قسم کے دستی چاقو رشوت کے طور پر دینے تھے کچھ چھوٹے توشک، قینچی کیس، کچھ شالیں جن پر پھول کڑھے ہوں وہ بھی دینے کا پابند تھا اس مال کی قیمت 650000 ڈالر تھی۔

اس کے باوجود حسن نے قیدی رہا کرنے سے انکار کر دیا جب تک اس کے سامنے رقم وصول نہیں ہو جاتی۔ رقم کا بندوبست کرنے کے لئے امریکی حکومت نے جوئل بارلو کی طرف رجوع کیا جو ہیمفرے کا دوست اور شاعر تھا اور پیرس میں رہ رہا تھا اس نے اپنے یورپی تعلق اور ذرائع استعمال کئے لیکن کوئی ایسا شخص نہ مل سکا۔ اور وہ حسن کو مطمئن کرنے والی رقم کا بندوبست کرنے میں ناکام رہا۔ جب بارلو خالی ہاتھ حسن کی طرف لوٹ کر آیا تو حسن نے اپنے چوڑے نتھنوں سے سے پھنکارتے ہوئے کہا کہ تم اور تمھاری حکومت جھوٹی ہے اور میں تمھیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھوں گا اور اعلانِ جنگ کروں گا۔ آخری لمحوں میں، بارلو الجزائر کے ایک یہودی تاجر کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا جو امریکہ کو یرغمالیوں کی رہائی کے لئے نقد رقم اور جہاز دینے کو تیار ہو گیا۔

بارلو نے فروری 1797ء میں تصدیق کرتے ہوئے اور اٹھاسی یرغمالیوں کو فلاڈلفیا میں پہنچانے کے بعد کہا ''ہمارے لوگوں نے نہایت صبر کا مظاہرہ کیا ہے اور ہم جلد غلاموں کی نسبت سے بہتر ہو جائیں گے۔ شہر کے اکثر لوگ اس دن ساحل پر آزاد ہونے والوں کو مبارک دینے جمع تھے انہوں نے ان پر پھول نچھاور کئے اور کیک پیش کئے۔ اس دن پرمسرت جان فاس نے اتراتے ہوئے کہا ''ہماری طرح کے حالات میں آج تک کسی عیسائی حکومت نے اپنی رعایا کے لئے

ایسا کچھ نہیں کر دکھایا جو ہم نے کر دکھایا ہے'' امریکہ نے دنیا کی حکومتوں کو انسانیت کی مثال کا نمونہ بھیجا ہے۔ڈے بھی اس دن خوش تھا اور اس نے طرابلس اور تونس اور امریکہ کے درمیان ایسے معاہدے کروانے میں مدد کی۔

حقیقت میں دونوں حکومتیں معاہدے کرنے کے لئے تیار تھیں دونوں نے الجزائر کی مثال کی تقلید کرتے ہوئے پہلے امریکہ پر حملہ کیا اور پھر امن کے معاہدے کئے طرابلس کے رئیس مراد نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر تین امریکی جہاز پکڑ لئے جب کہ تونس نے علیز انامی بوسٹن کا جہاز پکڑ لیا۔جنگی جہاز نہ ہونے کے باعث امریکہ اس جارحیت کا جواب نہ دے سکا۔امریکہ صرف بارلو کو گفتگو کے دوسرے دور کے لئے نارتھ افریقہ بھیج سکا۔بارلو نے جلد ہی تونس اور طرابلس سے 160000 ڈالر کے بدلے امن معاہدے کر لئے۔

حکومت اب اپنی سالانہ آمدنی کا بیس فیصد حصہ بر بری ریاستوں کو سونے، قیمتی پتھروں ،گن پاؤڈر اور جنگی کشتیوں کی صورت میں ادا کرنے لگی ،تا کہ قزاقی سے بچتے رہیں۔یہ ادائیگیاں اتنی بھاری تھیں کہ یورپی بلبلا کر شکایت کرنے لگے کہ امریکہ قزاقوں سے بہت رعایت برت رہا ہے اور خراج کی قیمت بڑھا رہا ہے۔آخر بارلو نے جیفرسن سے نفرت کے انداز میں پوچھ لیا کہ کب تک اور کس سطح تک اس بربری نظام کو لے کر جانا ہے اور اس کا خاتمہ کہاں ہونا ہے؟ سفارتکار بارلو نے پیش گوئی کی کہ یہ محض وقتی معاملہ ہے اور یہ حکومتیں جلد ہی اپنے خراج کی رقوم اور مطالبات بڑھا دیں گی اور اور امریکہ کے خلاف دوبارہ جنگ شروع کر دیں گی۔لیکن بارلو کی بات توجہ دینے کے بجائے کانگریس نے اعلان کر دیا کہ نارتھ افریقہ سے امن کا معاہدہ ہو چکا ہے اس لئے جہاز سازی کے بجٹ کو کم کر دیا۔

مجلسِ قانون سے باہر بہت سے امریکی حکومتی پالیسی سے مایوس ہو چکے تھے کہ حکومت قزاقوں کو زبانی کلامی ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے جب کہ انہیں رشوت سے للچاتی اور نخرے سہ رہی ہے اس قسم کی تنقید کی انتہا فنون میں ظاہر ہوئی۔1797ء میں نیو انگلینڈ کے معزز وکیل رائل ٹیلر جسے ناول لکھنے کا شوق تھا اس نے جہاز کے ایک سرجن کی افسانوی ڈائری شائع کی جس کا نام Updike Under Hill تھا۔بحری قزاق اسے پکڑ لیتے ہیں اور غلام بنا لیتے ہیں underhill بھوک پیاس بے عزتی ،ذلت ۔زخم اور دیگر کئی قسم کے صدمات اور زخم سہتا ہے۔لیکن اسے یہ سب کچھ ان لوگوں کی

تذلیل کرنے اور کھال ادھیڑنے سے نہیں روک پاتے جو ذلت آمیز معاہدے قزاقی قوتوں سے کرتے ہیں اور انہیں ہتھیاروں سے مسلح کرتے ہیں تا کہ وہ مزید تمسخرانہ رعایتیں حاصل کر سکیں ۔ٹیلر اپنی کہانی کا خاتمہ ایک خطاب پہ کرتا ہے جس کی اہمیت فیڈرلسٹ پیپرز جتنی تھی اور امریکیوں کو اپنی فیڈرل پاور کو مجتمع کرنے کی ضرورت یاد دلائی تا کہ دوسری قوموں میں اپنی عزت حاصل کر سکیں اور ہمارا پہلا مقصد ہمارے درمیان اتحاد ہے۔

دوسرے لکھاریوں نے بھی ٹیلر کا ساتھ دیا لیکن وہ اس بات کو سمجھنے میں ناکام رہے کہ امریکہ کیوں آئینی طور پر قلعہ بندی کر رہا ہے اور نیوی قائم کر رہا ہے جب وہ ابھی تک نارتھ افریقہ کے قزاقوں کے آگے جھک بھی رہا ہے؟ سوزانا روسن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ ہمیں کیوں بدمعاش، حرامی، اور برے قزاقوں کا غلام کر رہا ہے؟ یہ خاتون لکھاری امریکہ کی مشہور پلے رائٹ اور Slaves in Algiers اور The struggle for freedom کی مصنف تھی۔

ٹیلر روسن اور نامعلوم شاعر دونوں مایوس دکھائی دیتے ہیں۔تاہم امریکی صدر جان آدم ابھی تک امریکی لوگوں کی بربریوں سے لڑنے کی رضامندی کے بارے میں مشکوک تھا اس لئے اس نے خراج دینے کا سلسلہ جاری رکھا حتیٰ کہ دونوں ریاستوں میں مستقل نمائندے نامزد کر دیے، رچرڈ او برائن جو الجزائر سے رہا ہوا تھا اسے الجزائر میں اور Cathcart کو طرابلس میں بھیج دیا۔اس نسبت سے تونس میں عہدہ کسی سابق قیدی کو نہ ملا بلکہ حکومتی عہدے دار کے حصے میں آیا جس نے اس سے پہلے مشرق وسطیٰ نہیں دیکھا تھا اور اس نے کبھی قزاقوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا اس کا نام ولیم ایٹن تھا جو ایک چوڑا چکلا اور دلیر نوجوان تھا جو بربریوں کا سب سے جذباتی دشمن تھا۔

ان نمائندوں نے مارچ 1799ء میں ،کانگرس کی اجازت سے چھ میں سے تین جنگی جہازوں کی افتتاحی تقریب کے فوری بعد اپنے عہدے سنبھال لئے۔ان تینوں جہازوں پر کل 124 گنیں اور توپیں نصب تھیں اور نوزائدہ میرین کور نے اسے مزید قوت بخشی۔یونائیٹڈ نیشنز، آئین اور کانسٹیلیشن نے کم لیکن بھرپور قوت کا مظاہرہ کیا۔

نوزائیدہ نیوی بہت شاندار طریقے سے فرانس کے ساتھ غیر اعلانیہ قیاسی جنگ سے دست بردار ہو گئی جو نپولین نے بحرالکاہل میں امریکہ کی غیر جانبدارانہ برطانیہ کے ساتھ تجارت کو روکنے

کے لئے شروع کی تھی اپنے قریبی ساحلوں پر حاصل ہونے والی کامیابیوں سے اعتماد حاصل ہوا اب امریکہ دور کے اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے تیار تھا۔

اس اعتماد کے باوجود بھی قوم متزلزل تھی کہ اس نو حاصل شدہ قوت کو شمالی افریقہ کے خلاف استعمال کرنا چاہیے کہ نہیں۔ کیتھ کارٹ نے طرابلس سے اپنے پہلے مراسلے میں اس بات کو تسلیم کیا کہ یہ بربری کہتے ہیں کہ انہوں نے بارہا امریکی جنگی جہازوں کا سنا ہے لیکن دیکھا کبھی نہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی جنگی جہاز نہیں یا ہم بہت جلد بھاری رقم قربان کرنے والے ہیں۔ کیا امریکہ کے لوگ یورپ کی تقلید میں سدا خراج دیتے رہیں گے اور شرم کا سودا کرتے رہیں گے یا جس طرح ڈیوڈ ہیمفرے امید کیا کرتا تھا کہ ہم ان قزاقوں کو ختم کرنے والے نظام کے خالق ہوں گے۔

معیشت اور عسکری قوت کے حوالے سے امریکہ کی مشرق وسطیٰ میں مداخلت ابھی بہت دور تھی لیکن تمام امریکی کسی جنگی یا معاشی مقصد کے تحت مشرق وسطیٰ کی طرف نہیں کھینچے چلے آئے۔ کئی امریکی اس خطے کے رومانوی تصورات اور مہم جوئی کے شوق میں دیوانہ وار آئے پہلے امریکیوں میں جون لڈیارڈ بھی شامل تھا جو عالمی سیاح اور بہت سخت جان مہم جو تھا جس کا تذکرہ ابتدائی دیباچے میں کیا جا چکا ہے 1788ء میں پانچ ماہ تک مسلسل اپنے مصر کے تجربات بیان کرتا رہا، مصر جو عربی بولنے والوں کی مرکزی زمین تھی۔ اس کی تحریروں نے کئی امریکیوں پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان میں جون لڈیارڈ کا قریبی دست ٹامس جیفرسن بھی شامل تھا۔ جسے بہت جلد امریکی صدر بننا تھا بعد میں اپنے دیگر افسروں کی طرح بہت جلد اس زمیں کو قزاقوں اور لٹیروں کی زمین خیال کرنے لگا ایسی زمین جو عجائبات سے بھری پڑی تھی۔ جیفرسن اور اس کے معاصرین کی نظر میں مشرق وسطیٰ محض طاقت کی سرحد نہیں تھی بلکہ اساطیر کی تمثیل گاہ بھی تھی۔

دشمن اور ملکوتی مشرق

مشرقی وسطیٰ کی اصطلاح 1902ء میں ایک امریکی ایڈمرل نے وضع کی تھی۔ اس سے پہلے امریکی اور یورپی اسے عام طور پر دی ایسٹ کے نام سے پکارتے تھے یا زیادہ تر اسے The Orient کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس اصطلاح کو مبہم طور پر اس براعظم کے لئے استعمال کرتے تھے جو مراکش اور مصر کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ اور قوس کی شکل میں سعودی عرب اور مشرقی بحیرہ روم سے گزرتا ترکی میں ختم ہوتا تھا۔ ہر نام مکمل طور پر جغرافیائی کا سابلانکا کا نہیں تھا، جو حقیقت میں میڈرڈ اور مارسیل اور روم کے مغرب میں بہت دور واقع تھا۔ Orient یا روشن مشرق غالباً اسے اس لئے کہا تھا کہ اسے ایک منفرد تہذیب نے یکجا کر رکھا تھا جس کی خصوصیت وہاں حکومت کرنے کے مختلف طریقے، سماجی ڈھانچہ، تعمیرات اور لباس تھا۔ اس کے باشندوں کو اہل مغرب کئی مختلف بدلتے ناموں سے جانتے تھے جیسے عربی، لیونطینی الجیری اور ترکیہ وغیرہ۔ ان لوگوں کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا یہ لوگ دیگر ممالک کے لوگوں کے لئے بہت ظالم ہیں۔ ایسی زبانیں بولتے ہیں۔ جو امریکی سماعت کو چیرتی ہیں۔

دلکش اور دھوکے باز مظہر:

مشرق کے بارے میں خطرناک خیالات، پہلے یورپی باشندوں کے اذہان سے نیو ورلڈ تک اس کی کھوج لگانے کے لئے پہنچے کرسٹوفر کولمبس 1442ء میں جب مقدس زمین کے نئے راستے دریافت کرنے نکلا تو اس نے اپنے ہمراہ ایک عربی ترجمان بھی لے لیا اور سوچا کہ اس کا جو

حاصل وصول ہوا اسے یروشلم کی فتح پر خرچ کیا جا سکے۔ ایک صدی قبل جب جان سنیڈیز جسے بہت جلد ورجینیا کا خزانچی بننا تھا اس نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ خطہ خون کے پیاسوں سے بھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے دنیا میں شاید کوئی ایسا خطہ ہو گا جو اتنا دلکش ہو جتنا یہ ہے لیکن یہ اتنا ہی دھوکہ دینے والا ہے۔ ورجنیا کے گورنر جون سمتھ کی شیلڈ پر بھی ترکی سرداروں کے بارے میں اسی قسم کی رائے کندہ ہے، جون سمتھ ان سرداروں کے پاس ترکوں کے خلاف کرائے کے سپاہی کے طور پر کام کر چکا تھا۔ مشرقِ تاباں پر مغربی برتری اور برابری کے جیسے نظریات پلائی ماؤتھ کے ذریعے پہنچے۔ کالونی کے نزدیک چٹان جس پر یہ تحریر کندہ ہے ''مشرقی قومیں غرق ہوئیں اور ایک ایسی حکومت کا ظہور ہوتا ہے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے''

اگر چہ ابتدائی امریکہ کو مذہبی برداشت پر بہت فخر ہے لیکن اس برداشت کا پھیلاؤ اسلام تک بہت کم ہوا جسے بہت مشکل سے مذہب تصور کیا گیا۔ معتبر کالونیل اخلاقی مفکر کاٹن ماتھر اور جوناتھن ایڈورڈ با قاعدگی سے اسلام کو غلط اور اخلاقی طور پر شرافت سے عاری عقیدہ کہتے رہے، ہاورڈ کے مطابق محمدؐ (نعوذ باللہ) ایک جعلی نبی اور شیطان کے سفارت نمائندے تھے اسلام کے بارے میں اس حاسدانہ تصور کو تقویت قرآن کے میلانی تراجم سے ملی الیگزنڈر روس کا القرآن کے نام سے انگریزی میں ترجمہ 1669ء میں شائع ہوا۔ جس کا مقصد اس میں موجود تضادات کلمات اور عجیب و غریب تقاریر اور مذاحیہ تذکروں کو اجاگر کرنا تھا تا کہ عیسائی اپنے دشمنوں کے قد وقامت اور سراپا کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان پر قابو پا سکیں۔ اسی طرح جارج سیل کا ترجمہ جس کا نسخہ جیفرسن کی لائبریری سے ملا وہ پروٹسٹنٹ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ قرآن پر کامیابی سے حملے کر سکیں اور ان کے لئے امید ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس قرآن کو مغلوب کر لیں گے۔

1697ء میں حضرت محمدﷺ پر لکھی گئی کتاب جس کا مصنف ہیمفرے پردوتھا کا عنوان The True Nature Of the Impostor Fully Displayed ہی اس کے مقصد کا اعلان کرتا ہے۔

کالونیل امریکہ کے لوگوں پر مشرق وسطیٰ کے بارے میں غلط اطلاعات اور حقائق کی کھچڑی پکا کر ظاہر کی گئی۔ اس کا عکس نیو ورلڈ میں لکھا گیا پہلا افسانہ جس کا عنوان *Father Bambo's The Pilgrimage To Mecca* میں ملتا ہے۔

امریکہ تک مشرقِ وسطی کے بارے میں منفی باتیں یورپی سفارتکاروں اور سیاحوں کی

یادداشتوں اور آپ بیتیوں کے ذریعے پہنچیں اور ان میں سے سینکڑوں آپ بیتیاں اٹھارھویں صدی کے آخر تک شائع بھی ہو چکی تھیں اگر چہ ان میں زیادہ تر کتب فرانسیسی زبان میں تھیں اور ان میں چند ایک کتب انگریزی میں بھی انگریز قارئین کے لئے دستیاب تھیں اس میں جیمز روس کی کتاب Travel to Discover the Source Of Nile بھی شامل تھی کتب مشرقِ وسطی کو ایک خلائی خطے کے طور پر پیش کرتی تھیں جو بیک وقت رومانوی بھی اور خطرناک بھی تھا خطے کی عورتوں کو ہوس پرست اور مردوں کو بہت آزاد اور شاہانہ طرز کا حامل دکھایا جاتا تھا۔ سولہویں صدی کا جغرافیہ دان لیوا افریکانوس جو مسلمان سے کیتھولک عیسائی ہو گیا تھا وہ اس خطے کے باشندوں کا حال لکھتے ہوئے کہتا ہے یہ لوگ بہت وحشی ڈاکو ہیں جو اپنے قیدیوں کی آنکھیں نکال لیتے ہیں اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیتے ہیں۔ رچرڈ نول کی اپنی کتاب (History of The Turks) کے مطابق عثمانی اس وقت دنیا کا سب سے بڑا خطرہ تھے۔ فرانسیسی سیاح اور طبیب مشرق کے بارے میں زیادہ بہتر تاثرات پیش کرتے ہیں جس طرح کلاسیکی لکھاری ہیروڈوٹس، تھیوسی ڈائڈاز، اور ہومر بہت دلکش تاثرات ابھارا کرتے تھے۔ عربی بولنے والے غلاموں یا مشرق وسطیٰ سے لوٹ کر آتے تاجروں سے تھوڑا بہت معلوم کرنے کے باوجود جان لڈیارڈ کے دور کے امریکی مشرق وسطیٰ کے بارے میں بہت کم جانتے تھے اور جو وہ تھوڑا بہت جانتے تھے وہ بہت نا قابلِ اعتبار اور متنازع تھا۔

مشرق وسطیٰ کے بارے میں حقائق کی عدم موجودگی نے ایک خلا قائم کر دیا جسے اس خطے کے بارے میں افواہوں سے پر کیا گیا نا صرف اس خطے کی مغرب کی کسی بھی چیز سے سخت دشمنی بلکہ اس کے عجائبات کے بارے میں بھی کئی افواہیں اڑائی گئیں۔ اس خطے کے تصور میں حسی اور خیالی سطح پر مسرت کشید کرنے کے کئی ذرائع تھے ان میں سب سے زرخیز ترین ذریعہ جو کالونیل امریکہ میں دستیاب تھا وہ بائبل کا تھا جس کے متن سے ابتدائی امریکہ کے لوگ بخوبی واقف تھے اور اسے غیر متغیر سچائی تسلیم کرتے تھے۔ اور یہی مشرق وسطیٰ کے بارے میں ماورائی کہانیوں کا سب سے بڑا ذریعہ تھا قدیم وجدید ٹسٹامنٹس میں بلند و بالا مینار اور معبد خانے اور ہوا میں قائم باغات اور چمکتے موتیوں اور شاندار صحراؤں کا حال مذکور تھا جب یہی عبارات ٹیا لے پنسلوانیا کی جلسہ گاہوں یا ہوازدہ کیبنوں میں پڑھے جاتے تھے تو مشرق وسطیٰ کے بارے میں سپنے بننے کی ترغیب دیتے تھے حتی کہ پادریوں کے زیرِ اثر لوگ بھی اس کے بارے میں خیالی پلاؤ پکاتے تھے۔

بائبل کے بعد سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب الف لیلیٰ تھی اس نے بھی مشرق وسطیٰ کے بارے میں کئی سرابی قسم کے نظریات قائم کئے۔قرونِ وسطیٰ میں رومانوی کہانیوں کا مجموعہ الف لیلہ جب پہلی بار 1708 میں انگریزی میں شائع ہوا تو اس نے پورے برطانوی راج اور خاص طور پر امریکی کالونیز میں بہت مقبولیت حاصل کر لی۔اس کی وجوہ سمجھنا ذرا مشکل نہیں۔علی بابا،سند باد اور الہ دین کا بچ نکلنا اور اپنی زندگی کے لئے شہرزاد کی کہانی سنانے کی دلسوزی نے امریکیوں کو مشکل زندگی سے ایک چھپے خزانوں کی چمکتی دنیا قالینوں سے ڈھکے مینار نقابوں میں چھپی لیکن دستیاب لونڈیوں کی دنیا میں منتقل کر دیا۔کوئی شخص اس حسی بے ہوشی کا تصور کر سکتا ہے جو نیوانگلینڈ میں نفیس مزاج پادریوں پر طاری ہوئی کتاب کے تعارف کے اس اقتباس سے:

> سلطان کے محل کا خفیہ دروازہ اچانک کھلا اور وہاں سے بیس عورتیں باہر آئیں ان کے درمیان ملکہ چل رہی تھی..........انھوں نے اپنے برقعے اور کپڑے اتار پھینکے تاکہ وہ زیادہ آزادی محسوس کریں ان کے سامنے دس حبشی غلام کھڑے تھے۔ہر ایک نے اپنی محبوبہ کو ساتھ لیا،ملکہ بھی خالی نہ تھی اس نے تالی بجائی اور فوری طور پر ایک غلام حاضر ہوا اور تیزی سے اس کی طرف بھاگا۔یہ شاندار کھیل آدھی رات تک چلتا رہا ان سب نے ایک بڑے حوض میں غسل کیا بعد ازاں کپڑے پہن کر محل کو لوٹ گئیں۔

بائبل کے عجائب اور جسمانی مباشرت کی رغبت نے مشرقِ وسطیٰ کو ایک سپنوں بھرا خطہ بنا دیا۔کیا مشرقِ تاباں کے بارے میں یہ تصورات اس خطے کی سیر اور اپنی کم درجے کی خوبیوں کو خطرے میں ڈالنے کی مغربی لوگوں کو ترغیب دینے کے لئے کافی ہیں؟اس کا جواب امریکیوں اور اس سے کہیں زیادہ یورپی باشندوں کے لئے آسان تھا کہ مشرق وسطیٰ نے ایک تحریک دی تھی۔ایک قوم کے شہری ہونے کے ناطے سے جو پہلے ہی سے اپنی انفرادیت اور توانائی کی وجہ سے مشہور تھی اس کے لئے اتنے بے چین تھے کی ایک غیر ملکی کہتا ہے کہ ان کی کرسیاں بھی بے چینی کی وجہ سے جھولتی ہیں امریکی حرکت اور مہم جوئی کے لئے ترستے تھے۔ایسے بنیاد گزاروں کو اپنے وطن میں ہزاروں بار چھاپا گیا جو آزاد زمینوں کی تلاش میں تھے ان میں سے تو کچھ ایسے بھی تھے جن کی مہم جوئی کی ہوس شمالی امریکہ کی وسعت بھی پوری نہیں کر سکی تھی ان لوگوں نے نا صرف دریائے

اوہایو کے مغرب کے بیابان کھنگالے بلکہ مشرق کی سمت اس کے مخالف حصے بھی دیکھ ڈالے لیکن ان کے نزدیک مشرقِ تاباں کا مطلب نظر سے دیکھنے سے کہیں آگے کی چیز تھی کوئی نادر یافت اور نا معلوم آفاق تھے جو اپنی دریافت کے منتظر تھے۔جان لڈیارڈ جیسے امریکیوں کے نزدیک رومانوی اور چلتا پھرتا کرشمہ تھا اور مشرقِ وسطیٰ آخری حد تھی۔

یانکی مصر میں

جولائی 1788ء کے پہلے ہفتے میں جان لڈیارڈ نے سرحد عبور کی اور اس کا جہاز اسکندریہ مصر کی بندرگاہ پر آ لگا۔وہ شہر گنجان آباد غلیظ بد بودار تھا جس میں چھ ہزار لوگ آباد تھے اور اس میں کوئی قدیم شکوہ نہیں تھا جو لڈیارڈ نے بائبل میں پڑھا تھا۔''اسکندریہ میری توقع سے کہیں زیادہ تباہ حال ہے'' اس نے جیفرسن کو خط لکھتے ہوئے ابتدا میں کہا 'مقامی مصیبتیں اور بیماریاں بہت زیادہ ہیں جن کا کوئی شمار نہیں جیسے غربت،غارت گری،قتل،وبا،اندھا تعصب اور بیماری۔

جان لڈیارڈ کو جس شکست کا سامنا کرنا پڑا وہ عثمانی سلطنت کا تسلط تھا جس سے اٹھارھویں صدی کا مصر جڑا ہوا تھا اہلِ مغرب لوگوں کو ترکی کہتے تھے (شاہی وزیر کے دروازے سے متعلق حوالہ)۔اس سلطنت کا طلوع چودھویں صدی میں ہوا دھیرے دھیرے بڑھتے ہوئی مشرق وسطیٰ پر پر تسلط کر لیا اور وسطی ایشیا اور مشرقی یورپ کے وسیع علاقوں تک اس کی حکومت قائم ہو گئی۔عثمانی سلطنت نے عیسائی یورپ کے خلاف مسلسل حملے شروع کر دیے جو 1683ء مین ویانا کے قبضے کے بعد ختم ہوئے۔اس سے سلطنت کا زوال شروع ہوا 1780ء تک عثمانی یورپ کے نزدیک زیادہ قابلِ توجہ نہ رہے جیسے ہوا کرتے تھے۔ویانا کے لوگ جو اپنے دروازوں پر کبھی Moorish Hordes اور Terrible Turks کے خیال پر چھکا کرتے تھے اب ترکی انداز میں دعوت دیا کرتے تھے اور اب ایک ہسپینی خاتون کے عثمانی حرم سے بچ نکلنے کی کامیڈی The Abduction from the Seraglio پر سنسنی محسوس کرتے تھے۔

کچھ علاقوں میں سلطنت کے زوال کا اعلان عربی بولنے والو کے صوبوں کی بہ نسبت زیادہ تھا وہ سلطنت جو کبھی امارت اور روشن خیال تھی جہاں سے بڑے بڑے سائینس کے ماہرین اور ریاضی دان نکلے اب وہ سکڑ کر محض جاگیرداروں تک رہ گئی۔اس سلطنت کی وسیع آبادی کی زندگی

میں قرونِ وسطیٰ سے بہت کم تبدیلی آئی، اس وقت کوئی پرنٹنگ پریس، نہ کلاک، اور جدید تعلیمی ادارے تھے، سڑکیں بہت خستہ تھیں اور کسی مجاز مرکزی شخصیت کی عدم موجودگی میں مسافروں پر بہت خطرناک حملے ہوتے تھے کچھ یورپی باشندوں نے اس تند خطے میں داخل ہونے کی جرات کی لیکن خود کو ساحلی شہروں تک محدود رکھا جہاں سفارت کاروں کی حفاظت حاصل تھی لیکن مقامی آبادی کے لئے ایسا کوئی سہارا حاصل نہیں تھا۔ کیونکہ عثمانی مرکزی قیادت کمزور ہو چکی تھی۔ دیہاتی کسان صرف مقامی عمل داروں اور لٹیروں کے چابک کھانے کے لئے رہ گئے تھے۔

مصر میں خاص طور پر حالات خراب تھے وہاں کی تین سے چار لاکھ آبادی خستہ حالات میں رہ رہی تھی اور بہت سے ہر سال قحط اور بیماری کی وجہ سے مر جاتے تھے۔ اس مصیبت سے نجات دلانے کے بجائے سلطان کے مرکزی گورنر طاقت کے حصول کے لئے مقامی مملوک سے الجھ پڑتے اور دیہات برباد کر دیتے اور بدنصیب کسانوں کو تاراج کر دیتے، 1788ء میں ایک اور اوپیرا میوزک کا پروگرام کیا گیا جس میں خیالی مشرق وسطیٰ کو پیش کیا گیا اس کے فوری بعد امریکہ نے اپنی دستاویزات کے برعکس ایک مینار بنایا جس کا نام خالص مصر رکھا گیا اور کہا کہ مصری تہذیب بے مثال ہے۔

یہ قدیم مصر تھا جو لڈیارڈ نے اسکندریہ میں دیکھا۔ پھر بھی اس نے اس بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ شہر کی حالت پورے ملکی حالات کی وجہ سے ہے اور اساطیری مشرق وسطیٰ کی تلاش میں اس نے قاہرہ کا رخ کیا دریائے نیل میں یہ پانچ دن کا سفر تھا یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس کا اسے بخوبی پہلے سے اندازہ تھا لیکن اس سفر نے بھی اسے مایوس کیا۔ کیا یہ وہی عظیم الشان اور وسیع و عریض دریائے نیل ہے جسے دنیا کے حیران کن عجائب سے تشبیہ دی جاتی ہے؟ یہ دریا کنک ٹی کٹ سے ذرا سا بڑا ہے اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

قاہرہ میں لڈیارڈ نے روسیٹی کو اپنا تعارفی خط دیا روسیٹی وینس کا رہنے والا تھا جو شہر میں برطانوی مفادات کا خیال رکھتا تھا۔ لڈیارڈ کو وہاں معلوم ہوا کہ بہت سے مغربی مشرق وسطیٰ کے لوگوں کو درنایاب سمجھتے ہیں لیکن مشرق وسطیٰ کے مسلمان مغربی اور امریکی لوگوں کو فرینک سمجھتے ہیں یہ ایک اصطلاح ہے جو صلیبیوں کے وقت سے زندہ ہے۔ روسیٹی نے لڈیارڈ کو حفاظت کے حوالے سے بتایا کہ اسے عام لوگوں کی طرح رہنا چاہیے اور عام لوگوں کی طرح لباس پہننا چاہیے۔ لڈیارڈ

کے نزدیک یہ تجویز کہ ایک عیسائی کو محض مسلمانوں کو خوش کرنے کی خاطر اپنی شناخت چھپانا چاہیے تمسخرانہ غضبناک اور ناقابلِ قبول تھی۔ اس نے جیفرسن سے شکایت آمیز لہجے میں کہا کہ یہ یورپ کے سپوتوں کے لئے شرمناک بات ہے کہ انھیں جاہل اور مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں اس قسم کے تکبر کا شکار ہونا چاہئے۔ اس کے باوجود لڈیارڈ نے اس کی تجویز مان لی پتلونوں اور پگڑیوں کے لئے تین کونوں والے ہیٹ اور پاجامے بیچنا اور نیل کی چھان بین کرتا لڈیارڈ تین ماہ کامیابی سے گذار گیا۔

پورے سفر کے دوران میں اس نے مصری دیہاتی اور شہری علاقوں کا کامیاب دید بین ثابت کیا اس نے مصری مخروطی میناروں، پھیلتے بڑھتے شہروں اور کاروانوں کی لمبائیاں بھی اپنے پاس درج کر لیں اس نے عام لوگوں کی بدقسمتی پر بہت افسوس کیا اور انہیں کسی بھی وحشی اور گنوار کم تر درجے کی زندگی گذارتا محسوس کیا۔ اس نے انسانوں کی ایسی حالت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڈیارڈ کا تجسس اسے جنگی میدانوں میں بھی لے گیا جہاں عثمانی فوجیں اور ترکی مملوک آپس میں بھڑے ہوئے تھے۔ اپنے گرد گھیرا تنگ ہوتے دیکھ کر مملوک کمانڈر نے آخر لڈیارڈ سے کہا کہ وہ ان دستوں کی کمان سنبھال لے۔ اور یہ بات کنکٹی کٹ کے باسی کو گھر لے کر جانے سے بہت دور تھی یعنی وہ گھر نہیں جا سکے گا، یہ بات اس امریکی نے مصر کی سول وار میں عہدہ کی پیش کش کی وجہ سے محسوس کی۔

مصر کی وسیع پیمانے پر تقسیم نے لڈیارڈ کو غمگین کر دیا اس نے مصر کی حالت اور ترکی کو جنگ سے کمزور کرنے کا الزام روس پر لگایا۔ اس نے ایک عیسائی فرقے کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جو جنگی قسم کے آوارہ گرد اور توہم پرست تھے اور اسلام پر بھی الزام لگایا جس نے دوسروں کی نسبت بہت بڑی غلطی کی۔ دوسری طرف اس نے مسلمانوں کی خدا ترسی اور تجارت اور بہت زیادہ آزادی کے ملاپ کو بھی سراہا۔ اس نے اونٹوں کے ساتھ پیدا ہونے والے خانہ بدوشوں کو بھی سراہا جو سرحدوں اور حکومت سے آزاد ہو کر گھومتے تھے ان کا خاکہ کالونیل دور کے سرحدی لوگوں اور بعد میں کاؤبوائز سے ماخوذ تھا یہ لوگ مشرق وسطیٰ پر امریکی تحریروں کا حالیہ موضوع بن سکتے تھے اور اس خطے پر یو ایس پالیسی پر مستقل اثر انداز ہو سکتے تھے۔

آزادی پسند خانہ بدوشوں کی متھ سے ہٹ کر لڈیارڈ کو مشرق وسطیٰ میں بہت کم رومان نظر

آیا۔ خاص طور پر جو الف لیلیٰ میں قصے بیان کئے گئے ان میں سے کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ اس ملک کے لجنڈ شاعر اور نثر نگاروں سے زیادہ کوئی بھی جیز بھی اس معیار کو نہیں پہنچتی بھی جو الف لیلیٰ کا تھا۔ اس نے جیفرسن سے شکایت کرتے ہوئے کہا چمکتے درختوں کا تقابل مٹی، دھوپ، جھکڑ، کیڑے مکوڑے، مکڑے مکھیوں، کوڑھی کے مریضوں، بخار اور عالمی اندھے پن سے کیا جو ان میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ جیفرسن کی طرح، لڈیارڈ نے بھی مشرق وسطیٰ کے معاشرے کو۔ امریکہ کے بائیں ہاتھ کی بڑھتی تاریکی کا عکس قرار دیا اور دائیں ہاتھ کو امریکہ کی روشن خیالی سمجھا۔ اس نے اپنی تحریر کا اختتام کرتے ہوئے لکھا۔ مصری نغمے بہت شیریں ہیں۔

اس دوران لڈیارڈ نے افریقہ کی طرف سفر کی تیاری کر لی۔ اس نے مملوک کمانڈر اسماعیل سے بھی مشورہ کیا جس نے لڈیارڈ کو ان جادوگروں کے گروہ کے بارے میں خبر دار کیا ان سے بچ کر رہے وہ آدمی کو جانور میں بدل دیتے ہیں۔ اور نصیحت کی وہ بہت کم اور عام سامان کے ساتھ سفر کرے۔ اور ساتھ کوئی قیمتی چیز نہ رکھے۔ بعد ازاں اس نے ایک قافلے میں سینار تک اپنی جگہ بنالی سینار جنون کی جانب ہزار میل کے فاصلے پر تھا۔ نومبر 1788ء کے خط میں لڈیارڈ نے جعفرسن کو مصر کبھی نہ آنے کی نصیحت کی اور کہا کہ Homer,Thuciydides,Savary نے جو مشرق وسطیٰ نقشہ کشی کی ہے انہیں جلا دیے، اس نے کہیں بھی یہ بات چھپانے کی کوشش نہ کی۔ اور اعتراف کیا کہ میں نے یہاں اپنی مرضی سے وقت نہیں گزارا ہے۔ پھر اس نے اپنے ٹریڈ مارک ڈرامہ کے ساتھ اپنے معتقد امریکی دوست کو خدا حافظ کہا اور کہا کہ میں اکیلا جاتا ہوں۔ مجھے مت بھولنا میں تمھیں نہیں بھولوں گا۔ آخری لمحوں میں تمھارے بارے میں سوچنا مفید ہوگا۔ سدا خوش رہو۔ یہ آخری بار اس نے خدا حافظ کہا تھا۔ اس کی روانگی میں تاخیر بیماری اور صفرا کے سبب ہوئی۔ دوا کے طور پر اس نے نیلہ تھوتھا اور ٹارٹار کھالیا۔ اور پھر اس مریض کو مسلسل خون کی قے شروع ہوگئی۔ پھر اسے قاہرہ کے سب سے بہترین ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ چوبیس گھنٹے بعد وہ شخص، جس نے اپنی والدہ کو اپنی بہترین صحت کے بارے میں بتایا تھا اور دنیا کو اپنے قدموں میں محسوس کیا تھا اور خود اور خطرات کا تمسخر اڑا رہا تھا فوت ہوگیا۔

جان لڈیارڈ، دریائے نیل کے ساتھ، صحرا میں ایک خوبصورت قبر میں دفنایا گیا۔ اب اس قبر کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ اس نے اپنے پیچھے ایک کتاب A Eulogy To Woman چھوڑی جو

جنس مخالف کے شائستہ اور تہذیب یافتہ اور کچھ دیگر تاثرات کے بارے میں ہے۔

اس نے جو مثال قائم کی وہ بے مثال تھی۔ پہلی بار امریکہ کے ایک شہری نے سفر کیا تھا اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں مبنی پر حقائق خبریں دی تھیں۔ مشرق وسطیٰ وہ خطہ تھا جو اس کے ہم وطنوں کے لئے اجنبی تھا۔

اس اثر کی شہادت 1792ء میں سامنے آئی جب ہنری بونائے نے لڈیارڈ کے کارنامے لیڈیز میگزین میں بیان کرنا شہروع کئے یہ میگزین فلاڈلفیا کا نمائندہ تھا۔ اس مضمون کے ساتھ ہی مشرق وسطیٰ کے موضوع پر کئی ناگوار کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مشرقی خواتین کے بارے میں لف لیلیٰ طرز کی کہانیاں تھیں جن میں یہ خواتین بہت سیدھی سادھی تھیں لیکن محبت کے جوش سے مغلوب ہو کر وحشی ہو جاتی تھی۔ ان میں مصری، سرکیشیائی اور دروزی باشندوں کی تہذیبوں کا مطالعہ تھا۔ اور شہروں کے حالات تھے جن سے جان لڈیارڈ کے تاثرات کی تصدیق ہوتی تھی۔

یہ موضوعات جس شخص کے لئے نئے ہوں وہ ان کے تنوع سے ہکا بکا رہ جاتا ہے، جونہی صدی گزری اور نئی صدی کا آغاز ہوا۔ دوسرے امریکیوں نے بھی جان لڈیار کی پیروی شروع کردی اور مشرق وسطیٰ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ انہی سیاحوں میں ایک سیاچارلسٹن ا بھی تھا۔ جو مستقبل کا جنگی سیکرٹری اور ایک پھول کو دریافت کرنے والا شخص تھا اور اس پھول کا نام بھی اس کے نام پر رکھا گیا۔ 1806ء میں، پرشین خان کے مہمان کے طور پر اس کی دلجوئی، قاص لڑکیوں سے کی گئی جنہوں نے لمبی سرخ پتلونیں پہنی ہوئی تھیں۔ اور ان کے چہرے نقاب سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اسے تیل کا کنواں دکھایا گیا۔ جو ابدی آگ کی سرزمین تھی۔ جس کے بارے میں انکا اندازہ تھا یہ کبھی تیل کے طور پر استعمال ہوگی۔ بارہ سال کے بعد جارج بیرل آف بوسٹن مشرقی کہانیوں سے متاثر ہو کر، دلدلی علاقوں کی بانسری کی دھن سننے کے نظریے سے مغلوب ہوگیا اور سرکیشیائی نغمے کے سُر سننے کے لئے بھی بے تاب ہوگیا۔ اس نے نتیجتاً اناطولیہ کا رختِ سفر باندھا۔ وہاں اسے علم ہوا کہ بانسری کی آواز، ایک خراب بیگ پائپ جیسی ہے۔

اور صاف آواز والا سرکیشیائی باشندہ صرف غلاموں کی منڈی میں مل سکتا ہے اس کے باوجود، بیرل نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ امریکیوں کو اپنے تعصّبات ایک طرف رکھ کر، اپنا راستہ مشرقِ وسطیٰ کے لئے اختیار کرنا چاہئے۔ اس قسم کی تفصیلات نے جن میں غیبت اور جھوٹ بھی تھا۔

امریکیوں کے مشرقِ وسطیٰ کے بارے طلسمی خیالات کو ابھارا۔ اور بہت سے مردوں اور عورتوں کو فلسطین، ترکی، مصر اور میسوپوٹامیہ کی زمینوں نے ترغیب دی اور گھروں میں بیٹھے لوگوں نے اس خطے کے خواب دیکھنے جاری رکھے۔ صرف انیسویں صدی کے اوائل میں قریب قریب ستیس کتابیں، مصر کی سیاحت پر شائع ہوئیں۔ امریکہ کے چار شہروں کا نام قاہرہ رکھا گیا۔ دو کا مدینہ اور تین کا بغداد رکھا گیا۔ دو مکہ بھی تھے۔ ایک جلب اور ایک الجیریا تھا۔ لڈیارڈ کے سفر ناموں سے دھکتا مشرق وسطیٰ، کئی امریکی مہم جوؤں کے لئے بھی اور فیصلہ کنندگان بشمول ٹامس جیفرسن کے لئے بھی گہری دلچسپی کا باعث رہا۔

جیفرسن نے خود یہ فرض کر لیا تھا کہ جب لڈیارڈ مصر سے لوٹے گا تو وہ پیدل امریکہ کے شمال مغربی حصے تلاش کریں گے۔ یہ توقعات 1789ء میں ختم ہوگئیں۔ جب جیفرسن نے بہت بے تابی اور تجسس سے ٹامس پین کو خط لکھا جو اس وقت لندن میں تھا اور اس خبر کی تصدیق افریقن سوسائٹی سے کرنے کو کہا، ٹامس پین نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لڈیارڈ افریقن سوسائٹی میں بہت مقبول تھا ان سب کو اس کی موت کا دلی دکھ ہے۔ سر جوزف بینکس نے لکھا کہ مرحوم سیاح نا صرف بہت اچھا لکھاری بلکہ روشن خیالی مفکر بھی تھا۔ وہ شخص سرتاپا ایک دماغ تھا۔

جیفرسن، شمالی امریکہ کی سیاحت کا خواب دو سیاحوں لیوس اور کلارک کی مدد سے پورا کر سکتا تھا۔ لیکن اب اسکی دلچسپی اندرونی امریکہ کی سیاحت میں بنسبت دیگر سمندری علاقوں کے کم ہو چکی تھی۔

مستقل کا صدر جن پیچیدہ اور دباؤ والے مسائل کا سامنا کر رہا تھا وہ امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے تعلقات کا باعث بن سکتے تھے۔ یہاں، لڈیارڈ کے مشاہدے بہت قیمتی ثابت ہو سکتے تھے۔ ان مشاہدوں نے جیفرسن کو اس قابل کر دیا کہ وہ مشرق وسطیٰ کو امریکیوں کی آنکھ سے دیکھے بطور صدر، جیفرسن ہر قسم کے سرابوں سے پاک ہو کر، مشرق وسطیٰ کے ساتھ معاملات طے کر سکے۔

امریکی شناخت کی کٹھالی:

پرنسٹن کے ایک اعلیٰ ڈاکٹر کا بیٹا، جو پندرہ سال کی عمر میں جہاز کے عرشے پر کام کرتا تھا، اور بیس سال کی عمر ہونے سے پہلے کپتان ہو گیا۔ وہ ایک پیارا شوہر اور چار بچوں کا باپ تھا۔

جس کی عزت اس کے افسر بھی اور اس کا عملہ بھی کرتا تھا۔ اس کا نام ولیم بین برج تھا۔ ولیم صرف عظمت کا حقدار ٹھہرتا اگر بری قسمت کا شکار نہ ہوتا۔ فرانس کے ساتھ جنگ میں، دشمن کے دو بحری جنگی جہازوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس پر زور دیا گیا کہ وہ بغیر کوئی گولی چلائے جہاز پر ہتھیار ڈال دے۔

دوسری بار۔ اس پر بری قسمت ستمبر 1800ء میں چڑھ دوڑی جب اسے حکم نامہ ملا کہ جارج واشنگٹن نامی جہاز کو مشرق وسطیٰ لے جائے۔ تقریباً تین سال سے امریکہ اپنی قومی آمدنی کا بیشتر حصہ خراج کے طور پر بربری ریاستوں کو دے رہا تھا۔ شمالی افریقہ کی اکثر بندرگاہوں پر امریکی جہاز، لکڑی، مصالحہ جات، نیوی کا سامان اور بندوقیں اتارا کرتے تھے اس کا مقصد مقامی حکمرانوں کو مضبوط کرنا تھا۔ جارج واشنگٹن نامی جہاز پر تقریباً 500000 ڈالر کا سامان تھا، جسے الجزائر پہنچانا تھا۔

بین برج کے لئے اس رشوت کو لیجانے کی رسوائی اس حقیقت سے جڑی تھی کہ جہاز واشنگٹن پہلا جہاز تھا جو بحیرہ روم میں داخل ہوتا۔ اپنے ملک کا نمائندہ ہوتے ہوئے۔ ولیم کو توقع تھی کہ اسے عزت دی جائے گی۔ لیکن عزت کے بجائے ذلت کا سامنا ہوا۔ تم مجھے خراج دیتے ہو، تاکہ غلامی سے بچ سکو حسن بے نے اسے پھنکارتے ہوئے کہا۔ الجزائر اگرچہ عثمانی خلافت سے آزاد تھا۔ پھر بھی الجزائر سلطان کو خراج دیا کرتا تھا۔ اور اب حسن بے نے ولیم بین برج کو تمام سامان استنبول لے جانے کا حکم دیا۔ کپتان نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ تب حسن بے نے اسے یاد دلایا کہ اس کا جہاز براہ راست شہر کی توپوں اور 32 گنوں والے کریسنٹ نامی جہاز کی زد میں ہے جو الجیریا کو امن بحال رکھنے، جہازوں پر حملہ نہ کرنے، ملاحوں اور عملے کو غلام نہ بنانے کے لئے دیا تھا۔ بین برج نے اس کے حکم پر عمل کیا۔

جارج واشنگٹن جہاز پر پندرہ سو بکریاں پچیس گائیں چار گھوڑے اور چار چار ہرن چیتے اور شیر بھی تھے اس کے ساتھ شتر مرغ اور طوطے بھی تھے اس چڑیا گھر اور جانور خانہ کے علاوہ کئی ملین ڈالرز کا سونا زیورات اور دیگر اشیاء بھی تھیں۔ ان کے ساتھ الجیریا کا سفیر اور اس کا کنبہ۔ اور ایک ہزار افریقی غلام بھی تھے۔ تیس سال سے کم عمر بھرے چہرے والا جس کے بال بہت سنورے ہوئے تھے اس کپتان نے اس تسلط اور مسلط کردہ مصیبت پر شدید نفرت کا اظہار کیا۔ اور اس سے کہیں زیادہ ذلت آمیز بات یہ تھی کہ جہاز سے امریکی جھنڈا اتار کر اس پر الجیریا کا نشان لگا دیا

تھا۔ایسی ذلتیں مجھے آزاد امریکہ جیسے الفاظ پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔اس نے گرج کر کہا اور دوبارہ خراج کا سامان نہ لے کر جانے کا عندیہ دیا۔جب تک کہ مجھے گولوں کی زبان سے خراج دینے کا حکم نہ دیا جائے۔

استنبول کا تین ہفتوں کا سفر اتنا ناگوار تھا کہ جس کا تصور ممکن نہیں۔بین برج نے خط لکھا، اس کے عملے کو، مسلمانوں کی نماز کے اوقات کے دوران۔ ہوا کی سمت صحیح رکھنے اور انہیں مکہ کی طرف منہ رکھنے اور لڑھکنے جیسی روایتی تفریح مل گئی۔ہر عملہ سمندر کے اس حصے سے نکل کر، بحیرہ روم اور کالے سمندر کی سرحد سے آگے گزرا۔ چونکہ ان کے پاس شاہی فرمان نہیں تھا۔اور انہیں دستوں کے قریب سے گزرنا تھا۔بین برج نے نہایت عقلمندی سے انتظار کیا۔اس پریشانی میں، وہ مرمرا کا سمندر عبور کرتے چلے گئے۔بین برج یوں پہلا امریکی سرکاری آدمی تھا جس نے عثمانی قوت کا مرکز دیکھا تھا۔

تمام زاویوں سے نظارا بہت شاندار تھا۔نقاشی اور تصویر سازی سے سجے مینار، اور گنبد بہت شاندار نظر آرہے تھے۔ان کے سائے میں شہر کا ڈھانچہ تھا جسے ناجائز حکمرانی اور بدعنوانی نے تباہ کر دیا، اس سلطنت کے حاکم کے خلاف بغاوت نوجوان سلیم سوم نے کی تھی۔جس نے اپنی فوج کے لئے دوررس اصطلاحات کی تھیں اور اسے جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی۔اس کا اپنی فوج کے افسروں سے فرانسیسی زبان سیکھنے کا تقاضا تھا تاکہ وہ یورپی ماہرین سے مشورے کر سکیں۔ان ماہرین میں فوج کا سپہ سالار بونا پارٹ سوم بھی تھا جو ایک دستے کا انچارج تھا۔سلیم کی توجہ کا جواب دیتے ہوئے بونا پارٹ سوم نے جولائی 1798ء میں مصر پر چڑھائی کر دی اور بڑھتا ہوا شام کے ساحلوں تک آپہنچا۔اور صلیبی جنگوں کے بعد برطانوی فوجوں نے بھی چاروں طرف سے اس پر یلغار کر رکھی تھی۔یورپی تاجروں نے غیر علاقائی استحقاق کو استعمال کیا جو انہیں عثمانی دربار کی طرف سے ملا تھا۔

بین برج اگرچہ مغربی ملک کا باشندہ تھا جس کی عثمانی عزت کرتے تھے جس کے بارے میں عثمانیوں کا خیال تھا یہ ایک جزیرے کی بادشاہی تھی جنھوں نے کامیابی سے یورپی تسلط سے آزادی حاصل کر لی تھی ان لوگوں نے ستارے اور پٹیاں زندگی میں صرف ایک بار دیکھی تھیں اور وہ بھی فرانسیسی جہاز کے مستول پر 1793ء میں ایک خاص دن کے موقع پر لیکن اس کا اثر دیرپا تھا جونہی

جارج واشنگٹن نے حرم سرا کی طرف رخ کیا سلطان نے جھنڈے کے ستاروں کو آسمانی ستاروں سے جوڑا۔یہ ترکی کا اپنا اندازہ تھا۔کہ دو قوموں کے درمیان تعلق قائم ہو گیا ہے۔

بین برج کا ترکی میں بہت شاندار استقبال ہوا، پاشا کے دربار میں رسائی ہوئی۔عثمانی نیوی کے چیف اور سلطان کے بھائی نے اپنی مقامی سرزمین کے بارے میں تفصیلات بتا کر خوب خاطر تواضع کی۔بین برج سے متاثر ہو کر، سلطان پاشا نے ولیم لوفٹن سمتھ جو اس کے دربار میں امریکی سفیر تھا کو خط لکھا اور کہا کہ کپتان بین برج کی میزبانی کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے اور امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں بھی اس قسم کے دورے ہوتے رہیں گے۔پاشا نے بین برج کو بہت قیمتی تحفوں سے نوازا اور اسکی درخواست پر روزی کمانڈر کی موت کی سزا ختم کر دی۔واشنگٹن جہاز کو شاہی سلامی پیش کی گئی۔جونہی اس نے ساحلی سمندر چھوڑا اور گھر کے لئے روانہ ہوا۔

بین برج کی جو بے عزتی الجیریا میں ہوئی تھی ترکی کی مہمان نوازی بھی اسے کم نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ اس کا غصہ امریکہ پہنچ کر اور میڈل آف ہیروازم وصول کر کے بھی کم نہ ہوا۔بین برج جھاگ اڑاتے ہوئے گرجا" کاش امریکی ان قزاقوں کی کمزوری سمجھ لیتے تو وہ جنگ کا اختیار استعمال کرتے۔مجھے یقین ہے کہ وہ ان بدمعاشوں کی نسل کو زیادہ دیر خراج نہ دیتے۔

فتوحات اور مصیبتیں

غصے اور ناراضگی میں بین برج اکیلا نہیں تھا سیکرٹری آف سٹیٹ جیمز میڈی سن کے مطابق حسن کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری نے ان کے امریکی عوام کی حساسیت اور نئے صدر ٹامس جیفرسن کو بھی متاثر کیا ہے۔

اس مسئلے کو حل کرتے ہوئے پندرہ برسوں تک صدر کا بربری ریاستوں کے حوالے سے رویہ ذرا بھی تبدیل نہ ہوا اس نے صدر کا حلف اٹھاتے ہوئے قسم کھائی اور کہا کہ ان قوتوں کے تقاضوں کا کوئی انت نہیں ہے۔اور نہ ہی ان کے وعدوں میں کوئی تحفظ ہے۔اس نے یقین کر لیا کہ رشوت اور خراج سے کم خرچ، قوت کا استعمال ہے۔اس نے قسم کھاتے ہوئے کہا کہ وہ آئندہ بلیک میل نہیں ہوگا اور اپنے آپ کو اس تضحیک اور تمسخر کا دشمن قرار دیا۔اس نے شمالی افریقہ کے ساحلوں پر اپنے جنگی جہاز بھیجنے کا عزم کیا اور ان کی خواہش پر گولا بارود بھیجنے کا ارادہ کیا۔جیفرسن

اگر بہت سے تضادات کا حامل شخص تھا لیکن اس نے عالمی معاملات سے امریکی علیحدگی کی تعریف کرتے ہوئے۔ عسکری الجھاؤ میں اپنی مخالفت کم کرتے ہوئے دفتر سنبھالا، اس نے نیوی کے جہازوں کی تعمیر روک دی اور نیوی افسر کم کردیئے۔ جیفرسن نے بربری ریاستوں کے خلاف اتحاد قائم کرنے اور بحرالکاہل کے قزاقوں سے چھٹکارا پانے کی امید باندھ لی۔

ادھر طرابلس نے امریکہ کے دو تجارتی جہاز لوٹ لئے۔ جن کا نام کیتھرین اور فرینکلن تھا۔ اور مزید 100000 لاکھ ڈالر کا مطالبہ کیا تونس نے چالیس گولوں اور دس ہزاروں بندوقوں کے سیٹینڈ اور 36 توپوں والا جنگی جہاز مانگ لیا۔ جیمز کیتھ کارٹ طرابلس میں امریکہ کا سفیر تھا نے مختصر لفظوں میں لکھا کہ طرابلس سے امن خریدنے کے لئے تونس کے ساتھ بھی بولی لگانا پڑے گی۔

امریکہ کے پاس سادہ سا ایک حل تھا کہ وہ یا تو ہمیشہ کے لئے بحرالکاہل کو ترک کرے یا جنگ کی تیاری کرلے۔

جیفرسن نے جنگ کو اختیار کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ایک قانونی رکاوٹ کا سامنا ہوا۔ امریکہ کا قانون بربری خطرے اور دھمکی کے جواب میں جنگ کا حق صدر کے بجائے کانگریس کو دیتا تھا جیفرسن کو یقین نہیں تھا کہ آیا کانگریس جنگ کا حکم دیتی ہے۔ اس نے آئین کو ایک طرف رکھتے ہوئے ایک پولیس جیسے آپریشن کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ مکمل جنگ کا اعلان نہیں کرسکتا تھا۔ نیوی کو شمالی افریقہ کے ساتھ معاہدوں پر عمل درآمد کروانے پر زور دیا۔ اور قزاقوں کے سخت ردِعمل کو روکنے کے لئے ان کے جہازوں کو تباہ اور غرق کرنے کا حکم دیا۔

کانگریس کو قابو کرکے اور ذاتی طور پر مشرقِ وسطی میں عسکری ایکشن کی خود کو اختیار دینے کی مثال نے آنے والے صدور کے لئے آسانی پیدا کردی۔ جیفرسن کے معاملے میں بحری اور بری فوج تیزی سے حرکت میں آگئی۔ جیفرسن جب جنگ کا ارادہ کررہا تھا۔ تریپولی کے ساتھ اچانک جنگ چھڑ گئی یوسف قرمان علی پاشا نے امریکی سفیر کیتھ کارٹ کو بلا کر خبردار کیا کہ خراج دینے کی تاخیر اصل میں تم لوگوں کا تکبر اور غرور ہے۔ 14 مارچ، 1801ء میں فرمان علی کے فوجی دستوں نے 2 امریکی سفارت خانے کی طرف پیش قدمی کی اور خالص طرابلسی انداز میں کئی قسم کی جارحیت کی اور امریکی جھنڈے کا کھمبہ کاٹ دیا۔ آزادی حاصل کرنے سے اب تک پہلی بار امریکہ نے جنگ کا علان کیا۔

اب امریکہ نے طرابلس کی طرف سے مزید جارحیت کا انتظار نہ کیا اور تیزی سے مشرقِ وسطی کی طرف جہاز روانہ کیئے۔ ای سکس پریزی ڈنٹ ، اور فلاڈلفیا جہازوں کے ساتھ 12 گنوں والا ایک ہلکا جہاز بھی تھا۔ جب یہ سکواڈ، جبرالٹرا کے پاس پہنچا وہاں مشہودہ نام کا جہاز جو کبھی امریکہ کا تھا۔ قبضہ کرکے کھڑا کیا ہوا تھا۔

وہ بحرالکاہل کو عبور کرکے، طرابلس کی رکاوٹ کی طرف چل پڑے بندرگاہ پر پہنچ کر انہوں نے چند گولے شہر پر داغے، اس عمل کے دوران انٹر پرائز جہاز کا ٹکراؤ طرابلس نامی جہاز سے ہوا جو دشمن کا جہاز تھا اور جس پر بارہ توپیں نصب تھیں امریکی جہاز انٹر پرائز نے ایک قابل عمل جنگی چال چلی۔ جہاز کے عملے نے برطانوی جھنڈہ ستاروں اور پٹیوں والا جھنڈ لہرا اکر طرابلس پر گولے برسا دیئے۔ جنہوں نے اسکے بادبان برباد کردیے اس پر لفٹینٹ ڈیوڈ ڈپورٹر کی کمان میں چند آدمی چڑھ گئے قزاقوں کی توپیں اور سامان سمندر میں پھینک دیا۔ اور اس جہاز کے کمانڈر رئیس محمد سوس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور طرابلس جہاز کو طرابلس جانے کی اجازت دے دی۔ جہاں محمد سوس کو شہریوں کے سامنے کوڑے مارے گئے۔ اس جہاز کے 80 افراد کے عملے میں تیس لوگ زخمی ہوئے اور تیس لوگ مارے گئے لیکن امریکہ کا ایک آدمی بھی زخمی نہ ہوا۔

امریکہ کا مشرقِ وسطی کے ساتھ یہ پہلا فوجی ٹکراؤ تھا جس میں امریکہ کامران ٹھہرا۔ لیکن اسکی فتح بہت کم تھی۔ طرابلس کے تمام کپتان، چھوٹی کشتیوں میں بھاگ نکلے اور مشہودہ بھی اپنا گھیرہ توڑ کر بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ سکواڈ کموڈو، رچرڈ ڈیل جو جز وقتی جنگجو تھا۔ وہ جنگ آزادی میں دو بار پکڑا گیا اور تین بار زخمی ہوا۔ دو پال جونز کی سربراہی میں سمندر کا سفر کرچکا تھا۔ وہ بہت تذبذب کا شکار تھا۔ تمام تونسی، تونسی اور الجیری قبیلوں پر لعنت بھیجتا ہوا، امریکی تجارت بچانے کا کوئی اور ذریعہ نہ پا سکا سوائے اس کے کہ بحراالکاہل میں چار جنگی جہازوں کو مستقل رکھا جائے۔ امریکہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یا تو بحراالکاہل میں اپنی جنگی فورس رکھے یا دوبارہ سے انہیں رشوت دینا شروع کردے۔

کیا ہمیں امن قیمت کے عوض ملے گا؟ غصے بھرے جیفرسن نے کابینہ سے خطاب کرتے ہوئے پوچھا۔ ہمیں فتح کبھی بھی جنگی جہازوں کا کا بڑا فلیٹ رکھے بغیر نہیں مل سکتی۔ اس کے لئے ہمیں جنگ کے اعلان کی ضرورت ہے یہ کانگریس کا کام تھا لیکن صدر اسے ڈھانپنے کا ارادہ کرچکا

تھا لیکن حیران کن طریقے سے کانگرس نے اس کی منظوری دے دی۔ ورجینیا کے نمائندے جان سٹرائیٹن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے شہری جو تجارت کرتے ہیں وہ بھی حفاظت کا اتنا حق رکھتے ہیں جتنا ہمارے شہری اپنے گھروں میں رہ کر فصلیں اگاتے ہیں۔ 6 فروری 1802 کو کانگریس نے بحری سفر کرنے والوں اور تجارت کے تحفظ کا قانون، طرابلس قزاقوں کے خلاف منظور کیا۔

سمندر میں پانچ جنگی جہاز اور بغیر بادبان کے جہاز رکھنے کی اجازت دی گئی اور اس کے ساتھ ان پر بہترین عملہ تعینات کرنے کی اجازت دی گئی۔ اور انہیں یہ بھی اجازت دی گئی کہ وہ دشمن کی کشتیاں اور جہاز ان کی بندرگاہوں تک محدود کر دیں۔ یا انہیں قبضے میں کر لیں۔ اور جو بچ نکلنے کی کوشش کرے اسے ختم کر دیں لیکن یہ امریکہ کی طرابلس کے خلاف پہلی مہم تھی جو کامیاب ہوئی۔

ناکامی کے آثار 25 مئی کی رات کو ظاہر ہوئے جب طرابلس کی بندرگاہ پر گیارہ گندم سے لدے جہاز ملے۔ لیفٹیننٹ پورٹر کی زیرِ نگرانی طرابلس کے ساحل پر اترنے والے فوجی آدھی سے زیادہ کشتیاں جلانے میں کامیاب ہو گئے اور اس کے ساتھ ان کے غیر منظّم عملے کو بھی منتشر کر دیا۔ یہاں شاعر لانگ فیلو کا چچا اس بات کو دہراتے ہوئے کہتا تھا کہ کھیل بہت اچھا تھا لیکن طرابلسی خود کو دوبارہ منظّم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ہم پر آگ برسا دی۔ جس سے پورٹر کے دونوں چوتڑ زخمی ہو گئے۔ اور پندرہ ملاح مارے گئے۔ امریکہ وسطی ایشیا میں پہلی تباہی سے دوچار ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا حاصل رعب جمانے کے لیے بہت کم تھا۔ طرابلسی کشتیوں نے اپنے جہاز بچانے کی کوشش شروع کر دی۔ اور شہر کی توپوں کے تحفظ کے لیے خشکی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ امریکی پریشانی رچرڈ موریس جوان کا کمانڈر تھا، اس کی وجہ سے مزید بڑھ گئی جس نے اپنی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ برطانوی افسروں کے ساتھ جبرالٹر میں کھانا کھاتے وقت گزار دیا۔ بجائے اس کے رچرڈ موریس اپنے طے کردہ کام کو انجام دیتا، اس نے طرابلس کے ساحل پر سفید جھنڈا لہرا دیا اور پاشا کے لیے 5000 ڈالر کی پیشکش کر دی۔

کیتھ کارٹ نے اس کی خوب وضاحت کی کہ رچرڈ موریس غدار اور ہر قسم کے جذبات کا سودا کرنے والا شخص تھا۔ یوسف فرمان علی ایک سرد مہر اور ظالم حکمران تھا جس نے اپنے ایک بھائی کو قتل کر کے اور دوسرے کو دیس بدر کر کے اقتدار سنبھالا تھا۔ وہ سستے میں بکنے والا نہیں تھا۔ اس نے

موریس کو جتلا دیا کہ میں جنگ سے نہیں ڈرتا، یہ میرا پیشہ ہے۔ پاشا پہلے ہی سے اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ امریکی یورپیوں سے ذرا کم نہیں۔ وہ باتیں بہت کرتے ہیں اور عملی طور پر کرتے کچھ نہیں۔ اب حالات اس کے قابو میں تھے۔ اس نے کہہ دیا کہ اب امن میری شرائط پر ہوگا۔ اس نے امریکہ سے دو لاکھ ڈالر اور بیس ہزار سالانہ وظیفے کا مطالبہ کیا۔ ان مطالبات سے گنگ ہو کر اور اس خوف سے کہیں فرمان علی اسے گرفتار نہ کر لے اور تاوان کے بدلے قیدی نہ کر لے، موریس اپنے جہاز کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ نیوی نے اس کا کورٹ مارشل کیا اور کمیشن سے فارغ کر دیا۔

جیفرسن نے قسم کھائی تھی کہ اب تجارت کا تحفظ ہر سمندر میں ہماری اپنی قوت اور بہادری سے ہوگا۔ اس قسم کی کی قسمیں 1803 تک ڈھاک کے تین پات ثابت ہوئیں۔ امریکہ کے ساتھ طرابلس کے یہ ناگوار اقدامات دیکھ کر تونس اور الجزائر نے بھی اپنے تقاضے بڑھا دیئے اور مراکش نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ امریکہ کے برطانوی وزیر رفس کنگ نے اپنی حکومت کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ بربری طاقتوں کے خلاف ہمارے تحفظ اور امن کا انحصار ہماری قوت اور جنگی جہازوں پر ہے، نہ کہ تحفوں اور معاہدوں پر ہے۔ جیفرسن اس بات سے پوری طرح متفق تھا۔ لیکن فرانس سے لوزانا خریدنے کے بعد قرضے سے نجات حاصل کر کے، اس پر بحر الکاہل میں دو جنگی جہاز رکھنے پر بہت زور دیا گیا۔ جو کہ ایک مکمل قسم کے حملے کے لیے ناکافی تھے۔

صدر کو ایک قابل ذکر فوقیت حاصل تھی اور وہ فوقیت ایک نئے کموڈور ایڈورڈ پریبل کی صورت میں تھی۔ جو چالیس سالہ سخت گیر نیوی افسر تھا۔ اس کا تعلق Maine سے تھا۔ اسے نظم وضبط اور مفید صحت کا خبط تھا۔ جنگِ انقلاب کے دوران میں برطانوی قید والے جہاز میں کئی قسم کی بیماریوں نے حملہ کیا۔ لیکن ایڈورڈ پریبل پر ذرا اثر انداز نہ ہو سکیں۔ نہ اس کے سرخ بالوں، نہ اس کی سڑی ناک پر، اور نہ اس کی سمندر میں قزاقوں سے جنگ لڑنے کی خواہش پر اثر ہوا۔ پریبل نے دھاڑتے ہوئے کہا کہ نوابین دھوکے باز قزاقوں کا گروہ تیار کر رہے ہیں۔ اور قسم کھائی کہ میں انہیں مار گراؤں گا اور اس سطح پر لا کھڑا کروں گا جو ہمارے نظریات کے لیے ساز گار ہوں۔ پریبل کی ماتحتی میں سفر کرنے والا بین برج بھی تھا جو جارج واشنگٹن جہاز کا بدقسمت کپتان تھا جو الجزائر میں ہونے والی بے عزتی کے اثر سے نکل آیا تھا اور اب امریکہ کے پریمئر جنگی جہاز، چھتیس توپوں والا فلاڈلفیا کی کمان کر رہا تھا۔ اگست 1803 میں بحر الکاہل میں داخل ہونے کے فوری بعد بین برج

نے مرکوبا نامی جہاز کو الجھالیا جس کی چھان بین کے بعد علم ہوا کہ وہ امریکی اغوا شدہ جہاز ہے جس کا پرانا نام Celia ہے۔ اس کے عملے کو زنجیروں سے باندھ کر عرشے کے نیچے رکھا گیا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس جہاز کے پکڑے جانے سے امریکہ پر اچھا اثر پڑے گا'' کپتان نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ اس نے انسانیت اور اچھائی پر مراکشی قیدیوں کو دکھانے کے لیے زور دیا تا کہ ان کے ذہن میں امریکی کردار کے بارے میں قائم رائے بدل جائے۔

پریبلو اس اثنا میں طنجہ میں لنگر انداز ہو چکا تھا۔ اس نے بادشاہ سے بات چیت کا مطالبہ کیا۔ کیا تم گرفتاری سے خوفزدہ ہو؟'' سلیمان نے سوال کیا۔ جونہی پریبلو بغیر تعظیم اور تلوار نکالے بغیر آگے بڑھا۔ پریبلو کا جواب نفی میں تھا۔ اور اگر تم ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو میرا اسکواڈ ابھی تمہارے شہر، فوج اور جہازوں کو تباہ کر دے گا۔ مراکش سلطان فوری طور پر 1786 کے معاہدے بغیر کسی شرط کے بحال کرنے پر متفق ہو گیا۔

پریبلو کا سفر پورے تیقن سے شروع ہوا لیکن اس کا انجام بھی حسب سابق شکست کی صورت میں ہوا۔ 31 اکتوبر کی دوپہر کو، ایک طرابلسی جہاز کا ساحل کے قریب تعاقب کرتے ہوئے، فلاڈلفیا سمندری گھاس میں پھنس گیا۔ جہاز کو نکالنے کی کئی اضطرابی کوششیں ہوئیں۔ اس کے اگلے مستول کاٹ دیئے گئے۔ سامان پھینک دیا گیا۔ لیکن سب کوششیں فضول ثابت ہوئیں۔ اس کی توپیں غلط زاویے پر تھیں۔ اور دشمن کی توپوں والی نو کشتیاں قریب آ رہی تھیں۔ بین برج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے اور اس کے 307 عملے کے ارکان سے وردیاں چھین لی گئیں اور انہیں سابقہ امریکی سفارت خانے کے باہر چھوڑ دیا۔ جب کہ فاتحین نے فلاڈلفیا کو رسوں سے کھینچ کر آزاد کروالیا اور طرابلس کے ساحل پر لے آئے تا کہ اس جہاز کو طرابلس نیوی میں شامل کیا جائے، فرمان علی نے شوخی بھرے لہجے میں کہا اسے عطیہ ءخداوندی کا نام دیا جائے۔

نہایت افسوس سے اطلاع دے رہا ہوں کہ امریکہ فلاڈلفیا جہاز کھو چکا ہے۔ بین برج نے نیوی کے سیکرٹری کو خط میں کہا۔ اور اسے انقلاب کے بعد امریکہ کا بدترین فوجی نقصان قرار دیا۔ وہ اپنے پہلے مشرق وسطیٰ کے سفر کی ہزیمت کا شکار ہو چکا تھا۔ اور اپنی دوبارہ ہزیمت کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ کسی دشمن کو قتل کرنا کتنا مہلک تھا۔ اور غیر تہذیب یافتہ دشمن کے آگے جھکنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور دشمن تضحیک کر رہا تھا۔ اس نے اپنے کمانڈر کی منت کی کہ طرابلس کو رقم دینے کی

بجائے، فلاڈلفیا کو فوراً تباہ کر دیا جائے۔

پریبلو کو قائل ہونے کی بمشکل ضرورت پڑی۔ ''خدا کے لیے، کیا تمام لوگ، افسر اور عملہ، غلامی کی بجائے موت کو ترجیح دے چکے ہیں۔'' پریبل نے ایک اور منصوبہ سوچا۔ جس کے تحت انہیں طرابلس کے حال میں پکڑے ہوئے جہاز کو طرابلس کی بندرگاہ تک فلاڈلفیا کے قریب لے کر جانا تھا اور آگ لگا دینا تھی۔ آپریشن کی کمان کے لیے پریبل نے امریکی نیوی کے ہیرو کے بیٹے کی طرف رخ کیا۔ جو نوجوان لیفٹیننٹ تھا، جو شائستہ اور بہادر تھا اور بہت دلکش اور خوبصورت تھا۔ اس کا نام سٹیفن ڈی کاٹر تھا۔

اپنی پتلی ناک، خوبصورت منہ اور لمبی بھوؤں اور خوبصورت آنکھوں والا ڈی کاٹر، نیوی افسر کے بجائے شاعر نظر آتا تھا۔ اس نے بچپن میں جہاز کے اگلے مستول سے جھولتے ہوئے گر جا اور اپنی والدہ کی غنڈوں سے جان بچائی۔ اور یوں اس کی طبعی اور جسمانی ساخت کی شہرت پھیل گئی۔ اسی سال مالٹا میں کشتی لڑتے ہوئے، اس نے ایک انگریز افسر کو قتل کر دیا تھا۔ اور جزیرے کی طرف بھاگ گیا۔ اب پچیس سال کی عمر میں وہ امریکی جہاز ای سکس (Essex) پر اپنی خدمات انجام دے رہا تھا۔ جہاں اسے پریبلو کی طرف مشن کی کمان کرنے کا حکم ملا۔ پریبلو نے کہا کہ ہم ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں جس کا نتیجہ ہماری اموات، دائمی غلامی یا ہمیشہ کی عظمت میں بدل سکتا ہے۔ اس نے آگے بڑھنے کے لیے پوچھتے ہوئے کہا، اور پورے عملے نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

16 فروری 1804 کو ساڑھے نو بجے، جوان چاند کی روشنی میں ڈیکاٹر روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہ کچ، جس کا نیا عیسائی نام انٹری پیڈ تھا پر 67 فوجی تھے جو مالٹا کی وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان کے سامنے دو گولے فائر کرنے والا فلاڈلفیا اور طرابلس دستے تھے۔ کل 150 توپیں تھیں جن کا رخ ان کی طرف تھا۔ ایک عربی بولنے والے خلاصی کی مدد سے انٹری پیڈ بندرگاہ میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور تیزی سے فلاڈلفیا کی طرف بڑھا۔ ڈی کاٹر نے سرگوشی میں رضا کاروں کو فلاڈلفیا کے عرشے پر چڑھنے کا حکم دیا۔ رضا کار آسانی سے عرشے پر چڑھ گئے اور اس کی حفاظت پر مامور لوگوں کو قتل کر دیا اور اسے آگ لگا دی۔ طرابلس کے سنتری چیخ اٹھے ''امریکی آ گئے''، لیکن اب دیر ہو چکی تھی فلاڈلفیا کے گولوں نے آگ پکڑ لی تھی اور شہر میں دھماکے ہونے لگے تھے بیس منٹ کے

بعد لوگ خود تنویمی عمل کے زیرِ اثر واپس لوٹے جب آگ نے پورے جہاز کو لپیٹ میں لے لیا شعلے مستول بن چکے تھے اس مہم میں صرف ایک آدمی ضائع ہوا۔ فلاڈلفیا کی توپوں کو ضائع کرتے ہوئے انھیں براہِ راست جنگ کا حوصلہ ملا۔

اس آپریشن کی پورے یورپ میں تعریف ہوئی برطانوی لارڈ نیلسن نے اس آپریشن کو اپنے عہد کا سب سے بڑا بہادرانہ اور جرات مندانہ عمل قرار دیا پوپ ہشتم نے دعوی کیا کہ امریکی نیوی نے عیسائیت کے لئے وہ کام کیا ہے جو بڑی بری عیسائی حکومتیں نہیں کر سکی تھیں۔ ڈیکاٹر کی تمام بے خوفی کے باوجود پریبل پر بین برج اور اس کے عملے کی رہائی کا بوجھ تھا بین برج وہ شخص تھا جس نے خراج یا امن کے بدلے ایک سینٹ ادا کرنے کے بجائے تمام عمر سمندر میں گزارنے کی قسم کھائی تھی، اس شخص نے پاشا کو 100000 ڈالر کی پیشکش کی قرمان علی اس پیشکش پر صرف مسکرایا اور قیدیوں کی رہائی کے بدلے 1.5 ملین ڈالر کا مطالبہ کیا۔

احساسِ ذلت اور غصے میں مبتلا پریبل نے ایک بار پھر جارحیت کرنے، شہر پر بمباری اور حملے کا عزم کیا۔ ایک تیز ایکشن کر کے ڈیکاٹر اور پندرہ جوانوں نے جو سنگینوں ڈھالوں اور چھوٹی کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے بندرگاہ پر دشمن کی کشتیوں پر اتر گئے۔ ہاتھ میں نیزہ ہونے کے باوجود وہ ایک ڈاکو کپتان کو گولی مارنے اور دوسرے کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ جس نے ڈیکاتر کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا بھائی، جو فلیٹ میں افسر تھا، کم خوش نصیب ہوا۔ وہ سر میں گولی لگنے سے مارا گیا۔ دن کے اختتام تک امریکیوں نے 47 طرابلسی مار دیئے اور 56 طرابلس قیدی بنا لیے۔ کچھ ترکوں نے مردوں کی طرح موت کو سینے لگایا اور کچھ عورتوں کی طرح مر گئے۔ ڈیکاٹر نے شوخی سے کہا لیکن پریبل نے اس کی شوخی خاک میں ملا دی۔ کمانڈر کو جب یہ علم ہوا کہ ڈی کاٹر نے صرف تین جنگی کشتیاں قبضے میں لی ہیں، کموڈور نے اس کی سرزنش کرتے ہوئے کہا، صرف تین کشتیاں! باقی کہاں ہیں؟

پریبلو کے پاس اس کی سرزنش کی اچھی وجوہ تھیں، کہ چھ ماہ کے بعد اور ہزاروں گولے خرچ کرنے کے بعد بھی طرابلس پر ذرا آنچ نہ آئی تھی۔ ایسی کوششوں سے طرابلسی قزاقوں کو ڈرنے کے بجائے حوصلہ ملے۔ یہ ڈاکٹر جوناتھن کاؤڈری کا مشاہدہ تھا جو فلاڈلفیا پر قبضے کے بعد پکڑا گیا تھا۔ اس اثنا میں امریکی قیدیوں کی خوراک کم کر کے روٹی کے آٹھ اونس اور تھوڑے ابلے

گھی تک کر دی گئی۔ انہیں باقاعدگی سے مارا جاتا اور گھسیٹ کر صحرا میں کام کے لیے لے جایا جاتا تھا۔ ان کی زندگی کی ضمانت میں تخفیف کر کے پھر سے نئی امیدوں کو 7 اگست کو وضع کیا گیا۔ جب پریبل کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ میں سوائے افسوس کے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہماری نیوی انتظامیہ اتنی محدود ہے کہ مجھے طرابلس کے طوفانِ بدتمیزی کو روکنے کے لیے ہر قسم کے وسائل سے محروم کر دیا۔ لیکن اپنی رخصتی سے پہلے پریبل ایک آخری مایوسانہ کوشش فتح کے لیے کرنے کا عزم کر چکا تھا۔

انٹری پیڈ جہاز پر 1500 پاؤنڈز گن بارود تھا۔ اور کئی قسم کے گولے بھی تھے۔ ڈی کاٹر کے بچپن کا دوست کیپٹن رچرڈ سومرز، جس کے ساتھ دو لیفٹیننٹ ویڈز ورتھ اور جوزف اسرائیل اور دس ملاح بھی تھے، جو جہاز کو بندرگاہ پر لے گئے۔ انہوں نے فیوز کو آگ لگا دی اور خود ایک کشتی میں بیٹھ کر بچ نکلے۔ جہاز دھماکے سے پھٹا اور پاشا کا پورا فلیٹ تباہ ہو گیا۔

سکواڈرن نے تین ستمبر کی دھند آلود رات میں انٹر پیڈ کو ڈوبتے دیکھا اور مسلسل دیکھ رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد پوری فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ ایک چشم دید گواہ مڈشپ مین رابرٹ ٹی سپنس نے اس کی وضاحت یوں کی کہ میں نے ہوا میں گولوں کو پھٹتے دیکھا۔ جیسے کئی سیارے آپس میں ٹکرا گئے تھے۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ اپنے ہدف سے محروم اور نامعلوم وجوہ کی بنا پر، انٹر پیڈ دھماکے سے پھٹ گیا۔ اگلی صبح بین برج ایک لگنے والے زخم کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا ساحل پر لایا گیا، تاکہ وہ جلی ہوئی اور آپس میں گتھم گتھا لاشیں دیکھ سکے۔ اس نے ان لاشوں کو دفنانے کی اجازت چاہی لیکن بے نے انکار کر دیا اور اس بات پر زور دیا کہ لاشوں کی باقیات کتوں کے لیے چھوڑ دی جائیں۔

مالٹا کے برطانوی گورنر سر الیگزنڈر بیل نے پریبل کو لکھا کہ تم نے پیسوں کے عوض امن نہ خرید کر بہت اچھا کیا ہے۔ لیکن کموڈور کو تسلی اور سکون نہیں مل سکتا تھا۔ وہ ابھی اس فتح کے احساس سے بے چین تھا جس سے بچ نکلا تھا اور اسے ان قیدیوں کا خیال تھا جو ابھی تک طرابلس میں قید تھے۔ امریکی عوام کی نظر میں پریبل ہیرو تھا۔ جنوری 1805 میں اس کی واشنگٹن واپسی کو خوش آمدید کہنے کے لیے تقریبات ہوئیں۔ اور ان تقریبات کا اس وقت انعقاد ہوا جب جیفرسن کے دوسرے دور کی ابتدا اسی دن ہونے والی تھی۔ ڈی کاٹر کا بھی جشن منایا گیا۔ اسے سنہری تلوار سے نوازا گیا اور اسے کیپٹن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ جو نیوی میں سب سے کم عمر کیپٹن تھا۔

یہ جشن اکیلا اگر چہ اس حقیقت کو چھپا نہ سکا کہ امریکہ مشرق وسطیٰ میں جنگ کے لیے گیا تھا۔ مگر اب تک نا کام رہا ہے۔ امریکہ کے پاس ناکامی کا کوئی جواز بھی نہ تھا کہ اب نیوی کے پاس اتنے جنگی جہاز تھے کہ تمام کروزر کوشکست دی جاسکے۔ طرابلس کے ساتھ دیر تک امن اور وہ بھی ہماری شرائط پر ممکن تھا۔ میڈی سن نے سچی بات کی مگر کابینہ کے دوسرے رکن اس طاقت کے استعمال سے ہچکچاتے رہے۔ سوئیٹزرلینڈ میں پیدا ہونے والے سیکرٹری خزانہ البرٹ گیلین نے دلیل دی کہ قزاقوں کو رشوت دے کر امریکہ صرف بے ایمانی کا حصہ بنے گا۔ جوان قوموں کے ساتھ ہوگی جو ہماری طرح طاقتور اور دلچسپی رکھنے والی ہیں، اور اس طرح بحیرہ روم میں اسکواڈر رکھنے کا نولاکھ ڈالر خرچ بچاتے ہیں طاقت کے استعمال پر عوام کی رائے بھی تقسیم تھی۔ جو کہ جنگ مسلط کرنے کے اخراجات اور امن خریدنے کی قیمت کے باہمی تناسب سے آگاہ نہ تھے۔

حکومت اور عوام ملٹری ایکشن کے لئے حمایت کی کمی کا بوجھ جیفرسن ے کاندھوں پر آپڑا۔ اپنی دوسری مدتِ صدارت میں صدر نے مشرق وسطیٰ میں جاری بحران کو قوم کی بیرونی تعلقات کے سلسلے میں اہم ترین ترجیح قرار دیا۔ اس نے لکھا۔ ''فلاڈلفیا کا کھو جانا موجودہ انتظامیہ کے لیے سب سے بڑا نقصان ہے۔ ''ایک قومی داغ'' جس نے امریکی کمزوریاں دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کا خطراہ پیدا کر دیا ہے۔ جیفرسن کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن امریکی سفارتکاروں کی یورپ میں کوششیں تھیں۔ جو فرانس برطانیہ حتیٰ کہ سلطنت عثمانیہ سے بھی قیدیوں کی رہائی میں مدد دینے کا مطالبہ کر رہے تھے اور ہر ایک نے یہ خود پر لے لیا تھا۔ جیفرسن پریشان تھا کہ نمائندوں نے ہر ملک میں خیرات مانگ کر امریکہ کو انتقام لینے کے لیے جائز کوششوں کے حق سے محروم کرنے کا خطرہ پیدا کر دیا اور امریکی عزت کی دھجیاں اڑادی ہیں۔ خطرے کو روکنے کے لیے صدر کو امریکی جنگی جہازوں کو الجزائر کے قصبے تباہ کرنے کا حکم دینا پڑا۔ مگر ایسا کرتے ہوئے بھی اس کے پاس عوامی حمایت کی کمی تھی۔

لیکن ایک امریکی ایسا بھی تھا۔ جس کے لیے طاقت کے استعمال کے حوالے سے عوام میں جوش و جذبے کی کمی کی اہمیت نہ تھی۔ تونس میں امریکی کونسل ولیم ایٹن جان گیا تھا کہ قزاقوں کو خراج کی ادائیگی سے امریکہ کے لیے صرف ناپسندیدگی باعث بنے گی اور ان کی سرگرمیاں مزید بڑھیں گی اسے تجربہ ہو چکا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں صرف طاقت کا احترام کیا جاتا ہے اور امن کے

حصول کے لیے امریکہ کو اس کا استعمال کرنا ہوگا۔

جدید افریقی انسان:

اگر چہ تصویر میں اس کے خدوخال بہترین خصوصیات کے نظر آتے ہیں مگر ایٹن کو اس کے ایک ہم عمر نے شخصیت اور شکل صورت کے لحاظ سے بھی ایک بل ڈاگ قسم کا انسان قرار دیا۔ یہ جار حیت 16 سال کی عمر میں نمایاں ہوئی۔ جب ایٹن کنکٹی کٹ میں واقع اپنے باپ کے فارم ہاؤس سے بھاگ کر کانٹی نینٹل آرمی میں لڑنے گیا۔ بعد میں وہ Dartmorith گیا اور یونانی اور لاطینی پڑھی اور اسکندر اور قہر کی مہم جو یاں زبانی یاد کیں۔ اس طالب علم نے خنجر زنی میں نمایاں مقام پایا۔ اور وہ 80 فٹ سے اسے درست رکھ سکتا۔ اس نے ایک بیوہ کے سامنے اعتراف کیا کہ کوئی بھی تمھیں آج کے بعد اتنا پیار نہ کرے گا جتنا میں کرتا ہوں لیکن اس نے کہا کہ میں وینس کے تیروں پر مارس کے میدان کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایٹن فوراً بعد جنرل اینتھونی کے تحت بحثیت کپتان بھرتی ہوا جو کہ اوہایو میں مقامی امریکیوں سے لڑ ہوا تھا۔ اگر چہ وہ خود کو ایک ایسا شخص کہتا تھا جو حد سے زیادہ سنجیدہ اور بہت اچھا نہیں تھا اور نہ ہی سادہ جیسا کہ سمجھا جا تا تھا۔ ایٹن ایک انا پرست تھا جو احکامات پورا کرنے میں تکلیف محسوس کرتا تھا۔ دستے سے نکالے جانے پر اسے ایک کلرک کی نوکری ملی۔ جو کہ ورمونٹ کی قانون سازی اسمبلی میں تھی۔ جہاں اگر اس کے جان ایڈم کے اسیکرٹری آف سٹیٹ ٹموتھی پرکنگ سے فیملی کی سطح پر تعلقات نہ ہوتے تو وہ شدید ناپسندیدہ صورتحال میں ہوتا۔ پکرنگ نے 1799ء میں ایٹن کو امریکہ کا تونس کے لیے پہلا کونسل بنایا۔ یہ ایک ایسی ذمہ داری کا کام تھا جو اس کے کردار سے مطابقت رکھتا تھا۔

جان لیڈیارد کی طرح ایٹن بھی پہلے تو مشرق وسطیٰ سے متعلق رومانوی تصورات رکھتا تھا۔ اس نے ایک کائنات کے اور درگزر کرنے والے خدا پر اپنے ایمان کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا اور اس خیال کو مسترد کر دیا کہ مسلمان اور عیسائی ہمیشہ دشمن رہیں گے۔ اسے دی گئی ہدایات میں تونس کے لوگوں کو قزاقی سے دور رکھنا تھا اور انہیں زراعت جیسی پر امن سرگرمی کی طرف لانا تھا۔ پھر بھی شمالی افریقہ جاتے ہوئے اس کے ساتھ جو تحفے تھے ان میں دو جنگی جہاز تھے۔ جنھوں نے دوسرا پیغام دیا۔ جو کہ قزاقوں کے لیے ادائیگی کا تھا۔ تونس نے رشوت قبول کر لی اور پھر فوراً ہی امریکہ کے

ساتھ جنگ کی تجویز کی دھمکی دی۔ایٹن کو انہیں قیمتی کپڑوں،سونے کی گھڑیوں اور موتی لگی چھڑیوں سے لبھانا تھا۔جس کی قیمت چھ ہزار امریکی ڈالر تھی۔جواب میں اسے آٹھ سو ڈالر کا بل دیا گیا جو کہ اس گن پاوڈر کا تھا جو نئے کونسل کی آمد پر اسے سلیوٹ کرنے میں استعمال ہوا۔

تکلیف کا ایک سال ہمیشہ کے لطف سے بھی لمبا ہوتا ہے۔ایٹن 1800 تک شکایتیں کرتا رہا۔کیا ایک جہنم کی تعمیر کافی نہیں ہے۔یہ مختصر عرصہ کونسل کی خوشیاں ختم کرنے کے لیے کافی تھا اور اسے مکمل طور پر مایوس کرنے کے لیے بھی بہت تھا تونس کے خلاف اس کی شکایات بہت زیادہ تھیں کہ ان کو ترتیب دینا مشکل تھا۔ بہنے والی جھیلوں کی شدید بدبو،ڈھانچوں کی شدید بو،ایک سیدھے سورج کی شدید گرمی جو دم اور تمبا کو سے زیادہ گرم تھا۔سخت رویے والے ترک،بے ایمانی کا رویہ رکھنے والے یہودی دولت مند اور ساہوکار یہودی لوگ جو وہاں تھے بے وفا اٹالین لوگ سست رفتار اونٹ،غیر دوستانہ رویہ کے اسمگلرز اور وہاں کے عرب لوگ جن کا رویہ سخت تھا۔اگرچہ اس نے مقامی کلچر کے متعلق سیکھنے کی بہت کوشش کی۔چار لہجوں میں مہارت حاصل کی اور خطے میں بہت سفر کیا،لیکن وہ مشرق وسطی کے متعلق کوئی امید افزا بات نہ کر سکا۔اس نے تونس کو اداسی اور ساتھ ہی ہم جنس پرستی کی زمین قرار دے ڈالا جہاں کے باشندے عزت اور ایمانداری کی کوئی پابندی نہ کرتے تھے۔

جسمانی بے آرامی سے زیادا ایٹن کو دکھ تب ہوا۔جب اسے امریکہ کی ایمانداری سے کمائی گئی دولت کو شمالی افریقہ کے ذخائر میں جاتے دیکھنے کی ذلت اٹھانا پڑی۔میرے ملک کی ذہانت کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔وہ چلا اٹھا جب اس نے کیپٹن بین برج کو الجزائر کے لوگوں کے ہاتھوں بدسلوکی سے دوچار دیکھا۔اس کی یہ کیفیت دوبارہ ہوئی جب 1801ء میں تریپولی نے امریکی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔اور جب اس نے دیکھا کہ امریکی بحریہ امریکی تجارت کی حفاظت میں ناکام رہی کیا وہاں کوئی امریکی نہ تھے۔جو اپنے اعصاب پر قابو رکھتے خون کے برتن توڑتے اور جن کے ناراض دل دکھتے۔ان ناانصافیوں پر جوان پر مسلط کی گئیں۔اس نے پوچھا کیا ہم اپنی قومی عظمت کو ایک بربر قبیلے سے تعلق رکھنے والے قزاقوں کو روکنے سے بہتر کرنے تک رہ گئے ہیں۔ایٹن نے اپنے سوالوں کا جرات مندانہ جواب دیا۔ایک ہزار امریکی مرینز تونس میں داخل ہوں اور وہاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیں جو دوسرے بربر حکمرانوں پر خوف بٹھا دے گا۔مگر

اسیکریٹری آف اسٹیٹ میڈی سن نے اس منصوبے کو مسترد کر دیا مگر ایٹن کو اتھارٹی دی کہ وہ حکومت سے مشورہ کر کے انہیں بیس ہزار ڈالر پر آمادہ کرے جبکہ حکومت سمندر پر تیرنے کے لیے فریگیٹ کی طرح Quaker meeting Houses بھیج سکتی ہے۔کونسل نے شکایت کی کہ امریکہ کی حیثیت بدل کر رہ جائے گی اور وہ ایک تیرتے ہوئے عقاب سے تبدیل ہو کر ایک یونہی کمان اور سگار پکڑے عقاب کی حیثیت رہ جائے گی،ایٹن نہیں سمجھ سکا،کہ صدر اور کانگریس کیوں نہ جان سکی کہ تاوان دینا اور طاقت کا استعمال نہ کرنا قراقوں کو طاقت دے دے گا اور امریکی جہازوں کے لیے مزید خطرہ پیدا کر دے گا۔ایٹن نے لکھا یہ لوگ صرف ایک زبان سمجھتے ہیں اور وہ ہے خوف کی زبان۔

ایٹن امریکہ کی کمزوری سے مایوس ہوا۔جب ستمبر 1801 میں ایٹن کی ملاقات طرابلس کے بادشاہ کے بھائی جو کہ جلاوطن تھا سے ہوئی۔جسکا نام حامد قرمان علی تھا۔اس کی شرافت اور حوصلے سے متاثر ہو کر ایٹن نے تجویز کیا کہ امریکہ اسے تخت کے حصول میں مدد دے جو اس کا جائز حق تھا اور اسے ایک قابل اعتماد اتحادی قرار دیا۔صرف طرابلس (لیبیا) میں حکومت کی تبدیلی سے امریکی اپنی قومی عزت کو بحالی کر سکتا ہے اور یہ فولاد سے ہو سکتا ہے۔سونے سے نہیں۔لیکن اصول پسند اور خاموش طبع مڈی سن نے اس منصوبے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔اگر کونسل کو حامد کی حمایت میں اپنے جوش وجذبے اور اندازوں کے مطابق کام کرنے کی اجازت تھی۔مگر میڈی سن نے واضح کیا کہ امریکہ کسی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔

ایٹن ناراض تھا۔امریکی حکومت قزاقوں سے پرفیوم اور گلاب کا عرق خرید رہی تھی ان کے خلاف بندوق کا استعمال نہیں کر رہی تھی۔اس نے تنبیہ کی کہ دس سال کے اندر قراق اتنے طاقتور ہوں گے کہ وہ امریکہ کے ساحلی قصبوں پر حملے کر سکیں اور بحری اڈا کو ان کی خواتین کو بے عزت کر لیں گے۔اور لڑکوں کو اٹھا لیں گے۔پھر واشنگٹن کے پہریدار بھی غلاموں جیسی وضع میں نظر آئیں گے۔ایٹن نے حقارت سے کہا۔بعد میں آنے والی امریکی نسلوں نے ایٹن کو ایک ہیرو سمجھا۔ایک شروعات کرنے والا،ایک ایسا شخص جو عام راستوں سے انحراف کرتا۔وہ اس بات کو بھول جاتا کہ وہ زیادہ گھلنے ملنے والا شخص نہیں اور ایک ایسا بوڑھا شخص ہے جو اپنے ساتھی کونسلز پر سخت تنقید کرتا اور اس کے ساتھ ضدی بھی تھا اس نے سیکرٹری خزانہ Grallatin کو ایک بزدل یہودی قرار دیا اور جیفرسن کو شکاری مزاج کا کہا۔جو بربر لوگوں کی کے سامنے جھکے ہوئے تھے۔بدقسمتی کا انتظار کرنے

والا ایٹن خاموشی سے مالی معاہدوں میں میں خفیہ منصوبے بھی بنا رہا تھا۔اس کی ایک عادت جس نے اس کے بڑوں اور اس کے تونس میں میز بانوں کو پریشان کیا۔اس منصوبے نے تونسی حکومت کو اسے نکالنے کی وجہ دے دی اور اپریل 1803 میں وہ وطن واپس آ گیا۔

ایٹن نے یوسف کی جگہ اس کے بھائی حامد کو طرابلس میں لانے کا منصوبہ نہیں بدلا۔اس نے واشنگٹن میں پہنچ کر کانگریس کی مدد کے لیے لابنگ شروع کی۔اس نے قانون سازوں کو یقین دلایا کہ لیبیا کے لوگ اور دھوپ کے مارے سیاہ پڑتے بچے ان کے مقاصد میں ان کی مدد کریں گے پھر فلاڈلفیا کے عملے کو قیدی بنا کر اس پر طرابلس کے قبضے کی خبر آ گئی۔

ایٹن کو تباہی کی خبروں نے غصہ دلا دیا۔اگر امریکہ کی مشرق وسطی میں پوزیشن متاثر ہو رہی تھی تو یہ بات بہت مایوس کن تھی۔

ایٹن کی مہم آخر 1804 میں نتیجہ خیز ہوئی۔ جب اسے بربری ریاستوں میں امریکی ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ پہلے موقع پر وہ مصر روانہ ہوا۔ جہاں پر اپنے بھائی سے چھپ کر حامد نے پناہ لی تھی۔ اسے تسلی دیتے ہوئی ایٹن نے کہا کہ خدا کا فیصلہ یہی تھا کہ تم اس تکلیف کا سامنا کرو۔ہمیں یقین رکھنا چاہیے کو وہ اب ان مصیبتوں کو دور کر دے گا۔

لیکن ایٹن کی تکالیف ابھی مشکل سے شروع ہوئی تھیں لیفٹیننٹ Presley Neille O'Bannon اور اس سے منسلک چھوٹی سی میرین فوج کے ساتھ نیل کے ساتھ سفر کرتے ایٹن نے مشکلات، بدو لوگوں کے حملوں اور سلطنت عثمانیہ کے کچھ عہدیداروں کی طرف سے تلاش (یہ عہدیدار وکرپٹ بھی تھے) کا سامنا کیا اس نے حامد کو اکیلا اور مشکل حالات کا شکار پایا جو قاہرہ سے 150 میل دور عرب ٹاور میں تھا۔ جہاں 8 مارچ 1805 کو اس نے اور ایٹن نے اپنی فوج ترتیب دی۔ یہ فوج زیادہ تر انتہائی حدوں پر تھی جو نو امریکیوں نوے لیبیا کے لوگوں یورپ کے 63 مشنریز اور دوسو پچاس بدو لوگوں پر مشتمل تھی۔فوجی ساز وسامان کم تھا۔اس نے کہا کہ وہ توپ خانے کے متبادل کے طور پر عربوں میں پائے جانے والے غم وغصے کو استعمال کرے گا۔اس کو گنوں اور بلٹ اور آتشی مادے کا متبادل بنائے گا۔اپنے دستے کو اکھٹا کرتے ہوئے ایٹن نے وضاحت کی کہ امریکہ میں تمام لوگ عقیدے کی تفریق کیے بغیر برابر تصور ہوں گے اور اہمیت ان کی ایمانداری کو دی جائے گی۔اس نے بڑے پیمانے پر سونا تقسیم کیا اور وہ غرایا کہ اس خطے میں صرف پیسے کی پرستش ہوتی

ہے اور اپنی بھرپور کوشش کا یقین دلایا جو وہ حامد کو اقتدار میں لانے کے لیے کرنا چاہتا تھا۔اسے حامد نے امریکہ کے ساتھ پرامن تعلقات یقین دلایا۔ایک دفعہ بادشاہ بن کر وہ تریپولی میں تمام قیدی رہا کر دے گا۔ پھر ایٹن نے خود کو جنرل کے عہدے پر فائز کیا اور ایک سفید یونیفارم ڈیزائین کیا اور وہ کام کرنے کے لیے چل پڑا جس کا زمانہ قدیم سے کسی کمانڈر نے سوچا بھی نہ تھا۔ پانچ سو میل تک تپتے مغربی صحرا میں مارچ کرنا یہ تھا وہ کام۔

چٹانوں سے بھری پہاڑیوں اور جلتی ریت پر چلنا جو کہ زمین کے ایک مشکل اور غیر مہمان نواز علاقے میں تھیں یہ واقعی بہت مشکل تھا۔ بارہ دن بعد آدمیوں کو آدھا راشن چاولوں کا ہی ملنے لگا۔ جو کہ پانی کی کمی کے سبب پکا ہوا نہ ہوتا تھا۔لیکن زمین کی سختی ایٹن کے راستے کی رکاوٹ تھی سب سے زیادہ خطرناک وہ لڑائی تھی جو اس کی فوج کے مسلمان اور عیسائی گروپوں میں شروع ہو چکی تھی اور بدو بھی اجرت میں اضافہ نہ کرنے پر بغاوت یا چھوڑ جانے کی دھمکی دے رہے تھے۔ انہیں حب الوطنی سچ اور ایمانداری سے کوئی غرض نہ تھی اور جہاں سے کوئی فائدہ نہ ہوتا انہیں وہاں سے لگاؤ بھی نہ تھا۔ حامد نے بھی یوسف کے متعلق بات کرتے ہوئے خدشات ظاہر کیے۔ اسے امریکہ پر بھی یقین نہ تھا۔تناؤ اپنے عروج پر پہنچا جب حامد نے بھی بدو لوگوں کو ٹرین پر حملے کا حکم دیا۔ جو سپلائی لا رہی تھی اس بحران کا سامنا کرتے ہوئے ایٹن اور اس کی فوج بکھر گئے اور پیاس کی شدت سے بے حال ہو گئے۔ جب وہ Bay of Bomba جو Tobjurk کے مغرب میں ہے جہاں امریکی جنگی جہاز ان کا انتظار سپلائی لیے ہوئے کر رہے تھے۔اگرچہ خلیج خالی تھی۔ دن گزرتے گئے اور موت چار سو آدمیوں کے لئے یقینی نظر آنے لگی جب ایک کشتی نمودار ہوئی۔اس کے ساتھ کھانا اور پانی تھا۔کھانا کھا کر ایٹن کی فوج نے مغرب کی طرف مارچ جو کہ ڈارنا کی طرف تھا جاری رکھا۔ جو خطے کی دوسری بڑی بندرگاہ تھی۔ اور طرابلس پر فیصلہ کن حملے کی تیاری کے لیے بہترین تھی۔ 25 اپریل تک وہ Darna کے دروازے پر تھا۔اس نے شہر سے سرنڈر کا مطالبہ کیا۔اس نے گورنر سے کہا کہ ہم مذہب مختلف ہونے کے سبب کسی بے گناہ کا خون نہیں بہائیں گے اور یقین دلایا کہ اس کا واحد مقصد تخت (لیبیا کا) اس کے اصل وارث کو دلانا ہے۔ گورنر کا جواب بہت نپا تلا تھا کہ فیصلہ میرے یا تیرے سر کی قیمت پر ہوگا۔ایٹن زیادہ دیر نہ رک سکتا تھا اس نے پتا چلایا کہ قرمان علی کے لوگوں کا بڑا حصہ Darna سے طرابلس جا رہا تھا جبکہ Argas کے ساتھ دو اور جہاز بھی نمودار ہوئے

اورشہر کی دفاعی تنصیبات پر بمباری شروع کر دی۔ایٹن نے اپنی تلوار نکالی اور سیدھا حملے کا حکم دے دیا دو میرینز مارے گئے جبکہ ایٹن کی پیٹھ میں تیر لگا۔ پھر بھی حملہ آوروں نے شہر کی دیواریں توڑنے میں کامیابی حاصل کی۔ جنگ دست بدست تھی پھر بھی چار گھنٹے بعد ستارے اور پٹیان (امریکی جھنڈا) Darna پر لہرا رہا تھا۔ جنگ کا نتیجہ ابھی دور تھا۔ یوسف کے تین ہزار سپاہی اچانک آئے اور جوابی حملہ کر دیا۔اس حملے کو ایٹن کے ساٹھ آدمیوں کی قیمت پر روکا گیا۔مگر خود کو جنرل کہنے والا ایٹن اپنے سپاہوں سے متعلق پر اعتماد تھا کہ وہ اس قبضے کو برقرار رکھ سکتے ہیں اور اپنا سفر طرابلس کی طرف جاری رکھ سکتے ہیں۔

پھر آنیوالے مئی میں US Constellation نامی جہاز ساحل سے آیا۔جس کے ساتھ ایک حیران کن پیغام تھا۔ جو کموڈور کی طرف سے تھا۔امریکی حکومت نے اپنی مدد جو حامد کو واپس لانے کے لیے دی تھی واپس لے لی ہے اور وہ ایسا یوسف کے ساتھ ایک اچھے معاہدے پر پہنچنے کے بعد کر رہی ہے۔

لیکن ایٹن کو کبھی پتہ نہیں نہ چلا کہ جیفرسن طاقت کے استعمال سے تریپولی کی حکومت بدلنے کے منصوبے کے قابلِ عمل ہونے پر شکوک رکھتا تھا۔ اس کے بجائے وہ بات چیت کو ترجیح دیتا اس نے ایٹن کو ایک خود کو بے حد اہمیت دینے والے شخص کے طور پر مسترد کر دیا حامد نے اخلاقی طور پر کمزوری سمجھ کر کسی معاہدہ پر دستخط سے خود کو دور پایا۔ جبکہ Lear نے اس بات پر زور دیا کہ صرف یوسف سے بات کی جائے۔اس کو لیبیا کے ایک سو جنگی قیدی واپس کر دیے جائیں گے اگر وہ فلاڈلفیا کے قیدی چھوڑ دے اور 60 ہزار ڈالر بھی ملیں گے۔

یوسف اب دارنا میں ایک اہم دشمن کی موجودگی سے خوفزدہ ہو کر تیزی سے ڈیل کی طرف آیا۔اس نے حامد کو طرابلس آنے کی اجازت دے دی اگر ایٹن اپنے لوگ واپس بلا لے۔ یہ فیصلہ ۴ جون 1805 کو ہوا اور تبھی USS Constellation تریپولی کی بندرگاہ پر اترا یہ فلاڈلفیا بحری جہاز کے جلے ملبے کے ساتھ سے گزرا اور اسے اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ بین برج اور 296 لوگ بندرگاہ پر آ گئے وہ انتیس ماہ کی مشکل قید سے رہا ہوئے تھے۔

سارے شمالی افریقہ میں پھیلنے والے نظام سے متعلق خبروں نے الجزائر کو مزید تاوان کا مطالبہ چھوڑنے پر مجبور کیا جبکہ تونس نے ایک سفیر واشنگٹن بھیجا جہاں اس کا شاندار استقبال ہوا

اور وہ وائٹ ہاوس میں ڈنر پر بلا گیا۔

جو کہ کافی رات کو ہوا۔اس کی وجہ ماہ رمضان کا احترام تھا۔اس وفد کے پاس وائن اور جارجیا یونانی شراب کے لئے پیسے کم پڑ گئے ان میں سے تین نے واپس گھر جانے سے انکار کر دیا مگر وہ تونس کا امریکہ کے ساتھ معاہدے کی تجویز میں کامیاب رہے۔ جبکہ تریپولی میں بحری جہاز کے ایک حصے کو امریکی بڑھیوں نے جھنڈ الہرانے والے حصے میں بدل دیا۔سفارت کاری کے نتائج سے خوش ہو کر Lear نے اندازہ لگایا کہ امریکہ کا بربر دنیا کے ساتھ امن ایک ایسی قابل عزت بات ہو گی جس کی سارا یورپ تعریف کرے گا۔

ایٹن جو لیئر کے برعکس مایوس تھا۔اس نے دینا کے گرم ترین صحراؤں میں سے ایک میں سفر کیا تھا اور اپنے سے بہتر فوج کے خلاف تیز رفتار جنگ لڑی اور اسی یونیفارم میں نوے دن گزارے اسے پسپا ہونے کا کہا گیا۔اس سے بہتر تھا کہ Constellation (بحری جہاز) خون اور موت میں ڈوب جاتا وہ پیلے پڑتے امریکی بحری جہاز کے عملے کو ترکوں کے ہاتھوں ذلت اٹھاتے تو نہ دیکھتا۔اس نے کمودر Barron کو بتا دیا کہ جیفرسن کے فیصلے نے امریکہ کی دفاعی طاقت سے متعلق غلط فہمی پیدا کی ہے اور اب کے قزاق پھر سے اور زیادہ شدت سے حملے کریں گے۔لیکن کموڈور نے دارنا چھوڑنے کے احکامات حاصل کیے۔ رات کے اندھیرے میں ساحل کی طرف بڑھا۔ایٹن اور اس کا عیسائی دستہ امریکی جہاز کے ذریعے نکالا گیا۔ایٹن یاد کرتا ہے کہ بدو کچھ کہہ رہے تھے کہ کیمپ میں کچھ باقی نہ رہا۔

ایٹن نے جسے لیئر کی بے وفائی اور جیفرسن کے دھوکے سے تعبیر کیا اسے کبھی معاف نہ کر سکا ''عزت بے چینی محسوس کرتی اور انسانیت کا خون ہوتا ہے''۔اس نے اپنے کانگریس کے دوستوں سے شکایت کی حکومت کو باپ اور دوستوں کو قتل کرنے کا مجرم اور وطن سے بے وفائی کا مجرم اور ایک منظّم قزاقی کرنے والا کہا۔اس کے سخت غصے کے باوجود بہت سے کانگریس کے لوگوں نے اسے ایک ہیرو سمجھا اور اسے مشرق وسطی کے 16 ویں صدی کے جغرافیہ دان جس کا نام تھا Leo Africans اس کا نیا جیمز قرار دیا۔تم نے بے پناہ عزت کمائی اور مشرق میں اپنے ملک کا نام روشن کیا۔کموڈور Preble نے اس کی تعریف کی۔ پھر بھی اس کے گرم جوش حمایتی بھی مضطرب تھے جب وہ ایک بادشاہ کا جو تخت کا حقدار تھا تختہ الٹانے کا سوچنے یا انتہائی مہنگے امن کو خطرے میں ڈالنے کا سوچتے۔

حقیقت پسندی کی ایک ایسی ہی لہر نے جیفرسن کو اکسایا اس نے اپنا وہ مقصد پا لیا تھا۔ جس کے لیے اس نے بڑی کوشش کی اور وہ تھا ایک بحری قوت کی تشکیل جو بربروں کو روکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جان گیا کہ مشرق وسطی میں طاقت کا استعمال اخلاقی وعدوں سے بھی ہوا ہے قرمان علی (بادشاہ کا بھائی) شکست کھا گیا مگر آخر میں کچھ حاصل کیا۔ امریکہ نے مشرق وسطی میں ایک حکمران (لیبیا کے بادشاہ) کو شرمندہ کیا اور اس کی اہمیت اور تجارت کی آزادی سمیت کافی حاصل کیا مگر اسے بھی تاوان کی ادائیگی روکنا پڑی۔

امریکہ کی جیت کی اصل جیفرسن کے کانگریس سے دسمبر 1805 کے خطاب میں واضح ہوئی۔ اسے پالیسی بنانے میں کبھی مشکل کا شکار نہ ہوا۔ ایک دفعہ اس نے بحریہ کے 12 افسر بر طرف کیے اور نئے فریگیٹ Frigates بنانے کی مخالفت کی۔ اب وہی امریکہ کے بحری دفاع کو ماضی سے کہیں بڑھا رہا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ سمندری بندرگاہوں کا دفاع مضبوط کیا جائے گا اور راستے پر مسلسل پیٹرولنگ ہوگی۔

نئے کپتانوں کی بھرتی کے لیے ایک مہم چلائی جائے گی۔ اور 74 بڑی گن بوٹ کی تیاری شروع کر دی گئی یہ امریکی کے پہلے جنگی جہاز تھے جو اگلے محاز تک جا سکتے تھے۔

جیفرسن نے اپنا پلان بے نقاب کر دیا کہ کیسے ایک آپریشن کے ذریعے جو اس کے ملک کے لوگوں کا چھوٹا سا گروہ کرے گا جو ترپولی کے ساتھ معاہدہ پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے نتیجے میں امریکی قیدی آزاد کر دیے گئے اور اس کے تاجر خطرے سے آزاد ہو گئے۔ لیکن امریکہ کو پھر بھی بحیرہ روم پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ جیفرسن اس نتیجے پر پہنچا کہ بربر حکمران اب ہماری طرف سے دوستی اور امن کی قدر کر رہے ہیں۔ جیفرسن کے لفظوں کی خوب تعریف ہوئی پھر بھی کچھ نے محسوس کیا کہ شمالی افریقہ کی طرف سے مستقل امن کی اور تاوان کے لیے ادائیگیوں کو ختم کرنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ امریکی بحریہ کو جو کہ بڑھائی گئی ہے اور جسے نئی قوت ملی ہے اسے ایک بار بربروں سے لڑنا پڑے گا۔

بارود اور گولے:

22 جولائی 1807 کو فریگیٹ Chesapeak ورجینیا کے راستے نارفوک روانہ ہوا تھا کہ

بحیرہ روم میں امریکی اسکوارڈن سے مل سکے۔ ایک دفعہ خطے کے باہر کے پانیوں سے جہاز کو برطانیہ کے ایک ڈبل ڈیکر جہاز لیوپرڈ کا سامنا ہوا جس پر 50 گنیں تھیں۔ برطانیہ کے پاس نپولین سے جنگ کے سبب جہاز چلانے والوں کی کمی تھی۔ اس نے درست طور پر مطالبہ کیا کہ امریکی جہاز برطانیہ کے تنہا ہونے والے جہازوں کو تلاش کریں اور انہیں دوبارہ شاہی بحریہ میں (برطانیہ کی بحریہ میں) داخل کریں) لیوپرڈ اندر آ گیا۔ مگر امریکی کمانڈر جیمز بیرن جو کہ سیمول بیرن کا چھوٹا بھائی تھا وہ گرفتار ہو گیا۔ یہ جنگ بالکل یکطرفہ ثابت ہوئی۔ ان کے پاس اپنی توپوں کو چلانے والے فیوزوں کی کمی تھی امریکی صرف ایک طرف سے فائر کر سکے۔

یہ سب شمالی افریقہ کی کامیابیوں کے مختصر عرصہ بعد ہوا۔ چیس پیک کی شکست امریکی نیوی اا ور قوم کے فخر کے لیے زبردست ضرب تھی بیرن کو ایک کورٹ مارشل بورڈ نے غفلت کا مجرم قرار دیا اور اس میں ڈیوڈ پورٹر کو بھی شامل کر لیا اور ڈیکارٹر کو بھی۔ اس کے باوجود شرمندہ کرنے والی بات یہ تھی کہ نیوی بحیرہ روم کے اسکوارڈن کا سائز کم کرنے پر مجبوری تھی۔ تاکہ امریکی ساحلوں کا دفاع مضبوط ہو سکے اس کے باوجود کہ انھیں بربر قبائل پر حال ہی میں فتح ملی تھی۔ جیفرس نے خاموشی سے الجزائر کو اضافی رقم دینے کا کہا تاکہ وہاں اس امن کو یقینی بنایا جا سکے اور کہیں بھی یہ غیر یقینی تھا۔

الجزائر یقینی طور پر امریکہ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ فروری میں اس کے جہازے امریکی جہاز کو ڈبو دیا۔ اور اس کے 15 عملے کے ارکان قیدی بنا لیے۔ انہوں نے اس پر کئی فائر کیے۔ جیسا کہ ٹامس نکلسن بتایا ہے۔ جس کا تعلق نیوجرسی سے تھا کہ انہوں نے تلواریں ہاتھ میں لے کر ہمیں سوار کروایا اور شدید حملہ شروع کر دیا۔ ہمیں 48 گھنٹے خوراک کے بغیر بند کر دیا۔ ایک بار پھر امریکی گلیوں میں بھگائے گئے اس سے پہلے کہ انہیں نیلامی میں بیچا جاتا۔ جنہوں نے بھاگنے کی کوشش کی انہیں وہی سزائیں ملیں جو وہاں رائج تھیں۔ جبکہ انہوں نے بیمار لوگوں کو ننگا کر دیا اور پھر ایک چھڑی جس کی نوک پر لوہے کا مخروطی خول تھا کو کمر کے نچلے حصے سے داخل کیا اسے پشت تک لے آئے۔ یہاں تک کہ کاندھوں کے درمیان آ گئی۔ پھر انہوں نے اس کو ہوا میں اٹھایا اور بیچارہ بیمار دوسرے غلاموں کے سامنے شدید تکلیف میں دم توڑ گیا یہ نظارہ سب کو دکھایا گیا۔

امریکہ کی ان شدید واقعات کو جواب دینے کی قابلیت کو اس وقت سمجھا گیا جب 1812ء

میں اس کی برطانیہ سے جنگ ہوئی تین ماہ بعد الجرائر کے قزاقوں نے Edwin نامی جہاز بھی چھین لیا۔ جو کہ ایک ہلکی قسم کا جہاز تھا اور اس کے عملے کے 11 ارکان قیدی بنا لیے۔ میری پالیسی اور خیال یہ ہے کہ امریکی غلاموں کی تعداد بڑھائی جائے نہ کہ انہیں ختم کیا جائے۔ جیسا کہ علی پاشا نے کہا اور میں انہیں ایک ملین ڈالر لے کر بھی نہ چھوڑوں گا۔ الجرائر کا یہی رویہ بعد میں تریپولی میں اور پھر تونس میں نظر آیا۔ جنہوں نے امریکی تاجروں پر حملے جاری رکھے اور تاج برطانیہ کی وفاداری بھی۔

اگر امریکہ کے پاس پچاس جنگی جہاز تھے۔ لیکن اس کا سامنا اب 800 جہازوں والی رائل نیوی سے تھا جس کے ایک چوتھائی جہازوں سے براہ راست سامنا تھا اور ان سے بحیرہ روم میں امریکہ کا ایک جہاز بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کیا برطانیہ کے ساتھ ہمارے وسائل کا اتنا فرق ہونا چاہیے کہ ہم ایک بحری قوت سمندر میں بھیج سکیں۔ الجزائر والے اس سے بہت نرم پڑ جائیں گے۔

ٹوبائس لیئر نے پیشگوئی کی۔ لیکن برطانیہ امریکہ کو جنگ ختم کر کے اتنی رعایت نہیں دے گا اور جیمز میڈی سن کے پاس قزاقوں کو رشوت دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

تاوان ادا کرنا اب امریکیوں میں بہت غیر مقبول ہو چکا تھا۔ امریکیوں نے بہر حال اس کام کو انجام دینے کے لیے مورڈیکائی نوہ منتخب کیا۔ جو ایک غیر معمولی صلاحیت کا شخص تھا اور جرنلزم، ڈرامہ نگاری اور سیاست میں ماہر تھا اور عوامی شخصیات سے دوستی رکھتا تھا۔ وہ پرتگیزی یہودی کی نسل سے تھا اور یہودیوں کی شناخت اور حقوق کا زبردست دفاع کرتا تھا۔ اسی طرح وہ منفرد طور پر بربروں سے معاملہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان سے بھی جو یورپی بیک گراونڈ رکھتے تھے وہ بھی اسے اسلامی مشرق وسطی اور عیسائی یورپ کے درمیان بات چیت کروانے کے لیے اچھی صلاحیت رکھنے والا سمجھتے تھے۔ درحقیقت ایک اور یہودی کرنل ڈیوڈ فرانکس جارج واشنگٹن کے زاتی نمائندے کی حیثیت سے مراکش کے ساتھ 1786ء میں معاہدے کی بات چیت میں شامل تھا۔ میڈی سن نے اسی مثال کو سامنے رکھ کر مورڈیکائی کا نام تونس کے لیے تجویز کیا اور اسے 3000 ڈالر تک ہر قیدی کی رہائی کے لیے خرچ کا اختیار دیا۔ کونسل کو وضاحت کرنا پڑی کہ یہ رقم تمام قیدیوں کی فیملی کی طرف سے دی گئی تھی اور اس طرح وفاقی حکومت سے متعلق نہ تھی۔

1813ء میں جہاز پر مورڈیکائی مشرق وسطی کو روانہ ہوا اور ساتھ ہی الجرائر سے معاہدہ کر لیا۔ اس نے چھ امریکی قیدیوں کو رہائی دلائی مگر اس کی قیمت بہت زیادہ تھی جو 25910 ڈالر تھی۔ اس

خرچ سے مجبور ہو کر اور اس خوف سے کہ لوگ اس کے متعلق جان لیں گے میڈی سن نے کونسل کو واپس بلانے کے لیے کسی بہانے کی تلاش کی۔ یہ اچھا ہو گا کہ وجہ اس بنیاد پر ہو کہ ترک لوگ اس کے مذہب کے سخت خلاف ہیں۔ صدر نے جرات سے کہا اور یہ عوام کو پتہ چل گیا ہے کہ وہ یہودی ہے۔ اگرچہ تونس میں کسی نے ایسا نہ کہا تھا۔ لیکن پھر بھی مورڈیکائی کو واپس امریکہ آنا پڑا۔

میڈی سن نے امریکی یہودیوں کو مشرق وسطی میں ڈپلومیٹ نامزد کرنے کی روایت شروع کی۔ مگر یہ ابتدائی لبرل ازم شروع ہی میں اس وقت مشکل میں پڑ گیا جب تاوان ادا کرنے کی مسلسل صورتحال پیش آئی۔ یہی ناکامیاں اس بات کی ذمہ دار تھیں کہ امریکی قزاقوں کے سامنے تاجر تھے ان کے مطالبات کے سامنے اور ان کے بڑھتے خطرات کا طاقت سے جواب نہ دے سکے تھے۔ امریکہ طاقت مجتمع کرنے سے قاصر تھا۔ جبکہ برطانیہ سے دشمنی جاری تھی۔

1812ء میں جنگ نے امریکہ کی سیکورٹی کے لیے خطرہ پیدا کر دیا۔ برطانیہ نے قوم کا دارالحکومت بھی جلا دیا اور اس کی مشکل سے قائم ہونے والے اتحاد کو بھی ختم کر دیا۔ کیونکہ نیو انگلینڈ کے رہنے والے جنگ کے مخالف تھے اور علیحدگی کا سوچ رہے تھے۔ پھر بھی گراؤنڈ کمانڈر کی خاموشی کے باوجود جیسا کہ اینڈریو جیکسن نے اختیار کی وہ ایک ایسا رہنما تھا جسے امریکہ کے مشرق وسطی میں بحری قوت بہتر کر کے اور اس تجربے سے جو انھیں بربریوں سے لڑ کر ملا کی مدد سے اہم کردار ادا کرنا تھا ۔ امریکی جہازوں کے عملے نے برطانوی بحریہ کی چالیں برداشت کیں اور پھر کئی جہازوں پر قبضہ کر لیا اور کئی ڈبو دیے۔ لیکن الجرائر سے حساب ابھی باقی تھا۔ اگرچہ کرسمس کی شام کو سائین ہونے والے معاہدے جو 1314ء میں ہوا کی رو سے جنگ ختم ہو چکی تھی مگر عوام کا امریکہ میں مطالبہ تھا کہ قزاقوں کے خلاف سخت کروائی ہو اور یہ صدر پر منحصر تھا کہ وہ فیصلہ کرے کہ کب اور کیسے؟۔

جیمز میڈی سن نے آسانی سے فیصلہ نہ کیا۔ 64 سال کی عمر میں بھی وہ بوڑھا اور کمزور تھا اور دلائل پر نمو کرنے والا اور شرمیلا بھی اور اکثر اپنی کابینہ کے ساتھ مشکلات کا شکار بھی۔ اب اس کو بربروں کے خلاف کاروائی کے لیے عوامی دباؤ کا سامنا بھی تھا۔ اور وہ امن کے بعد اتنی جلدی ایک نئی جنگ شروع کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

تین ماہ گزر گئے تب وہ کانگریس گیا اور جلد ہی جنگ کی اجازت لے لی۔ تیز رفتار دستوں کے کمانڈر سٹیفن ڈیکاٹر نے جو ہدایات حاصل کیں۔ اس میں اسے کہا گیا کہ شمالی افریقہ کے

حکمرانوں کو سخت تباہی کا خوف مسلط کر کے ایک مستقل اور دیرپا امن کا حصول ممکن بناؤ۔

15 مئی کو سٹیفن ڈیکاٹر نیویارک روانہ ہوا۔ وہ دس جہازوں کے طاقتور اسکوارڈن کے ساتھ تھا اور 44 گن فریگیٹ بھی اس کے ساتھ تھا۔ جو حال ہی میں برطانیہ سے چھینے گئے تھے۔ ایک ماہ بعد Guerriere نے اسپین کی سرحد کے قریب الجزائر کے 40 گن والے فلیگ شپ کو جالیا۔ اس کے کپتان اور عملے کے 31 لوگوں کو بھی کو ماردیا پھر ڈیکاٹر کی فوج نے ایک اور مخالف BRIG کا پیچھا کیا جس کا نام اسٹیڈیو تھا۔ 500 قیدی آدمیوں کو قید کیا گیا۔ 7 امریکی بھی مارے گئے۔ جو ایک غلط فائر کا نشانہ بنے۔

28 جون کی صبح عمر پاشا جو الجزائر کا نیا حکمران تھا جاگا تو اس نے دیکھا کہ دس امریکی جنگی جہازوں نے کیسے اس کی بندرگاہ میں داخل ہو کر حملہ کیا۔ اس نے برطانیہ سے مدد مانگی اور یاد دلایا کہ برطانیہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ امریکیوں کا اگلی چھ ماہ میں سمندر سے صفایا ہو جائے گا اور اب لگ رہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ آپ کے جہازوں کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں۔ برطانیہ اب امریکہ سے جنگ کی حالت میں نہ تھا۔ اور اکیلا الجرائر خود کو امریکی بحری بیڑے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ اب الجزائر کے حکمران کے پاس کوئی صورت نہ تھی کہ وہ ڈیکاٹر کو نئے کونسل کے عہدے پر قبول کرے اور اس کے ساتھ ولیم شیلر کو بھی جو پرنسٹن سے تعلیم یافتہ اور سخت موقف والا مذکرات کار تھا اس کا کہنا تھا کہ اسلامیت پسندی کو تھوڑی ہدایت کی ضرورت ہے۔ اور شمالی افریقہ پر اس کے خیالات ایٹن سے ملتے تھے جو حیران تھا کہ اتنی طاقت کے باوجود بھی کمرشل دینا کا امن بربر حملوں سے مشکل میں رہا اور تاوان لیا گیا شیلر اور ڈیکاٹر نے سلطان کے جا کر وہی پیش کیا جسے انہوں نے لبرل ازم اور روشن خیالی سے آراستہ کر رکھا تھا اور اس سے توپکے زور پر منوایا گیا نہ صرف الجزائر اور کئی امریکی قیدی رہا کر دیے بلکہ عمر نے میڈی سن کو امریکہ کا بادشاہ کہتے ہوئے اسے اپیل کی اور اپنا اچھا دوست کہا۔ عیسائی بادشاہوں میں اہم ترین بڑی شان والا بادشاہ دوستانہ مزاج کا شخص مگر اس کی ساری نرمی بے کار گئی کیونکہ یہ امریکہ کی طے شدہ پالیسی تھی جو جنگ اور جنگی تاوان دینے سے اچھی ہے۔ صدر نے جواب دیا۔ امریکہ کسی ملک میں بھی جنگ نہیں چاہتا۔ مگر وہ کسی ملک سے امن خریدے گا بھی نہیں اسی جولائی میں مزید سامنے آیا جب محاذ پر موجود جہاز Independence نے خود کو الجزائر سے دور کر لیا ولیم بین برج نے اس کا حکم دیا کہ یہ شمالی اافریقہ میں امریکہ کے لیے

موجود رہے گا اور بحیرہ روم کے اسکواڈن کے لیے بنیاد کا کام دے گا۔ جو امریکہ کی پہلی سمندری قوت مستقل بنیاد پر ہوگی۔

اس وقت تک ڈیکاٹر نے تونس اور ترپیولی تک حرکت کی اور مطالبہ کیا کہ قبضہ میں لئے گئے جہازوں کا معاوضہ دیا جائے اور باقی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ دشمن کے 29 جہازوں کے جھنڈوں کے ساتھ فلیٹ واپس آ گیا ساتھ ہی ترپیولی کے 6 قیدی تھے۔ جن کو اس طرح پیش کیا گیا جیسے وہ حقیقی ترک ہوں۔ یہ کام نیویارک کے کئی تھیڑوں میں ہوا۔ اس طرح امریکہ اور شمالی افریقہ کی تین دہائیوں کی کوشش ختم ہوئی اور بربری قبائل سے تعلق رکھنے والے قراقوں کو جنہوں نے 25 جہاز اغوا کیے اور 700 امریکی قید کئے۔ ختم کر دیا گیا۔

پھر بھی سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا یہ کوشش درست ہے مالی لحاظ سے تو جواب واضح نہ تھا۔ 1802 سے 1805ء تک ترپیولی سے جنگ کی قیمت 3 میلن ڈالر تھی۔ جو اس رقم سے زیادہ تھی جو امریکہ نے اپنی سال کے دوران بربری قبائل سے تعلق رکھنے والے قزاقوں کو دی تھی۔ قراقوں کو رشوت دینا اتنا مہنگا نہیں جتنا مہنگی ان سے جنگ پڑی ہے۔ لیکن امریکہ نے جو حاصل کیا اس کی اصل قیمت بہت زیادہ تھی۔ جیفرسن کے اصول کے مطابق امریکہ نے مشرق وسطی میں آزاد اور سخت رویہ اپنا کر خود کو بلیک میل ہونے سے بچایا اور عالمی طور پر بہت عزت کمائی۔ اب ایک امریکی ہونا دینا بھر میں قابلِ فخر ہے۔

Nile نامی جریدہ جو بہت پڑھا جاتا تھا اس نے بہت ڈھول پیٹا کہ اگر الجزائر کے ساتھ ہونے والی جنگ سے یورپی کونسل پر کوئی اثر نہ ہوا تو پھر ہم اس جنگ کے معاملے میں بہت غلطی پر ہیں۔ یہ بات بے وزن نہ تھی۔ امریکہ کی اس مہم کے ایک کے سال بعد ہالینڈ اور برطانیہ کے ایک بیڑے نے Decure کی مثال پر عمل کرتے ہوئے الجزائر کو جھکانے کے لئے ضرب لگائی۔ اس زمانے کا ایک برطانوی ناراض ہوتا ہے یہ برداشت نہیں ہونا چاہے تھا کہ برطانیہ امریکہ کے رویہ پر نرمی کرے جس کی امریکہ نے منظوری دی اور الجزائر کو سزا دی۔

بربری جنگوں نے امریکہ کے متعلق یورپ کا نقطہ نظر کو بدل دیا۔ لیکن زیادہ فیصلہ کن طور پر فتح امریکہ کے اس تصور کو ملی جو وہ دینا چاہتے تھے۔ اس جنگ نے امریکہ کے تازہ ہوتے قومی فخر کے جذبات اور بڑھتی ہوئی شناخت کے جزبات کو یکجان کر دیا۔ حب الوطنی کے نشانات جیسے

جھنڈے بے بالوں کے عقاب اور انکل سام کے نشانات بڑھ گئے ہفت روزہ NILES نے اس قوت کی تعریف کی جو آزادی اپنے چاہنے والوں یا پرجوش علمبردار کو دیتی ہے اور جب یہ تشدد کے مخالف ہو تو یہ نا قابل شکست ہو جاتی ہے لوگ جو سوزنی راسن کے امریکہ کی اہمیت پر Slavesr in Algires اور The Siege Of Tripoli جیسے ڈرامے دیکھ رہے تھے اور جیمز الیسن جیسی فلمیں دیکھ رہے تھے جن میں امریکی بہادری کی داستانیں تھیں۔ وہ جوزف ہیمن نام کے شاعر کے لفظوں سے خوش تھے۔ جس نے اس طرح میں امریکی بہادری کی تعریف کی تھی۔

> بادشاہ کو جلد ہی پریشان ہونا پڑا جب اس کے دشمن کا اچانک حملہ ہوا۔ قلعوں کے اندر وہ آتے ہیں اور راستے بڑے اچھے طرح سے سلیوٹ کرتے ہیں۔ بارود اور گولیاں ہر کسی کو بغیر ہچکچاہٹ کے ساتھ دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عظیم ترک بادشاہ اس کا حق دار ہے۔

بربری جنگیں امریکہ کی فتح پر منتج ہوئیں۔ لیکن اس میں شامل کچھ اہم کرداروں کی فتح پر نہیں۔ سٹیفن ڈیکاٹر کو ابھی امریکہ جا کر ایک اور صورتحال کا سامنا تھا اور اسے یہ مثال گھڑنے پر شہرت ملی کہ میرا ملک ہے صحیح یا غلط، پانچ سال بعد اگرچہ جیمز بیرن کے ساتھ ایک لڑائی میں مارا گیا۔

ایٹن بھی شمالی افریقہ میں ملنے والے صدمے سے سنبھل نہ سکا اور اگرچہ اس کے تجربے نے اس کو امریکہ کی تعریف کرنے کے قابل بنایا۔ وہ ایک تلخ آدمی بن گیا۔ انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر آرن بر کے 1806ء میں غداری کے منصوبے میں شامل ہو کر لوزیانا کو فتح کرنے کی کوشش کی جسے نظر انداز کرتے ہوئے میسا چوسٹس کی قانون ساز اسمبلی نے جو کہ ہیروازم کو جاری رکھنے کی خواہش مند تھی ایٹن کو دس ہزار ایکڑ زمین کاشت کے لیے دی۔ جہاں وہ بے کار تنہا اور الٹی جیسی کیفیت سے لڑتا رہتا۔ اس نے 1810ء میں ایک قریبی فوجی دوست سے کہا کہ مجھے محاصرے میں لیا جا چکا ہے۔ اس کے مطابق موت کا فرشتہ اس کی جان لینے آچکا تھا اور وہ اگلے سال مر گیا۔

جیفرسن جو پاڈی پر اپنی زمینوں پر ڈیکاٹر کی شمالی افریقہ میں کامیابیوں کی خبریں اور بربری جنگوں کے خاتمے کی خبریں سن رہا تھا وہ اب بوڑھا ہو رہا تھا اپنے پرانے اور قریبی دوست سے رابطے بحال کرتے ہوئے جیفرسن نے امریکہ پر اپنے فخر کا لکھا۔ نیوی جسے وہ امریکہ کی لکڑی کی دیوار کہتا تھا اور اس کے بربر ریاستوں کو دوست رکھنے کے عزم کو اس کی تعمیر کا سخت مخالف اور اس

کے نقصانات کے باوجود نیوی نے مشرق وسطیٰ میں جن حالات کا سامنا کیا اس نے اسے دنیا کی اہم قوت بنا دیا۔

اسکواڈرن جیفرسن اور ایڈمز کی موت کے بعد سے جو کہ ایک ہی دن ہوئیں جولائی 1826 کو قوم کی پندرھویں سالگرہ تھی۔

امریکہ اپنے قیام کے نصف صدی کے بعد بھی خود پر انحصار کیے ہوئے تھا۔ اور اپنی حفاظت بھرپور طرح سے کرنے کے قابل تھا۔ قزاقی سے نجات امریکی تجارت میں اضافہ کا باعث ہوئی۔ بحیرہ روم کی بندرگاہوں میں آمد و رفت میں چار سوفی صد اضافہ ہوا 18201 کے دوران۔ اب امریکہ خطے کو 12 ملین ڈالر کی سالانہ امداد بھیجتا اور ترکی کی افیون کی فصل زیادہ تر خریدتا۔ امریکی عیسائیوں کے لیے کتنا افسوس کا مقام ہے۔ ایک امریکی عیسائی مشنری کہتا ہے جب وہ اناطولیہ آتا ہے۔ اپنے تاجروں کی دوراندیشی پر ماتم کرتا ہے کہ وہ اپنے زہر کے لیے مارکیٹ ڈھونڈ رہے ہیں۔ زیادہ امریکی واضح طور ایسے ارادے نہ رکھتے تھے۔ مگر اپنی حال میں ملنے والی قوت سے خوش تھے۔ 2 دسمبر 1823 کو کانگریس سے خطاب میں مونرو نے نئی دنیا میں بھی یورپ کی مداخلت روک دی۔ اس نظریے کی آواز قریبی سالوں میں دور تک سنی گئی تھی جبکہ بربری وار شروع ہوئی نہ تھی او امریکہ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے تیاری کر رہا تھا۔

خارجہ امور میں شاندار مہارت ہر حال ان تضادات کو نہ چھپا سکی جن کا امریکہ کو داخلی سطح پر سامنا تھا۔ اگرچہ ملک کی آبادی آزادی کے پچاس برسوں میں پانچ گنا سے بھی بڑھ گئی۔ جو کہ 11 ملین تھی اور پچاس برسوں میں پانچ گنا سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ جو کہ 11 ملین تھی اور جس کا پانچواں حصہ غلاموں پر مشتمل تھا۔ اگر بربری جنگیں امریکہ کو اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا چکی تھیں افریقی امریکی غلامی نے انہیں تقسیم کر دیا۔ لیکن بربری مہم سے یہ فیصلہ کن لڑائی بھی متاثر ہوئی اور شمالی افریقہ میں امریکی قیدیوں کے تجربات نے بھی اس پر اثر کیا۔

آزادی کے بعد کے عرصے میں کچھ واقعات امریکہ پر اتنے گہرے اثرات مرتب کر سکے جتنے اس کی مشرق وسطی سے جنگیں۔ ایک سخت خطرہ جو خطے سے تھا وہ یہ کہ مختلف علاقے مل کر اپنے وسائل اکھٹے کر کے امریکی ساحلوں سے دور ایک نیول فورس بناتے۔ قزاقوں کو کچھ فراہم کرنے کی بجائے ان سے لڑنا اور یورپین رویے سے علیحدہ ہونا ایسے واقعات تھے۔ جس سے امریکہ نے

قومی کردار متعین کرلیا تا کہ اس کے شہریوں کو ایسی ذلت کو دوبارہ برداشت نہ کرنا پڑے۔ جیسی بین برج کو 1800 میں ہوئی اور نہ ہی وہ اس کی طرح ہچکچاہٹ کا شکار ہو کر خود مختار امریکہ کے لفظ پر سوچنے لگیں۔

حال ہی میں کامیابی ملنے پر امریکیوں نے مشرق وسطی میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ شمالی افریقہ سے دور عرب، اناطولیہ اور عراق وشام اور زرخیز ہلال تک پہنچ گئے۔ ان کا مقصد سارے علاقے کو امریکہ کے نقطہ نظر کے مطابق کرنا تھا۔ رومانس کو چھوڑ کر بارود اور گولے سے الگ ہو کر ان جوان مرد وخواتین کا واحد مقصد تھا۔ کہ بائبل اور کتابوں سے اپنے خیالات لوگوں کے ذہن میں اتاریں اور اس کے لئے اسکول کے کمرے اور کلینک استعمال کریں۔

روشن اور آزاد ہوتی دنیا

بوسٹن کے پرانے ساؤتھ چرچ کی مخصوص کھڑکیوں سے لوگ چرچ کی کرسیاں اور رہنما بھی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس دن کا بڑا انتظار کیا۔ 31 اکتوبر 1819ء وہ قائل ہوئے کہ نیا دور شروع ہو گیا۔ شاید ایک نئی دنیا میں ان کی آہستہ آوازیں ایک شور میں شامل ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی اہم مذہبی رہنما آیا ہے۔ پھر بھی جب دروازے کھلے۔ نہ تو کوئی چرچ کا عہدیدار تھا اور نہ کوئی پادری تھا جو کہ ایک تنگ جگہ میں سے چلتا ہوا آیا بلکہ وہ (عیسائیت) کی تبلیغ کرنے والے تھے۔ جن کی عمر پچیس سال تھی۔ مجمع بالکل خاموش جب ان میں سے ایک نے جو چھوٹی کشادہ ناک اور عینک پہنتے ہوئے تھا وہ منبر پر چڑھ گیا۔ اس کا نام لیوی پارسن تھا۔ اس کا موضوع انجیل نہ تھی۔ اور نہ ہی اس نے عیسائی عقیدہ پر بات کی بلکہ اس کا موضوع یہودی تھے۔ جنھوں نے ہمیں نجات کا بتایا وہ یہودی تھے۔ پارسن نے شروع کیا۔ انہوں نے عقیدے کے ساتھ بائیبل کا تحفظ کیا۔ اس کے لیے کام کیا اور تکالیف اٹھائیں اور ہم جس مذہب کے ماننے والے ہیں اس کے دفاع کے لیے جانیں دیں۔ ہمارا خدا ان کا خدا تھا۔ ہماری خوشی ان کی خوشی تھی۔ سب سے اہم بات جو کہ پارسن نے کہی کہ یہودیوں نے دنیا کو نجات دہندہ (یسوع مسیح) دیا۔ (مسیح ایک اسرائیلی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ارشارہ اسی طرف تھا) ہاں بھائیوں وہ یہودی ہے پھر یہودیوں کے لیے اپنی احسان مندی دکھاتے ہوئے اس نے بڑی فراخ دلی سے نتیجہ نکالا کہ عیسائیوں کو ضرور کوشش کرنی

چاہیے کہ یہودیوں کو ان کے آباو اجداد کا گھر اور بائیبل کی زمیں واپس مل سکے۔ پارسن نے وضاحت کی کہ کیسے یہودی اٹھارہ صدیوں سے ایک سیاسی بے یقینی اور بے گھری اور آزادی کی کمی کا شکار رہے ہیں۔ اب اگرچہ وقت آگیا ہے کہ اس سب کو بدلا جائے۔ اعتراف کیا جائے کہ ہر یہودی کے دل میں اب اس زمین پر رہنے کی نا قابل شکست خواہش ہے۔ جو کہ اس کے آباؤ اجداد کو دی گئی۔ ایک خواہش جو عیسائی ہونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ فلسطین کا علاقہ ہے۔ کبھی بہت شان وشوکت رکھنے والا یہ علاقہ اب ایک آزاد ملک بھی نہیں ہے بلکہ ایک دور دراز کا صوبہ ہے۔ اس ترک علاقے میں رہنے والی ایک مختصر تعداد اس کے اصل وارثوں کی منتظر ہے۔ کہ وہ اسے دوبارہ حاصل کریں اور اس پر دوبارہ دعویٰ کریں۔ پھر اس نے کہا کہ سلطنت عثمانیہ کے فلسطین پر قبضے کو ختم کر دیا جائے تو کوئی معجزہ ہی یہودیوں کو فوراً واپسی سے روک سکتا ہے۔

پارسن یقیناً فتوحات کی وکالت نہیں کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ بربری جنگوں میں فتح کے بعد امریکہ اس پوزیشن میں نہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ سے ٹکر لے سکے۔ بلکہ اس کا ارادہ پرامن انداز سے آمادہ کرنے کا تھا۔ عیسائی مشنریز کو مشرق وسطیٰ کا دورہ کرنا تھا اور یروشلم کی مقدس دیواروں تک جانا تھا۔ اور انہیں وہاں پر ایسے اچھے کام کرنے تھے کہ یہودی بھی اپنے گھر واپسی پر سوچیں اور اس کا استقبال کریں۔ فلسطین میں مسیحی یہودی اجتماع حضرت عیسیٰ کی دوسری بار آمد کے لیے ضروری حالات پیدا کر دے۔ مسلمان اور بھٹکے ہوئے عیسائی بھی اس مقدس نور میں آرام کریں گے۔ روحانیت اور امن کی نئی صدی شروع ہو گی۔

اجتماع نے یہ خبریں کھلے عام توجہ سے سنیں اور یہ بات بہت بڑھ گئی جب دوسرا شخص تبلیغ کے لیے آیا۔ یہ پلنی فسک تھا۔ جو کہ قد میں اور لباس میں پارسن سے آگے تھا۔ مگر کم بات کرنے والا۔ اس نے یہی ارض مقدس میں حیران کن کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور "دیکھو میں یروشلم کو جانتا ہوں" اس نے اعلان کیا۔ لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

21 صدی کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے وہ لوگ جو ان کی تعریف کر رہے تھے انہیں ان کے عقیدے میں سخت گیر پائیں گے اور امریکی سوسائٹی کے لیے ایک طرف۔ یہ لڑائی کہ وہ اکیلے ہی یہودی اور مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کے لیے جو مشرق وسطیٰ میں رہتے ہیں کام کر سکتے ہیں یہ بات سننے والوں کو سچ لگتی تھی۔ اگرچہ آج امریکیوں کو یہ اہم نہ لگے (کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے)۔ آخر

ہم سب قدیم تہذیبوں کی اولاد ہیں اور بڑی عظیم روایات کے وارث ایک ایسا عقیدہ قبول کر رہے تھے جو ان نئے لوگوں کا تھا جو ایک پروٹسٹنٹ فرقے کی نمائندگی کرتے تھے۔ جس کی تاریخ صرف تین سو سال پرانی تھی اور ایک ملک جو صرف پچاس سال پرانا تھا۔

امریکیوں کے پاس جو کچھ تھا کم تھا۔ عیسائی کے نظریات اور ان کی تنظیمیں بہت زیادہ اثر رکھتی تھیں۔ جو کہ کلاس، تعلیم اور جنس کی تمام رکاوٹوں سے بالاتر تھیں۔ مشنریوں اور ان کی حمایت کرنے والوں میں کسان، تاجر، ڈاکٹر اور فنکار، کم پڑھے اور ملک کے بہترین کالجوں کے گریجویٹ، سب تھے۔ یہ لوگ امریکی آئیڈیل جسے انفرادیت، شہری خصوصیات اور حب الوطنی سے گہرے وابستہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو انقلابی روایتوں کا وارث سمجھتے تھے۔ اپنی جنوبی چرچوں میں پینتالیس سال پہلے مقامی امریکیوں کے لباس میں آزادی کے متوالوں نے برطانوی چائے بوسٹن کی بندرگاہ پر ضائع کی تھی۔

صلیبی جنگ کے لیے جذبوں سے بھرے جیسا کہ فسک اور پارسن نے تجویز کیا نہ صرف طویل عرصے سے آباد امریکیوں کو اپنی گرفت میں کر لیا بلکہ نئے آنے والوں کو بھی۔ یہ جوش بوسٹن تک نہ تھا اور نہ ہی نیو انگلینڈ کی بائبل بیلٹ تک (جیسا کہ کہا جاتا ہے)۔ اپنے سفر کے لیے دیہاتی علاقوں کا دورہ کر کے چندہ اکٹھا کرنے کی شروعات کرتے ہوئے مختلف اجتماعات نے دونوں کو خوش آمدید کہا۔

ان تمام گروہوں میں مشترک بات یہ تصور تھا کہ امریکہ کو دنیا کی مختلف قوموں کے لیے مثال بنانے کا کام ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ وہ اس بات کے لیے پرعزم تھے کہ انسانیت کو ایک اونچے اور بہتر طور پر زندہ رہنے کی جدوجہد کریں۔ ایک تاریخ دان ایلز برو نے فسک اور پارسنز اور ان کے ہزاروں مرد اور خواتین پیروکاروں کا لکھا کہ وہ غیر عیسائی دنیا کے سامنے ایک بہترین امریکہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مشنریوں کی منفرد خصوصیت ان کی ایمانداری (عام امریکی کی نسبت) اور ان کا اہمیت جتانا مشفقانہ انداز تھا۔ جس کا اثر نہ تھا۔ مگر پھر بھی اچھے ارادے سے بھرپور تھا۔

لیوی پارسنز اور پلینی فسک نے اس دوران واشنگٹن ڈی سی کا سفر کیا۔ جہاں پر ایڈمز نے انہیں وہ خط فراہم کیے جو کہ ان کی ایمانداری کے متعلق تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ دونوں مشنریز امریکہ سے مشرق وسطیٰ جانے والے مشنریز میں پہلے تھے۔ وہ اس زمین کی طرف جا رہے تھے

جس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہاں ہونے والے عظیم واقعات نے ہمیشہ سے تمام زمانوں اور قوموں کی منزل متعین کی ہے (فلسطین کی طرف جا رہے تھے)۔

جان لیڈیارڈ نے مصر کا سفر مہم جوئی کی تلاش میں کیا اور ولیم ایٹن اور اسٹیفن نے اپنے ملک کا دفاع شمالی افریقہ کے ملکوں سے کیا۔ فسک اور پارسنز کا مشرق وسطیٰ کا بحری راستے سفر کا واحد مقصد اپنے عقیدے کا پرچار تھا۔ اس کا اور اس کے ساتھی ہم وطنوں کا خیال تھا کہ مشرق وسطیٰ میں پروٹسٹنٹ عقیدے کو پھیلانا دنیا کے لیے اچھا ہے۔ امریکہ کے نئے لوگ اس خطے کے قدیم لوگوں کو تبدیلی مذہب کے لیے کیوں کوشش کر رہے تھے اور اس حوالے وہ پراعتماد کیوں تھے؟

نیا اوتار

اس کا جواب جاننے کے لیے دو سو سال پیچھے جانا ہوگا۔ جو کہ ان خیالات سے جڑتا ہے جن پر امریکہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ولیم بریڈ فورڈ نے اعلان کیا کہ آؤ اور صیہون کی زمین میں خدا کا کلام (بائبل) پھیلاؤ۔ یہ اس نے اس وقت کہا جب 1620 میں وہ Mayflower جہاز سے اترا۔ وہ اصل میں جرمیاہ کی کتاب سے یہ الفاظ نقل کر رہا تھا۔ لیکن صیہون اس کے لیے کنعان کی وہ سرزمین نہ تھا جو کہ (بائبل میں) وعدے کی سرزمین ہے۔ بلکہ اس کا نیا اوتار امریکہ۔ (امریکہ میں کچھ عیسائی شدت پسند فلسطین کی بجائے امریکہ کو ہی وعدے کی سرزمین قرار دیتے ہیں)۔ اس امریکہ کے باشندوں کو اس نے قدیم اسرائیلی قرار دیا۔ لیکن اس کے جو 101 لوگ تھے وہ سب اس کے فرقے کٹر کے لوگ تھے۔

بریڈ فورڈ کے الفاظ نہ صرف نئی دنیا کی دریافت پر اثر انداز ہوئے بلکہ ان الفاظ سے عہد نامہ قدیم پر پھر سے توجہ دی گئی (جبکہ عیسائی اس وقت صرف عہد نامہ جدید ہی کو پڑھتے تھے)۔ اصلاحات کا مطالبہ کرتے ہوئے برطانیہ کے لوگوں نے ان کتابوں تک رسائی حاصل کی جنہیں کیتھولک چرچ نے عرصہ ہوا ترک کر دیا تھا۔ جن میں بنی اسرائیل کے بادشاہوں کی تاریخ پر کتابیں تھیں۔ اس کا انداز تمثیلی تھا۔ انگلینڈ کی زمین بائبل کے بیانات کے لیے بہت موزوں تھی۔ اس تصادم کے اثرات بہت انقلاب پزیر تھے بائبل نے انگلش زبان کو مالا مال کر دیا اور اس کے روحانی نظریات نے پارلیمنٹ کو مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ انگلش لوگوں کی تعداد، چرچ

کے عہدیدار اور ارکان، سب کے سب عبرانی زبان کے ماہر تھے۔انہوں نے اپنے بچوں کو عیسائی بنایا اور ان کے نام اپنے عہدنامے میں موجود مقدس شخصیات کے نام پر رکھے۔

کٹر میں پرانے عہدنامے کی پیروی کرنے کا رجحان شدید تھا، جو کہ انگلینڈ کے ریفارمسٹ میں سب سے زیادہ سخت تھے۔ایک ایسے مذہب کی تلاش میں جس پر سیاست اور چرچ کا نظام کسی طرح اثر انداز نہ ہو اور پھر ان پر جو تشدد ہوا اس کے نتیجے میں بھی انہوں نے یہودیوں اور ان کے قدیم عقیدے کو یاد کیا۔ان کا خیال تھا کہ خدا جن چنے ہوئے بندوں (مراد یہودی ہیں۔ان کے عقیدے میں بھی یہودی خدا کے چنے ہوئے لوگ تھے) سے مخاطب ہوا اور ان سے وعدہ کیا اور انہیں قید سے رہائی دلائی۔ایک نیا اسرائیل جو کہ غلامی سے آزادی کی طرف ایک دوسرے سفر کی شروعات ہو۔جیسا کہ کٹر لوگوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اس وعدے کو پورا کرنے کے پابند ہیں۔ منتخب بندے (جیسا کہ یہودی خود کو کہتے اور کٹّر بھی ان کو سمجھتے) کی اصطلاح سے مجبور ہو کر انہوں نے انگلینڈ سے ہالینڈ کا سفر کیا اور وہاں سے پلائی متھ کی چٹان کا جو کہ ان کے لیے نجات کا دروازہ تھا۔

اپنی شناخت کو یہودی کی شناخت پر بنیاد رکھتے ہوئے کٹّر لوگوں نے پرانے کنعان (فلسطین) کا نقشہ نئے علاقہ سے جہاں وہ اب آباد ہوئے ہمیشہ اوپر رکھا۔"کسی ملک میں بائبل کی طرح جانی جانے والی مقدس دستاویز نہیں"۔جیسا کہ ایڈورڈ رابنسن کہتا ہے، جو کہ بائبل کی آرکیالوجی کا شروع کرنے والا تھا۔

مینار یروشلم، بیت اللحم اور وعدے کی سرزمین اب ابتدائی یادوں اور مقدس احساسات سے جڑ گئے۔مقدس زمین کے جغرافیہ سے زیادہ واقف نہ کہ اس کے اردگرد موجود علاقے سے واقف ہوتے ہوئے امریکیوں نے صحیفوں (بائبل) میں موجود مقدس ناموں پر جیسا کہ Shiloh، Salem اور Zion پر شمالی امریکہ کے ایک ہزار شہروں کے نام رکھے۔نئی دنیا کے کئی کالج جیسا کہ پرنسٹن میں بھی عبرانی پڑھنا لازمی تھا۔پرنسٹن سے ہی جیمز میوئی سن نے زبان میں مہارت حاصل کی اور yale اور Dartmouth اور Columbia جنہوں نے اپنی تحریروں میں عبرانی زبان کے لوگوز لگائے۔حتیٰ کہ مقامی امریکی جن کا آباد کار علاقے تھے بنی اسرائیل کے دس گمشدہ قبائل سے، ان کو بھی بائبل سے جوڑ لیا گیا۔چرچ کے عہدیدار سیموئل ویکمن نے 1685 میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یروشلم کو نیو انگلینڈ سے ملایا اور وہ (یہودی) تھے جن سے خدا نے وعدہ کیا۔بنجمن فرینکلن کے دادا

نے اسی خیال کو زیادہ پر اثر انداز سے کہا کہ تم نیو انگلینڈ میں ایسے ہو جیسے یہودی۔

اٹھارہویں صدی کے وسط تک نو آبادیاتی امریکہ نے یقینی طور پر اپنے مذہبی اثر رکھنے والے الیکشن کی مدد سے لوگوں میں تجدید نظریات کے حوالے سے جوش و جذبہ پیدا کیا۔نئے چرچ بنائے گئے، بپٹسٹ، میتھوڈسٹ اور پریسبائٹرین فرقہ کے نئے چرچ بنائے گئے۔جیسے کہ پرنسٹن اور ڈارمتھ نے اپنے نظریات پھیلانے کے لیے تعاون کی بنیاد ڈالی۔ Calvinist عقائد اب نظر انداز ہونے لگے اور اب ان کی جگہ نئے نظریات سامنے آئے۔جن سے امریکی اعتماد کا اظہار ہوتا تھا۔جو کہ انہیں فرد کی جنونیت پر تھا جس سے وہ اپنی قابلیت کی بنیاد پر خود کو بچانے کے لیے شدید قسم کی مذہبی عبادت کرتا تھا۔لیکن عیسائیوں کو نہ صرف اپنا تحفظ کرنا تھا بلکہ (جیسا کہ ان کا خیال تھا) دوسروں کو بھی روحانی طور پر نئے سرے سے پیدا کرتے ہوئے بچانا وہ ضروری سمجھتے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے اپنی قابلیت پر بھروسہ کرتے ہوئے بہت سے امریکی نئے ہزار سال کے منتظر تھے۔ایک سنہری زمانہ جب ہر قوم آزاد ہوگی۔جیسا کہ جوتھن ایڈورڈ نے پیش گوئی کی کہ ساری دنیا ایک معاشرہ ہوگی جو کہ سب کی سب یسوع مسیح پر ایمان رکھے گی۔اس واقعے کی بنیاد پروٹسٹنٹ امریکہ ہوگی۔جیسا کہ امریکہ کی بنیاد رکھنے والوں کا خیال تھا جبکہ وہ میتھیو نئے عہدنامہ کی ایک کتاب) سے "دنیا کی روشنی اور پہاڑی کے شہر" کا پڑھ کر بتا رہے تھے۔

آزادی کی جنگ کے دوران نئے اسرائیلی ہونے کے خیال نے خصوصی اہمیت حاصل کی۔ جس میں (برطانیہ کا بادشاہ) جارج III کو فرعون قرار دے دیا گیا اور اٹلانٹک کو ریڈ سی۔ہیملٹن جس نے عبرانی زبان پڑھنا اپنی جوانی میں سیکھا تھا۔امریکہ بطور منزل کے ایسے نہ تھا جیسا کہ یہودی قوم کے لیے۔ایک قوم جس کی تاریخ مکمل طور پر اس نوعیت کی تھی جسے کسی طرح عام انسانی کاموں سے ملایا نہیں جا سکتا (یعنی کہ یہ اہم قسم کے کارنامے تھے جن سے یہودی تاریخ بھری ہے اور عام طور پر یہ انسانی تاریخ میں کم نظر آتے ہیں) جیسے یہ کسی بڑے منصوبے کے اثرات ہوں علاقے پر سنائی پہاڑ پر آباد یہودی تین ملین تھے جو کہ آزادی کے وقت کی امریکی آبادی کے برابر تھے۔ہاورڈ کے سیموئل لینگڈن کہتے ہیں کہ بارہ اسرائیلی قبیلے تھے جبکہ امریکہ کی یونین میں تیرہ ریاستیں ہیں۔کنعان کا صحرا عبور کرتے ہوئے قبیلوں کی تصویر جیفرسن اور فرینکلن کے کہنے پر امریکہ کی مہر پر سجائی گئی۔امریکہ میں مذہب کے حوالے سے موجود جوش نئی ریاست کو چرچ سے

جدا کرنے سے نہیں روک سکا۔

ایک بیان جو سینٹ کی طرف سے متفقہ طور پر دیا گیا۔ عقیدہ اگرچہ امریکہ کے ہر حصے میں نفوذ کر چکا تھا۔ کانگریس کے لوگ، کابینہ کے ممبر اور حتیٰ کہ صدر بھی امریکہ کے اندر اور باہر مشنری کاموں کی اکثر وکالت کرتے۔

فرنٹیئر کی آزادیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اور ایک قومی چرچ کی حد تک ہی نہ رہنے والے پروٹسٹنٹ ازم نے امریکہ میں اپنے مختلف فرقے بنانے شروع کر دیئے۔ تاکہ اپنی روحانی تخلیقیت اور طاقت کے لیے نئی جگہیں دیکھ سکے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک مذہبی توانائی بہت بڑے پیمانے پر دوسری بیداری پر منتج ہوئی۔ جب یہ بنیادی باتوں اور جلد نجات کے عقیدہ کی طرف واپس گئی۔ کنکٹی کٹ کے ایک وزیر نے 1815 میں اعلان کیا کہ ہم اس دور میں داخل ہو گئے ہیں جو نئے ہزاریہ کی فوری تیاری ہے۔ اور یہ ایک ایسا دور ہوگا جس میں تمام جنگیں رک جائیں گی۔ ہر معاشرے کا اپنا چرچ ہوگا اور ہر خاندان روزانہ چرچ آئے گا۔ سب سے زیادہ زور یہودیوں کو عیسائی بنانے پر دیا گیا، تاکہ نئے اور پرانے اسرائیل کو ملایا جا سکے۔ مذہب تبدیل کروانے والے ادارے جیسا کہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے جو کہ یہودیوں میں ہو رہی تھی کے لیے سامنے آئے اور بڑے پیمانے پر تبدیلی مذہب کی توقعات بڑھیں۔ ایک مقبول پیش گوئی یہ تھی کہ خدا کی عبادت گاہ انسانوں کے درمیان قائم ہوگی۔ (جیسا کہ یہ بائبل میں ہے)۔ اور نیو انگلینڈ کے قصبوں اور دیہاتوں میں نوجوان اپنی پوری زندگی اس بات کو حقیقت میں بدلنے کے لیے کام کرنے کو تیار تھے۔

دوسری بیداری جو امریکہ پر کچھ مدت کے لیے آئی، جس نے نہ صرف ان کی روحانیت سے لطف اٹھایا بلکہ ان کے قومی فخر سے بھی۔ عیسائیوں کو حب الوطنی کو بڑے پیمانے پر سامنے لانا تھا۔ جیسا کہ فسک نے کہا آگ جلانے اور اس جوش اور جذبے کو بھڑکانے سے جو یسوع کے لئے مقدس ہو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ ملک سے محبت اور خدا کے لیے عقیدت کے اسی امتزاج نے الیکزس کو متاثر کیا جو امریکہ کا غیر معمولی خصوصیات رکھنے والا ایک شخص تھا۔ فرنچ شخص نے 1835 میں ایک تحریر لکھتے ہوئے نتیجہ نکالا کہ عیسائیت نے انسانی روح پر عظیم اثر ڈالا۔ اور یہ دنیا سے ہمیں زیادہ امریکہ میں ہوا۔ صرف امریکہ میں مذہب جمہوری اداروں اور انفرادی آزادی کے جذبے

سے جڑا ہوا ہے۔

حب الوطنی اور نیکی کے جذبے سے بھرے ہوئے بہت سے امریکی دنیا کی روحانی طور پر حفاظت جو کہ انجیل کے پڑھائے جانے اور سیاسی طور پر آزادی کے پھیلاؤ سے تھی، کے لیے تیار تھے۔ مشن کے پھیلاؤ کی خواہش امریکہ کے خارجہ تعلقات میں بھی نظر آتی تھی۔ جو کہ اس کی غیر ملکی قبضوں کے خلاف جنگ میں بڑا اہم وزن تھا اور اس کے لڑتے جھگڑتے لیڈروں کے لیے اکٹھا ہونے کا نقطہ۔ اپنے تمام روحانی اختلافات کے باوجود امریکہ کے بنیاد گزار امریکہ کے سیکولر شہری تصور سے متعلق اپنے عزم میں بالکل متفق تھے۔ جیفرسن کے لیے امریکہ ایک ایسی چیز تھا جو انسانوں کے لیے بہت قابل قدر تھی۔ ایک ملک جو کہ تمام قوموں کو ایک خوشی سے بھرپور باہمی آزاد مکالمے کے لیے اکٹھا کرے گا، اور Unitarion فرقے سے تعلق رکھنے والے ایڈمز کے لیے امریکہ دنیا سے لاعلمی کے خاتمے اور زمین کے بچاؤ کے ایک عظیم منصوبے کا خاکہ تھا۔

امریکہ کا دنیا کی بہتری کے عزم کا تصور جو کہ سیکولر اور مذہبی تھا۔ 1808ء میں ولیم کالج جو میساچوسٹس میں تھا نے واضح کیا جب پانچ طالبعلموں کو برقی طوفان نے گھیر لیا۔ ان کی واحد پناہ گاہ گھاس کا ڈھیر تھا۔ طالبعلم رہنما سیموئل مل نے بتایا کہ تُو اور میں بہت چھوٹے وجود ہیں۔ ہمیں اس پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس تباہ حال دنیا کے دور دراز کونوں تک اپنا اثر بڑھانا چاہیے وہ سب کے سب محفوظ رہے۔ بھیگے ہوئے مگر گوسپل کی تبلیغ کے جذبے سے سرشار۔ Haystack واقعہ جیسا کہ اسے بعد میں کہا گیا یہ دوسرے کالجوں تک بھی پھیل گیا۔ جلد ہی طالب علم اپنے مقامی چرچوں میں درخواست کر رہے تھے کہ سمندر پار مشنری کوششوں کو سپورٹ کیا جائے جو کہ اپنے سے بڑے لوگوں کو عمل پر آمادہ کر رہے تھے۔

بڑے لوگوں (چرچ کے لوگوں) کا جواب بہت تیز تھا۔ 1810 میں انہوں نے بیرونی مشنز کے لیے امریکن بورڈ آف کمشنرز قائم کیا، جو کہ مختلف فرقے سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں پر مشتمل تھا۔ جس میں صنعت کار، ڈاکٹر، بزنس مین، وکیل شامل تھے۔ بورڈ کو مشنری سنٹرز کی مدد کرنا تھا اور مشنری اسٹیشنز کو بھی۔ اور یہ کام ساری دنیا میں ہوتا جو کہ نان پروٹسٹنٹ تھے وہاں ہونا تھا۔ ''صرف محبت پر مبنی عیسائی عقیدہ ہی نئے ہزار سال مین (کے قریب) انسانوں کو قریب کر سکتا ہے۔ نئے ہزار سال جس میں دنیا سے غربت، ناانصافی اور تشدد کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا'' یہ بیان

بورڈ کے ایک بانی رکن سیموئل ہوچکن نے دیا۔

ان برائیوں کو سب سے پہلے امریکہ کے جنوب مغربی حصے سے ختم ہونا تھا۔ اور پھر افریقہ، انڈیا اور چین سے۔ لیکن تبلیغی کاموں کے تمام میدانوں میں بورڈ سب سے زیادہ پرجوش تو مشرق وسطیٰ کے متعلق تھا۔ یہاں ایک خطہ تھا جو اب ہی کسی یورپی طاقت کی طرف سے قبضہ کیا گیا تھا مگر جو تہذیبوں کے ملنے کی جگہ تھا۔ ایک خطہ جو مقدس ترین تھا۔ 1812 کی جنگ کے خاتمہ کا اعلان کرتی گھنٹیوں کو مڈل بری کالج میں سن کر لیوی پارسنز نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ یہ مشرقی قوموں کی پکار کو سنتا ہے جو چلا رہی ہیں تاکہ وہ نجات کے لیے خدا کی طرف آئیں۔ اس نے خوشی سے کہا کہ Zion ترقی کرے گا۔

اگر زیون سے مراد، جیسا کہ ولیم بریڈفورڈ نے کہا جو کہ ایک پادری تھا۔ امریکہ کی وعدہ کی گئی زمین تھی، تو لیوی پارسن کے لیے اس سے مراد پرانا اور اصل اسرائیل تھا، جو کہ اب فلسطین کہلاتا تھا۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں تبدیلی مذہب کے لیے کام کرتے مشنریز کو یقین تھا کہ ایک فوری کامیابی صرف فلسطین میں مل سکتی ہے۔ صرف یہی جگہ تھی جہاں پروٹسٹنٹ کی خواہش تھی کہ وہ روحانی دوستوں یعنی یہودیوں سے مل سکیں۔ ان کے خیال میں اس طرح ان کی مسیحؑ کی دوبارہ آمد کی تمنا پوری ہونے والی تھی۔

امریکہ کے پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگوں نے یہودیوں کے لیے جو دلچسپی دکھائی یہ ان کے ساتھ بڑے پیمانے پر ربط سے پیدا نہ ہوئی تھی۔ صرف چار ہزار یہودی امریکہ میں رہتے تھے، جو کہ کل آبادی کا 0.04 فیصد تھے۔ نہ ہی یہ ان کی یہودیوں سے ذاتی دوستی کی خواہش کا نتیجہ تھا۔ حتیٰ کہ کچھ ابتدائی پروٹسٹنٹ تحریریں اس قسم کے فقرے رکھتی تھیں جنہیں یہود مخالف کہا جا سکے۔ اگر آج کے لحاظ سے دیکھا جائے۔ اس میں ان کی یہودی لوگوں کو فوری طور پر عیسائی بنانے کی خواہش بھی شامل تھی۔ لیکن پھر بھی جو جذبات وہ ان کے لیے بطور اپنے ساتھ رہنے والے شہری ہونے کے حوالے سے رکھتے تھے۔ وہ اس گرمجوشی سے بہت دور تھے جو کہ Evangelist لوگوں نے یہودیوں کے متعلق ٹھہرائے تھے۔ جس میں ان کو عقیدے کے لحاظ سے کزن کہا گیا تھا اور نجات کے حوالے سے کام کرنے والے قرار دیا گیا۔ یہودیوں کو ان کے گھر واپس بھیجنے کا وعدہ (جو کہ بائبل میں کیا گیا، موجود تھا) کی تکمیل کی امید میں عیسائی دوبارہ سے یہودیوں کو بااختیار بنانے کی

کوششوں میں مصروف تھے۔ جیسا کہ وہ مسیحؑ کے وقت مین بااختیار تھے۔ اس طرح وہ مسیحؑ کی دوبارہ واپسی کے لیے کام کر رہے تھے (ان کا خیال تھا کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیے بغیر مسیحؑ کی دوبارہ واپسی نہ ہوگی)۔ یہ تجدید کا تصور تھا اور اس کے اثرات بہت اہم تھے۔ عیسائی عقیدے کی رو سے کہا جاتا تھا کہ یہودیوں کی طاقت سے محروم ہونے کی وجہ ان کی طرف سے مسیحؑ کو نہ ماننا تھا۔ لیکن اب Evangelist لوگ یہودیوں کی واپسی کو یسوح مسیحؑ کی زمین پر دوبارہ آمد سے پہلے لازمی سمجھ رہے تھے۔

''دوبارہ واپسی'' کا عقیدہ پروٹسٹنٹ ازم میں نہ نیا تھا اور نہ ہی امریکی پروٹسٹنٹ لوگوں میں ہی تھا۔ اس کی بات ہنری فنچ کی 1621 کی کتاب The World's Great Restoration اور ''The Calling of the Jews'' میں موجود ہے اور ملٹن کی نظموں میں بھی کی گئی ہے۔ یہ بات جون لکس کی فلاسفی میں بھی ہے۔ نئی دنیا سے Puriton یہ تصور ہالینڈ لے گئے، جہاں انہوں نے ہالینڈ کی حکومت سے درخواست کی کہ اسرائیلی لوگوں کو واپس بھیجا جائے۔ اس زمین پر جو وعدے کی سرزمین ہے۔ جس کا ان کے آباؤ اجداد کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ ان کو ہمیشہ ملے گی۔ نوآبادیاتی امریکہ کے مذہبی رہنماؤں نے جن میں جان کاٹن بھی تھا جو کہ میساچوٹس کا اہم مذہبی رہنما تھا، اور اس کے ساتھ میتھر تھا جو ہاورڈ کا پہلا صدر تھا۔ انہوں نے سلطنت عثمانیہ کی تباہی کا مطالبہ کیا تاکہ یہودیوں کی واپسی کا راستہ ہموار ہو سکے۔ دوسری بیداری تک یہودیوں کو یروشلم میں بسانے کا خواب بہت مقبول نظریہ تھا۔ ایذا اسٹائلز نے کہا بارہ قبیلوں کی وطن واپسی سے جو روحانی قوت پیدا ہوگی وہ ایک دنیا کی تبدیلی مذہب کے لیے کافی ہوگی۔ ایک اور نیوہیون تحریک کے رہنما نے، جس کا نام ڈیوڈ آسٹن تھا، اس نے پیش گوئی کو لفظی معنی میں لیا اور ساری عمر بندرگاہیں، ہوٹل اور گودام بنوانے میں گذار دی تاکہ یہودیوں کی روانگی کی تیاری کر سکے۔ میک فارلینڈ نے اعلان کیا کہ یہودیوں کی فلسطین واپسی کے ساتھ ہی مسیحؑ کی حکومت دوبارہ آ جائے گی۔ میک فارلینڈ میساچوسٹس کا ایک پریسبائیٹرین تھا جس نے 1808 میں Haystake واقعہ پر بیان دیا۔

ہمیشہ کے لیے دوبارہ واپسی کے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ عملی موجودگی کی سعی فکر کے بغیر تھی اور ہزاروں عرب جو فلسطین میں رہ رہے تھے ان کی سیاسی یا مذہبی خواہش ہرگز نہ تھی۔ امریکہ نے بھی مشرق وسطیٰ کے پہاڑی علاقوں پر توجہ مرکوز رکھی۔ نپولین کا مصر میں آنا اور بربری

قبائل سے تعلق رکھنے والے قزاقوں کی شکست۔ سب ہی فلسطین کی آزادی کی طرف قدم تھا۔

''ایک مرتبہ سلطنت عثمانیہ کو نکال دیا جائے جو کمزور ہو چکی ہے۔ یہودی تیزی سے صحراؤں کو پھولوں کی طرح کھلا دیں گے اور یروشلم پھر سے دنیا کے شہروں میں خوبصورتی، دولت اور بہترین ہونے کے لحاظ سے بے مثال ہوگا۔'' یہ قیاس 1816 کے ہفت روزہ Niles کے شمارے میں تھا۔ کانگریس کے براعظمی صدر ایلیاز بونڈ نیر جو کہ امریکن بائبل سوسائٹی کے صدر تھے، انہوں نے پیش گوئی کی کہ ''خدا کی عظیم طاقت یہودیوں کو جلاوطنی سے نجات دے گی اور وہ فلسطین ضرور جائیں گے۔ جو کہ ان کی محبوب سرزمین ہے۔ اس سے زیادہ مضبوط جذبہ سے جون ایڈمز نے تصور کیا ایک لاکھ اسرائیلی لوگوں کا۔ جو کہ فرانس کی فوج کی طرح تربیت یافتہ ہوں اور فلسطین کو فتح کرتے ہوئے اس میں داخل ہو جائیں۔'' میں یہودیوں کو یہودیہ میں (فلسطین کا ایک علاقہ) دوبارہ سے ایک قوم دیکھنا چاہتا ہوں۔ سابقہ صدر نے مورڈیکائی کو لکھا۔ جو تونس میں امریکی کونسل تھا۔ اسی سال فسک اور لیوی پارسنز بھی Sally Ann بحری جہاز پر سوار ہو کر مشرق کے لیے روانہ ہوئے۔

چھوٹی چھوٹی چیزیں:

انہوں نے وہی راستہ اختیار کیا جو امریکی تاجر بحیرہ روم میں اختیار کرتے تھے۔ اور چھ ہفتے کے بحری سفر کے بعد نیو انگلینڈ سے سمرنا پہنچ گئے۔ جو کہ ترکی کے ایجین ساحل پر تھا۔ کوئی مشکل سے ہی اس صدمے اور تنہا ہو جانے کی کیفیت کا سوچ سکتا ہے۔ جو ان مبلغوں کو ہوئی جب وہ مشرق وسطیٰ کے اس قدیم شہر میں داخل ہوئے۔ جو کہ ہومر کی جائے پیدائش بھی تھا۔ جیسا کہ فرض کیا جاتا ہے، ترتیب دیئے گئے اور اچھی طرح آراستہ بوسٹن جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے کے مقابلے میں سمرنا جسے ''مشرقی بحیرہ روم کا موتی'' کہا جاتا ہے۔ وہاں بے ترتیب گلیوں کا ہجوم۔ عجیب قسم کی بو اور ماحول سے مطابقت نہ رکھتا میوزک تھا۔ اس ملک میں اور امریکہ میں مشکل سے ہی کوئی چیز مشترک تھی۔ کہ انہیں ایک ہی دنیا کے قرار دیا جائے۔ ایک اسی دور کے امریکی نے دیکھا۔ پھر بھی یونانی عیسائی جو شہر کی آبادی کا نصف تھے، انہوں نے امریکیوں کو دوستانہ انداز میں خوش آمدید کہا۔ انہوں نے اگلے دو ماہ خود کو مقامی ماحول کے مطابق کرتے اور مقامی لہجوں اور روایات کا مطالعہ کرتے گزارے۔ سیموئیل بورڈ آف ڈائریکٹرز کا سیکریٹری تھا۔ اس حکم کے مطابق

فسک اور پارسنز نے 48 ڈالر مشرقی لباس پر اور 6.50 ڈالر عربی زبان کا سبق لینے پر خرچ کیے۔

1820 میں مارچ کے مہینے میں یہ دونوں 300 میل لمبے سفر پر ایشیائے کوچک سے روانہ ہوئے اور ان ساتوں شہروں کا سفر کیا جو کہ سینٹ پال نے اپنے سفر میں دیکھے تھے۔ اگرچہ وہاں چند یہودی ہی آباد تھے۔ اس علاقے میں آرتھوڈاکس یونانی عیسائی اور آرمینی بڑی تعداد میں تھے جو پروٹسٹنٹ کو روحانی طور پر بھٹکا ہوا سمجھتے اور دوبارہ پیدائش کے لیے تیار سمجھتے۔ وہاں مسلمان بھی تھے۔ چنانچہ امریکیوں نے بھٹکا ہوا سمجھا اور سوچا کہ ان کی بہتری کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے اور کس طرح'' ووسٹر نے دارالحکومت میں فسک اور پارسنز کو لکھا۔ وہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے بھی سوچ رہے تھے۔ جو فلسطین، مصر، شام اور ایران میں بھی تھے۔

ہاں فلسطین جو کہ عظیم واقعات کا علاقہ ہے۔ فلسطین ان کو ان کا بنیادی مقصد (یہودی آبادکاری) یاد دلاتا اور ان کے رکنے کے لیے سب سے پہلی جگہ کے طور پر قابل ترجیح تھا۔ پارسنز کو پہلے جانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ Zion میں روحانی فلاح (یہاں عیسائیت پھیلانا مراد ہے) کا کام کرنے کے لیے اجازت ایک بڑا اہم فائدہ تھی۔ اس نے اسرائیلی فوج کو لیڈ کرتے ہوئے روحانی کنعان آنے کا عزم کیا۔ اس کے پاس 5 ہزار مذہبی دستاویزات تھیں۔ چنانچہ یہ سفر ہلکا نہ تھا۔ اس میں نو زبانوں میں بائبل کا ترجمہ بھی شامل تھا۔ اپنے انگریز مشنری دوستوں سے پارسنز کو Polonius کی طرح نصیحت کی۔ ''اچھے لوگوں کی طرح جاؤ۔ صبح ورزش کرو۔ پہلے پھل کھاؤ، گرم لباس کو پہنو۔ پگڑی باندھو۔'' انہوں نے اس کو یہ نصیحت بھی کی کہ اس کو صرف ایسٹر اور Passover زیارتوں کے لیے سفر کرنا چاہیے۔ جب غیر ملکیوں پر فلسطین میں کم توجہ دی جاتی ہے۔

اگرچہ اس وقت میں فلسطین بہت دور بھی نہ تھا اور یہ ایک صوبہ بھی نہ تھا۔ فلسطین پر سلطنت عثمانیہ کی خصوصی توجہ تھی۔ اگر اس کی کوئی اور وجہ نہ تھی تو بھی یہ ضرور تھی کہ اس کا دنیا کے بڑے مذاہب میں خاص احترام تھا۔ انتظامیہ خصوصی طور پر یروشلم کے حوالے سے حساس تھی۔ جہاں پر تو مذہبی فرقوں کو بے حد خودمختاری تھی اور غیر ملکیوں کو رہنے کی اجازت نہ تھی نہ ہی حکومت اور نہ ہی انتظامی سربراہ ایک غیر ملکی کو دوستانہ سمجھ رہے تھے۔ جس کا تعلق ایک ایسے الگ عیسائی فرقے سے تھا جو ایک پرانے توازن کو بگاڑنا چاہتا تھا۔ ووسٹر کے الفاظ میں اس کو اس کا مقصد یاد دلایا گیا جو تھا کہ دنیا کی نیکی اور خوشی کی طرف واپسی کے لئے کام کرتا۔ پارسن دسمبر 1820 میں سمرنا کے باہر گیا۔

اور کئی ماہ بعد ٹھٹھرا ہوا اور تھکے پیروں سے مقدس شہر میں داخل ہوا۔

پارسن کا دعویٰ تھا کہ وہ پہلا امریکی شہری ہے جو کہ ان مقدس دیواروں تک جا سکا۔ باقی ملک کے برعکس جسے مغرب کے سیاح پسماندہ کہتے تھے حتیٰ کہ مشرق وسطیٰ کے دیگر کئی علاقوں کے مقابلے میں بھی یہ علاقہ کم آبادی والا اور بہت اچھی طرح سے انتظام رکھنے والا تھا۔ پارسنز نے جب یروشلم دیکھا تو حیران رہ گیا۔ زیتون کے پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اس نے مغرب میں پرانے شہر پر نظر ڈالی اس وقت جنوب مشرق میں بحیرہ مردار بھی دیکھا دینا میں بہتریں امکانات والی جگہ جہاں سے اہم اور مقدس ترین واقعات وابستہ ہیں۔ اس نے حیران کن طور مقامی گرجوں سے دوستانہ خوش آمدید حاصل کیا خاص طور پر لاطینیوں سے مگر اس کو شہر میں آباد دس ہزار یہودیوں میں سے کسی کو بھی عیسائی بنانے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے لئے سب سے پریشان کن تھا کہ اسلامی قوانین کے مطابق وہاں مزید چرچ نہ بن سکتے تھے اور کسی مسلمان کو تبدیلی مذہب پر آمادہ کرنے کے کام کی سزا موت تھی۔ اس وقت صرف یونانی اور آرمینی ہی سب سے بہترین امیدوار تھے۔ جن پر وہ کام کی سکتا تھا کیونکہ وہ برائے نام عیسائی تھے جیسا کہ مشریز انہیں طویل بددیانت عیسائیت کے پیروکار کہتے تھے۔ وہ ایک ایسے فرقے سے تعلق رکھتے جو عرصہ ہوا عیسائیت سے دور جا چکا تھا پارسنز کو امید تھی کہ مقامی لوگ ان کو مسلمانوں اور یہودیوں سے قریب لے جائیں اور وہ ان کو یسوع مسیح پر اپنا ایمان ظاہر کر کے متاثر کر سکیں۔ اس نے فسک کو 8 دن یروشلم میں گزار کر پیغام بھیجا کہ یہ دنیا کا مرکز ہے۔ ایٹن ابھی نہیں چھوڑا جانا چاہیے۔ دروازہ مکمل کھلا ہے۔

پارسنز اپنے ساتھی کے ساتھ 1821 میں واپس آ گیا۔ لیکن کرنا میں اس دوران صورتحال خراب ہو گئی۔ یونان میں جو پندرھویں صدی سے سلطنت عثمانیہ کے قبضے میں تھا۔ بغاوت ہو گئی اور باغیوں نے اناطولیہ کی یونانی آبادی کو بھی بھڑکا دیا۔ پرانی نفرت کو راستہ دیتے ہوئے ترک سپاہی اس علاقے سے جلاؤ گھیراؤ اور قتل عام کے بغیر کسی امتیاز کے کرتے گزر رے۔

دونوں مشنریز کو وہاں آئے USS نام کے جہاز میں پناہ لینا پڑی یہ کئی موقعوں میں پہلا موقع تھا۔ جب امریکی طاقت جو کہ مشرقی وسطیٰ میں تھے اس کے لیے کام کرنے والوں نے امریکہ کے نمائندوں کو بچایا۔ اگرچہ وہ محفوظ تھے۔ مگر پچس کی بیماری تھی۔ پھر بھی وہ پر امید تھا۔ اس امید سے کہ موجودہ سخت حالات سارے خطے کو عیسائیت کی طرف یا یسوع مسیح پر ایمان لانے کی

طرف لے آئیں گے۔ اس وقت تک امریکیوں نے اناطولیہ چھوڑ دیا اور نسبتا محفوظ جگہ اسکندریہ چلے گئے۔

پارسنز مشکل سے سفر برداشت کر سکا اور اسے ہلتی ہوئی کشتی کا سامنا تھا۔ 1822 کے سردیوں کے موسم میں فسک اپنے دوست کے بستر کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا اسے نصیحت کرتا اور اس کی صحت کی دعا کرتا رہا لیکن اس کی گئی دعائیں رائگاں ثابت ہوئیں۔ پارسنز نے شہادت حاصل کرنے کی اپنی تمنا کا اکثر ذکر کیا اور شہادت کی اس کی خواہش فروری میں پوری ہوئی۔ اس کی موت نے امریکن بورڈ کو ہلا دیا۔ ایک نوجوان مبلغ جو خود ایک پر جوش مشنری تھا اس نے ایک شاندار شعر کہا۔

پارسنز نے اپنے گیتوں سے جو روح جگائی وہ اپنے نہ جھکنے والے اور اوپر کی طرف پر پھیلاتی ہے۔ وہ جو اس کو پسند کرتا ہے وہ یہودی نسل سے محبت کرے گا۔

مشنری تحریک بالکل بھی بے دل نہ ہوئی اگرچہ نہ ہی فسک نہ کلنگ تھا اس نے مالٹا کا سفر کیا تا کہ پرنٹنگ پریس کا سامان بندرگاہ سے لے سکے اور پارسنز کی جگہ نئے آنے والے سے ملے۔ یہ پادری جونز کنگ تھا۔ جو مشرقی زبانوں کا استاد تھا اور کالج Amherst میں پڑھاتا تھا اور بہت باتونی تھا۔ جس نے مشن میں تین سال کام کیا تھا۔ دونوں باری باری انگلش شخص جوزف ولف سے ملے جو ربی کا بیٹا تھا اور چرچ آف انگلینڈ کا پیروکار بننے سے پہلے کیتھولک رہ چکا تھا اور آکسفورڈ کے ایک نواب کی بیٹی سے شادی کی، اپنے دماغ میں بے حوصلہ مت ہو۔ بائبل کی ہدایات پڑھو۔ جو کہ مشنریز کو ہدایات دیتی ہے کہ موت اور تاریکی میں روشنی اور زندگی دو، فسک، کلنگ اور ولف مصر پہنچے تا کہ وہاں سے فلسطین جائیں۔

نیل کے شروع سے چلتے تھیبس پہنچے انہوں نے 900 بائبل اور 3700 مذہبی تحریریں تقسیم کیں اور ہر اس مذہبی رہنما سے جو ان کو ملا چاہے وہ شیخ ہو یا ربی یا چرچ کا عہدیدار اس سے جھگڑے وہ ایک جلاوطن لبنانی حکمران بشیر سے ملے جو کہ میرونائٹ عیسائی فرقے کا تھا اس نے مذہب تبدیل کیا تھا وہ پہلے مسلمان تھا۔ جو یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ اس کے مہمان امریکی تھے۔ اس نے ہمیں سلام کیا۔ فسک بتاتا ہے اور ایک اظہار کرتی نظر سے دیکھا جو ہمارے قومی فخر کی تعریف کر رہی تھی۔ مشنریز کے ماضی سے بہت متاثر ہو کر ایک دروزی شہزادے نے انھیں لبنان

میں اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے امریکیوں نے ایک گائیڈ اور تیرہ اونٹ لیے تا کہ وادیٔ سینا کے پار جا سکیں وہ گاتے ہوئے گئے اور بحیرہ روم کے ساحل فلسطین میں جہاں پر ان کا سرد استقبال ہوا۔ جونز یاد کرتا ہے کہ عربوں نے بڑی تعداد میں ہم پر تلواریں۔ گن اور ہتھیار پھینکے اور اونچی آواز میں چلاتے ہوئے جنگ کا جشن جیسے شمالی امریکہ کے وحشی مناتے منایا۔ وہ سر میں زخم سے معمولی زخمی تھا۔ سارا گروپ بچ گیا۔ مگر اس نے زمینی خطرناک راستے سے یروشلم جانے کی بجائے ساحل کے ساتھ سفر جاری رکھا اور بیروت پہنچ گئے۔

یہ شہر اپنی آٹھ ہزار آبادی اور سفید عمارتوں کے ساتھ پہاڑوں سے جڑا تھا اور خلیج پر واقع تھا ۔ یہ یروشلم اور کرنا سے بھی بہتر انتظامی حالت میں تھا۔ اگر یہ ارض مقدس کے ساتھ تھا مگر فلسطین میں موجود سیاسی عدم استحکام کا اثر یہاں پر بھی تھا۔ یہ سمندر پر تھا۔ جو بھاگنے والوں کو مدد دیتا۔ برطانیہ کے سفیر بیروت میں موجود تھے۔ اور وہ اپنی حفاظت کو ان لوگوں تک بڑھانا چاہتے تے جو ان کا مذہب اور کلچر رکھتے مگر برطانیہ جیسے سامراجی مقاصد نہیں۔ مشنریز کے لیے سب سے زیادہ آمادہ کرنے والی بات شام کے پہاڑی ضلع میں بڑے پیمانے پر مشرقی عیسائی آبادی کی موجودگی تھی اور دروز اور یہودی آبادی بھی یہاں تھی۔ جب کلنگ امریکہ واپس چلا گیا۔ تو ولف نے پھر اپنا سفر جاری رکھا فسک بیروت میں آباد ہو گیا۔ اس نے علاقے کا پہلے ہی بہت سفر کیا تھا۔ اور عربی، یونانی میں ماہر ہو گیا تھا اور مشنری ووسٹر کے سوال کا جواب پالیا کہ ہم کیا بہتر کر سکتے ہیں اور کس طرح اگر ایک مشنری مشرق وسطیٰ کے لوگوں کو تبدیلی مذہب پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اسے ان کے بچوں کو تعلیم دینی چاہیے۔ انہیں امریکی طریقے پر لکھنا اور پڑھنا سکھانا چاہیے۔

فسک کو یقین تھا کہ وہ نو جوانوں کو آمادہ کر سکتا ہے کہ وہ عیسائیت اختیار کریں۔ اس اسکول مشرق وسطیٰ کو بدلنے کے ارادے سے قائم کیے گئے کئی اسکولوں میں پہلا تھا۔ جس کا دروازہ 1823 میں کھلا۔ اس سال امریکہ سے آئے آئیزک برڈ جو Yale کا گریجوایٹ تھا اور ولیم گوڈیل جو کہ ڈارمتھ سے تھا کی صورت میں نئی مدد آئی۔ وہ دونوں اپنی بیویوں کو بھی لائے تھے۔ Bird اور Grodell نے فسک کو اسکول چلانے میں مدد دی اور تبلیغی مہموں میں جو مشرق وسطیٰ کے شہروں میں چل رہی تھیں۔ جو دمشق میں جاری تھیں اس کی مدد کی۔

بوسٹن میں جشن منانے کی واحد وجہ رجعت پسندی کی طرف سے دلائی جانے والی توقع ہی

تھی۔ امریکن بورڈ نے اعلان کیا کہ اسے انجیل کی تبلیغ میں بڑی کامیابی ملی ہے اور اس نے دروز، میرونائٹ، شام کے لوگوں اور یونانیوں تک رسائی حاصل کر لی ہے اور دنیا کے دلچسپ حصے میں ایک مرکز بنالیا۔ سچائی اور راست بازی کا معیار قائم کیا گیا۔ جسے اب مستقل طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ سیرینوڈ اوائٹ جو قابل ذکر سوانح نگار ہے، جو امریکہ کا سینٹ کا پادری ہے اس دن کو دیکھنا چاہتا تھا جب عیسائی مبلغ کتابوں سے لدے پھندے مسلمانوں کے ان علاقوں کا رخ کریں گے جہاں جہالت تھی اور مصر، سعودی عرب اور فارس میں بھوک، غربت اور جہالت ختم ہو جائے گی۔

سچ تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو مبارکبادیں دینا ناجائز تھا، ان تھک کوششوں کے باوجود عیسائی مشنری بہت کم مشرقی لوگوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں سے اکثر لوگ مفلس اور کنگال تھے۔ ان کے پاس سوائے چرچ کی طرف سے دی گئی ملازمت کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ لبنان میں امریکی سرگرمیوں کی مخالفت میرونائٹ عیسائیوں کی طرف سے ہوئی۔ جو کیتھولک فرقہ تھا اور ان کا تعلق فرانس سے تھا۔ جو اپنی طرز کے سکول چلا رہے تھے۔ خدا کی تعلیمات، عورتوں کو پڑھانا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے، ایک صدر راہب نے کہا، عورتیں جو ابھی تھوڑا بہت جانتی ہیں اس کی بنا پر کافی خراب ہیں۔ انہیں لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو پھر ان کے ساتھ رہنا محال ہوگا۔ آرچ بشپ نے دھمکی دی کہ جن میرونائٹ عیسائی نے پروٹسٹنٹ عبادات میں شمولیت کی اس کو دین بدر کر دیں۔ اور تمام عیسائی مطبوعات بشمول بائبل کے تباہ کر دیں۔

مشرق وسطیٰ میں رکاوٹیں بہت زیادہ حائل تھیں۔ مشنریز، کسی بھی مقامی باشندے سے بغیر اعتماد کے بات نہیں کرتے ہیں۔ اس بات کو Yale کے تازہ گریجویٹ گرڈل نے سمرنا میں 1825 میں پہنچ کر تسلیم کیا۔ بمشکل دس آدمی، گوسپل کی تبلیغ سننے کی اداکاری کرتے ہیں۔ ایلی سمتھ جو بہت لائق اور قابل ماہر لسانیات تھا، جس نے عربی رسم الخط کا اعادہ کیا۔ اور امریکن بورڈ کی خاطر خطے کا دورہ کیا۔ اس نے خطے کی مایوس کن لیکن سچی تصویر کشی کی۔ اس نے ماتم کرتے ہوئے کہا، یہ اندھیروں کی زمین، موت کے سائے کی زمین، جہالت اور بے وقوفی کی سرزمین ہے۔ سمتھ نے مصر کے ایک واقعے کو دوبارہ بیان کیا، جس میں ایک مسلمان مرد اور اس کی بیوی شامل تھے، جو حال میں عیسائیت قبول کر چکے تھے۔

اس قسم کا واقعہ یروشلم میں فسک کے ساتھ بھی ہوا۔ اسے 1825 میں مذہبی مواد تقسیم کرتے

ہوئے گرفتار کر لیا گیا اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر تشدد کیا گیا۔ اس کی رہائی برطانوی سفیر کی ذاتی درخواست پر عمل میں آئی۔ اس قسم کی پریشانی دیکھ کر، فسک حیران تھا۔ کیا یسوع مسیح کبھی خود ان پر غالب ہوں گے؟

اس بار فسک بیماری زدہ، تھکا ہوا اور اخلاقی طور پر تباہ شدہ تھا۔ اس کے سکول کے طلبا جو زیادہ تر یہودی تھے، نیوٹسٹامنٹ کاغذ کے لیے بیچ چکے تھے۔ اور عیسائیت قبول کرنے والوں میں ایک طالب علم اسد الشدیاک کو مرتد ہونے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا تھا اور اسے مرنے کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں اور یہودیوں سے ڈر خوف کی وجہ سے اس نے بورڈ کی طرف سے بھی خود کو شکار ہوتے محسوس کیا۔ بورڈ نے اس پر گریک بشپ کی دوستی کو کم اہمیت دینے کے لیے اپنی رپورٹس بدلنے کا الزام لگایا۔ اس نے اپنی ان مشکلات کو بھی بہت کم بتایا جو اس نے یہودیوں کو عیسائیت قبول کرانے میں برداشت کیں۔

اکتوبر 1825 میں وہ گھر روانہ ہوا۔ اس نے آخری بار نزارتھ کا چکر لگایا۔ لیکن راستہ لٹیروں اور راہزنوں کی وجہ سے برباد ہو چکا تھا۔ فسک کو بیروت واپس آنا پڑا جہاں اس کا علاج جونکوں سے کیا گیا لیکن وہ شدید دردناک موت مر گیا۔

اگر کوئی شخص بائبل لینڈز میں عیسائی کارکنوں کے جانے پہچانے ناموں سے عبرانی کی کتاب لکھے تو ان ناموں میں فسک اور لیوی پارسن کے نام بھی ہونا چاہئیں۔ یہ بات ایک نامعلوم مذہبی آدمی نے کہی تھی۔

طبی علم حاصل کرتے طلبا اور میرونائٹ عیسائیوں کی مخالفت کے باوجود فسک کا قائم کردہ سکول نہ صرف کامیاب ہوا بلکہ ترقی بھی کرنے لگا۔ 1820 کے آخر تک اس سکول کی 9 شاخیں کام کر رہی تھی جن میں چھ سو طلبا علم حاصل کر رہے تھے اور ہر چھ طلبا میں ایک لڑکی تھی۔

بیروت مرکز نے بورڈ کو یقین دلایا کہ ہم کسی قسم کے مالی فائدے میں نہیں الجھیں گے۔ اس اعتماد کی وجہ سے ہمت کرتے ہوئے، بورڈ نے لبنان میں مزید مشنری بھیج دیئے۔ اور یہاں سے پورے خطے میں بھیج دیئے۔ ووسٹر نے ایک بار فسک اور پارسن کو خبردار کیا تھا کہ ان ننھے بچوں کو کبھی نفرت سے نہ دیکھنا۔ بظاہر بہت چھوٹی چیزیں ہیں لیکن ایک دن امریکی عقیدے کے تعارف کے لیے مشرق وسطیٰ میں نئے باب وا کریں گے۔

اگلی دہائیاں امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے لیے محور کا کام کریں گی۔ عثمانی سلطنت کی بڑھتی ہوئی کمزوری اور مقامی رہنماؤں کی آزادی کے لیے جدوجہد اور بڑی طاقتوں کا تسلط سے آزاد علاقوں کو اپنانے کی کوشش سے مشرق وسطیٰ میں بہت قتل و غارت ہو گی۔ اس دوران میں امریکی آبادکار، کیلی فورنیا اور اوریگان میں جنوب میں فلوریڈا اور ٹیکساس کی جانب آباد ہو سکتے تھے۔

یونین کے نئے تشکیل کردہ آزاد علاقوں نے جن میں کچھ غلام اور کچھ آزاد بھی تھے، سوال اٹھایا کہ آیا یہ علاقے عام سیاسی نظام کے تابع رہیں گے یا امریکہ مستقل ٹھکانہ رہے گا۔

امریکہ کے پھیلاؤ اور مشرق وسطیٰ میں انتشار ایک نئے اور گہرے تعلق کو استوار کر سکتا تھا۔ نئی نئی ٹیکنالوجی اور سفر کے انقلاب ذرائع سے ہزاروں امریکی مشرق وسطیٰ کا سفر کر سکتے تھے اور کئی علاقے جہاں تک رسائی مشکل ہو وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔ ان خطوں کے لوگ آنیوالوں کو خوش آمدید کہتے اور انہیں کاروباری، تعلیمی اور جنگی معاملات میں شامل کرتے۔

اس مرکز گریز تعلق میں امریکہ اور مشرق وسطیٰ کی بات چیت میں وہ باتیں جو سرے سے غائب تھیں جیسے طاقت، عقیدہ اور طلسم، یہ مہم جوؤں کے بجائے طاقت حاصل کرنے والے ولیم ایٹن اور فسک جیسے تبلیغی افسر سیاحوں، مشنری ملاحوں اور تاجروں اور عیسائیوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی نسل سے ملتے۔ امریکہ کے پالیسی میکرز پہلی بار اس بات پر زور دیتے کہ جنگی اور تجارتی مفادات میں سے کسی ایک کا چناؤ کریں اور اپنے اخلاقی اور روحانی نصب العین کی مشرق وسطیٰ میں تلاش کریں۔

حصہ دوم

مشرقِ وسطیٰ اور جنگ سے قبل امریکہ

ملاپ اور تصادم

جون 1821 میں آگ برساتے سورج کے نیچے نیل کے کنارے ایک مصری افسر ستانے اور نیل سے پانی پینے کو رکا۔ وہ گزشتہ نو ماہ سے سفر کی مشکلات جھیلتا آیا تھا، اسلحے سے لدی کشتیوں میں وہ اور اس کے سپاہی ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھ رہے تھے، ان کا مقصد اندرونِ افریقہ میں مصری تجارت کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنا اور راہزنوں سے راستوں کو پاک کرنا تھا اور مصری حکمران محمد علی کے اثر کو بڑھانا تھا۔ مصری افسر کے بارے میں، جو خود کو محمد آفندی کہتا تھا، اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ایک دبلا پتلا اور پیلی رنگت کا نفیس شخص تھا جو رنگت اور خدوخال کے سبب مشرقِ وسطی کا نہیں لگتا مگر اپنے چہرے پر مخصوص ترکی سکون لئے وہ اپنے ہاتھوں میں نیل کا پانی بھر کے اپنے ہونٹوں تک لاتا اور گھونٹ لینے سے پہلے عظیم، آزاد ریاست ہائے متحدہ کی ترقی کے لئے دعا کرتا تھا۔

محمد آفندی چونتیس سال پہلے میساچوسٹس میں پیدا ہوا جہاں اسے عیسائی نام جارج بیتھون دیا گیا سن 1870 میں ہاورڈ کے رکن کی حیثیت سے اس نے ابتداء قانون کی تعلیم سے کی مگر بعد میں وہ روحانیت اور عبرانی کی طرف چلا گیا۔ اس نے بھی پارسنز، فسک اور دیگر کی طرح توریت کی پہلی پانچ کتابیں اس وقت پڑھیں جب انگریزوں میں یہودیوں کے لئے گہرا احترام اور عیسائیوں کے ان سے کئے جانے والی شیطانیت اور غیر انسانی سلوک کی تلافی کا احساس بیدار ہو چکا تھا۔ وہ محض نجات تلاش کرنے لئے بہت آگے چلا گیا تھا اور اس نے تاریخی اور منطقی شواہد کی بنیاد پر انجیل کی جامعیت پر شک کیا تھا اور اس لئے اس نے سن 1688 میں کیا گیا قرآن کا اطالوی

ترجمہ بھی پڑھ ڈالا۔ وہ اس نتیجہ پر پہچا کہ مصطفوی، جو اس وقت تعداد میں سب سے زیادہ ہیں بائبل کے اور اس کے انبیاء کے زیادہ بہتر داعی ہیں اور موسی کی شریعت کے تحت بت پرستی کے بہتر مخالف بھی۔ عیسائیت کے تینوں ادوار میں مردہ پرستی اور فرشتوں کی عبادت عام رہی ہے۔ ہاورڈ کے ولیم کینگ اور ایڈورڈ ایورٹ نے جو بعد میں وزیر، اور سٹیٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے، اس خلافِ شرع بدعت کا جواب دیا اور اس نے کیمبرج کو کچھ نیا کھوجنے کے لئے خیر باد کہہ دیا۔

وہ مغرب کی طرف بڑھا جس کا مطلب اس وقت اوہائیو تھا جہاں پہلے اس نے صحافت میں قسمت آزمائی اور آخر کار Wabash کے دریا کنارے Harmonie کے فرقے سے منسلک ہو گیا جہاں سے وہ سن ۱۸۱۷ میں اکتا کر واشنگٹن آ گیا جہاں اس نے ایک پرنے خاندانی دوست جون ایڈم کوئنسی سے رابطہ کیا جو اس وقت سٹیٹ سکریٹری بنا تھا، اس نے انگلش کو Mediterranean Squadron میں لفٹننٹ بنا دیا مگر وہ جلد اس سے بھی اکتا گیا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی سو مصر آتے ہی اس نے استعفی دے دیا۔

مشرقِ وسطی نے اسے وہ سب کچھ دکھایا جس کی وہ کمی محسوس کرتا تھا یہاں نرالا پن بھی تھا، مہم جوئی بھی، اور وہ مذہب بھی جس سے وہ اسکول کے دنوں میں متاثر ہوا تھا۔ واپس جانے کی بجائے وہ مصر میں ہی رکا، اسلام قبول کیا، اور اپنا نام محمد رکھ لیا۔

ہاورڈ سے سینار تک:

بدعت کی حد تک تک آزاد ذہن کا مالک محمد عام امریکیوں سے مختلف تھا مگر مشرقِ وسطی کے بارے میں اس نے بھی جون ایڈورڈ، لیوی پارسن اور ولیم ایٹن جیسے کردار کا مظاہرہ کیا۔

1820ء تک وہ عربی اور ترکی دونوں زبانوں مین مہارت حاصل کر چکا تھا اور اب مصر کی خدمت کے لئے بالکل تیار تھا۔ برطانوی اثر ورسوخ کی بنا پر اس نے اسماعیل پاشا جو کہ محمد علی کا بیٹا تھا سے ایک انٹرویو کی اجازت حاصل کی۔ محمد علی اس انگریز کے مختلف تجربات سے متاثر ہوا اور سب سے زیادہ ملٹری میں اس کے تھوڑا عرصہ گزارنے پر، مصر اس وقت اپنی عسکری صلاحیتوں میں جدت اور ترقی لا رہا تھا اور یورپی مشیروں کی اسے سخت ضرورت تھی۔ ریاست ہائے متحدہ کی بری

فوج میں تو وہ لیفٹننٹ کے عہدے سے آگے نہیں بڑھا تھا مگر اسماعیل سے ملاقات کے بعد وہ ایک مصری کمانڈر بن گیا تھا جس کے ذمہ ان کا اسلحہ تھا۔

مصر کی عسکری قوت کو بڑھانا اور ترقی دینا اسماعیل کا اصل مقصد تھا مگر انگلش اپنی رومانوی طبیعت کے سبب ایسا کرنے کے لئے موزوں شخص نہیں تھا اس نے اسلحہ کو جدت دینے کی بجائے پرانی طرز کی مصری گھوڑا گاڑی کو جو قدیم مصر مین جنگ کے دوران استعمال ہوا کرتی تھی دوبارہ لانے کی کوشش کی، یہ تجربہ ناکام رہا اور اس سے پہلے کہ وہ ایسا کچھ اور کرتا اسے سوڈانی باغیوں کے خلاف نبرد آزما کر دیا گیا۔ اسماعیل اور محافظ زمینی راستے سے جبکہ انگلش سپاہیوں کے ہمراہ نیل کے پانیوں میں آگے بڑھا۔ ستمبر 1821 میں انگلش اور اسکے چھ ہزار فوجیوں نے جن میں ترک بھی تھے اور شمالی افریقی بھی وادی حلفہ پر اپنی کشتیاں روکیں اور وہ ان زمینوں پر اترے جو مصریوں کے لئے نئی اور مغربیوں کے لئے بالکل اجنبی تھیں۔

سومیل کا یہ سفر بے حد کٹھن ثابت ہوا انگلش نے بتایا کہ جونہی کشتی سفید جھاگ میں ایک یارڈ آگے بڑھی ملاح نے اپنی پگڑی سر سے اتار کر چلانا شروع کر دیا کہ ہم کھو گئے ہیں اور باقی سب نے خدا کو مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا، بہت مشکل سے وہ وہاں سے نکل پائے، آشوبِ چشم کے سبب وہ کئی دن تک کچھ نہیں دیکھ پایا مگر کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب رہا، سفید نیل کے گہرے پانیوں میں نکلتے وقت اس کے ساتھ بس ایک ہی کشتی تھی۔

ایٹن کے طرح پندرہ سال بعد انگلش مشرقِ وسطی کی وسعتوں کے اپنا قافلہ لے کر روانہ ہوا اور جون لیڈیارڈ کے طرح وہاں جو کچھ دیکھا اس کو وضاحت سے بیان کیا۔ وہاں کے دیہات، غلاموں کی مشکلات، ڈاکوؤں کا غضب، اس بیس سالہ لڑکے کی اذیت جس کے ابھی ابھی ختنہ کئے گئے، اور اس کے لئے سب سے دلچسپ وہاں کے کھنڈرات جو دریا کے کنارے تھے، وہ اکثر راتوں مین ان کا دورہ کیا کرتا اس نے کہا کہ نیل کا سفر انسانی تاریخ کالبِ لباب کسی کے آگے پیش کرنے جیسا ہے جس میں وہ قدم قدم پر مجسمے اور کھنڈرات دیکھتا چلا جائے۔

سمندر سے وہ اپنے سپاہیوں کو لے کر اس علاقے تک پہنچا جسے ابھی ابھی اسماعیل کے گھڑ سواروں نے تباہ و برباد کیا تھا، اسے مصری سپاہیوں کا رویہ گراں گزرا جو لوٹ مار کرتے گزر رہے تھے، وہ خوف کے عالم میں ان چالیس سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا جو ایک چھ یا آٹھ انچ کی لکڑی بار بار

کچھ باغیوں کے جسم میں داخل کر رہے تھے۔، سنار میں اس سے بھی زیادہ ہولناک منظر اس کے منتظر تھے۔ یہ وہی شہر تھا جہاں تیس سال پہلے لیڈیارڈ نے پہنچنے کی کوشش کی تھی، اس شہر کے بارے میں اس کی تمام تر خوش گمانیاں خاک میں مل گئیں جب اس نے وہاں سبز جھونپڑوں میں آباد ان لوگوں کو دیکھا جو بلی، چوہے کھاتے تھے اور عورتیں، اس کے مطابق اس دنیا کی بدصورت ترین عورتیں تھیں۔

انگلش خود آدھا بھوک کا مارا اور چیتھڑوں میں بمشکل اپنی بہتر شکل قائم رکھنے میں کامیاب ہو پایا۔ اس سفر کو کامیاب سمجھا گیا اور سوڈان میں اور آگے تک جاری رکھا گیا، اسکندریہ آ کر انگلشکی جان پہچان ایک تبلیغی جوزف ولف سے ہوئی جو برطانوی تھا عیسائی سے یہودی ہو گیا تھا۔ اس نے اسے عیسائیت کی طرف واپس لانے کی کوشش کی، وہ پلینی فسک سے بھی ملا جس سے اس نے لیوی پارسنز کی موت کا افسوس کیا۔ تبلیغی نے بھی اس خود پسند جرنل کو مشکلات سے بچانے کی کوشش کرنی شروع کی۔ اس نے کہا کہ تم شدید خطرے میں ہو۔

وہ اپنے پرانے یقین سے تو اکتا چکا تھا مگر اپنے پرانے گھر ضرور جانا چاہتا تھا، سن 1822ء کے آخر میں وہ ریاست ہائے متحدہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی سوڈان کی روداد چھاپی جس سے اسے اور مشرقِ وسطی کو خاصی شہرت ملی جون ایڈمز نے کتاب پڑھنے کے بعد کہا کہ کچھ امریکی کشتیاں نیل میں ویسے راستہ بنائیں گی جیسے Patomac, Hudson اور Mississippi میں ہم راستہ بناتے ہیں۔ جون کوئنسی نے بھی خوشی خوشی English کو سٹیٹ سیکرٹری بنا دیا۔ اس کا کام امریکہ اور عثمانی سلطنت کے درمیان پہلے معاہدہ کروانے کا تھا۔

رشوت اور بے باکی:

دنیا کی قدیم ترین اور جدید ریاست کے درمیان روابط وہم کا شکار ہو کر کمزور ہو رہے تھے پورٹے کو امریکی تجارت کے لئے اہم جان کر سن 1798 میں صدر ایڈم نے ولیم سمتھ کو عثمانیہ سلطنت کا پہلا سفیر ٹھہرایا جسے اس نے رد کر دیا یہ عہدہ خالی ہی رہا۔ جارج واشنگٹن نے بھی امریکہ کے لئے دربارِ خلافت کے ساتھ یونہی چلنے کو مناسب سمجھا۔ ملک اب بربری قزاقوں کو شکست دے سکتا تھا مشرق وسطیٰ کے ساتھ تجارت چوگنی بڑھا سکتا تھا اور سینکڑوں عیسائی مشنریز خطے کی

نمایاں طاقت کے ساتھ تعلقات کی بنا پر بھیج سکتا تھا۔

واشنگٹن اور دربارِ خلافت کے درمیان کسی بھی معاہدے کے نہ ہونے کا سبب امریکہ کا اسلام مخالف ہونا تھا اور اس میں یورپ کا ہاتھ بھی تھا برطانیہ اور فرانس اپنے معاشی فوائد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سلطان اور صدر کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں چاہتے تھے۔ ایک عثمانی رپورٹ میں لکھا گیا کہ امریکہ سے کیا گیا کوئی بھی معاہدہ عظیم برطانیہ کو خفا کر سکتا ہے رپورٹ سلطان دوم کے لئے بنائی گئی جس میں یہ بھی لکھا گیا کہ امریکہ نے الجزائر، تیونیس، اور طرابلس کے معاملے میں جنگ جیسا رویہ رکھا ہے۔ امریکی سرمایہ داروں کو وہاں مستقل مشکلات کا سامنا تھا بوسٹن جارج نے کہا کہ ہمارے ہم وطن وہاں کسی بھی سفیر کے نا ہونے کی بنا پر ان ہی کے رحم و کرم پر ہیں۔ ایک امریکی نے اس بارے میں کچھ کرنے کی کوشش کی اور وہ ڈیوڈ اوفلی تھا۔

اوفلی کی کوئی تصویر تو نہ مل سکی مگر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ سنجیدہ خدوخال کا سادے کالے واسکٹ میں ملبوس ایک شخص تھا جو مشرقِ وسطیٰ صرف مذہب کی خاطر نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر آیا تھا اس نے سن 1811 میں سمرنا میں ایک تجارت خانہ قائم کیا جس کی اسے بھاری کسٹم ڈیوٹی دینا پڑی اس کو اس نے خیالی خطرات سے خیالی حفاظت کی فیس کہا، اس نے کئی عثمانی عہدیداروں کے ساتھ کافی پینے کے بعد پاشا کی عدالت کا رخ کیا جہاں وہ سن 1815 میں دو ہزار ڈالر دینے کے بعد امریکیوں کے لئے بھی وہی حقوق لینے میں کامیاب ہو گیا جو یورپیوں کو میسر تھے یہ اگلے سال سے ہونا تھا مگر پاشا کو ہلاک کر دیا گیا تب تک اوفلی وہاں رشوت اور بے باکی کے طریقے کو سمجھ چکا تھا۔

اوفلی نے وہاں ترقی کی وہ امریکی جہازوں کا سمرنا لانے میں کامیاب ہو گیا وہ جہازیوں سے ساٹھ ڈالر لیا کرتا مگر ان کو حفاظت اور پاسپورٹ دینے سے قاصر رہا، دونوں ممالک کے درمیان روابط کو بہتر بنانے کی اس کی کوشش نے یورپ کو اس کا مخالف کر دیا۔

کسی بھی تبدیلی کی امید سن 1819 تک بہت مبہم تھی جب تک ایڈمز کے چالاک ذہن میں ریاست ہائے متحدہ اور عثمانی ریاست کے بیچ معاہدے کا خیال نہیں آیا وہ ایک باشعور اور نہایت تجربہ کار انسان تھا جوانی میں ہی کئی یورپی عدالتوں کا سامنا کر چکا تھا اور اب باون سال کی عمر میں وہ امریکہ اور استنبول کے مراسم کی اہمیت جانتا تھا اس نے وہاں موجود تبلیغیوں کی مدد کی۔

اس نے چالاک مگر بھروسہ مند وکیل براڈیش کو اپنا ساتھی چنا جس کا تعلق نیویارک سے تھا

اور وہ بھی اوفلی کی طرح کامیاب اور اپنے عقائد کا پکا تھا، وہ استنبول جانے کے لئے روانہ ہوا مگر راستے میں اس کے جہاز کو روک لیا گیا، باقی کا سفر اس نے زمینی راستے سے کیا۔

براڈیش بھی وہاں کے نظام کے لئے موزوں نہیں تھا اس پر خالد آفندی کو رشوت دینے کا الزام لگا اس کے باوجود عثمانی امریکی جنگی جہازوں کے تحائف کے لالچ میں آ کر اس معاہدے میں دلچسپی لینے لگے اور یورپی مداخلت کو نظر انداز کر دیا گیا کہا گیا کہ امریکہ اب برطانیہ کی طرح مضبوط ہے اور وہاں پر اسلحہ بنانے کے کارخانے بہت اسلحہ بنا رہے ہیں براڈیش کے مطابق اس معاہدے کے امریکہ کو 50000 ڈالر ادا کرنے پڑے اور اس سے امریکہ اور برطانیہ کے تعلقات بھی خراب ہو سکتے تھے ایڈم نے بھی اس قیمت کو زیادہ سمجھا ہو گا مگر اس بارے میں شواہد خاموش ہیں، بہر حال ہوا یہ کہ سن 1812 میں خالد کو ہلاک کر دیا گیا اور عثمانی یونان میں ہونے والی بغاوت میں مصروف ہو گئے۔

انیسویں صدی کے مغربی یونان کو جنوبی یورپ کا ملک سمجھتے تھے۔ سمرنا بھی اس ہونے والی جنگ کے اثر میں آیا۔ ریاست ہائے متحدہ کے لئے یہ جنگ کئی پہیلیاں لے کر آئی اس سے ان کے تعلقات بھی متاثر ہوئے اب امریکہ کے آگے سوال کھڑا تھا کہ اپنا معاشی فائدہ دیکھے یا پھر اپنے جمہوری کردار کو برقرار رکھے۔

اس جنگ میں امریکی ردِ عمل پر یونان کی الفت حاوی تھی وہ انہیں اور ان کی ہر چیز کو پسند کرتے تھے لارڈ بیرن اور دوسرے پڑھے لکھے لوگوں کی طرح وہ ان سے متاثر تھے اور اپنے بچوں کے نام ان کے تاریخی ناموں پر رکھا کرتے تھے، امریکی زندگی کے ہر شعبہ پر ان کا اثر تھا خواہ وہ فنونِ لطیفہ ہوں یا تعمیر یا ادب۔ وہ وہاں ہونے والی جدوجہد کو اپنی جدوجہد سے ملاتے تھے۔

ان کو مذہبی عقائد بھی ایسے ہی تھے، اس جنگ کو اسلام اور عسائیت والی جنگ سمجھا گیا ایک سیکولر اخبار North American Review نے بھی اس بارے میں لکھا۔ عورتوں کے گروہ نے اس کے لئے ایک مجسمہ کھڑا کیا جس پر یونان کی حمایت میں جملے لکھے گئے۔

یونان حکومت کو ان سب حالات کا علم تھا سو اس نے امریکیوں سے مدد مانگی۔ جس پر ہارورڈ ایڈورڈ نے جواب دیا کہ انسانیت کا، مذہب کا حالات کا اور مصلحت کا بھی یہی تقاضا ہے۔

امریکیوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا Yale اور Columbia کے طلباء نے ان کی آزادی کے لئے

کام کیا Albany کے شہریوں نے بھی ویسا ہی کیا اور Michigan کے ایک قصبے نے اپنا نام بدل کر Ypsilanti رکھ لیا جو کہ وہاں کے ایک جرنل کا نام تھا تمام ملک میں فنڈ جمع کئے گئے تا کہ ان کی مدد کی جا سکے تمام امریکہ سے تقریبا 100000 ڈالر کی مدد کی گئی۔

کچھ امریکیوں کے لئے محض مالی امداد کرنا کافی نہ تھا وہ اپنی زندگی بھی داؤ پر لگانا چاہتے تھے جولیہ ورڈ کے شہر جس نے Battle Hymn of the Republic لکھی تھی، سیموئل گریڈ لی نے ایسا ہی کیا اور وہاں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کیں۔اس کے علاوہ جارج جرویس، جیمز ولیم اور سٹیفن ڈیواٹر نے بھی ایسا ہی کیا اور وہ یونان کے لئے لڑے۔

ہنری کلے نے کہا کہ یونان کو قدیم نہیں بلکہ جدید دیکھتا ہوں مردہ نہیں بلکہ زندہ دیکھتا ہوں جو اپنے وجود اور اپنی آزادی کے لئے کوشاں ہے۔اس کے باوجود تمام امریکیوں نے ایسا نہیں کیا، کچھ نے ایسے کسی بھی اقدام کی مذمت کی جس سے سلطنتِ عثمانیہ میں تبلیغیوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے یا تجارت کو نقصان ہو۔

جون کوئنسی ایڈمز کے سامنے اب یہ سوال تھا کہ اس صورتحال میں مشرقِ وسطی میں موجود تجارت کار اور تبلیغیوں کے لئے کیسے سوچا جائے۔ وہ تعلقات میں بہتری کو بہتر سمجھتا تھا جب کہ سیکر یٹری اسلام کو ایک ظالمانہ مذہب سمجھتا تھا جو دوسروں کو تلوار کے زور پر ختم کرنے کی خواہاں تھے۔اس نے یونان کے لئے اپنی پالیسی بناتے ہوئے کچھ نیا سوچا۔اس نے خدشہ ظاہر کیا کہ یورپی برِاعظم میں مداخلت کر کے وہ یورپی مخالفت مول لیں گے۔

یونان کی امداد روک دینے میں امریکیوں کا فائدہ تھا یہ استنبول میں واضح ہو چکا تھا اسی دوران میں باغیوں کی یورپی حمایت نے صورتحال کو گمبھیر کر دیا تھا اور ایڈم کے لئے یہ بہترین وقت تھا کہ وہ ریاست ہائے متحدہ اور عثمانی معاہدے کو دوبارہ عمل میں لائے اور اس کے لئے اس نے جارج بیتھون سے مدد لی۔

اسلامی دارلحکومت میں ایک امریکی مسلمان:

ایڈم نے انگلش کو نجی خطوط کے ذریعے اپنی کامیابی اور پیش قدمی سے آگاہ رکھنے کی تلقین کی، جب اس نے انگلش کو عثمانیوں کے لئے بطور کرائے کے ایلچی کے نامزد کیا۔انگلش کا پہلا کام خسرو محمد

پاشا کی قربت کا حصول تھا اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو اسے براہِ راست سلطان کے قریب ہونا تھا۔

5 نومبر سن 1823 کو استنبول پہنچا، اس نے علاقائی لباس پہنا اور شہر کے وسط میں رہائش کا انتظام کیا اور آہستہ آہستہ روابط بنانے شروع کئے پہلے سلطان کے لائبریرین سے اور پھر اس سے آگے۔ ہر رابطہ اسے اس کے شکار کے قریب لے جاتا تھا مگر وہ خود بھی شکار ہو سکتا تھا اس نے ایڈم کو بتایا کہ اسے یونانی جاسوس سمجھا جا رہا ہے اور وہ اس قدر خطرے میں ہے کہ خود اس کا نوکر اس کے پیچھے نہیں چلتا کہ کہیں اس کے لئے چلنے والی گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔

آخر 4 جنوری کو اس کی ملاقات کپتان سے ہو گئی اس نے خسرو کو تسلی کروائی کہ ریاست ہائے متحدہ کو ان کی زمین میں کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ تو بس تجارت کی بات کرتے ہیں جس میں دونوں ہی کا فائدہ ہے ساتھ ہی اس نے کہا کہ امریکہ تمام مذاہب کی بشمول اسلام عزت کرتا ہے، وہاں ایک مسلمان کو بھی وہی حقوق دیئے جاتے ہیں جو ایک عیسائی کو ملتے ہیں۔ان باتوں سے متاثر ہو کر اس نے معاہدے پر غور کرنے کی حامی بھری۔ساتھ ہی یہ تسلی کرائی گئی کہ اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلے گا اور اسے رشوت میں دی گئی رقم کے حصے بھی نہیں کرنے پڑیں گے۔اب تک اس کا کام ٹھیک جا رہا تھا۔

اس کے باوجود ایڈم اس سے مطمئن نہیں تھا، اس کے آسانی سے رشوت دے کر بات منوا لینے کے طریقے نے اس کی قابلیت کو مشکوک کر دیا تھا سو اس نے انگلش کو جون روجرز کا مترجم بنایا اس کو سمجھا دیا گیا تھا کہ اس نے عثمانیوں سے وہی شرائط منوانی ہیں جو برطانیہ اور فرانس کے لئے ان کے پاس ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی خیال کرنا ہے کہ بات یونان کے خلاف نہ ہو۔

راجر کے رویہ کی وجہ سے اگلے دو سال تک اس کی ملاقات خسرو سے نہیں ہو سکی اور آخر کار ان کی ملاقات 5 جولائی سن 1826 کو ہوئی جس میں تحائف کا تبادلہ کیا گیا انگلش نے بتایا کہ دونوں راضی رہے اور راجر کو سمرنا بھیج دیا جہاں وہ معاہدے کی منظوری کا انتظار کر سکے۔ان کو وہاں اتنی عزت دی گئی جتنی اب سے پہلے کسی بھی مغربی کو نہیں ملی تھی۔

راجر سمرنا پہنچ گیا جہاں وہ اوفلی کے مہمان کی حیثیت سے رہا۔اس نے وہاں ایک سال سے زیادہ انتظار کیا مگر سلطان کی طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملا اس دوران میں ایڈم صدر بن چکا تھا، مگر اس کی انتظامیہ نے یونان کی اس حد تک حمایت کی کہ سمجھا جانے لگا کہ امریکہ باغیوں کی

مدد کر رہا ہے۔ سلطان نے شکایت کی کہ یہ فرنگی کبھی اپنا وعدہ پورا نہیں کرتے اس لئے بہتر یہی ہے کہ برطانیہ کا ساتھ دیا جائے اور امریکہ کو وہیں رکھا جائے۔

ایڈم نے عثمانیوں کے ساتھ ساتھ انگلش کی مخالفت بھی مول لی جو اس کے پر جوش رویہ کو معاہدے کے نہ ہونے کے لئے الزام دیتا تھا۔ ایڈم کے پاس اس کے وہاں سے ہٹانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا، انگلش واپس امریکہ آیا اور اس نے صدر کو درخواست دی مگر اس کی نہیں سنی گئی اور آخر کار وہ ۲۰ ستمبر سن 1828 کو ریاست ہائے متحدہ میں ہی فوت ہو گیا۔

اینس میرابلس 1830

انگلش کی موت کے بعد سے مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ اور زیادہ کمزور ہو گیا ساتھ ہی ترک امریکی معاہدے کے امکان بھی ماند پڑ گئے۔ ساتھ ہی یہ خطرہ بھی ابھرا کہ یونان کی وجہ سے پوری عثمانی سلطنت خطرے میں پڑ سکتی ہے اور اس کے خطوں کے لئے یورپی جنگ بھی شروع ہو سکتی ہے۔ صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کی گئی جس کو سلطان نے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت سمجھا اور عثمانی، مصری بیڑے کو یونان کی طرف روانہ کیا جس کو راستے میں ہی برطانیوی، فرانسیسی اور روسی جہازوں نے غرق کر دیا۔ 20 اکتوبر 1827ء میں نویرینو کے قریب سلطان کے تین چوتھائی جہاز ڈوب چکے تھے۔

نویرینو میں ترکیوں کی شکست نے یونان کی آزادی حاصل کرنے کی امنگ کو تقویت بخشی۔ 1829ء میں روس نے الجزائر کی سرحد کا بڑا حصہ حاصل کر لیا اور اس کے ایک سال بعد فرانس نے اپنے 24000 سپاہی الجزائر میں اتار دیئے۔ یہ ملک کے ۱۳۰ سالہ قبضے کی ابتداء تھی۔ لیکن پھر وہی سوال تھا کہ کمزور ہوتی عثمانی سلطنت کا کیا کریں۔ یورپ کو آنے والی صدی میں اس کے سبب مشکلات کا سامنا رہا جو کہ جنگِ عظیم میں شریک تھا۔

محمد علی جس کو مصر میں نپولین سے ملک کے بچاؤ کے لئے بھیجا گیا تھا اپنے جنگی جہازوں کی تباہی پر اور عثمانیوں کے اس نقصان کے نہ بھرنے پر سخت نالاں تھا۔ فرانس کی شہ پا کر اس نے اپنی فوج کو اناطولیہ بھیجا جہاں وہ اپنی سلطنت قائم کر سکے۔

اس صورتِ حال میں عثمانی حکمرانوں اور دوسری مغربی قوم امریکہ کے درمیان کوئی معاہدہ

نہیں ہو سکتا تھا۔ عثمانی جو اس نقصان کو بھرنا چاہتے تھے اس سب کو نظر انداز کر دینے کے خواہاں تھے ان کے وزیر نے برطانیہ سے کہا کہ ان کے بعد بھی امریکی ان کے اچھے دوست ہیں اور ایک امریکی جہاز تمہارے دو جہازوں کے برابر ہے۔ سلطان نے اس معاہدے میں پھر سے دلچسپی لی اور امریکہ میں بھی 1830 تک وائٹ ہاؤس میں نیا صدر آ چکا تھا اور فضا سازگار ہوتی دکھائی دی۔

ایک لاوارث غریب، نابالغ سپاہی جس نے محنت کر کے خود کو وکیل اور پھر 1812ء کی جنگ کا ہیرو بنایا اپنے سے پہلے آنے والوں جیسا ہی تھا، وہ انڈریو جیکسن تھا۔ وہ عثمانیوں کے ساتھ تجارت کرنا چاہتا تھا اور اس میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں چاہتا تھا، یہاں تک کہ یونان کے لئے ہمدردی بھی نہیں اس نے کہا کہ میں اپنے جھنڈے کو مشرقِ وسطیٰ میں وہی مقام دینے کے لئے جو یورپ کو میسر ہے کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ اور دربارِ خلافت کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہئے۔

جیکسن کے چنیدہ، جیمز بیڈل، ڈیوڈ اوفلی اور چارلس رند نے فروری 1830ء میں استنبول میں اس سلسلے میں گفتگو کی شروعات کیں اور آخر کار 7 مئی کو امریکہ نے عثمانیوں کے ساتھ اپنے پہلے معاہدے پر دستخط کئے اور اس طرح ریاست ہائے متحدہ کو بحرِ اسود میں تجارت کرنے کی اجازت ملی جس کے بدلے میں امریکہ نے ان کو جنگی جہاز اور دیگر عسکری ساز و سامان بہت کم قیمتوں پر دینے کا وعدہ کیا۔

سن 1830 کو امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے تعلقات میں یکدم تبدیلی آئی۔ یہ وہ سال تھا جب ریاست ہائے متحدہ کو مشرقِ وسطیٰ میں وہی تجارتی مقام حاصل تھا جو یورپ کو حاصل تھا۔ امریکی اسلحہ وہاں پہنچایا جا رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ گیارہ امریکی جنگی جہاز بھی ان کے ساحلوں پر پہنچا دیئے گئے تھے، نیز اس وقت کا سب سے بڑا جنگی جہاز بھی عثمانیوں کو دیا گیا تھا جس پر امریکی افسران مشیر کی حیثیت سے موجود تھے اور ترکی سپاہی ان سے تجربہ حاصل کر رہے تھے اس کے ساتھ ساتھ زمینی فوج کو بھی امریکہ نے خاصہ اسلحہ مہیا کیا تھا۔

اسلحے کی فروخت نے امریکی معیشت پر کچھ حد تک اثر ڈالا، نئے معاہدے کے سبب امریکی تجارتکاروں نے امریکی صنعتوں کی جدید اشیاء کو مشرقِ وسطیٰ تک پہنچایا جس کے بدلے میں انہوں نے وہاں سے کھجوریں، قالین اور دیگر اشیاء درآمد کیں اس کے علاوہ امریکی کپڑا بھی وہاں بھیجا گیا۔

عثمانی سلطنت میں اپنے قدم جمانے کے بعد امریکی کاروباری اس سے آگے بڑھے اور وہ یمن تک گئے جہاں انہوں نے کافی کی آدھی فصلیں خریدیں اور یہی انہوں نے عمان میں کیا۔ سن 1832 میں ایڈمنڈ رابرٹ اسلحہ، نقشے، اور امریکی سکے لے کر سفر پر نکلا اور سلطان سید سیدی کے پاس پہنچا جو پچھلی جنگ کے زخموں سے چور تھا اور اس کے محل کی دیواروں پر خون اور انسانی دماغ نظر آتا تھا، اس نے ریاست ہائے متحدہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو اس کے ملک کا مغربیوں کے ساتھ پہلا معاہدہ تھا، سن 1833 میں دکھایا گیا کہ محل کی دیواروں پر خون کے دھبوں کی جگہ امریکی فتوحات کی تصاویر آویزاں ہیں۔

ڈیوڈ پورٹر اور شیطان:

ڈیوڈ کو اس کے دوست شیطان کہتے تھے دوستوں میں سندباد کے نام سے جانا جاتا تھا ایک انقلابی کپتان کا بیٹا تھا، اس نے ایک دستے کی قیادت کی اور 1801ء میں طرابلس جہاز پر قبضہ کر لیا ساحلی حملے میں زخمی ہوا اور فلاڈلفیا جہاز کے عملے سمیت گرفتار ہوا 1812ء کی جنگ میں وہ برطانوی جہاز پر قبضہ کرنے والا پہلا امریکی تھا، اور Cape Horn تک جانے والا پہلا ملاح تھا اس پر ایک آدمی کے قتل کا الزام بھی تھا اور وہ پورٹو ریکو پر بھی حملہ کر چکا تھا، وہ بے صبرا تھا جس نے اپنی بیوی کو چیسٹر میں چھوڑ کر مرمرا میں رہنا شروع کر دیا تھا وہ آنے ولوں کے لئے نامہربان تھا اور مشرقِ وسطیٰ کو پسند نہیں کرتا تھا اس نے سلطان محمود دوم سے کہا تھا سلام کرنا عجیب ہے اس کے بدلے سلوٹ کیوں نہیں کیا جا سکتا۔

اینڈریو جیکسن جیسے مزاج والا ڈیوڈ پورٹر بھی عثمانیوں کے ساتھ امریکی مراسم کا خواہاں تھا اس کا کہنا تھا کہ دنیا میں ان جیسی دوسری کوئی قوم نہیں اور اس کے لئے اس نے سلطان کو بھاپ سے چلنی والی ایک کشتی تحفے میں دی تھی جو ساخت میں ہنس جیسی تھی۔ سلطان نے اس سے خوش ہو کر اسے وہاں کا سفیر مقرر کیا، ساتھ ہی اس نے کئی بار عثمانیوں پر تنقید کی خاص اس وقت جب کچھ یہودیوں کو قید کر کے ان پر تشدد کیا گیا جن پر قتل کا الزام تھا، پورٹر نے ان اقدامات کو بربریت آمیز کہا، اس نے یاد دہانی کروائی کہ امریکہ مسلمانوں اور یہودیوں میں کوئی فرق نہیں رکھتا، اس نے وہاں پر یہودیوں کے لئے کوششیں کی اور بیسویں صدی کے لئے یہ روایت قائم کی، برطانیہ اور

فرانس کی مدد سے اس نے قیدیوں کو آزادی دلوائی۔

اس کی بڑی مشکل وہاں کے یہودی نہیں بلکہ اپنے عیسائی تھے۔ شام اور لبنان میں ان کو خطرہ تھا خاص کر ایک شخص میرونائٹ پادری سے جس نے سن 1841 میں سلطان سے انجیل کے پیروکاروں کو ملک بدر کر دینے کو کہا تھا اور اس نے ڈیوڈ کی طرف رجوع کیا تھا۔

بمشکل ایک مذہبی ہونے کی حیثیت سے وہ تبلیغیوں کو اور ان کے کام کو خاص پسند نہیں کرتا تھا، اور وہ ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا جس سے ان کے معاہدے پر کوئی اثر پڑے، سو اس نے اس معاملہ میں کچھ نہ کیا اور کہا کہ اگر تبلیغی یہاں اپنا کام ایسے ہی جاری رکھیں گے تو وہ اپنی زمہ داری پر رکھیں گے۔

ایسا کرنے میں وہ Jacksonian طریقہ کار پر چل رہا تھا جس نے ریاست ہائے متحدہ اور عثمانیوں کے بیچ دوستانہ مراسم بنائے رکھے تھے، مگر بدقسمتی سے اب دفتر میں نئی انتظامیہ آ چکی تھی اور ڈینیل ویبسٹر اس میں سٹیٹ سکریٹری تھا، وہ ترکی کا ناقد اور عثمانیوں کے لئے اچھی رائے نہیں رکھتا تھا، لکھنے والے اسے ایک بے دین شخص بتاتے تھے جس نے سیاست کو اپنا خدا بنا لیا تھا، مگر دوسروں کا ماننا تھا کہ وہ ڈیوڈ تھا جس نے تبلیغیوں کی مدد سے انکار کر کے ایسا کیا تھا۔ یہ مشنریز خدا سے بندھے ہوئے ہمیشہ امن سے رہے تھے انھوں نے کبھی کسی میرونائٹ کو بدلنے یا عثمانی قوانین توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ویبسٹر اس بات کا قائل ہو چکا تھا اس نے 2 فروری 1842ء میں بہت تیز قسم کا ایک مراسلہ لکھا اور پورٹر کی عدم فعالیت پر سرزنش کیا و را سے مشنریز کی ہر قسم کی مدد کرنے کا حکم دیا۔

اس سرزنش نے پورٹر کو بہت تلخ کر دیا لیکن یہ تلخی زیادہ دیر تک نہ رہی۔ تریسٹھ سالہ یہ شخص 1842ء میں فوت ہو گیا اور اس کی میراث کئی لوگوں کو ملی جن میں پورٹرز، ہیپس اور برادن بھی شامل تھے اس شخص کی منزل مشرق وسطیٰ میں بہت اہم کردار کرنے کی تھی۔ اس نے امریکہ کے مشرق وسطیٰ کے ساتھ تعلقات کے اعلی نمونے قائم کئے۔ مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں کو ہتھیار بیچنے اور نئی تیکنالوجی متعارف کرانے کے علاوہ اس نے علاقائی قوت کے ساتھ امریکہ کے تشخص کو ٹھوس طریقے سے ابھارا۔ لیکن یورپیوں کی طرح اسے خطے میں کوئی علاقائی دلچسپی نہیں تھی۔ ڈیوڈ پورٹر کے بہت شکرگزار ہیں کہ اس نے امریکہ کے لئے سفارت کاری کی اور ان دنوں جب انگلش استنبول کی گلیوں میں گھستا پھر رہا تھا اور گلیوں میں مذاکرات کرتا پھر رہا تھا اور عثمانیوں کے ساتھ دوستی قائم

کرنے میں کامیاب رہا۔لیکن پورٹر اپنے ملک کے سیاستدانوں کے ساتھ ہم آہنگی قائم کرنے میں ناکام رہا جو اس علاقے میں بہت فعال تھے سیاستدانوں ، ملازمیں اور تاجروں کی نسبت عیسائی مشنریز نے مشرقِ وسطیٰ کے جنگ سے قبل امریکہ کے ساتھ تعلقات میں بہت اثر دکھایا۔

مشرقِ وسطیٰ کی عیاں تقدیر

امریکی مشنریوں کا جارحانہ رویہ ریاست ہائے متحدہ اور چرچ کے پیشواؤں کے درمیان ہونے والے گٹھ جوڑ کا آئینہ دار تھا۔اس تحریک میں سن ۱۸۲۰ کے بعد سے تیزی آئی ، جب مشرقِ وسطیٰ میں ان کے پہلے سفیر، لیوی پارسن اور پلینی فسک اپنے مقصد میں ناکام ہو کر ہلاک ہو گئے، اوران کے ساتھیوں آئزک برڈ ولیم گوڈیل اور ایلی سمتھ کی شام میں سکولوں کی تعمیر کی مخلصانہ کوششیں دس سال بعد بھی ان کے کام نہ آسکیں ، نہ ہی امریکی پالیسی کو مشرقِ وسطیٰ کی طرف کر سکیں ،اس طرز عمل کی داستان جس میں مردوں اور عورتوں کے چھوٹے گروہ میلوں کا سفر کر کے ان اجنبی علاقوں تک پہنچے اور انہوں نے اپنے ملک کے تعلقات پورے علاقے میں تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کو بھی تبدیل کیا، واقعی غیر معمولی، کٹھن اور خوں ریز ہے۔

سورج اور صلیب کے ٹھکانے:

اپنے اسکولوں کے ذریعے مشنریوں نے شام میں سن 1827 تک اپنے قدم جما لئے تھے۔مگر پورے فلسطین کو انجیل کا پیروکار کرنے کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔اس ہی سال امریکی بورڈ اور یہودیوں میں عیسائیت کو فروغ دینے والی خواتین کی جماعت نے بیت المقدس میں دوبارہ کام کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لئے تیس سالہ جوزف بریو کو سربراہ چنا جس کا تعلق برک شر سے تھا۔ایک پروفیسر کے مطابق، ''وہ نرمی، رحم دلی، اور تقوے کا نشاں دار تھا''۔خیال تھا کہ وہ وہاں کامیاب ہوگا جہاں لیوی پارنس اور پلینی فسک نہیں ہو پائے تھے۔اس نے مقدس شہر میں ان کے مستقل ٹھکانے قائم کئے جہاں اس نے یہودیوں کے اجتماعات شروع کئے۔اس نے میساچوسٹس سے نکلتے وقت پر جوش اور پر اعتماد انداز میں کہا،''ہماری زائرین ماؤں کو خوش ہونا چاہیے، کیا انہیں علم نہیں تھا کہ ان کی بیٹیاں انجیل کو بیت المقدس میں واپس بھیج دیں گی؟''۔اسے یقین تھا کہ وہ بیت المقدس کی دیوار پر چاند کے نشان والا سرخ اور امن کا سفید پرچم لگانے میں کامیاب ہوگا۔

امن بہرحال اسے فلسطین میں میسر نہیں ہوا، وہ سن ۱۸۲۷ میں، عثمانیوں کی نوورینو میں شکست کے فوراً بعد ملک میں آیا تھا۔سلطنت کے ٹوٹنے کی پیشنگوئی کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت خود کو عثمانیوں سے منسلک رکھتی تھی اور وہ تمام مغربیوں کو خواہ وہ کہیں سے بھی ہوں ''فرنگی''، ہی مانتے تھے جن سے مسلمانوں کو خطرہ تھا۔بریو نے وہاں لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوششیں کیں کہ ریاست ہائے متحدہ کے بحری جنگی جہاز تو اس دوران ان کے ساحلوں کے قریب بھی نہیں تھے اور وہ ریاست ہائے عثمانیہ کے ہمدرد ہی تھے، کارگر ثابت نہ ہویں۔اور اس سے بھی زیادہ بے اثر اسلامی تہذیب کے بارے میں اس کی رائے کا اظہار رہا جو اس نے پرانے صحیفے تقسیم کرتے ہوئے کیا تھا۔اپنی بیماری اور دو بستیوں سے تنگ آ کر بریو آخرکار نامراد ہو کر بوسٹن واپس لوٹ گیا۔

امریکی بورڈ کو بہرحال یہ امید رہی کہ بیت القدس میں کسی طرح کا ٹھکانہ قائم ہو سکتا ہے۔بورڈ کے تجربہ کار عہدے دار سن 1831 سے حالات کی بہتری کی نشاندہی کرتے رہے جب محمد علی نے، جنگ کے دوران ہونے والے نقصانات کی بھرپائی نہ کرنے پر غصہ میں آ کر شام اور فلسطین میں مصری فوجی اتارے۔مصریوں نے وہاں کے غیر مسلموں کا بھرپور ساتھ دیا، اور یہ موقع دیکھتے ہوئے بورڈ نے نئے فلسطینی مشن کی منظوری دی۔اس کی سربراہی پرنسٹن میں ملنے والے ایک جوڑے ولیم اور علیزا نے کی، جہاں ولیم انجیل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور Eliza سکول میں پڑھا رہی تھی۔دونوں نے سن 1833 میں شادی کی اور رضا کارانہ طور پر انجیل کے لئے کام کرنا شروع کیا۔

تمام فلسطینیوں نے محمد علی کو خوش آمدید نہیں کہا۔مسلمانوں نے وہاں موجود عیسائیوں، یہودیوں اور اپنے برابر حقوق دینے کا باقاعدہ برا مانا۔ناراضگی بڑھتی چلی گئی اور مسلمانوں پر ہرجانے اور مصری افواج میں ان کی بھرتی نے وہاں بغاوت کو جلا بخشی۔1834 تک خونریزی کا بازار گرم رہا جب ٹامس بیت المقدس پہنچا۔

ایلائزا نو ماہ کی حاملہ تھی اور ایسی حالت میں شہر نہیں چھوڑ سکتی تھی، ولیم کے پاس اسے اکیلا چھوڑ کر جافہ جانے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔اس نے اپنے خوف کا اظہار کیا کہ اب تک اس کے پاس اس کی بیوی کی کوئی خبر نہیں آئی ہے۔ایلائزا نے اس دوران خود کو گھر میں بند رکھا تھا، وہ باہر ہونے والے دھماکوں، دیواروں کے گرنے کی آوازوں اور قتلِ عام کے خوف سے گھبرائی ہوئی

تھی۔اس دوران اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا،۲۲ جولائی کو اس لڑکے کا باپ واپس لوٹا تو اسے تباہ شدہ شہر کے سوا کچھ نہ ملا،اس کی بیوی سخت بیمار تھی جو دو ہی ہفتے بعد چل بسی۔

فلسطین کے بارے میں اس نے لکھا،''ملک کی تباہی اور لوگوں کا زیاں، اردن کے وقار میں امریکی نام سے اضافہ ہوا''۔ان تحریروں نے بیت المقدس میں کام کرنے والے دوسرے تبلیغیوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔وائٹنگ ،بٹسی اور ایلائزا کی موت کے فوراً بعد ہی وہاں آ گئے مگر وہ بھی اس عسرت کو برداشت نہ کر سکے۔انجیل کا فلسطین ان کے سامنے شیطان کی سرزمین بن گیا۔برڈ کے مطابق یہ زمین اب بخشی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس پر عذاب نازل کیا گیا ہے۔سن ۱۸۳۴ تک امریکی بورڈ نے بھی شکست تسلیم کر لی کہ ایک فرد کو بھی وہ اپنی طرف راغب نہ کر سکے،انہوں نے اپنی ساری سرگرمیاں ترک کر دیں۔اب تبلیغیوں کی توجہ مشرقِ وسطی میں کہیں اور تھی،خاص کر لبنان کے اطراف میں۔

برڈ اور گوڈیل کے خاندانوں نے اپنا کام جاری رکھا اور وہ بیروت میں نئے اسکول قائم کرتے رہے۔مگر 1831 میں مصریوں کے آنے کے بعد سے وہاں کے حالات سازگار نہ رہے۔ان کی لڑائیاں اتنی شدید ہوگئیں کہ امریکی باہر نکلنے سے، بلکہ کھڑکی تک آنے سے بھی ڈرنے لگے۔شامی عیسائیوں نے بھی ہنگامہ مچایا اور انجیلی اسکولوں کی مخالفت کی۔ولیم گڈل نے احتجاج کیا اور کہا کہ ان سے بہتر رویہ ترکیوں کا ہے۔تنہا اور خوفزدہ ہونے کے وجہ سے انہوں نے سمجھ لیا کہ اب ان کا یہاں رہنا ممکن نہیں۔برڈ کے خاندان کے نکالے جانے کے بعد تمام ہی لوگ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

امریکیوں کے لئے شام اور فلسطین کی صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔یہاں تک کہ سمرنا میں جو کہ ایک عیسائی شہر تھا اور تبلیغیوں کی آماجگاہ تھا، اس کے لئے حالات ابتر ہو گئے۔نوجوان کوہ پیما گرڈلی کی وہاں پہلا ٹھکانہ قائم کرنے کی کوشش رائگاں گئی جب 1826 میں وہ کوہ پیمائی کے دوران ہی مارا گیا۔اس کی جگہ ڈینیل ٹمپل نے لی جو محنت کر کے خود کو نچلے طبقے سے اس مقام تک لایا تھا،مگر اس کی بھی انگلستان میں ہونے والی کوئی تربیت مشرقِ وسطی میں اس کے کام نہ آسکی، جہاں اس کی بیوی اور دو بچوں کو مار دیا گیا۔اپنے باقی بچوں کے ساتھ وہ امریکہ لوٹ گیا اور اس نے لکھا کہ،''اس ناخداترس اور بداخلاق جگہ پر اپنے بچوں کی تربیت کا سوچ کر بھی

مجھے خوف آتا ہے''۔

مشرقِ وسطی میں ہونے والے حادثے کے اثر سے وہ 1833ء تک نکل آیا اور ایک بار پھر اس نے سمرنا کا رخ کیا۔اس بار اس کے ہمراہ نئی بیوی اور پریس بھی تھے۔اس کی توریت اور کتابیں جانشوا کے اسکول میں پڑھائی جانے لگیں۔یہ وہی جانشوا تھا پانچ سال پہلے فلسطین سے لوٹ آیا تھا۔اس نے پوچھا کہ اگر تب تلوار نے عیسائی دعوت دینے والوں کے لئے مسلم سرزمین کا در وا نہیں کیا،تو کیا یہ امید نہیں کرنی چاہیئے کہ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بہتر ہو جائیں گے؟، اس کا جواب اس کو ۱۸۳۸ تک مل گیا جب دو سو سے زیادہ لڑکیوں نے اسکول میں داخلہ لیا۔

سمرنا میں تبلیغوں کی کامیابی غیر معمولی رہی اور باقی عثمانی سرزمینوں میں عدم تحفظ کے باعث یہ کام سرانجام نہیں دیا جا سکا۔امریکی بورڈ نے اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ارمیا جھیل کا رخ کیا جو شمال مغربی فارس میں تھی،اور آشوریوں کے مطابق وہاں عیسائی پہلے سے آباد تھے۔یہ ذمہ داری ہیرسین کو سونپی گئی۔ہیریسن اور ایلی سمتھ کو 1830ء میں سمرنا کے سپرد کیا گیا،انہوں نے خود کو چغوں اور پگڑیوں میں چھپایا اور آرمیثیا کی سرزمین پر قدم رکھنے والے پہلے امریکی بننے نکل کھڑے ہوئے۔

کسی بھی امریکی سرحد سے آنے والے کی طرح ان کو بھی جانفشانی کرنی پڑی،ارض روم کی طرف سفر کرتے ہوئے دونوں کو تین ہفتے تک خشک زمینوں سے گزرنا پڑا،اس دوران ان کو کوئی ایک بھی بستی نہیں ملی۔سمتھ نے بتایا کہ اس نے کئی راتیں مختلف طرح کے اصطبل میں مختلف اقسام کی دھول، گندگی اور کوڑے کرکٹ کے ساتھ گزاریں،اور وہ آشوبِ چشم اور بخار لے کر اٹھا،طفلس کے نزدیک آتے آتے اسے ہیضہ ہو چکا تھا اور وہ چلنے کے قابل نہیں رہا تھا سو دوائٹ نے آگے کا سفر اسے گدھے پر ڈال کر کیا،۔بہرحال مارچ تک یہ امریکی تمام مشکلات برداشت کرتے ہوئے ارمیا پہنچے۔

بیروت اور بیت المقدس کے مقابلے میں یہ شہر جنت نظیر معلوم ہوا۔نسبتاً آزاد خیال قاچار کے زیرِ حکومت فارس اس وقت اندرونی طور پر روس اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتوں کی دست اندازی اور مداخلت سے الجھا ہوا تھا۔وہاں پہنچ کر تبلیغیوں کو اندازہ ہوا کہ حکومت ان کے کام میں مخل نہیں ہے اور نستورین کا نظریہ بھی ان سے مختلف نہیں ہے۔سمتھ نے کہا،''میں ان لوگوں کے

درمیان سکونت اختیار کرنے کا خواہاں ہو گیا تھا، ایسی شدید خواہش اس سے پہلے کسی جگہ کے لئے نہیں جا گی؛''۔

وہاں انہوں نے ایک سکول قائم کیا جس میں جلد ہی چالیس طالبِ علم ریاضی، انگریزی، اور مناجات سیکھنے لگے۔ اس ٹھکانے کی مضبوطی کے لئے نئے تبلیغی بھی وہاں پہنچنے لگے، 1832ء میں جسٹن اور شارلٹ پرکنز کے ساتھ اسہل بھی وہاں پہنچا جو ایک اٹھائیس سالا پھرتیلا جوان تھا۔ بتایا گیا کہ اسکی آنکھیں روشن، اور خدوخال دوستانہ تھے وہ ایک طبیب بھی تھا اور اس نے تبلیغیوں کی روایت کے مطابق وہاں کے لوگوں کو بلا معاوضہ طبی امداد دینے کی ابتداء کی، اور پہلے ہی سال اس نے دس ہزار مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ اس نے بتایا،'' بیمار، نابینا، اور لاغر افراد سیکڑوں کی تعداد میں میرے گرد جمع ہوتے گئے اور جلد ہی ملک میں اور ملک کے باہر میری شہرت کے ڈنکے بجائے جانے لگے؛''۔

اس کی برداشت نے اس کو قابل بنایا کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے دور جنوب میں کردوں تک جا سکے، وہ عراق تک گیا، ڈاکوؤں کے ہاتھ لگا، اس نے سزائیں کاٹیں۔ 1840 میں اس نے ریاست ہائے متحدہ کو یقین دہانی کرائی کہ اُرمیا کا ٹھکانہ کامیاب رہا اب اس علاقے کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو اب عراق کہلاتا ہے۔ عہدیداران مان گئے اور انہوں نے Colby C. Mitchell اور Abel Hindsdale کو موصل کی طرف روانہ کیا۔

امریکی اپنی پہلی پہلی فتح کا اندراج کر چکے تھے مگر تب ہی ان پر کئی مصیبتیں ٹوٹیں، ریت کے طوفان سے Mitchells کو ٹائیفائڈ نے آلیا، وہ دونوں جیسے تیسے موصل پہنچ تو گئے مگر اب وہ کوئی کام کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ Elizbeth Dwight, اس کے بیٹے جون اور پارکنز کی پانچوں اولادوں کو اس ہی بیماری نے مار دیا۔ مرگی کے مرض میں مبتلا Charlotte Perkins کو ریاست ہائے متحدہ واپس لوٹنا پڑا، Sarah سمتھ سائیپرس کے پاس کشتی کے ڈوب جانے سے ہلاک ہوگئی اور ایلی کی دوسری بیوی پیچش کے مرض سے ہلاک ہوگئی۔

ایلی سمتھ نے بیان دیا،'' خراب صحت اور چھوٹی زندگی، یہ قربانیاں تبلیغ کے کام کے لئے لازمی ہیں؛''۔ اس نے یہ پیغام پورے مشرقِ وسطی کو دیا، خواتین حمل کے دوران عموماً کمزور پڑ جاتی ہیں۔ Mary Van Lennep نے لکھا کہ لگتا ہے یہ بیماریاں میرے لئے امتحان ہیں، میں دعا

کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ مجھے مشکلات سے گزارا جائے۔ تبلیغیوں پر اکثر حملے ہوتے رہتے تھے اور ان کو عثمانیوں کی جانب سے کوئی خاص حفاظت نہیں دی گئی تھی۔ ولیم گڈول نے لکھا،'' امریکہ میں ایک شخص کی ٹوپی، مصر میں ایک شخص سے زیادہ محفوظ ہے؛''۔ بہرحال تبلیغیوں کی سب سے بڑی قاتل بیماریاں ہی رہیں جنھوں نے ان کی اموات کی شرح کو مغربی سرحدوں پر بسنے والوں سے بھی بڑھا دیا تھا، تیسرا یہ کہ سن 1821 سے 1846 کے درمیان امریکہ سے آنے والے تبلیغی اپنے کام کے دوران ہی مارے گئے، اور ان میں سے زیادہ تر پہنچتے ہی ہلاک ہوئے۔ نکلنے سے پہلے تبلیغیوں سے کہا جاتا کہ وہ وقت قریب ہے جب آپ اپنے ملک کے ساحلوں کو چھوڑ دیں گے اور ممکن ہے پھر آپ کبھی یہاں کا رخ نہ کر پائیں، Mary Van Lennep ایک سال کے اندر ہی ہلاک ہوگئی۔

جو مشرقِ وسطی کے لئے نئے ٹھکانوں کا ایک جھلملاتا نظارہ معلوم ہوا تھا وہاں سے موت اور مشکلات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ Asahel کو بھی یہی سب جھیلنا پڑا، بہت جلد اس نے اپنی بیوی اور دو بچوں کو کھو دیا، اس صدمے کے بعد وہ موصل میں اپنا کام نہ کر سکا۔ 1843ء میں کردوں اور ترکوں نے وہاں حملہ کر دیا اور قریب 800 افراد کو ہلاک کر دیا۔ Grant نے تبلیغیوں پر لگنے والے اس الزام کو رد کیا کہ انہوں نے وہاں کے لوگوں کو مسلم حکومت کے خلاف بھڑکا کر اس قتلِ عام کو جلا بخشی ہے۔ اس نے Nestorians کو اور شاید خود کو بھی یقین دہانی کرائی کہ وہ وہاں صرف عبادات میں لوگوں کی دلچسپی بڑھانے کی غرض سے موجود ہیں۔

ان سب مشکلات کے باوجود بھی تبلیغی ریاست ہائے متحدہ میں اتنے پر اثر کیسے ہیں؟، اتنے کہ وہ ریاست ہائے متحدہ کی خارجہ پالیسی پر بھی اپنا اثر رکھتے ہیں؟۔ امریکہ نے کیسے خود کو دوبارہ کھڑا کیا؟، اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو یکجا کیا؟، اور وہ سب دوبارہ تعمیر کیا جو تباہ ہو چکا تھا؟

ایک عربی نے ایک نئے آنے والے تبلیغی پر فقرہ کسا کہ تم امریکی سمجھتے ہو کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو، مگر تم کبھی بھی خدا کو شکست نہیں دے سکتے، اور تبلیغی اس بات سے متفق رہا کہ خدا کو شکست نہیں دی جا سکتی مگر، محنت، اور دولت کے دم پر بھی معجزے دکھائے جا سکتے ہیں۔ خاص کر مشرقِ وسطی میں۔

رستخیز:

تبلیغیوں کے لئے تغیر سن 1840 میں آیا جب یورپیوں نے عثمانیوں کی سالمیت سے ڈر کر

شام اور فلسطین سے مصری افواج کو نکال دیا۔ کسی حد تک ایسا کرنے سے صورتِ حال بہتر ہوئی مگر اقلیتوں کے حقوق جو محمد علی کے وقت میں تھے ویسے ہی رہے۔ اس کے برخلاف یورپیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے سلطان عبدالماجد نے تمام افراد کو بلا امتیاز برابری دینے کا عہد کیا، خواہ وہ کسی مذہب یا قوم سے ہو۔ غیر ملکیوں کو بیت المقدس میں رہنے کی اجازت مل گئی اور پروٹیسٹنٹس کو بھی تسلیم کر لیا گیا۔ تبلیغیوں کے لئے یہ سب کارِ خدا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا، ''اب سے چند سال پہلے جہاں دشمنی اور تضاد تھا وہاں اب برداشت اور مساوات ہے''۔

پابندیوں میں کمی کا سیدھا اثر شام اور لبنان کی تبلیغی سرگرمیوں پر پڑا۔ Bird اور Goodells پھر سے بیروت میں کام کرنے لائق ہوئے اور انہوں نے ولیم ایڈی اور ہنری کی رہنمائی میں آنے والی نسل جو انجیل کے پیروکار تھی اسے خوش آمدید کہا اور ان کے لئے کام شروع کیا۔ ایلی سمتھ نے بائیبل کا عربی ترجمہ کیا اور امریکی عربی زبان کا آغاز کیا۔ ایک دہائی بعد ہی اسکے پریس سے چودہ علاقائی زبانوں میں سالانہ پچاس ہزار کتابیں چھپنے لگی، وہ صرف وہاں کی موسیقی کو اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش میں ناکام رہا۔ اس نے بتایا کہ نا صرف یہ کہ عربی موسیقی میں ہمیں کوئی موسیقیت نہیں ملتی، ہمارے موسیقاروں کے لئے بھی عربی دھنوں کی نقل کرنا غیر ممکن ہے۔

اس کامیابی نے نہ صرف مشرقِ وسطی کی صورتِ حال بہتر بنائی بلکہ امریکہ میں بھی اس کا اثر دیکھنے میں آیا۔

سن 1840 میں تقدیر کے خداداد کے نظریئے کو تقویت ملی جس کے تحت Puritan نے اس زمیں کا دعوی کیا جس کا ان سے خدا نے وعدہ کیا تھا جس کی امریکیوں نے پورے شمالی امریکی برِاعظم کی خاطر حمایت کی، اور اس ہی کے سائے تلے امریکہ کی سترہ ملین آبادی چھبیس موجودہ ریاستوں سے مغرب کے وسیع علاقوں میں پھیل گئی۔ اس نظریہ کی جہت عالمگیر علم بھی تھی۔ اوسلیون نے جس نے ''نظریہ تقدیر'' کی اصطلاح رائج کی تھی، امریکہ کو دنیا میں نیک خوئی، عظمت اور نجات کے لئے معین، اور تضادات کا خاتم ٹھہرایا۔

اس نظریہ نے تبلیغیوں کے مقصد سے میل کھایا۔ ڈوائٹ مارش نے، جو کہ موصل کے مشن کا سربراہ تھا بیان دیا کہ دنیا کی تقدیر امریکہ کی تقدیر سے ملی ہوئی ہے، اور امریکہ کی بچت انسانیت کی نجات میں ہے، انجیل کے پیروکار اس تحریک سے جو ان کے ملک کے لئے جلا بخش تھی سے

خاصے متاثر تھے، خاص کر اس کی سائینسی چھان بین سے، یہ علومِ صنعت کی بیش قیمت ایجادات سامنے لانے والا امریکہ تھا، جس میں چارلس گڈ ایئر اور جیروم کی ایجادات تھیں۔ امریکی تبلیغی نئ اشیا مشرقِ وسطی میں لائے تھے ان میں کیمرہ، سلائی مشین اور ایک مواصلاتی آلہ بھی تھا جسے امریکی بورڈ کے رکن کے بیٹے سیموئل مورس نے ایجاد کیا تھا۔ ولیم گڈیل نے کہا مجھے ان لوگوں کو یوں حیران کرنا پسند ہے، اس طرح اگلی صدی کی طرف ایک قدم اور بڑھایا۔

اس کے علاوہ ریاست ہائے متحدہ کی طرف سے عسکری قوت کے اظہار سے بھی تبلیغیوں میں تیزی آئی۔ مشرقِ وسطی کے لوگوں نے ایلی سمتھ کی مخالفت کی کہا گیا کہ ان کو علم ہونا چاہیے کہ ہم ایک طاقتور قوم ہیں، اور یہ ادراک دلانے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کو ایسا محسوس کروایا جائے۔ جیسے امریکی سرحدوں کو کام کرنے والے واعظ جب حملے سے ہراساں ہوئے تو ریاست ہائے متحدہ کے گھڑ سواروں کو طلب کر لیا گیا۔ Smirh اور ان کے ساتھیوں نے ریاست ہائے متحدہ کی حکومت کو مدد کے لئے پکارا اور ایک جنگی جہاز کا مطالبہ بھی کیا۔ ڈیوڈ پورٹر کی جگہ سن 1842 میں ڈیبنی کارنے لی اور اس نے تبلیغیوں کی ہر ممکن حمایت کرنے کا اعلان کیا، چاہے اس کے لئے اس کو تمام امریکی افواج کو بیروت کیوں نہ بلانا پڑے۔ Carr جو کہ ٹامس جیفرسن کا پوتا تھا اپنے دعوے کا سچا ثابت ہوا، اور ایک سال بعد ہی مصر اور شام کی بندرگاہوں کا دورہ کیا گیا، ان کا حکم تھا کہ وہ وہاں تبلیغیوں کی حفاظت کو یقینی بنائیں اور ان کی ہر ممکن امداد کریں۔

شمالی امریکہ اور مشرقِ وسطی میں تبلیغیوں کا اعتماد بحال ہو گیا تھا، پھر بھی جنھیں مغربی امریکہ میں مستقبل کے قلعے، بستیاں اور شہر بنانے تھے مشرقِ وسطی میں بننے والے ٹھکانوں سے فیضیاب نہیں ہو سکے۔ نہ تو وہ علاقے کی دعویداری کے بارے کچھ کر سکے اور نہ ہی کوئی بڑا کاروبار میں شاہی نظام کی عدم موجودگی اور معاشی حکمتِ عملی نہ ہونے کی بنا پر بھی مشرقِ وسطی کے تبلیغی ممتاز تھے، نہ صرف ان سے بلکہ امریکہ کے دیگر علاقوں اور یورپ کے واعظوں سے بھی جو عموماً حکومتی کارندے بھی تھے۔ ایک فرانسیسی قونصل نے کہا مجھے لگتا ہے کہ ان کا اصل مقصد مذہبی ہے، مجھے اس کے علاوہ کوئی سیاسی مقصد دکھائی نہیں دیتا۔

مشرقِ وسطی میں امریکی تبلیغیوں نے اس نظریہ کو اذہان پر حکومت جمانے کا اجازت نامہ گردانا۔ وہ وہاں اسلام اور مشرقی عیسائیت کو رد کرتے رہے۔ اس علاقے کو لوگوں اور تہذیب

تک ان کی رسائی مروج رہی، پھر بھی ان کی مقصدیت میں کرم فرمائی کی آمیزش رہی۔ ولیم گوڈیل نے لبنان میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ لوگوں کو اپنی استطاعت کے مطابق تنزلی سے نکال کر عروج پر پہچانے آئے ہیں۔

اب کروڑوں امریکی نجات کے حمایتی تھے۔ خونریز خانہ جنگی کے بعد چار دہائیوں میں تبلیغی اپنے عروج پر تھے۔ ان کو محض ملکی حمایت نہیں بلکہ کانگریس اور پریس کی حمایت بھی حاصل تھی اور ساتھ صدر کی بھی۔ کسان، مزدور، طلباء، شمالی، جنوبی سب انکے معتقد تھے، اور کبھی بھی کہیں بھی رضا کاروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس نظریہ کی سچ کے اہم بات یہ تھی کہ امریکی بورڈ کا بجٹ فسک اور پارسن کے دنوں میں 10000 ڈالر سے بڑھ کر نصف صدی تک 250000 ڈالر تک پہنچ گیا تھا۔

صورتِ حال کی بہتری کا اثر سائرس سملینکی کے پاس دیکھنے کو ملا جو ریاست میں سن 1811 کو پیدہ ہوا تھا۔ وہ بچپن میں ہی لاوارث ہو گیا تھا اور بہت چھوٹی عمر میں اس نے کام کرنا شروع کر دیا تھا، مگر ساتھ ہی اس نے تعلیم بھی جاری رکھی اور آخر کار کالج سے اس نے سکالرشپ حاصل کی۔ وہ ہنری ویڈز ورتھ کا پسندیدہ شاگرد تھا۔ خوش جمال Hamlin نظریہِ تقدیر کی تجسیم تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اس ہی مقصد کے لئے تیار کیا مگر پھر وہ انجیل کی تعلیمات کو صنعتی دور سے ہم آہنگ کرنے میں جت گیا۔ اس کے مطابق صنعتکاری کا مقصد محض پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے روحانی فوائد بھی حاصل کئے جا سکتے تھے۔ سن 1840 کو استنبول آ کر اس نے نوجوانوں کو ریاضی اور گرامر کی مبادیات کے بارے بتانا شرع کیا اور ان کو کام کی برکت کی طرف راغب کیا۔

اس کے وہاں آنے سے مذہب کے متعلق، سلطان کے کردار میں اور بھی تبدیلی واقع ہوئی اور نتیجے میں اس کو بیبک میں اپنا اسکول تعمیر کرنے کی اجازت مل گئی، 1842ء کو قریب چالیس طلباء نے وہاں داخلہ لیا، وہ آدھا وقت سکول میں گزارتے اور باقی کے وقت وہ فرینکلین کے تندور، بوسٹن کی طرز کے چوہے دان بنانے اور آٹے کی مل میں کام کرتے ہوئے گزارتے۔ ان کی مخالفت صرف آرمینی باشندوں اور سکول پر پتھراؤ کرنے والے مسلمانوں نے کی جس سے ہونے والے نقصان کا جلد ازالا کر لیا گیا، کہا گیا کہ پرانا کبھی نہ بدلنے والا مشرق اب یکدم آگے بڑھ رہا تھا۔ ہیملن کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا یہی اسکول آنے والے وقتوں میں ترکی کی سب جدید یونیورسٹی بن جائے گا۔

1830ء کی ابتر صورتِ حال کے بعد امریکی تبلیغی اب بہتر حالت میں تھے جنگ سے قبل وہ اپنی بہترین حالت میں آ چکے تھے۔ پوری سلطنت عثمانیہ میں سینکڑوں عیسائی، یہودی اور مسلم طالبِ علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ امریکی پریس کی چھپی ہوئی کتابوں سے امریکی نظریات کو غیر محسوس کن طریقے سے جذب کرتے جا رہے تھے۔ مصری ماہرِ تعلیم رفاع رفیع نے کہا کہ یہ ملک دنیا کا سب سے تہذیب یافتہ ملک ہے، جہاں کے رہنے والوں نے خود کو انگریزی تسلط سے آزاد کر کے خود کو آزاد اور خود مختار بنایا ہے، یہاں ہر مذہب کی عبادت کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ سلطان عبدالمجید کی درخواست پر تبلیغیوں نے وہاں امریکی طرز کا ایک کیڈٹ کالج بھی تعمیر کیا۔ زبان سیکھ لینے کے بعد نوجوان افسران ریاست ہائے متحدہ کے مینول اور ہیملٹن جیفرسن اور پین کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے تھے۔

مشرقِ وسطی کے عوام کو اپنے مذہب سے قریب لانے اور تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ تبلیغی اپنے وطن کے لوگوں کے اذہان بھی منور کرتے رہے۔ لاتعداد خطوط، مضامین اور رپورٹوں کی مدد سے وہ مشرقِ وسطی کا تفصیلی نقشہ امریکیوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ یہ روابط ایڈورڈ سا سبری کے بھی کام آئے جو سن 1841 میں، قومی سطح پر عربی زبان کا پہلا معلم بنا۔ اس نے شام اور سلطنتِ عثمانیہ کے دیگر علاقوں میں تعلیم کے لئے تبلیغیوں کا ساتھ دیا۔ اس نے کہا کہ مغربی مما لک مشرقی ملکوں کے مقروض ہیں کہ ان کی تہذیبوں نے انہیں بہت کچھ دیا ہے، اور اب وہ وقت ہے کہ اس احسان کا بدلا اتارا جائے۔

ان کامیابیوں کے باوجود تبلیغیوں کو روزانہ کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ولیم ایڈی نے شکایت کی کہ یہاں ریلوے کا کوئی نظام نہیں ہے، نظریات اور بوجھ، دونوں ہی اونٹوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کئے جاتے ہیں۔ تبلیغیوں کے کچھ شدید ترین مخالفین کا تعلق مشرقِ وسطی سے نہیں بلکہ ان کے اپنے امریکی بورڈ سے بھی تھا۔ بورڈ کے کچھ پرانے اراکین کا خیال تھا کہ کتابوں اور دواؤں پر ساری توجہ مبذول کر کے ان کا دھیان۔ نجات کے اصل مقصد سے ہٹتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر تھارنٹن کرک لینڈ نے، جو کہ ہاورڈ کے سابقہ صدر تھے، 1842ء میں، شام کے دورے سے واپسی پر واضح کیا، ''کیا عیسائیت کو لوگوں کے سامنے اس کی سادہ ترین شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے؟، اسکولوں کی تیکنیک کے علاوہ بھی لوگوں میں زیادہ مقبول ہو سکے

''۔تبلیغیوں نے جواباً کہا کہ اس طرح ان کو علاقائی لوگوں کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے اور ایک بہتر ذہنی اور روحانی فضا قائم ہوتی ہے جو مستقبل میں آنے والی تبدیلی کے لئے موزوں ہے۔ کرک لینڈ کی بیوی الیز بتھ نے اپنے شوہر اور بورڈ دونو کی مخالفت کرتے ہوئے تبلیغیوں کی حمایت کی۔ اس نے کہا کہ ان عظیم لوگوں نے سکول تعمیر کر کے عیسائیوں کے لئے فضا بنائی ہے اور امریکی تبلیغی اس سے زیادہ عزت کے حقدار ہیں۔

اس سوال کا جواب نہ تو بورڈ دے سکتا تھا نہ ہی تبلیغی، بلکہ اس کا جواب مشرقِ وسطیٰ کے عوام دے سکتے تھے جو وہاں اعلیٰ تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں کے خواہاں تھے۔ اگر چہ وہ ان کے مذہبی پرچار کی طرف توجہ نہ بھی کرتے تو بھی وہ ان کے دیگر کاموں کی ستائش کیا کرتے وہ عمومی طور پر ان کی موجودگی کو قبول کر چکے تھے۔ اس کشادہ دلی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی امریکی وہاں آئے۔ انہیں میں دو، دو نسلے بھی شامل تھے جن میں سے ایک تبلیغی سائینسدان تھا اور دوسرا تبلیغی سپاہی۔

مقدس جنت کی مہمات:

اونٹ کی پشت پر سوار، دھول میں اٹا ہوا غیر روایتی مہم جو نہ تو چوڑے سینے والا جون لیاڑو تھا نہ ہی جارج انگلش وہ چھیالیس سالہ خطاطی کا پروفیسر موٹا ایڈورڈ رابنسن تھا۔ صحرا کے کئی نظاروں کی طرح یہ نظریہ بھی سراب معلوم ہوتا تھا، ایڈورڈ اپنے قطب نما اور بائبل کے ساتھ، اس سورج کی تپش میں آٹھ گھنٹے تک سفر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے گزشتہ مہینہ سینا کے پہاڑوں کو عبور کرنے میں گزارا تھا۔ بنا شکایت کئے وہ وہاں کے نظاروں کو دیکھتا آگے بڑھتا اور خود کو یاد دلاتا کہ کبھی موسیٰ بھی انہیں راستوں سے گزرے تھے۔ آخرِ کار، مارچ 1838 میں وہ اس ریگزار سے نکل کر اس رومانوی سرزمین تک پہنچا، اس نے شہر کا اور عقبہ کے پانیوں کا نظارہ کیا اس نے کہا کہ وہ اس وقت اپنے آنسو نہیں روک سکا۔

رابنسن ان امریکیوں میں تھا جو خانہ جنگی سے دہائیوں پہلے مقدس سرزمین کی طرف آئے تھے۔ آنے والوں کی مدد کے لئے ریاست ہائے متحدہ نے فلسطین میں اپنے چھ سفیر مقرر کئے تھے۔ یہ مغربیوں کی سب سے بڑی نمائندگی تھی۔ ان اقدامات کو آنے والے تبلیغیوں نے، سیاحوں نے سائنسدانوں نے گو کہ سب ہی نے پسند کیا جو اس نئی کشادہ دلی کو خبر سنتے ہی یہاں

کھنچے چلے آئے تھے۔

ان میں سے زیادہ تر خبروں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ ولیم ٹامسن نے، جو ایک تبلیغی تھا، جس کے خطوط میں فلسطین کے بارے میں تندی تھی، اور جس نے بعد میں بیروت کے لئے ملک کو خیر باد کہا، ''The Land and the Book'' تحریر کی جس میں اس نے اس سرزمین کو پرشوکت برف پوش پہاڑوں کی جنت کہا، جہاں کے سفید میدان حسین پھولوں سے سجے تھے، جن کے حسن میں دریا اور ندیاں جس کے اضافہ کرتے تھے۔ اس کتاب کی تیس جلدیں ریاست ہائے متحدہ میں خریدیں گئیں جنہوں نے فلسطین کے بارے میں وہاں حسین فضا بنانے میں اہم کردار ادا کیا، مگر یہ فضا زیادہ عرصے قائم نہیں رہ پائی کیونکہ آنے والے امریکیوں نے وہاں اس سے بھی زیادہ دلکش نظارے دیکھے۔ جافہ سے امریکی قونصل نے کہا کہ دنیا میں ایسا دوسرا کوئی ملک نہیں ہے جس کے بارے میں اتنا زیادہ لکھا گیا ہو اور پھر بھی اس کے بارے میں بہت کم معلوم ہوا ہو۔

ایڈورڈ رابنسن ان سب سے مختلف تھا اور کانگریس سے تعلق کی بنا پر اس نے مذہبی تخلیقات کو اپنے سائنسی تجزیئے پر حاوی نہ ہونے دیا تھا۔ بچپن میں جب وہ ایک کھیت میں کام کیا کرتا تھا، اس مقدس سرزمین کا سفر کرنے کے سپنے دیکھا کرتا تھا، بڑے ہو کر اس نے عہد کیا کہ وہ روایات کے ان نقوش کو مٹائے گا جو غیر ملکیوں سے سے ماخوذ ہیں اور مشکوک ہیں، اور اس سرزمین کو گھیرے ہیں۔ صوفی عسائیوں نے قدیم اسرائیل کے ایک نقشے کو امریکیوں پر تھوپنا چاہا اور بعد میں آنے والے رابنسن نے اس کی تاریخی اہمیت اور صداقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

عربی بولنے والے تبلیغی Eli کے ساتھ مل کر جنوب میں اس علاقے کی جانب روانہ ہوا جس کو اب مغربی کنارا کہا جاتا ہے۔ وہاں کی اخلاقی پستیوں اور وہاں کے رہنے والوں نے اسے مایوس کیا، اس کے باوجود اس کے لئے ان بستیوں میں ایک مانوسیت تھی، یہ ایسا تھا جیسے کسی پرانے خواب کا سچ ہو جانا اور یہ جذبات 14 پریل سن 1838 کو شدت پکڑ گئے جب وہ سمتھ کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوا جہاں اس کا استقبال آٹھ تبلیغی خاندانوں نے کیا، یہ پروٹیسٹینٹس کا اب تک کا سب سے بڑا مجمع تھا۔

رابنسن نے وقت ضائع نہیں کیا اور اگلی ہی صبح وہ سوفٹ لمبی ٹیپ تھامے ہوئے تھا، اور بیت المقدس کی دیواریں ناپ رہا تھا۔ بائبل اور دیگر قدیم صحیفوں کی مدد سے اس نے سولومن پول ا

اور دیگر مقدس مقامات کی نشاندہی کی، بیماری کے باوجود وہ 1750 فٹ کی تنگ سرنگ سے گزر کر پرانے شہر میں قوی ہیکل موجود Virgin's Fountain تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے وہ قوی ہیکل پل بھی دریافت کرلیا جو کبھی ہروڈ کے مندر تک جاتا تھا، اور اب وہ Robinson's Arch کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بعدازاں وہ شہر کے اندر مہم پر روانہ ہوگیا وہ قدیم عبارتوں کا متلاشی تھا، اس کے مطابق ان کے عربی ناموں میں وہ عبرانی بازگشت موجود ہے جو ان کا اصل ہے۔ اسی طرح عربی گاؤں السموع میں اس نے انجیلی باقیات بھی ڈھونڈ نکالیں۔ اس نے دریافت کیا کہ الجش دراصل Gush Halav ہے اور الجیب حقیقت میں گیبون جہاں یسوع نے سورج کو ٹھہرا دیا تھا۔ رابنسن نے جس کو ایک تبلیغی نے باران پیما کے عظیم ترین ماہر ہونے کا اعزاز دیا، شاندار ماضی کو حال میں سب کے سامنے لا کھڑا کیا۔

اس نے سن 1852 کو فلسطین میں اپنا دوسرا دورہ کیا جس میں اس نے اپنی ریسرچ کو دو جلدوں میں چھاپا اور لندن رائل جیوگرافکل سوسائٹی کی طرف سے امریکہ کا پہلا گولڈ میڈلسٹ بن گیا۔ اس نے آرکیولوجی کی ایک بالکل نئی شاخ، انجیلی آرکیولوجی کی بنیاد ڈالی جس کو پڑھے لکھے معلم اور کم پڑھے لکھے پادری دونوں پڑھ سکتے تھے۔ اس سب نے دوسرے امیرکیوں کو بھی فلسطین آنے کے لئے اکسایا جو رابنسن جیسی چاہ رکھتے تھے۔

انہی میں ایک ولیم فرانس لنچ بھی تھا جو بحری فوج کا کمانڈر تھا، وہ شدید عیسائی اور مہم جوئی کا دلدادہ تھا اور شمالی امریکہ اور مشرقی علاقے دیکھ چکا تھا۔ وہ رابنسن کا ہم عمر تھا مگر دیکھنے میں اپنی روشن آنکھوں اور ہلکی داڑھی کے ساتھ وہ ورجینیائی معلوم ہوتا تھا۔ مئی 1847 میں میسکسیکو کی جنگ سے اکتا کر اس نے فلسطین کے دورے کی درخواست دی۔ اس نے کہا کہ وہ الجلیل کے سمندر سے بحرِ مردار تک پورے دریائے اردن کا سفر کرنے والا پہلا مغربی باشندہ ہوگا۔ اس کی علمی اور ورحانی اہمیت کے علاوہ اس کا ماننا تھا کہ اس دورے سے امریکہ اور مقدس سرزمین کے درمیان تعلقات مضبوط ہوں گے اور اس طرح عالمی سطح پر بھی فوائد حاصل ہوں گے۔

اپنے چنے ہوئے پانچ افسروں اور نو مضبوط، طاقت ور، محنتی اور خالص امریکی جہاز ران عملے کے ساتھ وہ نیویارک سے استنبول کی طرف روانہ ہوا۔ وہ عبدالمجید کی عدالت میں پیش ہوا جہاں تلوار نہ اتارنے پر اس کو ذرا مشکل کا سامنا کرنا پڑا مگر تھوڑی ہی دیر مین اس نے صدر کی

طرف سے بھیجا جانے والا تحفہ اور ایک امریکی ہندوستانی البم دے کر سلطان کا دل جیت لیا جس کے بدلے میں اسے محافظ فراہم کئے گئے۔ اس نے اس پر تکیہ نہیں کیا اور بیروت پہنچ کر Henry James کی مدد لی جو کہ ایک تبلیغی طبیب تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی گولی سے زخمی ہونے کی صورت میں دوہ اس کے بہت کام آسکتا ہے۔ اس نے کچھ اور محافظ بھی کرائے پر رکھے اور بہت سا اسلحہ خریدا، تمام اسلحہ، سائنسی آلات، اور خیمہ زنی کا ساز وسامال جانوروں پر لاد دیا گیا، ساتھ ہی دو فولادی کشتیاں بھی جانوروں پر لادی گئیں۔ Acre کے شہر سے نکلتے وقت یہ قافلہ تیس میل کے گنجان عالاقے سے گزرا، اس سفر نے ان کو تھکا مارا، مگر اس کے باوجود وہ اپنے عزائم کو مناجات اور دوسری موسیقی گا کر تقویت دیتے رہے۔

انہوں نے کہا، ہم نہ تو کسی عربی سے ڈرتے ہیں، نہ ہی کسی وبا یا بیماری سے، نہ تو سورج کی تپش سے اور نہ ہی تپتی ریت سے موئٹیگو کے مطابق ان کا کمانڈر انسان دوست، رحم دل اور سمجھدار انسان تھا، وہ ایک ہیرو تھا جو بس آگے بڑھنا جانتا تھا، وہ ایک سچا امریکی تھا۔

لنچ کو بھی یہ سب دیکھ کر جذبہ ملا، اپنے قافلے کے اوپر لہراتے ستارے اور دھاریوں سے لے کر الجلیل کے سمندر تک سب کچھ اس کے جذبات کو جلا دیتا تھا، یہ سوچ کہ وہ اس ہی جگہ پاؤں رکھ رہا ہے جہاں کبھی یسوع مسیح نے پیر رکھے تھے اور ان ہی پانیوں میں ہے جہاں کبھی یسوع مسیح چلا کرتے تھے، اور ساتھ ہی یہودی قبیلے کے ایثار نے بھی اس کے دل میں گھر کرلیا تھا۔ ایک امیر سرمایہ دار وائز میننے ان کو اپنے گھر دعوت پر بلایا اور ان کی خوب خدمت کی جس کے ایک ہفتے بعد، 19 اپریل 1848 کو لنچ اور اس کے ساتھیوں نے وائز مین کو الوداع کہا اور فولادی کشتیوں میں سوار ہوگئے۔

لنچ نے بیان دیا کہ ساحل سے وہ بس ایک ہی نظارہ رہا ہوگا، بادبان لگاتے ہوئے جہازی، سفید سایہ بان، ایک ساتھ ایک رفتار سے چپو چلاتے ہوئے لوگ جو اردن کے ہرے پانیوں میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ فولادی کشتیاں خاص ان دریاؤں کا زور سہنے کے لئے بنائی گئی تھیں، ساتھ ہی ایک لکڑی کی کشتی بھی رکھی گئی تھی جسے Uncle Sam کا نام دیا گیا تھا، دریا نے واقعی تندی دکھائی اور کناروں کو مسلح افراد نے گھیر لیا۔ لنچ نے وہ وقت یاد کیا جب وہ اجنبی بیابان میں تھے جہاں بربریت پسند عرب جنگوا سے، اس کی تلوار، اس کی بندوق کو بار بار آمادہ کر رہے تھے۔

اس کے باوجود بھی لنچ کے اندر موجود سائینسدان اسے دریا کی گہرائی، درجہء حرارت کے درست اندراج کے لئے دردسر رہا تھا۔ رابنسن کی طرح وہ بھی ان مقامات کی نشاندہی ٹھیک ٹھیک چاہتا تھا جن کا ذکر بائیبل میں تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کے گردوہ زمین پھیلی ہوئی ہے جہاں یعقوب کی جنگ فرشتے سے ہوئی تھا، جہاں سے اسرائیلی گزرے تھے، جہاں پر یہ تمام مقدس روایات تھیں، خون آلود قدموں کے نشان تھے اور نجات دلانے والے کا مقبرہ۔

چھ دن گزرنے کے بعد تھکے ماندے مگر پرجوش جہازی اریحا کے نزدیک پہنچے۔ لنچ کا ماننا تھا کہ صلیبی جنگوں سے اب تک یہاں کوئی عیسائی نہیں پہنچا، ان پر حملہ ہوسکتا تھا۔ ایک حکمتِ علمی کے تحت جو اس نے دورانِ جنگ، مغربی امریکہ میں ریڈ انڈینز سے سیکھی تھی تمام جہازی عملے اور کشتیوں کو ایک دائرے میں رکھا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کہ مداخلت صرف کچھ درجن عیسائی زائرین کی طرف سے ہوئی جن مین دو امریکی بھی تھے جو اپنے کپڑے پھاڑ کر اردن کی طرف لپکے۔

اس کے بعد قافلے نے اپنا باقی بیس میل کا سفر جاری رکھا اور وہ بحرِ مردار کی طرف بڑھتے رہے۔ منٹگو نے لکھا کہ ان کے آدمی وہاں سکون سے آگے بڑھ رہے تھے اور اپنی سہولت کے مطابق اس دوران مرغی تیار کر سکتے اور اخبار پڑھ سکتے تھے۔ Lynch کو اردگرد کے صحرا اور تازہ پانی کی کمی نے پریشان کر رکھا تھا، اس نے کہا کہ بلاشبہ ان پانیوں پر خدا کا عتاب ہے۔

اس نے اگلے تین دن بحرِ مردار کے پانی پر تجربے کرتے گزارے جس کے بارے مین وہ سوچتا تھا کہ اس میں طبی خصوصیات ہیں۔ قرمان اور مسدا کے کھنڈرات سے ہوتا ہوا وہ کیراک تک پہنچا جو کہ اب اردن ہے، جہاں صلیبی جنگوں والے عظیم عیسائی مسلمان اکثریت سے تنگ تھے۔ بیحد مصروفیت کے باوجود اس نے صحرا کی حسین راتوں سے لطف اندوز ہونے کا وقت نکال ہی لیا اور اس دوران میں وہ اپنے ملک سے بھی رابطے میں رہا جس سے اسے جون کوئنسی ایڈمز کی موت کی خبر ملی، ماحول نے اس افسوس ناک خبر کو اور زیادہ افسوسناک بنایا اور قافلے نے اظہارِ افسوس کے طور پر پرچم کو عارضی طور پر سرنگوں کیا۔

10 مئی کو لنچ نے وہی پرچم جہاز کے لنگر پر گاڑا اور کشتیاں کھول دینے کا حکم دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی وہاں سے بیت المقدس، ناصرہ اور قیصر کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں بھی اس کے جذبات دوسرے زائیرین کی طرح تھے جن میں جمالیاتی کراہت اور روحانی فرحان و تکبر کی

آمیزش تھی، اس دوران سفر مضمحل کر دینے والا ثابت ہوا اور جب تک قافلہ دمشق پہنچا Lynch کے آدمیوں کو بخار نے حواس باختہ کر دیا تھا، ان مین سے ایک افسر جے بی ڈیل بیروت میں ایلی سمتھ کے گھر ہلاک ہوگیا تھا جسے ولیم ٹامس نے دفن کیا۔

خلافِ توقع نیویارک میں Lynch کا استقبال ملے جلے جذبات کے ساتھ کیا گیا۔ وہ ناقدین جو ریاست ہائے متحدہ کی فوج کو میکسیکو بھیجنے پر صدر سے نالاں تھے اب عوام الناس کے سات سوڈالر ایک اور حماقت پر ضائع کئے جانے پر تنقید کر رہے تھے۔ اس سفر سے متعلق Lynch کی یادیں بے تحاشہ فروخت ہوئیں، وہ سخن سازی کا ایک انوکھا نمونہ تھا جس کا کچھ حصہ بیانیہ تھا اور کچھ حکیمانہ مگر لب ولہجہ کے اعتبار سے اس میں سختی کا تسلسل اول تا آخر قائم رکھا گیا تھا۔ عربوں کے متعلق اس کی رائے ظالمانہ حد تک سخت تھی، ''عرب کا واحد جنون سونا ہے جسے وہ نہتے اجنبیوں کے ہاتھوں سے جھپٹ سکتا ہے اور بے فکر دوست کو چکما دے کر حاصل کر سکتا ہے''۔ ساتھ ہی وہ فلسطینی کی معاشیات کے بارے میں شیخی بگھارنے مین اتنا ہی متعصب تھا۔ اس نے اس مقدس سرزمین کی ترقی کے لئے کئی منصوبے پیش کئے جن میں ایک وہاں افریقی امریکیوں کی، اردن کی وادی میں کاشتکاری کے لئے واپسی کا تھا۔ اس کے مطابق ان منصوبوں کی کامیابی کا سارا دارومدار حفاظت پر تھا اس نے لکھا ''پچاس معیاری اسلحے سے لیس جاں باز پورے ملک میں انقلاب لا سکتے ہیں''

اس نے اپنی کتاب کا خلاصہ یہودیوں کی فلسطین میں واپسی کو یقینی بنانے کی پرزور اپیل سے کیا۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اینڈریوسن نے کہا کہ یہ یہودیوں کی تقدیر ہے کہ وہ عربی تہذیب میں داخل ہوں، اور پورے خطے کو نئے سرے سے جوان کر دینے کی بھی یہی ایک واحد ترکیب ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دعویٰ کیا کہ یہودی اثرات اس علاقے میں جسے عربی شام کہتے ہیں ترقی لائیں گے جو کہ مشرق کی تجارت کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے بہتر ہوگا۔

فلسطین میں وقت کی تکمیل:

فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے کا مدعا نہ تو ریاست ہائے متحدہ کے لئے نیا تھا نہ ہی بنیادی۔ اس سے پہلے انجیلیوں کے متعلق یہی سوچ چرچ سے سامنے آچکی تھی۔ جہاں زیادہ مستحکم موحدین اور کلیسائی اسقفیوں نے اس سے اجتناب برتا غیر مقلدین، مجلسیوں اور کلیسائی نظامِ

حکومت کے پیروکاروں نے اس کو پسند کیا۔ بہت سے امریکیوں کا ماننا تھا کہ یہودی پہلے ہی اپنے وطن لوٹنے میں مصروف ہیں، وہ ایک کم آبادی والا علاقہ ہے جہاں کروڑوں لوگوں کی گنجائش ہے۔ برطانوی Lord نے ،،بے زمین لوگوں کی خاطر بنا لوگوں کی زمین کا نعرہ لگایا،،۔ جون 1838 کو ٹامس رابنز نے لکھا کہ یہودیوں میں غیر معمولی حرکت محسوس کی جاسکتی ہے، وہ فلسطین کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ Long Island سے تعلق رکھنے والی سارا ہائٹ نے جو سن 1830 میں مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر تھی لکھا ،،خدا کے اپنے افراد کو عبادت گاہ کی تعمیرنو کے لئے یکجا ہونا چاہیے تا کہ وہ اپنی عبادت گاہ میں عبادت کرسکیں،، اس نے غیر یہودیوں کا وقت پورا ہونے کی پیشنگوئی کی۔

سن 1844 کی تحریروں میں تحریک احیاء/بحالی کی سب سے زیادہ ترویج کی گئی نیویارک یونیورسٹی میں عبرانی کے پروفیسر پادری جارج بش نے اس سلسلے میں، the Dry bones of Israel revived جیسی تحریریں پیش کیں۔ حضرت محمد ﷺ کی سوانح عمری لکھنے والے اس شخص نے اپنی تحریر میں ان کو Pseudo prophet قرار دینے کے باوجود اعلیٰ کردار کا شخص بیان کیا وہ یہودیوں کو رفعت بخش کر دنیا کی عظیم ترین قوم کہلوانے کا متمنی تھا اور ایسا فلسطین میں ان کی بحالی کے ذریعے ہی ہوسکتا تھا اس نے پیشن گوئی کی کہ اس میں تمام عالم کا فائدہ ہے اور اسطرح انسانیت اور خدا کے بیچ ربط پیدا کیا جاسکتا ہے اور اسطرح ہر طرح کے سچ کو خواہ وہ کسی زبان میں بھی ہو سچ کی نمائش کی جاسکتی ہے۔ ناقدین سے یہ کتاب بھی نہیں بچ سکی Princeton Review نے بیان دیا کہ "عیسائیت میں یہودیوں کے احیاء کا یقین سالوں سے جڑ پکڑ رہا ہے" اس کے باوجود زیادہ تر امریکی جارج بش پر یقین رکھتے ہیں جس کے نام سے دوبارا اس ملک میں صدر آئے وہ یہودیوں کی قومیت کے خواب پر یقین رکھتے ہیں۔

بُش کے لئے یہودی پالیسی کو رائج کرنے میں عیسائیوں کا کردار دعاؤں تک محدود تھا یا زیادہ سے زیادہ یہودیوں کو فلسطین واپسی کی آمادگی تک کچھ نے بہر حال نوآبادی میں اس سے بڑھ کر کردار ادا کیا وہ ازخود مقدس سرزمین تک سفر کرتے، وہاں رہائش اختیار کرتے، اور یہودیوں کی واپسی کی تیاریاں کرتے۔

اسی کی ایک مثال امریکہ کے ایک سب سے زیادہ متنازع فرقہ سے تعلق رکھنے والے

جوزف سمتھ سے ملی جو اس تحریک کا بانی بھی تھا وہ تحریکِ احیاء سے مخلص تھا اور اکتوبر 1841 میں اس نے اپنا ذاتی قاصد بیت المقدس روانہ کیا زیتون کے ٹیلہ پر اس قاصد ہائیڈ نے ایک مقدس چبوترہ قائم کیا اور خدا سے دعا کی کہ "وہ اسرائیل میں یہودی ریاست کا قیام یقینی بنائے اور انہیں بحال کرے اور یروشلم کو اس کا دارالخلافہ بنا کر اس قوم کو پسندیدہ بنائے"۔ اس تحریک Mormon کے ماننے والوں نے اس دعا کو اپنے نصاب میں شامل رکھا اور اس مقام پر ایک یونیورسٹی قائم کی۔ کارسن جو ہائیڈز سے بھی زیادہ متحرک تھا مستقل فلسطین میں رہا اور یہودیوں کی واپسی کے لئے اس نے اپنی تمام زندگی وقف کردی چھیالیس سال کی عمر سے پہلے وہ بھی Mormon کا ماننے والا تھا مگر بعد میں اس نے تحریک احیاء کے لئے کام کیا اسی سال وہ ہمرڈیکائی سے ملا جو کہ کبھی تونس میں کونسل تھا اور تب سے وہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے کام کررہا تھا، ناکام ہونے اور تھک جانے کی بنا پر اس نے عیسائیوں کے لئے کام کرنا شروع کردیا تھا اس نے کہا کہ ہم اسرائیل کے بچوں کی آزادی کے لئے امریکہ کی جھولی کے سوا اور کس سے امید رکھ سکتے ہیں کارسن کا یقین تھا کہ ریاست ہائے متحدہ کو خدا نے خاص کر یہودیوں کی مدد کے لئے بنایا ہے اور امریکی عقاب یقیناً انکا مددگار رہے جس کے پر اس سرزمین پر سایہ فگن ہیں اسرائیل آنے کے سوانجات کا کوئی راستہ نہیں

وہ مستقل اسٹیٹ سیکریٹری کو یروشلم میں امریکی کونسل بننے کی درخواست بھیجتا رہا یہ درخواست اسٹیٹ کی تبلیغیوں میں سے امریکی سفیر چننے کی تلاش میں کارگر ثابت ہوئی جب انہوں نے اس کی منظوری اور قابلیت دیکھی 22 جون 1844 کو وہ امریکی پرچم اور سفید فاختہ کے ساتھ جسے وہ وہاں پہنچ کے رہا کرنے کا خواہاں تھا کارسن روانہ ہوا اس نے کہا کہ وہ اپنی جوان بیوی چھ بچوں بہترین زمینوں اور ہر آسائش کو چھوڑ کر نکلا ہے لیکن وہ خدائی روشنی جو یہودیوں کے بھلے کے لئے اسے نظر آتی ہے سب سے اہم ہے

فلسطین پہنچ کر اس نے یروشلم میں قیام کیا اور اپنی مہر تیار کی اس نے وہاں یہودیوں کے لئے امریکی تحفظ کو بڑھایا جن میں سے زیادہ تر امریکی امداد کے بھروسے پر تھے اس دوران کیلھون نے یہ سن کر کہ Cresson ایک کمزور دماغ کا آدمی ہے اس کی وہاں تعیناتی کو منسوخ کر دیا کارسن نے اس کو نظرانداز کرتے ہوئے یہودیوں کی مدد جاری رکھی اس نے کہا کہ جلد ہی اس کا ملک یورپی طاقتوں سے مل کر یہودی ریاست کو آزادی دلائے گا۔ شام کے بارے میں اسکو صرف اتنا ہی علم تھا

جتنا اس نے پڑھا تھا۔ تھیکرے جو کہ Vanity Fair ناول کا مصنف تھا اور اس سے مل چکا تھا نے لکھا کہ "شاید ہی کسی ملک کو اتنا انوکھا سفیر ملا ہو"

کارسن اس دوران آنیوالوں کو اپنے یہودی قومیت کے نظریات سے متاثر کرتا رہا مگر وہ وہاں سکونت اختیار کرنے والا واحد امریکی نہ تھا نہ ہی وہ سب سے انوکھا تھا اتنی ہی انوکھی ایک ناول نگار گا ئیک شاعر اور واعظ Harriet Livermore تھی۔

نیو ہمپشائر سے تعلق رکھنے والی شوخ چنچل ہیرٹ جو اب ایک باوقار عورت تھی سن 1812 کے بعد آنیوالوں سالوں میں کئی لوگوں کے دلوں میں گھر کیئے ہوئے تھی ایک فوجی ڈاکٹر سے دھوکہ کھانے بعد اس نے عشقِ مجازی کو خیر باد کہا اور عشقِ حقیقی کی طرف راغب ہوگئی۔اس نے کہا کہ وہ دنیا سے تھک کے مذہب کی طرف آئی ہے کچھ عرصے تک وہ کانگریشنل رہی اس کے بعد پرسیا ئیٹرین ہوگئی اور آخر کار کلیسائی نظام اختیار کیا اور اپنا ایک فرقہ بنایا وہ اپنے آپ کو ریڈانڈین کے لیے پیمبر گردانتی تھی جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ آخری دس قبیلوں کی نسل سے ہیں یہی لوگ اس کے ناولوں میں جگہ پا گئے،اس کے ناول کئی بااثر لوگوں کی مدد سے چھپے اور کہا گیا کہ وہ بہترین واعظہ ہے اور اس کی موسیقی سے کوئی ایک زبان انصاف نہیں کرسکتی ۔اس کی زندگی میں اہم تبدیلی دس سال بعد آئی جب یہودیوں کے فلسطین میں واپس آنے کی خبروں نے اسے مشرقِ وسطیٰ آنے پر اکسایا اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی ضمانت کے ساتھ وہ استنبول میں ڈیوڈ پورٹر سے ملی اور بیروت کے لئے روانہ ہوگئی۔شہر کے شمال میں وہ لیڈی ہیسٹر کے پاس رکی، جو کہ ایک پچاس سالہ برطانوی تھی اور کبھی اپنے چچا William Pitt کی سیکریٹری رہ چکی تھی اور مشرقِ وسطی اس ہی امید سے آئی تھی کہ یہودیوں کو وہاں آباد ہونے پر آمادہ کر سکے،مگر آخر کار وہ لبنان کی ایک نن بن کر رہ گئی تھی دونوں خواتین ایک جیسی ہونے کے بوجود اس بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتی تھیں کہ دونوں میں سے کون لارڈ کے ساتھ یروشلم جانے کی اہل ہے۔

یہاں سے وہ مقدس شہر کی طرف روانہ ہوئی اور اس نے زیون نے ٹیلے پر اپنی رہائش کا انتظام کیا۔وہ وہاں سے ایک تعلیمی کالونی کی تعمیر پر نظر رکھنا چاہتی تھی۔تحریکِ احیا کے کئی ماننے والوں کی طرح وہ بھی جیفرسن کے نظریئے سے متفق تھی۔وہ اس کالونی کی تعمیر مکمل کر کے باقی عمر عبادت میں گزار کر شہادت کے حصول کی خواہاں تھی۔

کالونی کے لئے فنڈ جمع کرنا اس کی سوچ سے زیادہ پیچیدہ ثابت ہوا اور اس کے سارے ذرائع جلد ہی ختم ہو گئے۔محض اشیائے خوردونوش،ادھارا تارنے اور زیون واپسی کے لئے کافی پیسے کمانے کے خاطر اس نے اپنے خطبات کی کاپیاں فرخت کرنے کی کوشش کی مگر یہ بے سود رہا اور وہ جلد ہی یروشلم کی گلیوں میں بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئی،اور آخرِ کار دل شکستہ ہوکر ریاست ہائے متحدہ لوٹ گئی۔سب 1868 میں اس نے ایک پناہ گاہ میں وفات پائی،کچھ لوگ اسے شہید مانتے ہیں۔

تحریکِ احیا پھر بھی زندہ رہی،جس دوران لیومور یروشلم میں صعوبتیں جھیل رہی تھی ایک اور امریکی شہر میں وارد ہوا، وہ بھی کالونی کی تعمیر میں خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔دراز قد کا جیمز ٹرنر مجرمانہ حد تک رحم دل شخص تھا وہ ایک طبیب،ایک موجد اور فنِ تعمیر کا ماہر تھا۔لوگ اس کی خطاطی کے دلدادہ تھے اور ان کے مطابق وہ لارڈ کی دعا کو اس باریکی سے تحریر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا کہ وہ ایک پانچ سینٹ کے سکے پر مکمل آجائے۔اس کی اصل کامیابی سن 1831 میں سامنے آئی جب اس نے جیفرسن کی املاک خریدیں جن میں تعمیرِ نو کی گنجائش نہیں بچی تھی۔ریشم کی پیداوار سے دوبارہ سب کچھ شروع کرنے کی اس کی کوشش رائگاں ثابت ہوئی پھر وہ مذہب کی طرف آ کر پریسبا ئیٹرین ہو گیا اور بعد میں Cambellite ہو گیا جو کہ عیسائیوں کو بحال کرنے کی ایک تحریک تھی،سن 1850 میں وہ فلسطین کے دورے پر آیا۔

لیومور کی طرح اسے بھی فنڈا کھٹے کرنے مین دقت ہوئی اس لئے تنگ آ کر وہ اپنے تعمیری پیشے کی طرف لوٹ گیا۔اور وہ گنبد صخرا کی آرائش میں جت گیا۔اس نے سب سے زیادہ خریدی جانے والی کتاب The City of The Great King بھی تحریر کی،جس میں ٹامس ولیم کی طرح یروشلم کی اچھائیاں بیان کی گئیں تھیں۔اور Bush کی طرح یہودیوں کی بحالی کا ذکر تھا۔اس نے کہا کہ خدا اپنے بندوں کو نہیں چھوڑ سکتا اور عیسائیوں کو ہمارے ساتھ چلنا چاہئے کیونکہ انہیں خبر ہے کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔

ان مبالغہ آرائیوں نے ناکامیوں سے لوگوں کی نظر ہٹا کر انہیں یروشلم میں یہودیوں کی واپسی میں مدد پر آمادہ کیا۔دیگر انجیل کے پیروکاروں نے وہاں کامیاب ہونے کی کوشش کی جہاں لیومور اور بارکلی کالونی کی تعمیر میں ناکام ہوئے تھے۔ان میں سب سے نمایاں تھی، وہ سے اسقفی اور ایک امیر کاروباری کی بیوی تھی۔ادھیڑ عمری میں وہ بعثنی ہوگئی اور آخری دنوں کی تیاری

کرنے لگی۔اس نے اندازہ لگایا کہ بہت سے عیسائی یہودیوں کے لئے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کی مدد کے لئے صحیح وقت کے منتظر ہیں، جو کہ اس کے مطابق سر پر کھڑا ہے، سن 1815 کو وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر فلسطین کے لئے روانہ ہوگئی۔اس نے کہا،''میرے دل میں احساسِ جرم بڑھتا جا رہا تھا کہ خدا مجھے وہاں بلا رہا ہے''۔

جافہ پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ میشولم سے ملی جو کہ ایک برطانوی یہودی تھا اور ابھی ابھی عیسائی ہوا تھا اور یہودیوں کے متعلق اس کی طرح سوچتا تھا۔اس کی کوششیں بھی اپنے سے پہلے آنے والوں کی طرح فنڈ نہ ملنے کی بنا پر رائگاں گئیں۔وہ مستقل ریاست ہائے متحدہ میں اپنے دوستوں سے درخواست کرتی رہی جنھوں نے سات رضا کار اور قریب دو سو چھپن ڈالر مالیت کے خیمے، دوائیں، بیج اور اوزار بھیجے۔بیت الحم میں ذرخیز زمین خریدی گئی اور یہودیوں کے لئے زراعت کا ایک سکول قائم کیا گیا۔بیرن موسس کی طرف سے انہیں اضافی مدد میسر آئی جس نے ہر ممکن امداد کرنے کی حامی بھری، وہ اپنی کتاب میشولم میں لکھ چکا تھا کہ اس کا زیون جانے کا وقت آ چکا ہے اور وہ دوسری بار اسرائیل میں کام کرے گا۔

دو سال کے اندر اندر یہ سب بھی بے سود ثابت ہوا، اس ناکامی کا ایک سبب یہودیوں کا کھیتی باڑی کرنے میں کسی بھی طرح کا ہاتھ بٹانے سے انکار تھا اور اس سے بڑھ کر میشولم اور Minor کے تضادات تھے۔ Minor نے اس دوران جافہ کے ایک چھوٹے سے علاقے میں منتقل ہوگئی جسے اس نے،''امید'' کا نام دیا، اس نے کہا کہ اگر ریاست ہائے متحدہ سے کسی بھی عبرانی دوست نے ہماری مدد کی تو ہم جلد اس کا قرض اتار دیں گے اس نے امریکی یہودی اخبار Occident سے درخواست کی کہ وہ اس موقعے کو ضائع نہ کریں، کچھ امداد آئی مگر بلآخر اسے بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ انچاس سال کی عمر مین سن 1855 کو فوت ہوگئی۔

اس کے بعد جافہ میں وہ جگہ کارسن نے خرید لی جو ایک انوکھا اور خود ساختہ قونصل تھا اور اس جگہ کو یہودیوں کو انناس، کیلے، اور لیمو کی کاشت سکھانے کے لئے امریکی فارم کا نمونہ سمجھتا تھا۔قریب ہی والٹر ڈکسن نے ایک اور کالونی قائم کی اور اس نے گراسٹائن بیک برادران کو اپنے پاس نوکری پر رکھا جنھوں نے اس کی بیٹیوں Almira اور Mary سے شادی کی جن کو علاقائی لوگوں نے ڈرایا ہوا تھا۔اس کے مطابق امریکی کاشتکاری کے منصوبے کو ریاست ہائے متحدہ کی امداد کی

ضرورت ہے جو اسے کسی نہ کسی طرح میسر رہی اور کسی طرح وہ فارم چلتا رہا۔

لیوی پارسن سن 1819 پلینی فسک کے وقت چالیس سال میں امریکی اپنی کوششوں میں جتے رہے۔انہوں نے کچھ صوبوں میں اپنی املاک خریدیں۔وہ یہاں تنہا نہیں تھے، فرانس برطانیہ اور روس کے تبلیغی بھی یہاں ان کے ساتھ تھے۔انہوں نے یہاں اسکول، ہسپتال اور کالونیاں قائم کی تھیں۔ولیم ایڈی نے شکایت کی کہ اس ملک میں تبلیغ کے لئے یورپ امریکہ سے بازی لے جانے کی کوشش میں جتا ہوا ہے مگر کوئی دوسری قوم مشرقِ وسطی میں امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تبلیغیوں کا خلوص اس انیسویں صدی میں اس امریکی کردار کا آئینہ دار تھا جس نے صنعتی دور میں دنیا کے لئے اہم فریضہ ادا کیا۔وہ امریکہ کے نئے تجربات اور محرکات کے حصول کی خواہش کی نشاندہی بھی کرتے تھے۔اور یہ سب دیکھتے ہوئے سن 1830 میں فرانسیسی سیاسی مفکر ٹوکویل نے امریکی جذبے کو کبھی نہ رکنے والی طاقت کہا۔یہ سب محض انجیلیوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ گھریلو خواتین، افریقی غلام، کاروباری افراد فنکار سب ہی Civil-War سے پہلے اپنے مذہب اور اپنے خوابوں کے سبب مشرقِ وسطی آئے۔

امریکہ کی زیرِ نگرانی:

شاعر اور سوانح نویس اور کہانی نویس واشنگٹن ارون نے کہا کہ میں خود کو مسلمانوں کی جنت کی طرف کھنچتا ہوا تصور کرنے پر مجبور ہوں۔سن 1889 تک وہ سب سے مشہور امریکی مصنف تھا۔وہ Sleepy-Hollow جیسے شاہکار کا مصنف اور Rip Van Winkle کا خالق تھا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک وکیل بھی تھا اور 1812ء کی جنگ کے دوران ایک افسر بھی تھا۔ڈیوڈ پورٹر اور ڈینیل ویبسٹر کے ساتھ ساتھ اس کے مراسم ایک سفیر سے بھی تھے جو انہی دنوں Madrid آیا تھا۔وہیں سے اسے غرناطہ جانے کا موقع ملا۔اس تجربے نے اس پر گہرا اثر چھوڑا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور الف لیلہ کا ایک کردار ہے۔

وہ مشرقِ وسطی کے بارے میں پہلے سے قیاس کیا کرتا تھا۔وہاں کے صحرا اور دیگر نظارے اس کے اپنی طرف کھینچتے تھے مگر 1807ء میں جنوبی افریقہ کے قیدیوں کو دیکھ کر اس نے مصطفے رباداب کیلی خان کا کردار تراشا تھا جو کہ Tripolitan Ketch کا کپتان تھا، جس نے نیویارک

میں اپنی قید کے دوران امریکی معاشرے پر اپنے نظریات پیش کئے تھے۔ مجھے ایک ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے کہ جسم کے پانچ میں سے ایک حصے میں تو روح ہوتی ہے، امریکی خواتین کے مطابق اس نے کہا کہ میں نے بے حد خوبصوت امریکی خواتین کو اپنے خاوند پر ہاتھ اٹھاتے دیکھا ہے اور یہ دیکھ کر میں غصے سے کانپ گیا۔ Salmagundi کے نام سے شائع ہونے والی اس کی تحریروں نے گستاخ خواتین کے ساتھ بے ایمان وکلاء، سیاست دان، جرنیلوں یہاں تک کہ صدر جیفرسن کو بھی نشانہ بنایا۔

1824 کو مشرقِ وسطی میں ایک اور واقعہ رونما ہوا جب Irving نے ایک ڈرامہ ''Abu Hassan'' پیش کیا جو الف لیلہ'' سے اخذ کیا گیا تھا۔ اس کے ایک حصے میں ایک کردار نے حاکم سے کہا کہ تمہارے جیسے عظیم حاکم کی کئی سو بیویاں ہیں جس پر اس نے اپنے ساتھی خلیفہ ہارون الرشید کو جواب دیا کہ اب میں نے خود کو درجن بھر تک محدود رکھا ہے، فطرت کو مطمئن کرنا بہت آسان ہے۔

مگر 1829ء میں اس نے غرناطہ کے کھنڈرات میں کوئی مضحکہ خیز بات نہیں دیکھی۔ اپنے دورے کے فوراً بعد اس نے The conquest of Granada لکھنی شروع کی اور اس کے فوراً بعد اس نے ''Alhamra'' تحریر کی جو بہت مشہور ہوئی جس میں جادوگروں، شاہ سواروں اور شاہزادوں کی کہانیاں تھیں۔

یہ کتاب سن 1832 میں شائع ہوئی اور امریکی اذہان میں مشرقِ وسطی کے تصورات کو جلا دیتی رہی۔ کچھ کے لئے یہ سب صرف پڑھ لینا کافی نہیں تھا اور انہوں نے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ واشنگٹن ارونگ نے بھی خود مشرقِ وسطی جانے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے اپنا بحری سفر جنوبی سپین سے مراکش کی طرف شروع کیا لیکن اس کے سفارتی فرائض اسے کہیں اور لے گئے۔ کوئی دوسری چیز اس کے سفر کو تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ ارونگ نے ہنری ڈیوڈ تھورو کو بتایا کہ وہ ادھر کسی طاقت کے زور پر جاتا ہے لیکن مشرق کی طرف وہ آزادی سے جاتا ہے۔ وہ دونوں مشرق کی دریافت کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

مذاق، اڑان یا کھیل:

لوگوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی علاقہ شمالی افریقہ کے قزاقوں سے آزاد تھا

مستقل سکواڈ کی موجودگی میں بحر الکاہل میں اب کوئی رکاوٹ مسافروں کے لئے نہیں تھی۔ اور کسی بھی شخص کے لئے مشرق وسطیٰ کی دریافت اور مطالعے کے لئے جانا بہت آسان تھا Irving نے بھی مشرقِ وسطی کا دورہ کرنے کی ٹھانی، وہ سپین سے مراکش جانا چاہتا تھا مگر اس کے فرائض اس کو کہیں اور لے گئے۔

جنوبی افریقہ کے قزاقوں کا صفایا ہو جانے کے بعد اب سمندر امریکیوں کے لئے محفوظ تھا اور وہ مشرقِ وسطی جانے والوں کے لئے سیدھا راستہ فراہم کرتا تھا۔ سن 1820 تک ہی سرمایہ دار ڈیوڈ اوفلی آنے والے امریکی طلباء کی مدد کے لئے اس کے دروازے پر آنے کی شکایت کر رہا تھا۔ دوسرے امریکیوں نے ان ہم وطنوں کے بارے میں بتایا جو پہلے سے یہاں آباد تھے۔ یہاں ایک نیویارک کا باشندہ تھا جو مسلمان ہو کر ایک مسجد کی امامت کیا کرتا تھا ایک شکاری تھا جو نیل میں مگرمچھ اور شیر کا شکار کیا کرتا تھا۔ فلاڈیلفیا کا ایک اور باشندہ سلطان کی فوج مین بھرتی ہو گیا تھا اور بیس سال وہیں رہا اور کام کرتا رہا۔ 1820ء میں قاہرہ میں آنے والے مغربیوں کی جنگلات کی طرف رہنمائی کرتا تھا اس کا نام نبی داؤد تھا جو اوہائیو کی ریاست کا تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل مین جب امریکی مشرقِ وسطی جا رہے تھے اور وہاں کی کے باقیات امریکہ لائی جا رہی تھیں، سن 1823 میں وہاں سے پہلے ممی بوسٹن لائی گئی اس کے بعد قریب 689 مصری عجائب وہاں لائے گئے۔ اور وہاں کئی با اثر لوگوں نے اس طرح کے کئی تحائف امریکہ روانہ کئے۔

قدیم مصر کے بارے میں امریکی تصورات کا ساتھ اس دور میں باقی مشرقِ وسطی کے حالات نے دیا سیاح، زائیرین، سائینسدان، تبلیغی، اور، معاشرے کے باعزت لوگ بھی وہاں جانے کے خواہاں تھے۔ مشرقِ وسطی اب ان کے لئے صرف میدانِ جنگ نہیں تھا یہ کسی بھی امریکی کے لئے جو ایسا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو سیاحت کا بہترین مقام تھا۔

سن 1803 تک بہت سے امریکی وہاں آئے ان کو وہاں ریاست ہائے متحدہ قونصل کی طرف سے حفاظت بھی میسر تھی اور آمد ورفت کے ذرائع بھی موجود تھے سن 1838ء تک بوسٹن کا کوئی باشندہ نیویارک تک ریل اور اس کے آگے بحری جہاز سے استنبول یا اسکندریہ تک با آسانی جا سکتا تھا۔

اس کے باوجود اس سفر کے لئے سخت مشقت کرنی پڑتی تھی، اس سفر مین کل اکیس دن لگتے تھے اور مسافر کو مارسیلز، لندن اور مالٹا میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ ولیم ہنری نے جو کہ ایک سینیٹر تھا، اس سفر کے بارے مین بتایا کہ نہ تو اس مین کوئی برتھ میسر تھی نہ کوئی بستر، میز اور نہ ہی ایسی کوئی بھی سہولت، ریل کا ڈبا چیونٹیوں، کاکروچوں اور ہر طرح کے حشرات سے بھرا ہوا تھا، سفر شروع کرنے کے بعد مسافر کو یہ سب بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مشکلات جھیلنا پڑتی ہیں اور ان سب مشکلات کے بدلے مین اسے ایک سو نوے ڈالر خرچ کرنے پڑتے ہیں جو کہ سب 1840 مین ریاست ہائے متحدہ کے کسی سینیٹر کی ایک مہنے کی تنخواہ اور ایک عام مزدور کی سالانہ آمدنی ہے۔ اس سب کے باوجود سواریاں ہمیشہ لوگوں سے بھری رہتی تھیں۔

انہی مسافروں میں جان لائیڈ بھی تھا جو نیویارک کا تیس سالہ باشندہ تھا، الف لیلہ پڑھنے کے بعد اس نے از خود ان مقامات کو دیکھنا چاہا جس کو دیکھ کر کبھی پیمبر مسکرا دئے تھے۔ سب 1835 میں وہ مصر کے لئے روانہ ہوا۔ وہ ان ساٹھ امریکیوں میں سے ایک تھا جن کا اسکندریہ میں ریاست ہائے متحدہ کے سفارت خانے میں اندراج ہوا تھا۔ اس میں سے بیشتر جنوبی علاقوں میں رہتے تھے مگر ان میں کچھ جیمز کولی کی طرح مسی سپی سے بھی تھے ساتھ ہی شمالی امریکہ سے تعلق رکھنے والی خواتین سارا راجر اور ایلزبتھ کابٹ کرکلینڈ بھی تھی جو کہ میساچوسٹس میں ریاست ہائے متحدہ کے سینیٹر کی چالیس سالہ بیٹی تھی۔ ان سب میں سب سے نمایاں ڈیوڈ ایف تھا جو کہ امریکی افریقی غلام تھا اور اپنے آقا کے ساتھ سن 1854 میں مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر آیا تھا۔ اوہائیو سے فرار ہونے کے بعد اس نے اپنے اس سفر کی داستان A colored man round the world کے نام سے لکھی جس کا انتساب اس نے اپنی ماں کے نام کیا۔

مختلف ہونے کے باوجود امریکی باشندوں نے مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں ویسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ ان کو وہاں کے شہروں میں مشرق کو ڈھونڈنے میں مشکل پیش آئی۔ مشرقِ وسطیٰ کی گلیوں کو دیکھ کر سن 1842 کے جیمز کولی کے بتائے ہوئے تنگ و تاریک قاہرہ سے یہ شہر قدرے مختلف تھا۔

مشرقِ وسطیٰ کے بارے مین ان کے سابقہ نقطہ نظر کے مطابق امریکیوں نے اس کے بارے مین وہی سفاک رائے قائم کی جوان میں سے کئی اپنے دل میں پہلے ہی اسلام کے لئے

نفرت لرکر وہاں آئے تھے اور وہاں آکر ان کے اس خیال کو اور تقویت ملی۔ اسٹیفن کے لئے یہ ایک جھوٹا مذہب تھا جس کی مسلمان پیروی کرتے تھے اور جیمز کولی کے مطابق یہ ایک بے علم اوہام پرست عقیدہ تھا۔ حد یہ ہوئی کہ David Dorr بھی جو کبھی مسلمانوں کو کالوں کے ساتھ ان کے سلوک کی وجہ سے پسند کرتا تھا وہ بھی ان سے ڈرنے لگا۔

امریکیوں کے اندازے کے مطابق ظلم اسلام کا خاصہ تھا اور ان کے اس خیال کو اسٹیفنکے قاہرہ کے دورے میں اور بھی مضبوط کر دیا جہاں ایک گورنر نے ایک ملزم کو کوڑے لگانے کی سزا سنائی۔ اس نے کہا کہ وہ ہوا میں اس کوڑے کے لہرانے کی سرسراہٹ سن کر ہی کانپ گیا اور اس سے آگے کچھ نہ دیکھ سکا، اس نے بتایا کہ یہ سب دیکھ کر گورنر مسکراتا رہا۔ وہ وہاں پر خواتین کے ساتھ ہونے والے سلوک سے بھی نالاں تھے۔ کولی نے کہا کہ عربی خواتین کو پنجرے میں بند پرندوں کی طرح رکھا جاتا ہے اور غاروں مین بند درندوں کی طرح انہیں کھانا دیا جاتا ہے۔ اس نے وہین ایک عورت کو دیکھا جو اپنے خاوند سے مار کھا رہی تھی اور مجمع اسے دیکھ رہا تھا۔ اور صرف خواتین ہی ان مظالم کا شکار نہیں تھین وہان یہودیوں کے ساتھ بھی برا سلوک کیا جاتا تھا، اس نے ایک آدمی کو دیکھا جس کا سرتن سے جدا کر کے اس کی ٹانگوں کے درمیان رکھا گیا تھا، اور اس کا جرم یہ بتایا گیا تھا کہ اس نے سیاست مین مداخلت کی ہے۔

امریکیوں کی دلچسپی کی ایک بات مشرقِ وسطیٰ کی سیاست بھی تھی، وہ اس سے بھی نالان تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ریاست ہائے متحدہ کا نظام سب سے زیادہ انسان دوست ہے وہان آنے والے سیاح وہاں کے نظام کو جابرانہ گردانتے تھے۔ اسٹیفن نے لکھا کہ اس نظام مین جب آپ کسی طاقتور شخص سے کنارہ کرتے ہیں تو آپ اسے پھر دوبارہ دیکھنے کی امید نہیں رکھتے، اور اس نے نے سلطان کے بارے میں کہا کہ وہ جیتا تو بادشاہوں کی طرح ہے مگر اس کی موت احمقانہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ویلنٹائن جو کہ نیویارک کا سب سے جانا مانا سرجن تھا سن 1843 میں مشرقِ وسطیٰ کے نظام کو دیکھ چکا تھا۔ اس نے ایک مصری شاہزادے کے بارے میں لکھا کہ اس کے پاس چربی زیادہ اور دماغ کم تھا، مدیر والٹر کاٹن بھی یہ جان کر ہراساں تھا کہ سلطان اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے ہزاروں سر قلم کروا سکتا ہے اس نے سن 1836 میں بیان دیا کہ اسلام آزادی اور حق کا مدفن ہے۔

تمام سیاح کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مشرقِ وسطی میں سب کچھ صرف اس ہی طرح ٹھیک کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کو ترک کر کے مغربیت کو اپنا لیا جائے۔ کاٹنکے مطابق وہی جذبہ جو کسی مسلمان کو اس زنجیر سے آزادی دلا سکتا ہے اس مذہب کو تباہ کر سکتا ہے۔ کولی نے بھی آنے والے اس دور کی طرف دیکھا جس مین مسلمان روشن خیالی کو اپنا کر تہذیب یافتہ اقوام میں شامل ہو جائیں گے۔۔ ہائٹ نے اس سے ایک قدم آگے جا کر سیاسی صلیبی جنگ کی اور ریاستِ عثمانیہ کے خاتمے کی بات کی۔ اس نے پیشن گوئی کی کہ اگلے وقتوں میں برطانیہ مصر اور ایشیا کے کچھ علاقوں پر قابض ہو گا اور فرانس شام اور شمالی افریقہ پر۔

اکیسیوں صدی کے لحاظ سے امریکی جو کہ مشرقِ وسطی کے نظام پر تنقید کرتے تھے، ریاکار تھے۔ خود ان کی قوم نے آبادی کے چھٹے حصے کو غلام بنا کر رکھا ہوا تھا۔ انیسویں صدی تک وہاں بھی سرِ عام پھانسی دینا عوامی تفریح سمجھا جاتا تھا، مگر مشرقِ وسطی آنے والے سیاحوں کے لئے یہ موازنہ کرنا آسان نہیں تھا اور لکھنے والوں کی ہر تحریر امریکی محبت کی آئینہ دار رہی۔ ایڈورڈ مورس نے جو کہ سفیر تھا، کہا کہ ملک سے باہر اس نے امریکیوں میں جو قومیت کا جذبہ دیکھا ہے وہ کسی دوسری قوم میں نہیں دیکھا۔

ریاست ہائے متحدہ جو کہ آزادی اور خود مختاری کی علمبردار تھی مشرقِ وسطی کو بہت کچھ سکھانے والی تھی۔ وہ اس وقت کے منتظر تھے جب بقول سارا ہائٹ کے ڈاکٹر، انجینیر، تبلیغی، معلم اس اندھیرے کو روشنی مین بدل دیں گے جس نے اس مقدس سرزمین کو گھیرا ہوا ہے اور اسے امریکہ جیسا شاندار بنا دیں گے۔

امریکی مشرقِ وسطی کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ویسے ہی وہاں سفر کرتے تھے وہ چاہے اسکندریہ سے اس علاقے میں داخل ہوں یا استنبول سے، قاہرہ جاتے تھے اور وہاں سے اہرامِ مصر دیکھنے اور پھر نیل کی سیر کو۔ اور خطرے کی وجہ سے ان کے لئے محافظ ساتھ رکھنا ضروری ہوتا، اور ان کو علاقائی لباس پہننے کی تلقین بھی کی جاتی جس میں بقول اسٹیفن پیلی چپلیں، نیلا ازار بند، تلوار اور ترکی پستولین شامل تھیں۔ مانگنے والوں سے بچ کر مسافر دریا کے کنارے باقیات پر توجہ مرکوز رکھتا۔ سائیس کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ماٹ نے ایک قدیم مجسمے سے ایک حصے اور اسٹیفن نے مندر کی دیوار پر لگے عقاب پر چھینی چلائی۔ اس نے کہا کہ یہ قدیم قیمتی باقیات کا ایک

حصہ ہے، امریکی وہاں مگرمچھ، گیدڑ، اور پرندوں کے شکار سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ مگر مردوں کی خاص دلچسپی وہاں کی عورتوں میں تھی۔

مشرقی وسطی کے لئے انیسوں صدی کے مغربی تخیل کو رکھتے ہوئے امریکی وہاں گھومتے۔ وہ خواتین کے محض چہرے دیکھنے کے عادی تھے اس کے علاوہ شاذو نادر ہی انہیں کچھ دکھ پاتا۔ یہ نقاب پوش خواتین مختلف تھیں ان میں سے ایک کے بارے میں Dorr نے لکھا کہ میں صرف اس کا نقاب اٹھانے کے پانچ پونڈ دینے کو تیار تھا اور ایک اور کے لئے پچیس ڈالر تک اس نے اپنی کتاب میں ان خواتین اور رقاصاؤں کے بارے میں لکھا کہ ان کے تھرکتے بدن کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ ماٹ نے ان کے ہاتھوں کی اور اسٹیفن نے ان کی ہونٹوں کی ایسی ہی تعریف کی۔ بہت کم سیاح Nathaniel Parker کی طرح شہوت پرست تھے جو کہ ایک مشہور شاعر تھا۔ سن 1852 میں مشرقِ وسطی آنے والے شاعر نے ساربان کی بیوی یا بیٹی کو دیکھنے کی کوشش کی اور اس کی نظر چودہ سال کی ایک یہودی لڑکی پر پڑی جس کے ساتھ ایک عربی عورت بھی موجود تھی جس نے حادثاتی طور پر کھلے دراوزے کی جانب دیکھا تھا، اس نے لکھا کہ پھر اس کے بعد ویسا کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملا۔

مصر اور نیل سے امریکی سیاح عموماً شام اور لبنان کی جانب جاتے تھے۔ باغی قبیلوں اور لٹیروں کے ڈر سے یہاں بھی ان کو اپنے ساتھ اسلحہ بردار محافظ رکھنے پڑتے تھے۔ تائکر نے لکھا کہ ہم اپنے ہتھیاروں کو تیار رکھتے اور اپنے سامان کو اپنی نظر سے اوجھل نہین ہونے دیتے، ایلزبتھ کیبٹ نے بتایا، ''میں نے وہاں کا لباس پہنا، سر پر پگڑی اور ایک سفید چادر لی جس سے میرا چہرہ خاصی حد تک چھپ گیا جبکہ میرے شوہر کہ ہاردورڈ کا صدر معلم تھا، پستول ساتھ لے کر گھومتا تھا۔

شام کے دورے میں دلچسپ لیڈی ہسلر کے قلعے کی سیر تھی۔ یہ وہی لبنانی خاتون تھی جس نے سن 1837 میں ہیرٹ لیومور کی میزبانی کی تھی۔ اس قلعے کی سیر کی روایت پندرہ سال پہلے George B. Rapelie نے ڈالی تھی۔ پچاس سالہ سیدھے سادھے شخص نے کئی گھنٹے خاتون کے ساتھ گزارے تھے، اس کی خوب تواضع کی گئی تھی اور وہ وہاں سے ریشم کا ایک نمونہ لے کر روانہ ہوا تھا جسے امریکی بازار میں پہچانا تھا مگر بدقسمتی سے جب تک اسٹیفن اور ہائٹ پہنچے اسٹیفن نے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے دوستوں نے اسے چھوڑ دیا تھا اور عربوں نے اس کے

ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ سن 1839 میں ولیم ٹامسن کو اس کی لاش ملی جس کو اس نے دفنایا۔

نیل کا سفر، اہرامِ مصر کی سیر، اور حسین عورتیں، ان سب کا وجود امریکیوں کے لئے مشرقِ وسطی کی معراج فلسطین ہی تھا۔ سیاحوں کی خوشی ایسی ایسی بڑھتی جاتی جیسے جیسے وہ مقدس سرزمین کے نزدیک ہوتے جاتے۔ کولی کے لئے وہاں کے سپیرے اسے کتابِ وعظ کی یاد دلاتے تھے اور وہاں کے علاقائی لوگوں کے ساتھ کھانا کھا کر اسے میتھیو کی یاد آتی تھی۔ سمندر کنارے کھڑے ہو کر اسٹیفن نے سوال کیا کہ کیا یہ سب ایک حسین خواب ہے، یہ وہی مقام ہے جہاں خدا کے چنے گئے افراد نے سمندر میں قدم رکھا تھا، یا پہاڑ کی وہ چوٹی جہاں مخلوق نے اپنے خالق سے بات کی تھی۔ یہاں داخل ہوتے ہی مجسمے اور تحریریں آنے والون کے ان احساسات کو اجاگر کرتی تھیں جن کے بارے مین وہ بچپن سے سنتے اور پڑھتے آرہے تھے، ان کے کئی شہروں کے نام یہیں سے منسوب تھے۔ Haight نے کہا کہ ہر منظر نے میری یادیں تازہ کر دیں مجھے ہر چہرے مین ایک پیمبر کی صورت نظر آتی تھی۔

اس کے باجود یہ خیالات مصر اور لبنان کی طرح دیرپا ثابت نہیں ہوئے۔ ان کو ان علاقوں میں بائبل جیسا کچھ نہیں نظر آیا بلکہ اس کے مختلف باقیات اور خاک ان کی منتظر تھی Sarah Haight نے بھی مقدس سرزمین کی موجودہ حالت پر افسوس کا اظہار کیا یہاں کی آبادی اور غربت مشرقِ وسطی کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ تھی۔ ڈور نے اس کے متعلق کہا کہ یہ سرزمین ویران ہو چلی تھی یروشلم برباد ہو رہا تھا یہاں اینٹوں کے سوا اب کچھ بھی نہین تھا وہ وہاں دو ہفتے گزار کر کبھی نہ آنے کے لئے واپس چلا گیا۔

بلا امتیاز مشرقِ وسطی سے لوٹنے والے امریکی ہر قسم کے قیاس سے محروم تھے۔ ڈور جو کبھی وہاں کے خواب دیکھا کرتا تھا اب اس سرزمین کو ویران اور بنجر کہتا تھا جہان صرف سپیرے اور ساربان تھے اس کے مطابق وہاں ایسا کچھ نہیں تھا جسے دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ ملک یا اس کے لوگ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ماٹ نے کہا کہ وہاں اخلاقی اور ذہنی نمو نہیں ہو رہی تھی۔ ان سب مین سب سے زیادہ شدت پسند اسٹیفن تھا جو شفاف آنکھوں والے نوجوان لڑکے سے اب ایک بدمزاج، اور دوسروں کی غلطیاں نکالنے والے شخص میں تبدیل ہو چکا تھا اس نے کہا کہ بسیار خوری، آرام طلبی، عورتوں سے نفرت اور نفاست کی کمی وہاں کے لوگوں میں عام ہے مین نے وہاں

ایک بھی ایسا شخص نہیں دیکھا جس میں یہ سب خامیاں نہ ہوں۔

مبہم اور اکثر بدصورت تصاویر کے باوجود امریکی سیاحوں کی کتابیں بہت مقبول تھیں۔ اسٹیفن نے جس کو مایا تہذیب کے مندر دریافت کرنے پر شہرت ملی سن 1837 میں اکیس ہزار کتابیں فروخت کیں۔ ناقدین نے کالٹن کی کتاب کو بھی سراہا، کہا گیا کہ اس کے کتابوں میں سب کچھ اتنی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے ولے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ واقعی وہاں موجود ہے۔ بیارڈ ٹیلر کی کتاب کو بھی بہت شہرت ملی جس کے بعد اس نے ایک دورے کے دوران عربی لباس پہن کر امریکیوں کو اسلام کے متعلق لیکچر دیا۔ اور ویسی ہی شہرت ڈیوڈ مور کے حصے میں بھی آئی۔

مشرقِ وسطی کے بارے میں امریکی سیاحوں کی شہادتوں نے اس کے بارے میں امریکی قیاس کو دھندلا کرنے کی بجائے اور اجلا کیا۔ بات جتنی تنگ دلی سے کی جاتی امریکیوں کے لئے وہ اتنی ہی اکسانے والی ثابت ہوتی ریاست ہائے متحدہ کے لکھنے والے مشرقِ وسطی پر لکھتے رہے۔ خود ایڈگر ایلن پو، نے جس نے اسٹیفن کی کتاب کی تعریف کی تھی الف لیلہ سے مرعوب ہو کر Al-aaraaf کے نام سے ایک نظم لکھی۔ سن 1850 میں ارونگ بھی اسلامی موضوعات کی طرف واپس آیا اور اس نے Mahomet and his successors کی دو جلدیں شائع کروائیں۔ جس میں اس نے تنقید کے ساتھ ساتھ پیمبر کی تعریف بھی کی۔

اور بھی امریکی مشرقِ وسطی کی طرف آئے نصف صدی تک ریاست ہائے متحدہ برطانیہ کے بعد مصر کا دورہ کرنے والی دوسری بڑی قوم تھی، اور یہی حال شام میں بھی تھا۔ یوسف نے، جو ایک عربی مترجم تھا اور لکھنے والوں، فنکاروں، اور دیگر مشہور شخصیات کو وہاں لے جا چکا تھا، کہا کہ وہ ہزاروں امریکیوں کو شام لے جا چکا ہے اور وہ انہیں ہر لحاظ سے پسند کرتا ہے۔

یوسف کی بات ہر امریکی سیاح پر صادق نہیں آتی تھی۔ ہرمن میلول جو کہ نیویارک کے ایک دیوالیہ ہو جانے والے بیوپاری کا خودمختار بیٹا تھا، اور ریاست ہائے متحدہ کی بحری فوج میں کام کر چکا تھا، اور مغرب میں رہائش پذیر ہونے سے پہلے سخت حالات سے گزر چکا تھا دسمبر 1856ء میں اپنے ساتھ ایک ٹوتھ برش اور بنا کسی تبدیلی کے مشرقِ وسطی کے لئے روانہ ہوا۔

اسماعیل پکارو:

اس کی کتاب Moby Dick کی تین ہزار کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں اور وہ دوبارہ اپنے

پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کرنا چاہتا تھا، اور مشرقِ وسطیٰ کے تصورات جو الف لیلہ سے ماخوذ تھے سے مرعوب تھا ان تصورات نے اسے بہت عرصہ تک اسیر رکھا تھا۔ Mobi Dick میں بھی اس نے اسٹیفن اور لڈیارڈ کا ذکر کیا تھا۔ ایک بہت بڑا سیاح ہونے کی حیثیت سے ہرمن میلول کے ناول ریڈ برن کا ہیرو اپنا کیمپ چھوڑ کر بربری ملکوں میں پہنچ جاتا ہے یہ کردار اس نے اسٹیفن اور لڈیارڈ کی شخصیات سے ڈھالا تھا جو نیو انگلینڈ کا عظیم سیاح تھا جس کا ذکر موبی ڈک میں بھی ہے اب میلول اپنے قارئین میں Call me ishmael کا اعلان کر چکا تھا اب وہ از خود عرب کی سرزمین دیکھنے روانہ ہو گیا تھا، وہ وہاں جا کر اپنی آنیوالے نئے ناول Typee کو وہیں کا رنگ دینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اس سفر کے لئے پر جوش ہے جس مین وہ یروشلم اور اہرامِ مصر دیکھے گا۔

وہ سارا ہائٹ کی طرح مشرقِ وسطیٰ مین استنبول سے داخل ہوا اور وہاں پہنچتے ہی جذبات سے مغلوب ہو گیا، تمام اقوام کا اتنا بڑا ملاپ تمام قوموں اور مختلف رنگوں کے لوگ ایک ہی بھیڑ میں جو مختلف زبانوں میں گفتگو کر رہے تھے اس کے لئے حیران کن تھے۔ وہ وہاں کی گلیاں، بازار اور پرانی عمارتیں دیکھ کر محظوظ ہوتا۔ اس شہر کے اپنے حسن نے اس پر جادو کر دیا تھا جہاں ہر کھڑکی سے یہودی، آرمینی، یونانی چہرے جھانک رہے تھے اور پھولوں جیسی نازک لڑکیاں اس کے سامنے تھیں۔ اس کو یہ دیکھ کر بھی حیرت تھی کہ مشرقِ وسطیٰ کے کروڑوں باشندوں نے کیسے مغربی تہذیب کو ایک ساتھ رد کیا تھا۔

وہ یہاں سے مصر کے لئے روانہ ہوا، اسکندریہ میں وہ Pompy Pillar دیکھنے لے لئے رکا جو اسے قند کی طرح معلوم ہوئے، وہاں سے قاہرہ اور اہرامِ مصر کی طرف بڑھا، اور ان کے قدموں میں سحر انگیز ہو کر رہ گیا۔

> چوٹیوں پر کہر اور ان میں رنگین پتنگیں، فرشتوں کی طرح جنت کا راستہ سمجھاتے، اوپر نیچے آتے جاتے سفید پوش عرب جو میرے دل میں اپنا خوف پیدا کر رہے تھے، عربوں کا خوف یہودہ کا یہاں وارد ہونا اور یعقوب کا یہاں قدم رکھنا طویل ولامحدود و نا قابلِ بیان و دل ہلا دینے والی بات ہے۔

خیالات کا یہ تسلسل میلول کے پاس اکثر قائم رہتا تھا اور وہ ایسی کیفیات کا منتظر رہتا تھا

جس میں اس کو روحانی اور غیر مرئی روشنی ملے جو اسے حقیقت سے آشکار کرے، مصر سے یہ سب حاصل کرنے کے بعد وہ فلسطین سے بھی اس کا متمنی تھا۔

جافہ پہنچتے ہی اس نے کہا کہ رومان کوئی دوسرا ملک اتنی جلدی نہیں ابھار سکتا جتنا فلسطین، وہ تیس عربی شاہ سواروں کے ساتھ تھا جو راستے کے پودوں اور خار دار جھاڑیوں پر تفریحاً گولیاں برساتے گزر رہے تھے اکثر کیڑوں اور دھوپ نے سخت پریشان کر رکھا تھا اور وہ جوڈیا کی جانب رواں تھا۔ اس نے خود سے سوال کیا کہ کیا اس زمین کا بنجر پن خدا کا عذاب ہے اور خود ہی جواب دیا کہ جنت کو مشکلات پسند ہیں۔ وہ اس منظر سے اکتاہٹ اور بے کیفی کا شکار ہو گیا۔ جیسے جیسے اندھیرا ہوتا گیا اس کا اضطراب یروشلم پر اس کی پہلی نظر یہ حاوی ہوتا گیا جس کے بارے اس نے کہا تھا کہ وہ آپ کی جانب ایسے دیکھتا ہے جیسے کسی ضعیف شخص کی خاکستری اداس آنکھ۔ اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں محسوس ہو رہی تھی نہ ہی مسجدِ عمر میں اور نا کسی اور مقدس مقام میں، وہ اکتا کر اس شخص کی طرف دیکھتا جو ایک ہی سانس میں اسے وہ مقام بھی دکھا رہا تھا جہاں یسوع مسیح نے خطاب کیا تھا اور بہتریں کافی کے بارے بھی بتا رہا تھا، یہاں اس نے یہودیوں سے کچھ مشابہت دیکھی۔ اس کے مطابق یہاں پران کا پونا کسی مردہ ڈھانچے میں مکھیوں کے گھر جیسا تھا۔

اب احیا کا نظریہ اس کے آگے بوگس تھا اور وہ اسے یہودیوں کا لا حاصل جنون گردانتا تھا۔ اس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ یہودی اس گنجان ملک کو اپنی سلطنت بنا سکیں گے اور نہ ہی اسے مشنریوں سے توقع تھی کہ وہ عربوں کو بدل پائیں گے اس نے کہا کہ مشرقیوں عیسائی کو بنانا ایسا ہی ہے جیسے کسی اینٹ کو کیک بنانا۔

اس کا یہ رویہ فلسطین میں ملنے والے پہلے امریکی وارڈ وکارسن کو پسند نہیں آیا۔ وہ سابقہ قونصل تھا اور اب ایک فارم کا مالک تھا جو اب روحانی سفر پر گامزن تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ فلسطین مین یہودی ریاست کے قیام سے امریکی خود پر لگے غلامی کے الزام کو دھو سکتے ہین۔ اس نے لکھا کہ یہ زمین کا وسط ہے اور یہان صرف اسی صورت مین امن اور اتحاد قائم ہو سکتا ہے کہ اسے عیسائی بنا لیا جائے۔ ساتھ ہی اس کہ ذاتی ریسرچ کے نتیجے میں اپنے عقائد کے بارے میں بھی اس کے پاس چند سوال تھے اور آخر میں ایک ابرانی نام اختیار کر کے یہودی ہو گیا۔

اس دوران اس کا فارم ناکامی کا شکار ہو رہا تھا اور اس کے بچانے کے لئے وہ اپنے آبائی

وطن کی جانب گیا جہاں اس کا استقبال اس کی بیوی نے ایک مقدمے اور اس دعوے سے کیا کہ وہ دماغی توازن کھو چکا ہے۔ اس مقدمے کو کئی سو لوگوں نے دیکھا جن میں مرڈیکائی نوہ بھی شامل تھی، مقدمے کا فیصلہ مدعا علیہ کے حق میں ہوا اور کہا گیا کہ کسی شخص کے مذہبی عقائد کے سبب اس کے بارے مین فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ Cresson واپس فلسطین آیا اور اس نے وہاں ایک یہودی عورت سے شادی کی اور یروشلم منتقل ہو گیا جہاں سن 1857 کو وہ ہرمن میلول سے ملا۔

یہ ملاقات خوشگوار نہ رہی اور میلول نے اس کے بارے میں لکھا کہ وہ ایک امریکی ہے جس نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور یہودی ہو کر یروشلم کی ایک یہودن سے شادی کی، اس کے آگے اس نے کارسن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جس نے اس کے بارے میں صرف ایک لفظ ''اداس'' پر ہی اکتفا کیا۔

میلول کے تعلقات بس یہیں پر ختم نہیں ہوئے وہ والٹر ڈکسن کے کالونی بھی گیا گراسٹائین برادران سے بھی ملا اور دیگر امریکی خاندانوں سے بھی، جن میں اس کے سب سے پہلے میزبان سانڈرس اور مارتھیا تھے۔ یہ جوڑا سونے کے کاروبار میں ناکام ہو کر یہان آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس بوڑھے اور لاغر شخص اور اس کی بیٹی کو یہاں کی گرمی اور سختیون نے اور زیادہ بیمار کر دیا تھا اس کے برعکس اس کی بیوی، جو ساتھ ہی کہ ایک شیخ سے عربی سیکھ رہی تھی ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی جس مین عظیم خواتین کا زکر تھا، ان سب نے ہی یہودیون سے نفرت کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ بس آتے ہین ہمدردی کا اظہار کرتے ہین اور پہننے کے کپڑے ملتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ سانڈرس کے فارم پر آج تک کوئی ایک بھی اس سے کچھ سیکھنے نہین آیا تھا مگر اس کے باوجود اس کی بیوی پر امید تھی اور اسے کارِ خدا پر بھروسہ تھا۔

وہ وہاں سے والٹر ڈکسن کی جانب گیا جہاں وہ اپنی بیوی Sarah کے ساتھ موجود تھا، میلون نے ان سے اپنی گفتگو کو اپنے جرنل میں لکھا:

H.M: کیا آپ یہاں مستقل طور پر آ گئے ہیں؟

Mr. D: یہاں مستقل قیام، یہ کس طرح کی بات ہے؟

Mrs. D: یہاں گرد بہت ہے نا؟

H.M: کیا آپ کے ساتھ کچھ یہودی کام کرتے ہیں؟

Mr.D: نہیں میرے پاس انہیں کام پر رکھنے کے پیسے نہین ہیں، اور ویسے بھی وہ کاہل کام کرنا پسند نہیں کرتے، میں اپنا کام خود اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر کرتا ہوں

H.m: اور آپ کو نہیں لگتا کہ ان کو کام سکھانا مشکل ہے؟

Mr D: سو تو ہے، عیسائی انہیں سکھا سکتے ہیں کیونکہ اب وقت قریب ہے۔

ڈکسن سے مل کر اس نے فلسطیں میں اپنا انیسواں دن مکمل کیا، یہ دورہ تھکا دینے والا تھا، مشرقِ وسطی نے، جس سے اسے بہت امیدیں تھیں بیحد مایوس کیا اس نے کہا کہ باقی دنیا کی طرح یہان بھی آدھی مایوسی ہے اور آدھا تمسخر۔

بیس سال گزرنے کے بعد اس نے مشرقِ وسطی کے بارے ایک نظم لکھی، اٹھارہ ہزار مصرعوں کی یہ شاہکار نظم پڑھنے والے پر اپنا اثر چھوڑتی تھی جس میں اس نے ایک امریکی طالبِ علم کی فلسطین جانے کی روداد لکھی تھی جہاں تبلیغی اور سرمایہ دار پہنچے تھے۔ اس کا ایک اور اہم کردار ناتھن تھا جس نے روحانی طور پر کلیرل پر بہت اثر ڈالا تھا، دونوں ہی ایک دوسرے کے عقائد میں تبدیلی چاہتے تھے، رتھ کلیرل نامی کردار کے عشق مین مبتلا تھا اور یہ سب لکھنے والے کے اپنے روحانی اضطراب کا آئینہ دار تھا۔ کہانی کو بنا کسی انجام کے ہی ختم کر دیا گیا تھا جس میں ناتھن کا قتل ایک عربی کے ہاتھوں ہو گیا تھا اور کلیرل بھی اپنے عشق میں ناکام ہوا تھا۔

کہانی میں دونوں اموات مشرقِ وسطی کی حقیقت کا بیان تھیں۔ میلول کے آنے کے ایک سال بعد کچھ عرب ڈکسن کے فارم میں اپنی گائے کی تلاش مین داخل ہوئے، امریکی ان کی مدد کو آئے مگر فساد برپا کیا گیا جس میں گراسٹائنبرگ کو گولی لگی۔ زخمی Grossteinbeck کے سامنے ہی اس کی بیوی کی کئی بار وحشیانہ عصمت دری کی گئی سارا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور اس کے شوہر کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا ان کی چھوٹی بیٹی جس نے مردہ بن کر اپنی جان بچائی محفوظ رہی۔ ڈکسن کی کالونی پھر دوبارہ کبھی آباد نہین ہوئی، اور بچنے والے ریاست ہائے متحدہ واپس چلے گئے جن میں گراسٹائنبرگ بھی تھا جس نے اپنا نام تبدیل کر کے امریکی کر لیا تھا اب اس کا پوتا ایک ناول نگار تھا۔

صحرائی اور سمندری جہاز:

صدی کے اوائل میں امریکیوں پر واضح حملے کے بارے میں کوئی جواب نہ دیا جاتا تھا مگر

سن 1850 تک اس خطے میں موجود امریکیوں کو کسی سہولت سے یا کمزوری سے لوٹا نہیں جا سکتا تھا۔ جارج بتھون کے اپنے محبّ وطن ہونے کو ظاہر کرنے کے لئے مذہب اور نام تبدیل کرنے تک امریکیوں کی وہاں اہمیت بدل گئی تھی امریکہ نے ڈکسن فارم پر حملے کا سخت نوٹس لیا اور اس کے ذمہ داران کو سزا دینے کا مطالبہ کیا مگر عثمانی حکمرانوں نے ان باتوں پر ذرا توجہ نہ دی۔ غصے میں بھرے امریکہ سے ایڈون دی لیون کو حکم ہوا کہ وہ فوراً جافہ جائے اور اس سلسلے میں گورنر سے ملے اور احتجاج کرے۔

دی لیون کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ مصری اس پر اعتماد کرتے تھے وہ ایک ادبی نقاد بھی تھا اور بیحد معاملہ فہم شخص تھا۔ وہ ایک یہودی تھا اور حسبِ سابق وہ وہاں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ربط کا زریعہ تھا اور جلد ہی محمد علی کے ساتھیوں اور عباس حلمی اور سید کا منظورِ نظر بن گیا تھا، اس کے یہ تعلقات کرائمیا میں روسیوں کے قتلِ عام کے دوران کارآمد ثابت ہوئے تھے اور اس نے کئی عیسائیوں کو پناہ دی تھی۔

ڈکسن اور اس کے خاندان کو انصاف دلانے کے لئے وہ عثمانیوں سے ہر ممکن اقدام چاہتا تھا اس کے مطابق اس کے بغیر امریکی جان و مال شام میں کبھی محفوظ نہیں ہوں گے 5 مارچ سن 1858 کو جافہ پہنچتے ہی اس کی گورنر سے ملاقات تو ہوئی مگر وہ ان کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکا اور کہا گیا کہ وہ ان سے ایسا سلوک کر رہا ہے جیسے ہمارے مما لک عرصۂ جنگ میں ہوں۔ جس کا جواب اس نے دیا کہ جب ہمارے لوگوں کا قتل اور خواتین کی بے عزتی گورنر کی اجازت سے ہو تو ہم اسے اعلانِ جنگ ہی تصور کرتے ہیں اور اگر اس سلسلے میں انصاف نہ کیا گیا تو جلد ہی ہمارے جنگی جہاز جافہ کو تباہ کر دیں گے۔

اسکے نتیجے میں فوراً ہی کچھ گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ ڈی لیون کا مطالبہ تو پورا ہوا مگر ساتھ ہی اس کی مشکلات مین اضافہ ہو گیا۔ جلد ہی گرفتار ہونے والوں کے سینکڑوں مسلح لواحقین نے قونصل کو گھیر لیا اسے یہ محاصرہ برداشت کرنا تھا یا پھر ملزمان کو رہا کرنا تھا۔ مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔

عربیوں کی فطرت کو سمجھتے ہوئے کہ اس بار کسی بھی قسم کی نرمی دکھانے سے نقصانات ہوں

گے اس نے ایک آٹھ رکنی وفد کو ہتھیاروں سے لیس کر کے غراتے ہوئے بدؤں کی طرف روانہ کیا۔ اس دن کے بعد سے عربیوں نے اسے پگلی کہنا شروع کر دیا اس کے اس عمل سے گورنر ناخوش ہوا مگر ڈی لیون نے کہا کہ ایک مسلمان عہدیدار کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ عیسائیوں کی خوشنودی کے لئے سچے ماننے والوں کو سزا دے۔

ملزمان کے خلاف باقاعدہ مقدمہ چلا اور ان کا جرم ثابت ہوا مگر ڈی لیون نے کہا کہ مشرقی لوگ شیر کی طرح ہیں ان کو ایک بار عیسائیوں کا خون لگ گیا تو یہ بار بار حملہ کریں گے اسے یقین تھا کہ اب علاقے میں ایسے اور حملے کئے جائیں گے۔ ریاست ہائے متحدہ نے طاقت کے بل پر وہاں موجود عیسائی اور یہودیوں کو حفاظت دی ڈی لیون نے وہاں ایک جنگی جہاز کی تعیناتی کا مشورہ دیا۔

اس کی درخواست کو منظور کر لیا گیا اور USS Mecedonian کو شام کے ساحل پر لایا گیا۔ اس کے کپتان یورنا ہیپ کا کہنا تھا کہ وہ کسی بھی دوسرے ملک کے جہاز کا کپتان ہونے سے بہتر ریاست ہائے متحدہ کی فوج میں معمولی سپاہی کے طور پر کام کرنے کو ترجیح دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامیاب کاروباری شخص بھی تھا جس نے جیمز ٹرنر سے Monticello کو خرید کر جیفرسن فارم کو بحال کیا تھا وہ کموڈور بننے والا پہلا امریکی یہودی تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ دو یہودی لیوی اور ڈی لیون عیسائیوں کی حفاظت پر کمر بستہ تھے اور اس سے اس علاقے میں ریاست ہائے متحدہ کا اعتماد نظر آتا تھا اور واضح تھا کہ وہ اپنی حکمتِ علمی اور طاقت دونوں کو ہی مشرقِ وسطیٰ میں کس حد تک استعمال کر سکتے ہیں۔

اب بس ایک دیو مالائی شے کی کمی تھی اور وہ کمی بھی جلد ہی ایک غیر معمولی امریکی جارج پرکنز مارش نے پوری کی جس کا تعلق ورمنٹ سے تھا۔ اپنے آپ کو فنونِ لطیفہ کے لئے وقف کرنے سے پہلے وہ بہت سے کام کر چکا تھا۔ سن 1840 میں کانگریس میں چنے جانے کے بعد اس کی دوستی جون کوئنسی ایڈمز سے ہوئی اور دس سال بعد اس نے استنبول میں امریکی سفارتخانہ سنبھالا وہ ترکیوں کو بدمزاج اور مشرقِ وسطیٰ کو برے لوگوں سے بھرا ہوا کھنڈر کہتا تھا اس کے باوجود وہ ایک

کامیاب سفیر بن کر سامنے آیا جس نے امریکی جنگی جہازوں کی خرید وفروخت کا سلسلہ شروع کیا اور فلسطین کے پہلے دورے مین ہی اپنے مذہبی عقائد کو بھی جلا بخشی۔

یہ دورہ جس میں وہ سخت بیمار رہا اس کے لئے تبدیلی کا ضامن بنا اور اس دوران اس نے اس مقدس سرزمین کی ابتر صورتِ حال پر نظر کی اور بعد میں اس نے اپنے انہی خیالات کا اظہار اپنے شاہکار ''انسان اور فطرت'' میں کیا۔اس نے وہاں جنگلی حیات کی حفاظت کے لئے بھی کوششیں کیں اور ساتھ ہی اس نے ایک تحریک کی بنیاد ڈالی اور National Research Institute on Nature قائم کیا۔

اس کو وہاں کے جانوروں میں خاص دلچسپی تھی، اس نے اونٹوں کو ''صحرائی جہاز'' سے تشبیہ دی اس کے مطابق اگر انہیں ریاست ہائے متحدہ لے جایا گیا تو یہ شمال مغرب میں بہت کارآمد ثابت ہوں گے اور اس سے آپسی تعلقات بھی بہتر ہوں گے۔

اس نے اپنے نظریات جنوری 1855 کو پیش کئے اور جیفرسن ڈیوس سے رابطہ کیا اس نے بتایا کہ نپولین نے عربیوں کے خلاف اسی جانور کا استعمال کیا تھا اور اس کے نتیجہ میں تیس ہزار ڈالر کی مالیت سے American Camel Company وجود میں آئی اور یہ رقم ڈیوڈ پورٹر کے تین رشتہ داروں کے سپرد کی گئی۔انہوں نے مشرقِ وسطیٰ سے اناسی اونٹ خریدے اور اسی جہاز میں امریکہ روانہ کئے جس میں Lynch کو فلسطین لایا گیا تھا۔کہا گیا کہ امریکی لوگ اونٹوں کو عربیوں سے بہتر سنبھال سکتے ہیں اور وہ ایسا زیادہ انسانیت کے ساتھ کریں گے۔اس کے ساتھ ہی پانچ عربی ساربان بھی امریکہ لے جائے گئے جن مین ایک حدیجی علی بھی تھا جسے امریکی Hi-Jolly کہتے تھے۔

ہفتوں کے سمندری سفر کے بعد بل آخر ۱۴ مئی 1856 کو وہ اونٹیکسس پہنچے اس سفر کے دوران امریکیوں پر کھلا کہ اونٹ پانی زخیرہ کرنے کے باوجود یہ عجیب الخلقت جانور ریح پیدا کرنے والے اور بدبودار ہوتے ہین جو بیمار کر سکتے ہیں۔Galveston کے شہریوں نے نا صرف جانوروں کا داخلہ شہر میں بند کیا بلکہ ان پر پچاس ڈالر جرمانہ بھی لگایا۔قافلہ کو مجبوراً اریزونا اور سان

انٹونیو کا متبادل راستہ اختیار کرنا پڑا۔ایک سپاہی اسٹیسی نے سوال کیا کہ آخر یہ اونٹ کیا ظاہر کرتے ہیں پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ یہ امریکیوں کے کردار کو ظاہر کرتے ہیں جو قدرت کو بھی اپنے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔

حکومت نے ان کا استعمال دیکھتے ہوئے ایک ہزار مزید اونٹ خریدنے کا فیصلہ کیا مگر ایسا ہو نہ پایا اور جلد ہی آہنی گھوڑے کے سبب یہ اونٹ بے کار ہو گئے ان میں بیشتر کو کانوں مین بیچ دیا گیا یا پھر وہ سرکس میں آئے اور کچھ کو ریگستان میں کھلا چھوڑ دیا گیا۔ان میں آخری کی موت لاس انجلیس کے چڑیا گھر میں ہوئی۔Hi Jolly کو بھی وہاں اچھی نوکری مل گئی اور جلد ہی اونٹوں کے اس واقعہ کو فراموش کر دیا گیا۔

1860ء میں مدتوں سے دبے ہوئے تناؤ نے یورپیوں کے سبب زور پکڑا اور بلا کی خونریزی ہوئی دروزی جنگجوؤں نے بارہ سو میرونائٹ عیسائی۔گریک آرتھوڈاکس اور گریک کیتھولک عیسائیوں کو ذبح کر دیا ایک امریکی تبلیغی ہنری جیسپ نے اس قتلِ عام کے بارے میں لکھا کہ خون گلیوں میں گھٹنوں تک جمع تھا جو بس بہے جا تا تھا۔کسی ایک لاش کو بھی دفن نہیں کیا گیا امریکی جو اس آنے والی آفت سے بے خبر تھے ایک بار پھر پہلے جیسے صورتحال اور آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور اب خود ان کو اپنی جان بچانا محال تھا،تبلیغیوں نے بالآخر بیروت کا رخ کیا جہاں وہ بھی امداد کے محتاج ہو کر رہے۔

مشرقِ وسطیٰ پر حملے یا کسی بھی ردِعمل کا مظاہرہ کرنے کی بجائے امریکی پہلی بار کئی محاذوں پر اس صورتِ حال کا سامنا کر رہے تھے جو تہذیبی بھی تھی ثقافتی بھی اور تجارتی بھی۔اور اپنے تعلقات کے باوجود مشرقِ وسطیٰ اور امریکی لوگ اس زمرے میں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے۔ان تعلقات میں بہتری کے ساتھ ساتھ امریکیوں کا وہاں مقصد جو کہ طاقت، قیام، اور ایمان تھا مبہم پڑ رہا تھا۔جیفرسن کو صدر بننا تھا اور لنچ کو کپتان بن کو ڈیوڈ پورٹر اور لیوی کا سامنا کرنا تھا۔لیون کو بھی جنوبی ریاست کا خدمت گزار رہنا تھا جب کہ Johann کو شمال کے لئے ہتھیار اٹھانے تھے۔اور اس دوران ڈیوڈ ڈور میں بری طرح زخمی ہو گیا۔

یہ ملاپ اور آنے والی خانہ جنگی سے بہت کچھ تبدیلی آنے والی تھی جس کے زیر اثر لوگ

مراکش سے شام تک موجود تھے۔علاقے کی پہلی جدید یونیورسٹی کا قیام بھی اسی دوران عمل میں لایا گیا اور نہر سوئیز میں امریکیوں نے بھر پور کردار ادا کیا جس نے اس علاقے کی سیاست پر ایک صدی تک اثر ڈالا اور جب خاکی اور نیلے پرچم جنگ میں مصروف تھے امریکی سپاہی ،مذہبی پیشوا اور سیاحوں نے مشرقِ وسطیٰ کو بدل دیا۔

حصہ سوم

جنگ اور تعمیرِ نو

انشقاق

غلامی: وہ مسئلہ جس نے امریکیوں کو جنگ اور انقلاب کے درمیانی عرصے میں سب سے زیادہ تقسیم کر رکھا تھا اس کا مشرقِ وسطی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایک امریکی معاملہ تھا جسے صرف امریکی ہی قلم زد کر سکتے تھے پھر بھی مشرقِ وسطی میں جمہوریہ امریکہ کے ابتدائی دنوں میں غلامی کے حق اور مخالفت میں کافی لے دے تھی اور اس بات کی کافی گنجائش بھی اور اس کی ایک جھلک مارچ 1790 میں شائع ہونے والے فیڈرل گزٹ میں ''غلاموں کی تجارت'' کے عنوان سے نظر آئی جسے مبینہ طور پر الجزائر کے ایک شاہزادے، سعدی محمد ابراہیم نے تحریر کیا تھا، اس کے پاس ہزاروں غلام تھے اور وہ ان کو ویسے ہی رکھنا چاہتا تھا اور اس بات کو محض اتفاق بتایا گیا تھا کہ اس کے تمام غلام گورے ہیں اور ان میں کوئی بھی افریقی نہیں ہے۔

اس نے سوال اٹھایا کہ اگر ہم عیسائیوں کو چھوڑ دیں اور غلام نہ رکھیں تو ہماری زمینوں کی دیکھ بھال کون کرے گا، یہ ایک بے سود سوال تھا کیونکہ اس کا جواب سیدھا تھا، جب امریکی نہیں تھے تو الجزائر کی زمینوں کی دیکھ بھال خود وہی کیا کرتے تھے۔ اس نے غلاموں کی بہتری بھی ان کے غلام رہنے میں بتائی اور جواز پیش کیا کہ مدتوں غلامی میں رہنے کے سبب اب وہ آزاد ہو کر زندگی نہیں گزار سکتے اگر انہیں آزاد کر دیا جائے گا تو یہ بوجھ بنیں گے یا غیر اخلاقی کاموں میں ملوث ہو جائے گے اس نے سوال اٹھایا کہ یک دم اندھیرے سے روشنی میں لانے سے بہتر یہ نہیں ہے کہ امریکی غلام ان ہی کے زیرِ نگرانی رہیں، لہذا اب یہ مطالبہ نہ کیا جائے تمام دنیا کی بہتری اسی میں ہے۔ اس مضمون سے نوجوان امریکیوں میں اضطراب پیدا ہوا، جس کی ایک وجہ

اس کا مصنف بھی تھا، ریاست ہائے متحدہ نے بھی غلاموں کے لئے یہی جواز پیش کیا یہ بحث چلتی رہی اور کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا یا دونوں ہی طرف کے مخالفین کسی بات پر متفق ہوتے دکھائی نہ دئے اور بالآخر فرینکلن کی موت واقع ہو گئی اس کے ستر سال بعد تک غلامی کا نظام ریاست ہائے متحدہ پر مسلط رہا۔

مخصوص مگر قرابت دار ادارے:

ریاست ہائے متحدہ اور مشرقِ وسطی میں غلامی کا موازنہ کرنے والا فرینکلن تنہا نہیں تھا کئی سال پہلے سن 1776 میں سیموئل ہاپکنز نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا اس نے کہا کہ اگر ہمارے کئی ہزار بچے الجزائر یا ترکی میں غلام ہیں تو کیا ان کی آزادی کی کوئی بھی قیمت ادا کی جاسکتی ہے اس کو اس تضاد کی وجہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ شمالی امریکہ میں عیسائی غلاموں کے لئے امریکہ کا رویہ الگ اور یہاں الگ کیوں ہے، اس کا جواب اس نے خود ہی دیا اور کہا کہ وجہ ان کا حبشی ہونا ہے۔

امریکی اور مشرق وسطیٰ کی غلامی کا موازنہ اور بھی عام ہو گیا جب ریاست ہائے متحدہ نے آزادی حاصل کر کے بربریت سے پیچھا چھڑایا اور بربریوں نے امریکی جہاز پکڑنے شروع کر دیے سیموئل ہاپکنز کی طرح جان لے نے بھی الجزائر میں پکڑے جانے والے جہازیوں سے ہمدردی کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنے غلاموں سے نرمی برتی اس نے وضاحت کی کہ الجزائر میں امریکی غلام گورے ہیں اور نیویارک میں کالے غلامی کر رہے ہیں New Jersy Gazette کے ایک نمائندے نے جو خود کو Humanus بتاتا تھا، ستمبر 1786 میں مشاہدہ پیش کیا کہ کالے غلاموں کے آقا جب الجزائر کے آقاؤں اور ان کے غلاموں کی بات کرتے ہین تو کانپ جاتے ہیں اور اس کو بربریت کہتے ہین تو کیا وہ خود بھی اس ہی بربریت کا مظاہرہ نہیں کر رہے۔ اس کے اگلے سال مارتھا جیفرسن نے اپنے غلام رکھنے والے والد کو ایک عورت کی الجزائر سے بھاگ کر اپنے ملک آنے کی اطلاع دی جہاں غلامی کی اجازت تھی، اس پر اس نے کہا، ''یا خدا! کیا ہمارے پاس پہلے سے کافی نہیں ہیں، میرا دل اداس ہو جاتا ہے جب میں اپنے ہی جیسے لوگوں کے ساتھ اپنی ہی ملک کے لوگوں کے ہاتھوں ایسا سلوک ہوتے دیکھتی ہوں،'' کئی تحریکوں نے غلامی کے نظام کے خلاف آواز اٹھائی، سن 1789 میں ایک گمنام صحافی نے لکھا کہ افریقیوں کی امریکی غلامی یا

امریکیوں کی افریقی غلامی کے بارے پوچھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ''ایک میں سے چھ اور دوسر میں سے آدھا درجن''

امریکہ اور مشرقِ وسطی کے غلامی کے نظام کی مماثلت کے بارے میں اس وقت کے لکھنے والوں نے بہت لکھا۔ٹائکر جس کا سن 1797 میں آنے والا ناول غلامی کے نظام پر تنقید کرتا تھا قزاقوں کے ہاتھ لگنے سے پہلے ایک سرجن کے طور پر غلاموں میں کام کیا کرتا تھا اس نے بتایا کہ افریقی غلاموں کو بھیڑ بکریوں کی طرح رکھا جاتا ہے،جن پر جنسی اور جسمانی تشدد بھی ہوتا ہے جب میں اپنے ملک کے اس رخ پر نظر ڈالتا ہوں تو شرمندہ ہوتا ہوں۔قزاقوں کے ہاتھوں خود اپنے غلام رہنے کے بعد اس نے کہا کہ مین آزاد ہوتے ہی حکام کے پاؤں پڑ جاؤں گا کہ وہ اس انسانیت سوز عمل کا خاتمہ کریں اور غلاموں کو آزادی دیں جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔سن 1797 میں ہی American in Algier کے نام سے ایک گمنام لکھنے والے کی تحریر بھی سامنے آئی جس کا دعوہ تھا کہ وہ الجزائر کی ایک جیل سے لکھتا ہے اس نے خود پر ہونے والے مظالم کو بیان کیا

کیا تمھارے مقدس احکامات میں قانونِ فطرت اور انسانی حقوق کا حکم نہیں اگر ہے تو تم نے افریقیوں کو پابندِ سلاسل کیوں رکھا انسان کے آزاد تخلیق کئے جانے کا کیا بنا؟ افریقی غلام کیسے بنے؟

اس سے بھی زیادہ پرزور موازنہ ان امریکیوں نے کیا جو از خود مشرقِ وسطی میں غلامی کاٹ چکے تھے۔جیمز اسٹیونز نے جسے الجزائر سے سن 1776 میں رہا کیا گیا تھا بھی غلامی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کے ہم دوبارہ ان تک کیسے پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے ہمارے ہی نظام کو ہمارے خلاف استعمال کیا ہے۔ولیم ایٹن نے بھی بلا جھجک شمالی افریقہ مین امریکی غلامی کی مزمنت کرتے ہوئے سن 1799 کو تونس میں کہا کہ یہ ایک اذیت ناک جہنم ہے۔

ان میں سب سے یادہ با اثر تیس سالہ کپتان جیمز رائلی تھا جس نے سن 1821 کی جنگ میں رضا کارانہ حصہ لیا تھا۔وہ سن 1815 کو عربوں کے ہاتھوں قید کرلیا گیا تھا جہاں سے اسے برطانوی قونصل نے آزاد کروایا مگر وہ اس سے پہلے مشکلات جھیل چکا تھا۔واشنگٹن واپسی پر وہ صدر سے ملا جس نے اسے اپنی آپ بیتی لکھنے پر راضی کیا اس کی کہانی Riley's Suffering in Africa کو قومی سطح پر بہت سراہا گیا،خاص طور پر اس کے آخری باب کو جس میں کالے غلاموں کی خرید وفروخت کی

المناکیاں بیان کی گئی تھیں۔اس کتاب کے مداحوں میں ایک پڑھنے والا ایسا بھی تھا جو اپنے والد کے کھیت پر کام کرنے سے زیادہ مطالعے کو ترجیح دیتا تھا اور بعد میں صدر بنایا گیا تھا وہ ابراہم لنکن تھا جو کہتا تھا کہ بائبل کے ساتھ جس کتاب نے اس کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ Riley's *Suffering in Africa* ہی ہے

اور اکیلا ایسا لنکنہی نہیں تھا اس کے ساتھ اور بھی بہت لوگ غلامی کے سخت مخالفین تھے کچھ نے یہ بھی کہا کہ شمالی افریقہ میں غلاموں کے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں ہوتا جتنا کالوں کے ساتھ امریکہ میں کیا جاتا ہے چارلس سمر نے بھی اپنی تحریر White Salvery in Barbary States میں دونوں کا موازنہ کیا اور شمال کو زیادہ ظالم ٹھہرایا۔

مشرقِ وسطی میں غلامی امریکی تبلیغیوں کے لیئے بھی تکلیف دہ تھی لیوی اور فسک کے مطابق غلاموں سے بھری ہوئی کشتی کو آتے دیکھنا ان کے لئے سب سے انسانیت سوز منظر تھا جس سے ان کے دل اداس ہو جاتے تھے۔اس کے بیس سال بعد ہیرٹ لیومور نے ریاست ہائے متحدہ کے غلامی کی اجازت دینے پر اسے عذاب سے ڈرایا۔

ان میں سے کچھ اس غلامی کا موازنہ الجزائر سے نہین بلکہ قدیم ابرانیوں سے کیا کرتے تھے۔مقدس سرزمین آزادی کا نشان تھی جیسا کے بہت سے گرجا گھروں نے بتایا تھا اور جیسا تمام مقدس مقامات سے پتا چلتا تھا۔مشاہدہ کرنے والوں نے یقیناً وہ نغمہ سنا ہو گا جس میں شمال کو کنعنا نکہا گیا تھا۔

زیادہ تر امریکی اس علاقے کا دورہ کر چکے تھے اور یہ سلسلہ سن 1788 میں John Ledyard سے شروع ہوا تھا جس نے مشرقِ وسطی کی غلام منڈی کا دورہ کیا تھا۔اس نے وہاں کے ہولناک مناظر کو قلم بند کیا مگر امریکہ کے متعلق ایسا کچھ نہیں بتایا۔ان کو وہاں ایک گوری عورت کے بیچے جانے پر حیرت تھی مگر وہ ریاست ہائے متحدہ میں بیچی جانے والی کالی عورتوں کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہتے تھے پار کر ولیز نے بھی مشرقی یورپی غلاموں کی حالت بیان کی کہ انہیں زنجیروں سے باندھ کر ایک ساتھ کھڑا کیا جاتا تھا مگر اس نے ریاست ہائے متحدہ میں ایسے کسی منظر کا ذکر کبھی نہیں کیا جان لائیڈ بھی غلامی کے بارے میں اور ان پر ہونے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

جیمز کولی نے بھی مشرقِ وسطی اور اپنے ملک مین غلامون کی حالت میں فرق بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں کے غلام اپنے آقاؤں سے خوش ہین اور انہیں زندگی کی سہولیات میسر ہیں۔ مگر Door نے، جو خود کو گورا نہیں مانتا تھا اور غلامی کاٹ چکا تھا یہ سوال کرنے کی جرأت کی کہ ہم کب دنیا کی آزاد ترین ریاست کہلائیں گے۔

شمال جنوب اور مشرقِ وسطی:

ڈور کو جواب کئی خونی جنگیں ہو جانے کے بعد ملا جو 12 اپریل سن 1861 میں شروع ہوئیں۔ اس دن سے لے کر جنوب کے ہتھیار ڈالنے تک امریکی مشرقِ وسطی کے معاملات مین الجھے رہے۔ اپنی وردیوں کے علاوہ ان کے پاس اس علاقے سے منسلک کوئی دوسری چیز نہیں رہی۔ دونوں کا اصل مقصد اس علاقے کے حاکم کی منظوری تھا یا کم ازکم امریکہ کے معاملے میں غیر جانبداری۔

سٹیٹ سکریٹری ولیم ہنری سیورڈ کو پریشانی لاحق تھی کہ مشرقِ وسطی کے حکمران جنہیں بڑی طاقتوں کی عزت اور کمزوروں پر رعب ڈالنے کی عادت تھی امریکہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ریاست ہائے متحدہ کے سفیر نے بھی اس معاملے میں اقدامات کئے۔

اپنی آمد کا جشن ایک مسلم محل میں منانے کے باوجود براہم لنکن مشرقِ وسطی کے متعلق کوئی رائے نہیں رکھتا تھا۔ اس نے فوراً ہی ولیم کی جگہ جے مورس کو مقرر کیا اور سلطان کو اچھے تعلقات کی یقین دہانی کروائی سلطان کو یہ ماننے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور وہ ان تعلقات اور جنوب کے بارے میں پرامید رہا اور اس نے غیر معمولی طور پر سن 1830 کے معاہدے کو بحال کیا۔

مشرقِ وسطی اور امریکی تعلقات جو عموماً استوار ہی تھے جنگ کے دوران تغیر کا شکار رہے جس کی خاص وجہ امریکیوں کا عربوں کے ساتھ رویہ تھا لیکن اس خطے میں کمزور سمجھے جانے کے خوف سے دو باتیں سامنے آئیں۔

پہلا واقعہ فروری 1862 کو رونما ہوا۔ صحافی Henry Myers اور Thomas جس کا تعلق Georgia سے تھا Sumter Cruise کے ذمہ دار تھے جس نے اٹھارا جہازوں کو جبرالٹر کی بندرگاہ پر روک رکھا تھا۔ ان دونوں نے Alabaman کے ساتھ مل کر جو کہ سپین میں ریاست ہائے متحدہ

کے لئے کام کر چکا تھا فرانسیسی Cadiz کو ساتھ رکھا اور طنجہ کا راستہ روک دیا۔ مشرقِ وسطی کی چاہ ان کو مہنگی پڑی جب شہر میں ان کی موجودگی کا پتا ریاست ہائے متحدہ کے قونصل James De Long کو چلا۔

اوہائیو کا سابقہ جج De Long ایک پچاس سالہ محبِ وطن شخص تھا اس نے سن 1861 میں دفتر آتے ہی ایک بڑے امریکی جھنڈے کا مطالبہ کیا تھا اور اس نے دوسرا مطالبہ مراکش سے کیا تھا کہ وہ وہاں کے ساحلوں پر کسی کو لنگر انداز نہ ہونے دیں جس کے پانچ دن بعد ہی 20 فروری کو اسے پتا چلا کہ طنجہ میں باغی لنگر انداز ہیں۔

اس نے کہا کہ امریکی گھر پر تو یہ سب باتیں کر سکتے ہیں لیکن جہاں میں موجود ہوں وہاں ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے Myers اور Tunstall کو گرفتار کروایا ان دونوں نے کئی بار رشوت دے کر اور اپنی زنجیریں توڑ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر یہ بے سود رہا اور وہ فرار نہ ہو سکے اس دوران اس نے قیدیوں کے یہاں سے نکالنے کے لئے فوج کی مدد طلب کی اور کہا کہ مجھے ساحل پر ایک افسر کی ضرورت ہے۔

ڈی لیون کو چار مہینے قبل ہونے والے واقعہ کی خبر تھی جس میں دو افراد کی گرفتاری پر لندن نے ریاست ہائے متحدہ کے خلاف مقدمہ کر دیا تھا اور اس کے نتیجہ میں قیدی رہا کر دیئے گئے، اس کو بھی ایسا ہی کچھ ہونے کا خطرہ تھا۔

اور ایسا ہی کرنے کی کوشش کی گئی اور کہا گیا کہ Myer اور Tunstall فرانسیسی جھنڈے کی حفاظت میں وہاں موجود تھے جس پر ڈی لیون نے حکمران کو مراکش کے ماضی اور امریکہ کو ستر سالہ دوستی یاد دلوائی اور سوال کیا کہ کیا یہ سب دو قزاقوں کے لئے فراموش کر دیا جائے گا۔

یہی سب جاری رہا اور پھر 27 فروری کو قریب تین ہزار افراد نے جن میں سے زیادہ فرانسیسی تھے قونصل کی عمارت کو گھیرے میں لے لیا اور قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا جسے اس ننے رد کر دیا اس نے کہا کہ میں نے بربریت پسند ہجوم کو بربریت پسند ملکون مین دیکھا ہیے مگر یہ پہلی بار ہے کہ اس طرح کے ایک ملک میں ایسا کیا جا رہا ہے جہاں عیسائی مجمع عیسائی قونصل کے خلاف جمع ہے۔ تیس امریکی فوجی وہاں اتارے گئے جو مجمع کے درمیان سے ڈی لونگ تک پہنچ گئے جس نے آخری شرط یہ رکھی کہ یا تو بندرگاہ کو کھول دیا جائے اور قیدیوں کو نکال دیا جائے یا پھر ریاست ہائے

متحدہ وہان پر اپنا سفارت خانہ بند کر دے۔ فیصلہ آخر کار امریکہ کے حق میں ہوا

ڈی لونگ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چاہے جنگ ہی کیوں نہ ہو رہی ہو ہمارے کچھ قوانین ہین جو رہیں گے اور ہمارا ایک جھنڈا ہے جسکی کوئی بھی بھپرا ہوا مجمع بے حرمتی نہیں کر سکتا، مگر ہوا اس کے برعکس، پہلے کی طرح لنکنے بھی دونوں قیدیوں کو بوسٹن سے رہا کیا اور ڈی لیون کا تبادلہ کروا دیا جس نے یہ سوال کیا کہ کیا ان اقدامات سے امریکہ کو کمزور نہیں سمجھا جائے گا۔

خانہ جنگی کا امریکہ اور مصر کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ اس کے برعکس وہ اور زیادہ قریب آ گئے سن 1823ء بعد سے ہی ریاست ہائے متحدہ نے مغربی علاقوں میں یورپی مداخلت کو روک دیا تھا چالیس سال بعد جب فوج مصروفِ جنگ تھی ایسا نہ ہو سکا۔ اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نپولین نے New World Empire کی سازش کی اور جنوری 1863 میں تیس ہزار سپاہی ویرا کروز میں اتارے۔ اس کے ساتھ پانچ ہزار مصری رضا کار بھی تھے جنہیں سید پاشا نے روانہ کیا تھا۔ یہ کالے سوڈانی سپاہی تھے جو اس موسم کے عادی تھے۔

لنکن کی انتظامیہ کو نپولین پر سخت غصہ اور مصر پر افسوس تھا۔ امریکہ اور مصر کے روابط اگر بہت مضبوط نہیں تو کم از کم دوستانہ تو ہمیشہ رہے تھے۔ فرانسیسی افواج نے میکسیکو کا زیادہ تر حصہ فتح کر لیا تھا اور وہاں میکسملن کو عہدہ دیا تھا اس دوران مصری خدمت گزار خوب کام آئے اور اپنا کام کرتے رہے ان میں کئی وہیں پر ہلاک ہوئے جن مین ان کا کمانڈر جبار محمد بھی شامل تھا۔

سن 1865 تک ریاست ہائے متحدہ کوئی مداخلت نہیں کر سکی۔ تب ہی اپنے سفیر کو اسکندریہ بھیجا گیا اور یہ پیغام پہنچایا گیا کہ جیسا پاشا نے کسی اور طاقت کا ساتھ دے کر میکسیکو میں کام ہے ویسا ہی ریاست ہائے متحدہ کسی اور طاقت کا ساتھ دے کر مصر میں کر سکتی ہے۔ دھمکی دی گئی کہ ریاست ہائے متحدہ کے پاس بھی ایک لاکھ کالے سپاہی موجود ہیں جو سوڈانی فوجیوں کی طرح گرم موسم جھیلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انہیں بآسانی مصر لایا جا سکتا ہے۔

اس دھمکی سے ڈر کر سید نے اس کے بعد میکسیکو کو کسی قسم کی کوئی امداد نہیں بھیجی۔ فرانسیسیوں کو بالآخر شکست ہوئی اور میکسملین مارا گیا اور امریکہ آنے والے واحد مسلمان عربی سپاہی واپس گھر چلے گئے۔

خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا اور اب امریکہ ایک بار پھر مشرقِ وسطی کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ جنگ

نے امریکہ کے کمزور سمجھے جانے کو خوف کو اجاگر کر دیا تھا اور اب اسے اپنی معاشی اور عسکری قوت کا مظاہرہ کرنا تھا جو پہلے سے کہین زیادہ تھی اور اس کا یہ اثر مشرقِ وسطی کی حکومت پر برقرار تھا اور اب امریکہ یورپ کی جگہ لے رہا تھا۔

اپنی اس طاقت کے ساتھ امریکی دوبارہ مقدس سرزمین ی طرف آ سکتے تھے اور اپنے خوابوں کی تعبیر پا سکتے تھے لنکن نے ان کا ساتھ دیا اور وہ 14 اپریل 1865 کو ایک اور ڈرامہ دیکھنے مشرق، وسطی پہنچا اور اس نے وہاں اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ وہ ایک دن یروشلم جانا چاہے گا اور اس نے اپنی بیوی سے بھی اس خواہش کا اظہار کیا۔

مگر وہ اپنا خواب پورا نہیں کر سکا اور اس کو ہلاک کر دیا گیا۔ سراغ لگایا گیا کہ ہیریسن کا اس کے قتل سے کچھ لینا دینا ہے اور جب سپاہیوں نے باقی تماشا گروں کو مار گرایا وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا سب سے پہلے وہ کینڈا پہنچا پھر وہاں سے برطانیہ اور پھر اٹلی اور آخر کار وہ مصر پہنچ گیا جہاں اسے گرفتار کر کے امریکہ پہنچا دیا گیا اور سن 1916 کو وہ وفات پا گیا۔ ریاست ہائے متحدہ نے مصری حکومت کو مرحوم صدر کی ایک تصویر تحفے کے طور پر بھجوائی۔

اکیسوی صدی کے قاری کے لئے شاید یہ حقیقت عجیب ہو کہ خانہ جنگی کی کہانی مشرقِ وسطی کے پس منظر میں بالکل درست ثابت ہوتی ہے۔ جس طوفان نے امریکہ کو توڑا پھوڑا اسی نے اسے متحد بھی کیا اور یہی تعلیم اور صحت اور خطے میں معاشی انقلاب کے تعامل کا باعث بنا۔ مشرقِ وسطی کے بعض علاقوں میں انقلاب کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ مصر سے بھی زیادہ تھے۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جو امریکہ میں جنگ سے قبل اجنبی تھا۔ بعد میں امریکی توجہ کا مرکز تھا۔

شمالی اور جنوبی امریکی نیل کی زمین پر

مصر پر امریکی خانہ جنگی کے دیر پا اثر کو ایک لفظ مین بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے ''کپاس'' جو کہ ایک عربی لفظ سے نکلا تھا مصرؔ نے سن 1820 میں کپاس کے ایک نئے پودے کو برآمد کیا جو کہ یورپ میں بہت مشہور ہوا جس سے محمد علی کو بہت فائدہ ہوا جس نے کہا کہ نیل کے گرد ہر جگہ کپاس موجود ہے ایک مغربی سیاح نے کہا کہ کپاس کے سفید پھول ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں اور سب اس ہی کے خواب دیکھتے ہیں۔ ولیم حاجسن نے اس کا موازنہ اپنے جنوبی کھیتوں سے کیا اور کہا کہ یہاں زرخیز زمین پر نااہل دیہاتی کام کرتے ہیں مگر اس کا اثر ان کی پیداوار پر نہیں پڑتا اور یہ ریاست ہائے متحدہ کے لئے دلچسپ بات ہے۔

سن 1837 تک مصر کی کپاس کی پیداوار میں اور اضافہ ہوا اور سن 1846 میں محمد علی نے ڈاکٹر جیمز کی مدد سے کپاس کی پیداوار کے امریکی طریقے اپنائے مگر وہ وہاں سے دو سال میں ہی تنگ آ کر واپس آ گیا، ایک حادثے میں اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی اور اپنے ملازمین کو دینے کے لئے اس کے پاس ان نو بکریوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا جو اسے وہاں کے حکمران نے تحفے کے طور پر دی تھیں۔

اپنے پرانے طریقے پر چل کر مصری جنوبی ریاستوں کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے جو تعدود میں زیادہ اور قیمت میں کم کپاس دے کر یورپی ضرورت کو پورا کر رہی تھیں۔ خانہ جنگی سے اس پر اچانک فرق پڑا، شمالی بندرگاہوں کو برطانوی اور فرانسیسی مدد سے بند کر دیا گیا تا کہ یورپی ملکوں تک خام مال نہ پہنچ پائے جس سے کپاس کی قیمتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور ساتھ ہی مصری پیداوار

میں بھی جس سے حکمرانوں کو خوشی ہوئی کہا گیا کہ مصر میں کپاس کا اضافہ ہمارے ملک کے لئے اہمیت رکھتا ہے یہ بھی کہا گیا کہ اگر کپاس پیدا کرنے والے ممالک اگر مصر مین کپاس کی پیداوار اور اس سے ہونے والے فوائد کو نہ دیکھ سکے تو جلد ان کی امیدوں پر پانی پھر جائے گا امریکہ نے تو یہاں تک کیا کہ اپنا ایک سفیر قاہرہ بھیجا تا کہ وہ وہاں کپاس کی پیداوار کو بڑھانے کے بارے میں بات کر سکے مصری برآمدات میں سات ملین ڈالر سے ستر ملین ڈالر تک اضافہ ہوا اور چار سال مین یہ اضافہ گیارہ گنا اور بڑھ گیا۔

اس میں زیادہ ہاتھ ایک شخص کا تھا جو محمد علی کا پوتا اسماعیل تھا وہ سن 1863ء تک اقتدار میں آنے سے پہلے ہی خود کو مصر میں سب سے زیادہ زمین کا مالک بنا چکا تھا اور جدید طریقے استعمال کر کے وہ خود کو اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچا رہا تھا اس نے اپنے شہر کو مغربی رنگ میں ڈھالا ہوا تھا اور صحرا میں نہریں، ریل کی پٹریاں اور ٹیلیگراف کا نظام قائم کیا تھا اس نے Lincoln کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہاں کے لوگوں کی بہتری کے لئے اقدامات کئے اور عثمانیوں سے خدیو کا خطاب حاصل کیا اس کا اصل مقصد آزادی تھا اور اس کے لئے اسے فوج کی ضرورت تھی۔

ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے سپاہیوں کے لئے جدید اسلحہ بھی خریدہ اور ان کو جدید تربیت بھی دلوائی۔ روایتی طور پر مصری تربیت کے لئے فرانسیسی یا برطانوی افسروں سے مدد لیا کرتے تھے مگر اسماعیل نے ان پر بھروسہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس ریاست ہائے متحدہ کی عسکری قوت یکدم سامنے آئی تھی مگر انہوں نے کبھی مصر میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

خوش آئیند مگر غیر جانبدار ماضی:

شام اور فلسطین کے برعکس جو کہ تبلیغیوں کی آماج گاہ تھے مصر میں امریکہ کی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسکندریہ اور قاہرہ میں امریکی سفارت خانے موجود تھے اور مصری بحری افواج کو بھی امریکی مدد حاصل تھی مگر یہ معمولی باتیں تھین جن کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا، تبلیغی بھی بس نیل تک ہی محدود تھے جہاں سن 1861 تک کوئی اسکول یا ہسپتال قائم نہیں ہوا تھا۔ امریکی حکومت نے مصری سیاست مین بھی کوئی خاص عمل دخل نہیں رکھا تھا نہر سوئیز کی کھدائی کے سلسلے میں بھی نہیں۔ مصر اور امریکہ کا رابطہ بھی بس تحائف کی لین دین تک ہی محدود تھا۔

ان کے درمیان پرجوش روابط پر میکسیکو میں مصری افواج کی موجودگی نے برف جما دی تھی مگر اس کے اثر کو کپاس کے برآمدات نے زائل کر دیا تھا اور اس کو خود چارلس ہیلز نے جس نے پہلے مصر کو دھمکایا تھا پسند کیا تھا اور خوش آمدید کہا تھا۔ اس نے لکھا کہ مصری حکمرانوں نے ہمیشہ ہمیں عزت دی ہے اور ہمارے ساتھ ان کا سلوک اچھا رہا ہے دسمبر 1864 میں لنکن نے بھی کانگرس کو مطلع کیا کہ مصر سے ہمارے تعلقات تسلی بخش ہیں۔

اسماعیل کے لئے ریاست ہائے متحدہ سے تعلقات کا محض تسلی بخش ہونا کافی نہ تھا۔ جنگ کے دوران اس نے امریکی ہتھیاروں کی صلاحیت اور ان کی صنعتوں کی عظمت دونوں ہی کا بغور جائزہ لیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کس طرح ریاست ہائے متحدہ نے واپس اپنے آپ کو دنیا کے سامنے اس ہی مقام پر لا کھڑا کیا۔ اس کا ماننا تھا کہ عالمی معاملات میں ریاست ہائے متحدہ کو اہم کردار ادا کرنا ہے اور وہ مصر کی آزادی میں بھی اہم کردار ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ امریکی عسکری مشیر نا صرف مصری افواج کے لئے فائدہ مند ہوں گے بلکہ وہ ان کے درمیان رابطے کا بھی اہم ذریعہ بن سکتے ہیں۔ پچاس سال پہلے اس کے ایک بزرگ نے ایک مہم جو کو اپنے اسلحے کے لئے ملازم رکھا تھا اور اب اسماعیل ہزاروں میل دور سے اس قوم کے کئی افسروں کی مدد کا متمنی تھا جس سے ان کے تعلقات کوئی خاص نہیں تھے حیران کن طور پر اس نے امریکہ کہ جانب دیکھا۔

تھیوڈور ماٹ جو دیکھنے میں کسی کہانی کا بہادر کردار معلوم ہوتا تھا اسماعیل سے ملنے سے پہلے ہی اطالوی فوج میں ایک افسر کے طور پر اپنی خدمات دے چکا تھا وہ De, Valentine Mott کا بیٹا تھا جس نے سن 1840 میں مشرقِ وسطیٰ اور مصر کا دورہ کیا تھا اور عثمانی حکمرانوں سے اچھے تعلقات رکھے تھے اپنے والد کے ساتھ استنبول میں اس نے ایک عثمانی حکمران کی بیٹی سے شادی کی اور ترکی زبان سیکھی اور عدلیہ میں اپنی جگہ بنائی۔ اسماعیل سے ملاقات کے دوران ماٹ نے اس پر گہرا اثر چھوڑا اور اسی وقت اس کو مصری فوج میں افسر رکھ لیا گیا۔ وہ فوراً ہی ریاست ہائے متحدہ واپس آیا اور اس نے کے ساتھ بریگیڈیئر فٹز جان پاسٹر تک بھی یہ بات پہنچائی مگر ان مین سے کسی نے ذرا بھی دلچسپی نہیں لی مگر Porter نے اس کی ملاقات ولیم شرمن سے کرائی جو اب ریاست ہائے متحدہ کی فوج کا چیف جنرل تھا۔ اس نے ماٹ کی بات کو تو رد کیا مگر وہ مصر سے ہمدردی رکھتا تھا اور دوسرے کئی افسروں کے بارے میں بھی سوچتا تھا جنہوں نے اس کے ساتھ یا اس کے خلاف

خانہ جنگی میں حصہ لیا تھا اور اب وہ کچھ نہیں کر رہے تھے، یہ ان کے لئے اچھا موقع تھا۔

ان ہی میں ایک ولیم ونگ بھی تھا جس کا بس ایک ہی ہاتھ جنگ کے بعد بچا تھا اور ساتھ ہی وہ وکیل بھی تھا وہ ایک باہمت سیاست دان اور بہادر افسر تھا جو ایک بار پوری رجمنٹ کو ایک بھی سپاہی کھوئے بنا اور ریگان میں ڈھائی ہزار میل آگے لے گیا تھا۔ وہ مشرقِ وسطیٰ مین اجنبی نہیں تھا وہ پہلے بھی وہاں کام کر چکا تھا اور اب اپنی موجودہ نوکری سے اکتا کر اس نے فوراً ہی شرمن کی پیشکش قبول کر لی تھی۔

ایسے ہی چارلز سٹون نے یہ پیشکش قبول کی جس کو بدقسمتی کا سپاہی کہا جاتا تھا اس کو واشنگٹن میں تعینات کیا گیا تھا مگر جلد ہی اس کو شکست کا ذمہ دار ٹھرایا گیا اور کسی بھی مقدمے کے بنا اس کو چھ ماہ قید رکھا گیا ذہنی اور جسمانی طور پر ٹوٹ جانے کے سبب اس کی بیوی اسی دوران ہلاک ہو گئی اور آخر کار اس نے ایک کان میں کام شروع کر دیا۔ شرمن کو وہ وہیں ابتر حالت میں ملا وہ بھی تبدیلی چاہتا تھا۔

اسٹون کو چیف آف سٹاف اور لورنگ کو انسپکٹر جنرل بنایا گیا۔ ابتداء میں ان کے ساتھ ٹھارہ افسر تھے جن میں سیموئل لاکٹ تھا جو کہ ایک فنکار اور شاعر تھا نارتھ ورجینیا سے تین آدمی تھے جنہوں نے افریقہ کے پاس غلاموں کی کشتی کو آزاد کروایا تھا اور ان کے علاوہ کچھ ایسے افراد بھی تھے جو چند سال پہلے تک ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے وہ سب ایک ہی بحری جہاز میں ایک ہی جیسی مشکلات سے دوچار ہو کر اگست 1859 کو اسکندریہ پہنچے۔

تہذیب کنندگان:

امریکیوں کی مصر آمد غلط وقت پر ہوئی معاشی بحالی جو ایک دم سامنے آئی تھی اب کسی حد تک تنزلی کا شکار تھی، کپاس کی قیمت میں خاطر خواہ کمی سامنے آئی تھی۔ اچھے دنوں میں مصر نے بے حد ترقی کی تھی قاہرہ میں نہریں اور پل بنائے گئے تھے لوگوں کو تفریح کا سامان مہیا کیا گیا تھا یورپ کے شاہی لوگوں کے لئے دعوتیں کی گئی تھیں ساتھ ہی نہر سوئیز کا جشن منایا گیا تھا اور ان سب کے نتیجے میں اب اسماعیل کے سر ایک سو ملین ڈالر کا قرضہ تھا اور اب یورپ مصر کے خزانے میں دخل اندازی کا خواہاں تھا۔

اس بات کی خبر دونوں امریکیوں کو نہیں ہونے دی گئی اور انہیں اسکندریہ اور قاہرہ بھیج دیا گیا جہاں دو دن انہوں نے شہر کا دورہ کیا اہرامِ مصر کے ساتھ انہوں نے وہ مقام بھی دیکھا جہاں محمد علی رہا کرتا تھا۔اس مقام نے ان کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا وہاں کی گلیوں نے اور مقامی عہدیداروں نے جس کو یہ شکایت تھی کہ یہاں بہت امریکی آ گئے ہیں اور اب کچھ کو واپس جانا چاہیئے ۔جیمز مورے مورگن نے جو کہ ایک چوبیس سالہ پیشہ ور پہلوان تھا اور جس نے خفیہ مہر برطانیہ کے حوالے کی تھی اس عہدیدار کو مقابلے کی دعوت دی جس کے بارے میں سٹون نے کہا کہ یہ یکدم ہونے والی ایک ایسی بات تھی جس کا میرے سامنے ہونا میری خوش قسمتی تھی۔عہدیدار نے مقابلے سے انکار کیا اور وہ اپنے مہمانوں کو بازار لے گیا جہاں ایک اطالوی درزی نے ان کے کپڑے تیار کئے جو کہ مکمل سیاہ تھے۔

وہاں سے ان کو نیل کے کنارے سے ایک عالی شان محل میں پہنچایا گیا کرنل چارلسنے کہا کہ یہاں مغرب کی تہذیب اور مشرق کی شان وشوکت آپس میں مل رہے ہیں،اس چوڑے شانوں والے شخص نے یہ نوکری اپنی بیوی اور پانچ بچوں کے لئے کی تھی جن کی کفالت اس کا فارم نہیں کر پا رہا تھا۔اس شان وشوکت سے مرعوب ہونے کے بعد امریکیوں کی ملاقات خدیو سے ہوئی جس کی شخصیت اس عالی شان محل سے مختلف تھی اس کو دورانِ گفتگو بار بار ایک آنکھ جھپکنے کی عادت تھی جو اس کے کردار کے ساتھ مل کر اسے مشکوک بناتی تھی،اس نے فرانسیسی میں بات کی جس کا ترجمہ چارلس نے کیا،امریکی اس کے الفاظ سے متاثر ہوئے۔اس نے ان کی پچھلی خدمات اور جنگ مین امریکہ کے کردار کی تعریف کی اس نے کہا کہ جب آپ کی مدد سے مصر کو آزاد کر لیا جائے گا تب وہ آپ سب کو اعلیٰ ترین شاہی اعزاز سے نوازے گا۔

اس داد کا حصول مشکل سے ہوتا ہے سو امریکی کام پر لگ گئے ۔جہاں کبھی محمد علی کا حرم ہوا کرتا تھا وہاں اسٹون نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔وہیں اس نے مصری فوج کی تاریخ میں پہلا جنرل سٹاف بنایا اور چار ہزار کتابوں اور نقشوں کی لائبریری قائم کی ساتھ ہی ایک پریس بنایا گیا جہاں اس نے امریکی اور برطانوی نمونے بنائے اور مصر کا پہلا کوڈ آف کنڈکٹ تحریر کیا۔اس دوران لورنگ نے مصر کے دفاع کا جائزہ لیا جس کا حال اچھا نہیں تھا فوج کے پاس قدیم اسلحہ تھا جو تقریباً ناکارہ تھا۔مواصلات کا نظام بھی ختم ہو چکا تھا اور ان سب چیزوں میں سب سے ابتر حالت خود سپاہیوں

کی تھی جن کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ سب ان پڑھ دیہاتی تھے جو اپنے ہی جیسے ان پڑھ دیہاتی افسروں کے ہاتھوں وہی کچھ کر رہے تھے جو نپولین کے دور میں ہوا کرتا تھا۔

ان سب چیزوں کو درست کرنا ایک کارنامہ تھا سو اسٹون اور لورنگ نے یہ کام آدھا آدھا بانٹ لیا۔ایک بازو والے جنرل نے دفاع کی زمہ داری لی،انجینیر اور جنگی جہاز کے کپتان بیور کنین کی مدد سے لورنگ نے اسکندریہ سے روختہ تک خفیہ مورچے بنوائے جن مین گولہ باری کرنے والا اسلحہ رکھا گیا۔اسٹون نے مکمل فوج کی تشکیلِ نو کو اپنے ذمہ لیا اس کی مدد رنیالڈز اور اس کے بیٹے جارج نے کی۔ایک بانس کا خیمہ ایجاد کرنے والے ایک اور باغی کمانڈر ہنری سبلی نے اسلحے کا ذمہ اٹھایا۔اسٹون اور اس کے ساتھیوں نے فوج کو رجمنٹ اور ڈویژن میں تقسیم کیا اور اسلحے کے کارخانے لگوائے۔

امریکیوں نے مصر کو جدید فوج کی بنیاد دے کر ان کی آزادی کی راہ ہموار کی اس کے باوجود جیسے ہی اسماعیل کو یہ اندازہ ہوا کہ باغات اور عمارتیں اس کے ملک کو آزاد نہیں کر سکتیں ویسے ہی امریکیوں کو بھی اندازہ ہوا کہ محض وردیاں اور داؤ پیچ ایک متحد فوج نہیں بنا سکتے۔اس کے لئے وطن کی محبت کو اجاگر کرنے اور تہذیب یافتہ معاشرے کے قیام کی ضرورت تھی اور یہ سب بنا کتاب پڑھے سیکھنا مصری فوجیوں کے لئے مشکل تھا،ان میں سے نوے فیصد پڑھنا نہیں جانتے تھے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے عربی زبان کا ایک اسکول قائم کیا گیا جہاں تقریباً پندرہ سو افسران آئے ان میں سے بہت سے اپنے بچون کے ساتھ یہ پوچھتے ہوئے آئے کہ کیا وہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ پڑھنا سیکھ سکتے ہیں اور بہت جلد اس سکول میں تین ہزار مصری تعلیم حاصل کر رہے تھے۔تین سال کے اندر اندر تین چوتھائی سپاہی ءپڑھنا سیکھ چکے تھے۔

مشرقِ وسطی میں امریکی تہذیب کے نمائندگان اب امریکی ایمان کی ترویج کر رہے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ وہاں پر تفریح بھی کرتے اور اپنے خیالوں کو سچ ہوتا دیکھتے اسماعیل کے بچوں کے اعزاز میں ہونے والی دعوتوں اور اوپرا میں ان کو دعوت دی جاتی جو کئی ہفتوں تک جاری رہتی کرنل ولیم نے بتایا کہ وہان ان دعوتوں میں انسان اپنے تصورات کی حدوں کو چھو لیتا۔

یہ حسین خواب زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکا پہلے آنے والے امریکیوں کی طرح انہیں بھی وہاں انہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور جلد ہی ان پر مشرقِ وسطی کے تلخ حقائق آشکار ہوئے،لورنگ

کے مطابق وہاں کا مذہب اسلام روشن خیالی کا مخالف تھا اور کسی بھی قسم کی آزاد فکر کی اس میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے شکایت کی کہ نوجوان مسلمانوں کو بربریت کا وہی سبق پڑھایا جاتا ہے جو ان کے بزرگوں نے ان سے پہلے پڑھا اور فساد برپا کیا وہ امید کرتا تھا کہ کوئی عربی لوتھر آ کر نفرت کے اس رواج کا خاتمہ کرے۔ اس کے برعکس کرنل گریورا اس مذہب میں عیسیٰؑ کے مقام کی وجہ سے مسلمانوں کو پسند کرتا اور ان کو یہودیوں سے بہتر مانتا مگر وہ بھی اسلام میں خواتین کے مقام سے ناخوش تھا اس نے کہا کہ ظلِ سبحانی کی اس قوم کو تہذیب یافتہ کرنے کی تمام تر کوشش بے سود جائے گی جب تک یہاں سے ہر ایک حرم کا خاتمہ نہیں کر دیا جاتا۔

اس احساس نے امریکیوں کی تہذیب، ان کے کسی بھی دوسرے معاشرے میں زندگی گزارنے کی صلاحیت اور عربی سیکھنے میں جھجک کو اجاگر کیا۔ مفاہمت کی کمی باہمی تھی جیمز مارگن کے صبح اٹھ کر اپنی بندوق صاف کرنے کی بجائے دعا کرنے پر احمد عربی اسے عیسائی شدت پسند ٹھہراتا اور جیمز مارگن کھلے عام خدیو کی انیس سالہ بیٹی پر ڈورے ڈالتا۔ مصر کے ایک عہدیدار نے جب اس سے ایک دفعہ پانی مانگا تو اس نے غصے میں آ کر پانی اس مصری کے منہ پر پھینک دیا۔

ان میں سے کسی بھی بات نے افسروں کو اپنا کام کرنے سے نہیں روکا اور سن 1873 تک مصر کے پاس انیسویں صدی کی جدید مغربی افواج جیسا سب کچھ تھا۔ افسروں نے اپنا کام بخوبی کیا تھا جب ہی ماٹ کو ایک بار پھر ریاست ہائے متحدہ سے فوجی افسروں کو لانے کے لئے بھیجا گیا۔

بدقسمتی سے اس فوج کے ہوتے ہوئے بھی مصر کی معاشی حالت بڑھتے ہوئے قرضوں کے سبب ابتر تھی کپاس اور نہر سوئیز سے ناکام ہو جانے کے بعد اسماعیل نے دیوالیہ ہونے سے بچنے کے لئے آخری حربہ آزمایا۔ جو علاقے اب یوگنڈا، یوتھوپیا اور دکنی افریقہ کے نام سے جانے جاتے ہیں پہلے کسی حد تک مصری حکومت میں تھے اور وہاں سونا ہاتھی دانت اور دیگر چیزیں موجود تھیں ان علاقوں مین سے اکثر پر محمد علی کا دعوی تھا ان علاقوں پر مصری تسلط اور فرانسیسی یا برطانوی طرز حکومت قائم کرنا مشکل، ہمت، اور صلاحیت کا کام تھا جو اسماعیل کے مطابق امریکی خصوصیات تھیں۔

قلبِ ظلمات:

اس سلسلے میں دو اقدامات کئے گئے اول تو ایک وفد کو سوڈان بھیجا گیا جو اسی راستے سے

سوڈان گیا جس راستے سے جارج انگلش پچاس سال پہلے گیا تھا، اس کی قیادت سب سے باعزت امریکی مشیر ریلے کولسٹن کر رہا تھا اس کا ارادہ تھا کہ وہ شمال مغرب کی طرف مڑنے سے پہلے چار سو میل آگے جائے گا جہاں وہ ایک اور وفد سے ملے گا جو کہ سپیر پرڈی کی قیادت میں سمندر کے راستے آ رہا تھا۔

وہ نومبر سن 1874 کو مصر سے روانہ ہوئے اور تین ماہ تک کے سفر پر رہے جہاں غلاموں کی غیر قانونی منڈیاں تھیں۔ اس دوران روزانہ اوسطاً آٹھ افراد کسی نہ کسی وبا یا گرمی کی شدت سے ہلاک ہوتے اور ان سے بھی زیادہ جانور۔ خود کولسٹن بھی اس دوران سخت بیمار ہو گیا اور اس کا نچلا دھڑ فالج کا شکار ہو گیا، اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور وہیں اپنا کام جاری رکھا اس نے سٹون کو مطلع کیا کہ میں ایک جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوں مگر میں مرتے دم تک اپنا کام جاری رکھنا چاہتا ہوں کہا جاتا ہے کہ اس نے خود کو ایک گھوڑے کی پشت سے باندھ کر قاہرہ کی طرف سفر کیا۔ پرڈی اس دوران برنوس پہنچنے میں کامیاب ہوا جہاں اس نے ایک ڈیم کے بننے کی پیشگوئی کی، وہ اپنے ساتھی پر بھروسہ کرتا تھا جس نے کیوبا، چلی اور جنوبی چین میں کام کیا تھا، وہ عربی جاننے والے چند امریکیوں میں سے ایک تھا وہ اس علاقے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کا نقشے میں اب تک کوئی ذکر نہیں تھا اس علاقے سے تو اس کو زیادہ امید نہیں تھی مگر تبلیغی اور فلاحی ادارے اس میں دلچسپی لے سکتے تھے، اس نے اپنی رپورٹ جمع کروائی مگر اس نے ریاست کو کوئی خاص فائدہ پہنچنے کے امکانات نہیں تھے۔

پہلے مشن کی بے سود تلاش نے دوسرے مشن کے اسباب پیدا کئے اور اس بار اسماعیل نے چارلس کو افریقہ کی طرف روانہ کیا وہ پچاس سال کی عمر میں بھی لڑکا سا دکھنے والا ایک پیچیدہ شخص تھا جو غصہ کا تیز تھا وہ نیل پر برطانوی اور فرانسیسی دعوے سے پہلے مصری تسلط چاہتا تھا اور غلامی کے خلاف تھا اس نے بتیس سالہ چارلس لونگ کو اپنا نائب چنا۔

وہ 21 فروری سن 1874 کو سفر پر روانہ ہوا دونوں افراد کے درمیان تعلقات سفر کے دوران ہی بگڑ گئے، اس فرسودہ شاعر نے اپنے زیادہ تر جاننے والوں کے خلاف بات کی جو کہ گورڈن کے مطابق اس کے اپنے کردار کی آئینہ دار تھی اسماعیل کو پھر بھی یقین تھا کہ امریکی یہ کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ایک دہائی بعد گورڈن کو مسلمانوں نے قتل کر دیا اور چارلی لونگ

رباقہ پہنچ گیا

حیرت انگیز طور وہاں امریکی کا استقبال گرم جوشی سے کیا گیا مگر اس کے یہ خیالات جلد ہی خوف میں بدل گئے جب روایت کے مطابق کچھ جنگجو دہاڑتے ہوئے وہاں آئے اور اپنی زد میں آنے والوں کو گرا کر ان کے سروں کو کچلنے لگے۔

اس نے چند چیزیں جن مین ایک آئینہ، موسیقی کا ایک آلہ اور ایک بیٹری تھی دکھا کر حاکم کو حیران کیا اور پھر تحائف کا تبادلہ ہوا مصر کی طرف سے قیمتی پتھر اور ایک گھوڑا دیا گیا جواب سے پہلے وہاں نہیں دیکھا گیا تھا اور حاکم کی طرف سے ایک لڑکا اور آٹھ جوان لڑکیاں تحفے کے طور پر پیش کی گئیں جن میں اس کی بیٹی بھی شامل تھی چارلی لونگ خوش تھا کیوں کہ اس کا مقصد تقریباً پورا ہو چکا تھا۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ نیل تک وکٹوریہ جھیل بھی جاتی ہے امریکی چھ دن تک اتھلے پانیوں میں چلتے رہے جہاں ان کا سامنا سات سو علاقائی جنگوؤں سے ہوا، فائرنگ کر کے وہ ان کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوا۔ اپنے چہرے پر گولی لگنے سے پہلے وہ بیاسی افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اس سے پہلے بھی وہ Niam-Niam کے گاؤں سے زندہ بچ کر آ چکا تھا اور زہر میں بجھے تیر اور شیر کے حملے سے بچ چکا تھا۔ تین ماہ بعد وہ بری حالت میں گورڈون کے ہیڈ کوارٹر پہنچا جہاں اس کی حالت فقیروں جیسی تھی۔

اس نے Lake Kio دریافت کی اور امریکیوں نے اعزازات سے نوازا خدیو نے کہا کہ اس نوجوان افسر نے تھوڑے دنوں میں وہ کر دکھایا جو پوری مصری فوج چار سال میں بھی نہ کر پائی اس کے پاس نہ تو اب زیادہ پیسے تھے اور نہ ہی وقت یورپی اس پر دیوالیہ ہونے کے لئے دباؤ ڈال رہے تھے سوا سے افریقہ کی ضرورت تھی۔

لونگ کو اب آرام کی ضرورت تھی وہ پیرس پہنچا جہاں سے اسے واپس مصر بلا لیا گیا۔ ستمبر 1875 کو وہ تیرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ صومالی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا اسماعیل نے اسے کہا کہ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کو پوشیدہ رکھا جائے گا میں تم پر اور تمہاری قابلیت پر بھروسہ رکھتا ہوں، برطانیہ کو شک میں مبتلا کئے بغیر اسے یوگنڈا کا راستہ تلاش کرنا تھا ایک اور وفد کو یوتھوپیا روانہ کیا گیا۔ کامیابی کی صورت مین ان مہمات سے مشرق اور افریقہ کو ملا کر مصر کو بچایا جا سکتا تھا۔

جب لونگ نے سلطان زنجبار کا قلعہ فتح کیا اور جُبہ کی طرف پیش قدمی کی، تو جُبہ کی مہم ناکامی کا شکار ہو گئی۔ کرنل آرین ڈرپ کو جنگ کا تجربہ نہیں تھا۔ اس نے امریکی میجر کی بات نہیں مانی، اور وہ وادی میں داخل ہو گیا۔ جہاں وہ خود بھی مارا گیا اور دو ہزار مصری بھی مارے گئے۔

اس قتلِ عام کا بدلہ لینے کے لئے اسماعیل نے جدید اسلحے سے لیس بارہ سو فوجی بھیجے۔ لورنگ کو چیف بنا کر بھیجا گیا اور اس کے ساتھ دوسرے امریکی بھی بھیجے گئے راتب پاشا کو بھی ساتھ بھیجا گیا جو کہ اپنی جسامت کی طرح نازک مزاج بھی رکھتا تھا اس کا اصل مقصد جنگ نہیں بلکہ اسماعیل کو مطمئن رکھنا تھا فروری 1876 میں وہ اری تم پہنچے جہاں ان کے جانور موسم کی سختی کی وجہ سے مرنے لگے Dye کے مطابق وہیں راتب نے اپنی بزدلی ثابت کر دی اس نے کچھ بھی کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی بجائے وہ اپنے چھ سو سپاہیوں کے ساتھ وادی میں اتر گیا۔

7 مارچ کو ہونے والا حملہ تباہ کن تھا مصریوں کی صف جلد ٹوٹ گئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ سب ڈائی اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ دیکھتا رہا تمام سپاہی بری طرح مارے گئے لورنگ نے کہا کہ اس دہشت کو بیان نہیں کیا جا سکتا نہ صرف مصریوں نے خود اپنے آپ کو مرنے کے لئے ان قبائلیوں کے آگے پھینک دیا بلکہ وہ ان کے پنجوں میں جکڑتے چلے جا رہے تھے ان کی واحد امید اب وہ توپیں تھیں جو ایک ہشام پاشا کی نگرانی میں تھیں مگر وہ کسی وجہ سے انہیں استعمال نہیں کر پایا اور ڈائی کے پاس واپس آنے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا مگر واپسی پر لورنگ کے پاس بھی صورت حال ابتر تھی لورنگ جو کسی بھی امریکی سے زیادہ جنگوں سے بچ کر آ چکا تھا اس بار ڈرا ہوا تھا اس نے وادی کو وحشی آوازوں میں چیختا چلاتا دیکھا۔ قبائلی آگے بڑھتے گئے اور ان زخمیوں کو ہلاک کرتے گئے جن کو میدان میں چھوڑا گیا تھا ڈائی ان کی رحم کی اپیلیں سن سکتا تھا جن میں کوئی بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی وہ اگر گولی سے بچتے تو تلوار سے مارے جاتے اور اس سب کے باوجود راتب نے جوابی کاروائی نہیں کی اور وہ وہ چھپا رہا امریکیوں کو اب اپنے ہی فوجیوں پر گولی چلانے کا ڈر تھا۔

اس دوران مصریوں نے گولہ باری کر کے کسی طرح قلعہ کو محفوظ کیا اور جواباً وہ لوگ قلعے سے باہر نکلے اور اپنی دہشت دکھانے کے لئے زخمیوں کا قتل اور لاشوں کے بے حرمتی کرنے لگے وہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر یہاں وہاں بکھرا دیتے۔

امریکی ایک اور ایسے ہی حملے کے لئے تیار تھے ڈائی نے قلعے سے باہر بکھری ہوئی لاشیں

اور انسانی اعضاء دیکھے جو ہر طرف بکھرے ہوئے تھے بچ جانے والے اپنی موت کے منتظر تھے کنگ جان نے پیغام بھیجا کہ اس کو قتلِ عام سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اس نے امن کا پیغام بھیجا۔

جیسے ہی وہ کیمپ میں داخل ہوا وہاں خوشیاں بکھر گئیں جس کے بارے میں لورنگ نے لکھا کہ اتنے بڑے قتلِ عام کے بعد ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں راتب نے بخوشی ہار تسلیم کر لی حسن معذرت کر کے شکار کے لئے باہر آیا اور مصور چلا گیا جہاں اس کے والد کی کشتی اس کی منتظر تھی اور اس کے کئی دن بعد تھکے ہارے مصری فوجی امریکیوں کے ساتھ واپس آئے۔

لورنگ اور اس کے آدمیوں کی مشکلات یہاں ختم نہیں ہوئیں بلکہ اور زیادہ بڑھ گئیں۔ راتب نے خود کو اس جنگ کا ہیرو کہا اور عثمان نے جس کے بارے میں لورنگ نے لکھا کہ اگر وہ کسی اور فوج میں ایسا کرتا تو اس کو بزدل کہہ کر سزائے موت دے دی جاتی دعویٰ کیا کہ اس نے خود ہزاروں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ جوابدہ صرف امریکیوں کو ٹھہرایا گیا، ڈائی کو جس نے ایک مصری افسر کو لڑائی سے انکار پر تھپڑ مارا تھا اور چارلی لونگ بھی نہ بچ سکا اس پر بھی یہ الزام تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام لوٹا اس پر بڑھ کر حملہ کرنے کا بھی الزام تھا، بہرحال وہ امریکہ واپس لوٹ آئے۔

اس سلوک کو جلد ہی فراموش کر دیا گیا اسماعیل کو مجبوراً نہر سوئیز کے شیئر بیچنے پڑے جون 1878 میں برطانیہ نے فوجی تربیت کا سکول بند کر دیا اور تقریباً تمام ہی امریکی افسران کو فارغ کر دیا جس کی لورنگ نے سخت مذمت کی۔

سوقریب ایک دہائی کی خدمت کے بعد وہ واپس آئے ماٹ استنبول میں اور ڈائی کوریا میں اپنی خدمات دینے لگا اور دیگر نے بھی اپنے لئے کوئی نہ کوئی انتظام کر لیا مگر سب ہی ایسا نہ کر سکتے سبلی اور رینالڈ شراب پی پی کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ان میں کچھ بیماری سے کبھی ٹھیک نہ ہو پائے۔ مصر کا ان تمام ہی پر قرضہ تھا جو کچھ کو تو سالوں تک نہیں دیا گیا۔ ملنے والی پنشن چھ ہزار ڈالر تھی جو کہ چارلس کے فارم کے لئے کافی تھی اس نے تاعمر اپنے پاس ایک گدھا پال رکھا تا کہ اسے مصر کی یاد رہے۔

لورنگ ان سب میں سب سے زیادہ خوش قسمت تھا اس نے واپس آ کر اپنے تجربات قلم بند کئے اور وہ نیویارک میں فوت ہوا اور اس کے ساتھ ہیاسٹون اور چارلی لانگھی، ان کو فلوریڈا

میں دفنایا گیا اور دس ہزار لوگوں نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔

خانہ جنگی کے اڑتالیس افسران نے جو گرے اور بلیو کہلاتے تھے سب نے مل کر کام کیا مصر کی کھوج کی اور اس کے لئے لڑتے بھی رہے انہوں نے ایک آرمی قائم کی سکول بنائے اور افریقہ کے لئے بہت کام کیا۔ ڈی Dye نے یادداشت میں ان کی بہت تعریف کی اور سراہا ''یہ لوگ بہت شہرت یافتہ، ماہرِ تعلیم، تہذیبی تبدیلی میں مدد کرنے کو شوقین تھے اور نیل کی کلاسیکی زمین پر تبدیلی لے کر آئے ان میں حصولِ علم کا بہت جذبہ تھا ان کا اہم کام مصریوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا اور انہیں مصری شہری بنانا اور اس کا شعور پیدا کرنا تھا یقینی طور پر انہوں نے آزادی اور تہذیبی عمل کے لئے جو فوج قائم کرنے میں مدد دی اب وہ لیڈنگ آرمی ہے اور تقریباً ایک صدی تک قائم رہی۔

اکیلے آزمودہ کار لوگ ہی مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں میں امریکی نظریات اور اندازِ فکر کی آبیاری کرنے والے نہیں تھے بلکہ عیسائی تبلیغی بھی اس قسم کے سکول قائم کر کے قومی اور شہری نظریہ قائم کرنے کی سعی میں شریک تھے امریکی ایونجلسٹ بھی خانہ جنگی سے متاثر ہوئے اس سے جو خوف پیدا ہوا اور اس سے جو امید جاگی اس سے شدید متاثر تھے۔

عزم شکست نہیں کھا سکتا:

کاش یہ غلامی اور نسلی تعصب نہ ہوتا جو غلامی کے خلاف شمالی حصے تک میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ ایڈورڈ ول موٹ بلائڈن نے کبھی مشرقِ وسطیٰ کا دورہ نہیں کیا تھا۔ وہ 1832ء میں ویسٹ انڈیز میں پیدا ہوا۔ اس پر باپ کی طرح درزی بننے پر بہت زور دیا گیا لیکن اس نے درزی بننے سے انکار کر دیا اور اپنی دینی اخلاقی تعلیم ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے اٹھارہ سال کی عمر میں گھر چھوڑ دیا اور نیو جرسی روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ Rutgers Theological Seminary میں داخلہ لینے کا تھا۔ اس نے ان کی تمام شرائط پوری کر لی تھیں لیکن ایک شرط وہ پوری نہ کر سکا کیونکہ ایڈورڈ کالا تھا اور اسے داخلہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ ریاستِ ہائے متحدہ امریکہ میں کہیں مساوات اور برابری ناقابلِ حصول تھی۔ اس نے لائبیر یا ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔

لائبیریا کی بنیاد 1817ء میں بطور غلاموں کی پناہ گاہ کے رکھی گئی جو امریکہ سے آتے تھے اور تیس سال کے بعد آزاد ریاست کے طور پر سامنے آئی جسے امریکن ریپبلک کے طرز پر ڈھالا گیا۔ اس ریاست نے بھی کچھ امریکی تعصّبات پال لئے کہ ہجرت کرنے والے تھوڑے سے طبقے کو بہت سہولتیں دی گئیں لیکن لاکھوں کی مقامی آبادی کو ان سہولتوں سے نوازنے سے انکار کر دیا۔ ایک بار جب ایڈورڈ کو پریسبا ئیٹرین چرچ سے عزت ملی تو اس نے لائبیریا کے بھولے اور جاہل قبائل کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس نے مغربی افریقہ میں مزید آگے کی طرف سفر جاری رکھا۔ وہ سیرالیون اور ان علاقوں تک گیا جو آج نائجیریا میں شامل ہیں۔ وہاں پہلی بار اس کا سامنا ایک نئے مزہب اسلام سے ہوا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

ایڈورڈ بلائڈن کو جلد معلوم ہو گیا کہ افریقی مسلمان، خود انحصار اور مددگار تھے۔ اس نے اسلام کو اس بات پر بہت سراہا کہ اس نے مقامی لوگوں کو جہالت سے بچایا، انھیں تعلیم دی اور افتخار دیا۔ ایڈورڈ بلائڈن کے لئے اہم بات یہ تھی کہ اسلامی تہذیب سیاہ فام افریقیوں تک جن اسلامی مبلغین کے ذریعے پہنچی وہ ان کے ہم رنگ اور اور اسی تہذیب کے تھے جس نے غلاموں کے شکاریوں کے سامنے دیوار کا کام کیا، ان میں سے جن کے ساتھ وہ ذیادہ جڑ کر رہا وہ زیادہ تر بے دین اور خدا کے انکاری تھے۔

اسلام سے متعلق جو کچھ نظر آیا بلائڈن اس سے بہت متاثر ہوا اس نے مبلغانہ کوششوں سے مزید کنارہ کشی کی اور اپنے آپ کو افریقہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ ایک دفعہ تعلقات مضبوط ہو گئے تو اسے پورا یقین تھا کہ یہ خطہ مشرقِ وسطیٰ کی قدیم تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان عمل انگیز کا کام کرے گا جس کی انھوں نے اس بات کے لئے پرورش کی کہ نسلی دشمنی کا خاتمہ ہو۔ مصر، لبنان اور شام کا 1866ء میں دورہ کرنے کے بعد بلائڈن اپنے اس خواب کی تعبیر کے لئے مضبوطی سے ڈٹ گیا۔

یہ خیال نہ صرف مسلمانوں اور عیسائیوں کو بھلا لگا بلکہ یہودیوں کو بھی اچھا لگا جنھیں بلائڈن قابلِ تعظیم سمجھتا تھا۔ سینٹ تھامس کے یہودی طبقے میں جوان ہونے کے سبب اسے وہ عزت مل چکی تھی۔ بعد کی زندگی میں بلائڈن کا اس بات پر یقین تھا کہ یہودیوں کی منزل کالوں کے ساتھ مل کر پوری دنیا میں بھائی چارہ قائم کرنا ہے۔ اس پر مزید یہ بھی یقین تھا کہ فلسطین میں دوبارہ یہودی

ریاست کا قیام افریقی آزادی کے لئے ایک مثال قائم کرے گا۔ ''میں اسرائیل سے اس زمین کو عارضی قیام اور ابتدائی تربیت کے طور پر یاد رکھنے کی التجا کروں گا۔ بلائڈن نے لکھا کہ وہ ایتھوپیا کو خدا کی طرف ہاتھ پھیلانے میں مدد کرے۔

ولیم بلائڈن نے بعد میں لائبریا کے سیکرٹری آف سٹیٹ کے طور پر کام کیا اور عظیم برطانیہ میں سفیر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ وہ ایک اچھا ایڈیٹر بھی تھا اور ساتھ ساتھ کلاسیک کا منفرد پروفیسر بھی۔ وہ لنکن اور دیگر ابتدائی عدم غلامی پسندوں کے ساتھ آزادی کنندہ بننے کی آرزو کرتا تھا۔ وہ Fugitive Slave Bill کے مصنف کے طور پر قوم کی تواریخ میں دوام نہیں چاہے گا بلکہ وہ آزادی کے اعلان کے مصنف کے طور پر دوام چاہے گا۔ اس نے امریکہ کے کئی دوروں کے دوران میں یہ فیصلہ کیا کہ جیف ڈیوس کی یادداشت انسانیت میں ہیجان برپا نہیں کرے گی بلکہ جان براؤن کی نام نہاد دیوانگی کو یاد رکھے گی۔

اس کے نتیجے میں نسلوں نے بلائڈن کو بین الافریقیت اور حبشی مسلم تحریک کو متاثر اور تحرک دینے کا امتیاز دیا۔ چند ایک نے اگرچہ اسے مشرقِ وسطیٰ میں تبلیغی معاصرین کا نمونہ قرار دیا، جو سب کے سب سفید فام تھے اور اسلام کے لئے بہت کم قابلِ قبول تھے۔ اپنے طاقت ور عزم اور تمام مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کو پُر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کے خواب کے سبب بلائڈن نے تحریک کو جنم دیا۔ بلائڈن کی طرح عیسائی مبلغین نے بھی اس بات کو مناسب سمجھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کو ان میں عام اور مشترکہ اقدار اور نئی پہچان پیدا کر کے متحد کیا جائے۔ وہ عالمی بہتری کے لئے امریکی نسلی نفرت کے شکار لوگوں کو ایک قوت میں بدلنے کے خواہاں بھی تھے۔ ان کی دعاؤں میں The Trumpet shall never call retreat کی وضاحت The Battle Hymn of The Republic میں یوں کی گئی تھی کہ نہ صرف امریکہ میں عدم مساوات پر فتح حاصل ہو گی بلکہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔

رائی کے دانے:

روایتی طور پر متحدہ امریکہ میں مشنری تحریک کی پہچان غلامی مخالف کے طور پر تھی۔ نسلی افتراق کی برداشت اور اختلاف وہ اقدار تھیں جو مبلغ اپنے ساتھ مشرقِ وسطیٰ لے گئے تھے۔ ہنری

جیسپ نے یقین دلاتے ہوئے کہا'' اگر خدا جمہوریت پسند جماعت کو نیگرو جمہوری سیاست دانوں کے ساتھ ایک میز پر بٹھا سکتا۔ تب یہ سکول تمام طالب علموں کو بلا امتیازِ نسل قبول کر سکتے ہیں۔ مبلغین کے خیال میں خانہ جنگی بہت تاخیر ہوئی سے لیکن رہائی کے بہت ضروری جواز کو لے کر آئی۔ یہ عظیم کوشش اصل اس (خدا) کا منتخب کردہ راستہ اور طریقہ ہے کہ ہماری زمین سے بدترین نفرت کا خاتمہ ہو جس نے دنیا کو ہمیشہ نقصان دیا۔'' جسٹن پرکنز نے موصل سے خط لکھتے ہوئے وضاحت کی'' یہ جنگ ہماری آزادیوں اور ہماری قوم کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔'' ایڈورڈ جوائے مورس جو پورشے میں امریکی سفیر تھا اس کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً 150 عیسائی مبلغ مشرقِ وسطیٰ میں کام کر رہے تھے۔ کسی ایک کی بھی مرکزیت کے ساتھ ہمدردی نہیں تھی حتیٰ کہ ان کی بھی نہیں جو جنوب سے تعلق رکھتے تھے۔

جب کہ جنگ نے زیادہ تر امریکیوں کو اندرونی اور مقامی بحرانوں کی طرف توجہ دینے پر اور عالمی معاملات کو نظر انداز کرنے پر آمادہ کیا۔'' اس جنگ کی مسرت بھری تاریخ بہت حیران کن ہوگی۔'' امریکی بورڈ سیکرٹری روفس اینڈرسن نے پیش گوئی۔ اور یہ تاریخ بنیاد کے بِنا نہیں ہوگی۔ بجٹ میں کٹوتی اور فوجی رضا کاروں کی کمی کے باوجود مشرقِ وسطیٰ کے مشن پنپنے لگے۔ مثال کے طور پر مصر جسے مبلغین نے نظر انداز کیا تھا۔ وہاں جان ریورنڈ ہوگ اور اس کے خاندان نے 1160 میل نیل میں سفر کر کے وہاں کے 63 گاؤں کا دورہ کیا اور تقریباً سات ہزار لوگوں کو تبلیغ کی۔ قاہرہ اور اصفہان کے درمیان اسیت شہر میں پہنچ کر ہوگ نے لڑکیوں کے ایک سکول کی بنیاد رکھی جو بعد میں مصر کے بہترین سکولوں میں شمار ہوا۔ جفہ میں ایک دوسرا اسکول میری برسکو بالڈون نے قائم کیا جو لمبے پتلے جبڑے والا ورجینیا کا رہنے والا تھا۔ اس سکول کے لئے پیسہ یونین ایڈمرل ڈیوڈ نے دیا جو ڈیوڈ کارپورٹر کا لے پالک تھا۔ نسائیت کی بنیاد گزار میری ملز نے استنبول میں لڑکیوں کا کالج قائم کیا۔ عیلی اور سیبل جونس نے جو بہت باتونی جوڑا تھا دونوں شمالی علاقے میں جنگ کے دنوں میں زخمی ہو گئے تھے۔ انھوں نے رملہ میں امریکن فرینڈز سکول قائم کیا جو مشرقی کنارے میں ایک شہر ہے۔ خانہ جنگی کے خاتمے تک صرف شام میں تینتیس سکول تھے جن میں طلبا کی تعداد ایک ہزار تھی اور ہر پانچواں طالب علم لڑکی تھی۔

سفیر مورس نے اپنی رپورٹ میں لکھا'' مشرقِ وسطیٰ میں مبلغ ضمیر اور روح کی آزادی سے

لطف اٹھاتے ہیں۔ جو قائم شدہ عقیدے سے اختلاف رکھنے والوں کے مطابق نہیں ہے جو یورپ کی روشن خیال سلطنتوں میں ہے۔ امریکی مبلغین 1870ء تک خطے میں اپنی سرگرمیاں بہت بڑھا چکے تھے۔ سکول، چرچ، کلینک اتنے زیادہ ہو گئے کہ پروٹسٹنٹ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اپنا کام انجام دینے لگے۔ کانگری گیشنلسٹ نتیجۂ ترکی میں تبلیغی کام کی ذمہ داری محسوس کرنے لگے جبکہ پرسبائیٹرین نے شام، مصر اور ایران پر اپنا حق جتایا۔ سب سے چھوٹے چرچ، ڈچ ریفارمڈ کے پاس کم آبادی کا حصہ آیا جہاں کچھ کم حوصلہ افزا علاقے عرب اور خلیج فارس تھے۔

مشرقِ وسطیٰ جنگ کے دوران میں یا پہلے عیسائی مشنریوں کے لئے اتنا للچانے والا کھلا علاقہ کبھی نہ تھا اگرچہ وہاں کی مقامی آبادی ان کی موجودگی کے لئے سخت گیر درشت اور کبھی نہ بدلنے والی تھی۔ مشرقی چرچ امریکیوں کو رد کرتے رہے اور انھیں متکبر کہتے رہے اور بے عزت کرتے رہے اور کہتے تھے'' ہمارے پاس امریکہ کی پیدائش سے پہلے کی انجیل ہے'' کو پٹک پیٹرے آرک نے ریورنڈ ہوگ کو لیکچر دیا کہ ہمیں تمھاری تعلیم و تدریس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' مبلغین کو یہودیوں کو عیسائی بنانے میں بہت کامیابی ملی لیکن مسلمانوں کو اپنا معتقد نہ کر سکے۔ 1870 کی ایک رپورٹ میں پرسبائیٹرین نے شکایت کی کہ مسلمانوں، روس اور راہباؤں نے ہماری پوری طرح مخالفت کی۔ مبلغوں کو اپنی حکومت سے بہت کم امید ہے۔ دربارِ خلافت سے کسی قسم کی رنجش پیدا کرنے سے گریز کی پالیسی پر قائم رہتے ہوئے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے مبلغین کو یاد دہانی کروائی کہ جس غیر ملکی کو عثمانی قانون پر اعتراض ہے اسے وہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی رہتا ہے تو اسے اپنی موجودہ حالت سے ڈرنا چاہیے۔ اس ڈر اور خوف کو 1862ء میں ایک بار پھر واضح کیا گیا جب دو عیسائی مبلغین کا قتل ہوا۔

مقامی دشمنی نے عیسائی مشنریوں کو مایوس کیا لیکن اتنا بے حوصلہ نہ کیا جتنا کہ وہ مقامی آبادی کو عیسائی بنانے میں ناکامی سے کم حوصلہ ہوئے۔ چار دہائیوں کی مشقت اور محنت سے امریکی پورے شام میں تیس سے زیادہ لوگ عیسائی نہ کر سکے اور اتنی ہی تعداد اناطولیہ میں عیسائی ہوئی۔ ہر مرتد جو مسلمان سے عیسائی ہوا، اس پر سالانہ اوسط خرچ کی طرف بے نرڈ ٹیلر نے اشارہ کیا کہ سولہ ہزار ڈالر تھی۔ یہ رقم انگریزی چراگاہوں میں عیسائی ہونے والے لوگوں کے اخراجات

سے پانچ گنا زیادہ تھی۔ ایک اور مصنف ہنری فیلڈ نے اعداد و شمار یوں دیے ''عیسائی مبلغین نے اسلام کو اتنا بھی متاثر نہیں کیا جتنا صحرا کی ہواؤں نے سنائی پہاڑ کی چوٹیوں کو متاثر کیا۔

ہمارے عیسائی مبلغین نے جتنے مسلمان پوری صدی میں عیسائی بنائے اتنے لوگ مسلمان ایک دن میں عیسائیوں سے مسلمان کرتے رہے ہیں۔ ان اعداد و شمار پر ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے امریکن بورڈ نے اپنے مبلغین کو ان مشکلوں اور تکلیفوں کی یاد دہانی کرائی جو انھیں مشرقِ وسطیٰ میں تھیں اور اس صلے کی یاد دہانی کروائی جو انھیں نتیجتاً لازمی ملنا تھیں۔ خانہ جنگی کے تجربے کی روشنی میں عیسائی مبلغین اسلام کے قلعے کے خلاف دفاعی جنگ کرنے کی باتیں کرنے لگے۔ انھی جنگی میدانوں سے مدد کی آواز بلند ہوتی ہے لیکن اتنی کمزور ہے کہ وہ ڈھالوں اور تلواروں کے ٹکرانے کی آواز کو برداشت نہیں کر سکتی اور امریکی پروٹسٹنٹس کی اس ناکامی کو نہیں چھپا سکتی جو انھیں مشرقِ وسطیٰ کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی مد میں ہوئی۔ اور نہ ہی مقامی لوگوں کو تعلیم دینے کے مباحث کو دبا سکی۔ جو عیسائیت قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ بورڈ ممبرز اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ مبلغین کا کام رہائی حاصل کرنا ہے نہ کہ سکول کالج یا ہسپتال چلانا۔ جبکہ مبلغین نے اس بات کو قائم رکھا کہ ان کا نیم ملحدانہ کام اخلاقی طور پر کم ضروری نہیں کہ یہ مشرقِ وسطیٰ میں روشنی پھیلانے کا کام ہے۔

مشنری سکولوں کے بارے میں استنبول میں نزاع کی صورت بہت شدید تھی جہاں سائرس ہیملن آرمینیائی طلبا کو روٹی اور تندور بنانا سکھا رہا تھا۔ وہ خطے میں ایک جدید یونیورسٹی بنانا چاہتا تھا لیکن سلطان نے قدامت پرستوں اور کیتھولک کے دباؤ کی وجہ سے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ خوش قسمتی سے ایڈمرل فیراگٹ اس وقت استنبول میں دورے پر آیا ہوا تھا اور سلطان کا مہمان تھا۔ اس نے ضروری اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ ہیلمن بے بک کی پہاڑیوں میں زمین کا ٹکڑا خریدنا چاہتا تھا جہاں وہ کیمپس کی بنیاد رکھ سکتا تھا۔ اس نے باسفورس کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے ہاورڈ سے کتابوں کا بندوبست کیا۔ صرف ایک مشکل باقی تھی جو بہت بڑی تھی جس نے سیکولر سکول کے قیام کے لئے مالی مدد دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ہیملن نے بورڈ کو استعفیٰ دیا اور مئی 1861ء میں امریکہ پلٹ گیا۔ اس کا ارادہ یونیورسٹی کے لئے فنڈ جمع کرنے کا تھا۔ اسے اپنے کزن ہیمی بال ہیملن جو لنکن کا نائب صدر تھا سے توقع تھی کہ وہ اس کے تعلق کی بنا پر فنڈ جمع کرے گا لیکن اس بار

جنگ شروع ہو گئی اور وہ پریشان وہ گیا۔ کوئی بھی غیر ملک میں اپنی رقم لگانے کو تیار نہیں تھا۔۔ جب پورے ملک کی تقدیر داؤ پر لگی تھی۔ ہیملن نے اس بات کو تسلیم کر لیا اور استنبول کی جانب لوٹ گیا لیکن پیرس سے گزرتے ہوئے اس کی ملاقات رابر رہنلینڈر رابرٹ سے ہوئی جو انسان دوست آدمی تھا اور نیویارک کا رہنے والا تھا۔ وہ ہیملن کے خیال سے زبردست متاثر رہا چونکہ وہ خود قابل مبلغ تھا۔ رابرٹ نے ابتدائی طور پر تیس ہزار ڈالر دیئے۔ جس سے تعمیر کا آغاز ہوا۔ ہیملن نے کام شروع کر دیا۔ اس نے گنبد دار ہال کی بنیاد رکھی جس کا نام بعد میں اس کے نام پر رکھا گیا۔ مشرقِ وسطیٰ میں یہ پہلی امریکی شہتیروں سے کی گئی تعمیر تھی۔

رابرٹ کالج کے دروازے 1863ء میں کھولے گئے اور چار طالب علم داخل ہوئے۔ یہ تعداد جلد کئی سو تک پہنچ گئی۔ سکول کو سلطان عبدالعزیز کی جانب سے اجازت مل چکی تھی۔ ابتدائی طور پر یہاں انجنیر نگ اور اپلائڈ سائنسز کا آغاز ہوا۔ جلد ہی اس کے ایک پرفیسر نے مشرقِ وسطی میں ٹیلی گراف کا تعارف کروا دیا۔ کالج نے مغربی نظریات کو درآمد کر کے نئی نسل کو جدید ترکی بنانے والی نسل بنا دیا۔

اس یونیورسٹی کے پانچ تعلیم یافتہ لوگ ترکی کے وزیر اعظم بنے۔ ان میں ایک خاتون بھی شامل ہے جو پہلی وزیرِ اعظم بنی اس کام میں خدائی مدد شامل تھی بہت پھیلتا ہوا یہ درخت بنتا ہوا رائی کا بیج ہے۔

ہیملن اکیلا مبلغ نہیں تھا جس نے مشرقِ وسطی میں امریکی طرزِ تعلیم کو پھلتے پھولتے دیکھا اس کی ہم پلہ اور اتنی پر اثر ایک دوسری یونیورسٹی بیروت میں قائم کی گئی جس کی بنیاد میں ڈینیل بلس کی محنت شامل تھی۔

بلس نے مشرق وسطی کے مقامی لوگوں عربوں، آرمینیائی، اور یہودیوں کی پہلی جھلک دیکھ کر 1855ء میں لکھا کہ ان کے چہرے ہر قسم کے تاثرات سے عاری ہیں۔ اس حقیقت کا احساس کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ ذی روح بھی ہیں کہ نہیں۔

بلس اس خطے میں اپنی بیوی ابی کے ہمراہ لبنان کے پہاڑی دیہاتوں میں سکول کھولنے آیا تھا یہ ایسا کام تھا جس میں برداشت اور حوصلے کی ضرورت تھی لیکن اس کی خوبی جسمانی قوت تھی جو اس کے پاس وافر تھی۔ ہیملن کی طرح وہ بھی دس سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا اور مختلف کھیتوں

اور کارخانوں میں کام کرتا رہا۔ بعد میں اسے وظیفے کی بنیاد پر سکول میں داخلہ مل گیا۔ اب 37 برس کی عمر میں کئی برفانی چوٹیوں کو عبور کرتا اپنی منزل کو پہنچا تھا۔ وہ پانچ برسوں میں ہی عربی سیکھ گیا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ سکول قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

بلس ان سخت اور شدید لڑائیوں سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا جو دروزیوں اور میرونائٹس کے درمیان شروع ہوئی تھیں ۔ اس تشدد نے شام کے عیسائی مشنریوں کو مجبور کیا کہ وہ بیروت کی طرف ہجرت کریں ان میں بلس بھی شامل تھا۔ اگرچہ وہاں وہ قلاش اور مفلس تھا لیکن اس نے آزمودہ کار ولیم تھامسن، ہنری جیسپ اور ہیری سن ڈائٹ سے رابطہ اور ان کے قائم شدہ سکولوں کا جائزہ لیا اس نے وہاں طلبا کو دیکھا جو گریجویشن کے بعد امریکہ روانہ ہوجاتے تھے، اس نے محسوس کیا ان طلبا کے نزدیک وعدوں اور خوابوں کی سرزمین اردن کے شرق وغرب میں نہیں تھی بلکہ مسی پی کے شرق وغرب میں تھی ۔ اس رجحان کو بدلنے کے لئے بلس نے ایک لائحہ عمل تیار کیا جو، ان طلبا کے دل میں وطن کی محبت اور عوام کی خدمت کرنے کا جذبہ نقش کر دیتا، اس نے زور دے کر کہا کہ مقامی اساتذہ کو تربیت دینا چاہیے اور ان کی زبان عربی ہونا چاہیے۔

1862ء کے پہلے دن بلس نے عرب دنیا میں پہلے جدید کالج کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی لیکن قبولیت میں نیم گرمی کا مظاہرہ کیا گیا۔ روفو اینڈرسن نے اس منصوبے کو تبلیغی مقصد سے انحراف سمجھا لیکن شامی علاقوں میں اپنے مقامِ عمل کو تقویت دینے کے لئے اس کالج کی قدر اور فوائد سمجھ گیا، اسے کئی دیگر برائیوں میں سے ایک برائی چننے کا عمل قرار دیتے ہوئے منصوبے کی منظوری دے دی۔ لیکن بلس کو بذاتِ خود ایک لاکھ ڈالر کی رقم جمع کرنا تھی۔ چندے کے لئے اس نے کئی برطانوی اور امریکی مخیّر حضرات کو قائل کیا ان حضرات میں فرینکلن ایچ ڈیلانو بھی شامل تھی جو بتیسویں صدر کی بڑی خالہ تھی۔ اس نے پہلا قدم اٹھاتے ہوئے ایک پلاٹ خریدا سینٹ جارج بے کے علاقوں کو نظر انداز کر دیا جو بھیڑیوں کی آماجگاہ تھی اور کوڑا کرکٹ یہاں پھینکا جاتا تھا۔ اس نے نئی جگہ پلاٹ خریدا اور ایک عمارت میں چند کمرے کرائے پر لئے۔ چار سال بعد مبلغین نے بیروت میں New syrian Protestant School کی بنیاد رکھی۔ بلس اس کا پہلا صدر بنا۔ پیچھے بیٹھے بورڈ ممبران کو حیران کر دیا جب اس نے حلف اٹھاتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی سفید فام، سیاہ فام، عیسائی، یہودی اور مسلمان یہاں داخل ہوسکتا ہے اور اس ادارے کی تمام سہولتوں سے لطف

اندوز ہوسکتا ہے وہ ایک خدا یا کئی خداؤں کا ماننے والا ہو یا کسی خدا کو بھی نہ مانتا ہو۔

بلس نے تیزی سے اس بات میں اضافہ کیا کہ ہمارے ساتھ یہ جانے بغیر کہ ہمارا عقیدہ کیا ہے اس کے لئے ہمارے دلائل کیا ہیں کسی بھی شخص کو کام جاری رکھنا مشکل ہوگا۔ بلس دیگر عیسائی مبلغین ہوگ اور ہیملن جو کچھ جانتے تھے ان کو تسلیم کر چکا تھا۔ لیکن اس کے زبانی اظہار کی جرات نہ کر سکا۔ وہ مشرقِ وسطی میں ان کے روحانی مذہبی یہاں لانے کے قابل نہیں تھا۔ امریکیوں کو یہاں حب الوطنی، جمہوریت اور انفرادی آزادیوں کے سیکولر نظریات کو راسخ کرنے کے لئے قیام کرنا ہوگا۔ ان نظریات نے کالج کے طلبا کے دل میں گھر کر لیا۔ جب طلبا کی تعداد سولہ سے بڑھ کر کئی ہزار کو پہنچ گئی تو یہ نظریات ان کے ذریعے پورے خطے میں پھیل گئے ۔ اس کالج کے ابتدائی تعلیم یافتہ لوگوں میں یعقوب صروف اور فارس نمر مصر میں جدید صحافت کے بانی تھے، ڈاکٹر شبلی شمائل ڈارون کا نظریہ ساز اور سماجی تبصرہ نگار تھا۔ ناصف الیازجی لغت نویس تھا اور بطرس البستانی نے تحریری عربی کو جدید خطوں پر استوار کیا۔ ایڈورڈ ولموٹ بلائڈن نے ان کاموں کی تعریف کرتے ہوئے جولائی 1866ء میں خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ دن دور نہیں جب لائبیریا سے طلبا کو عربی سیکھنے کے لئے بھیجا جانے لگے۔ اور یہ کالج ایشیا کے مغرب اور جنوب اور افریقہ کے مغرب اور شمال کو انجیلی عیسائی بنا دے۔

کالج کا جس کام میں بہت حصہ تھا وہ ادبی نہیں بلکہ سیاسی تھا۔ جیسپ کے مطابق بھائی چارے اور حب الوطنی کی بنیاد پر ایک نیا مصر تخلیق کرنا حقیقت میں عظیم کام تھا۔ یہ مقصد حقیقت میں ایک ناول سے ماخوذ تھا کہ بھٹکے ہوئے شامی لوگوں نے اصل میں خود کو ایک جداگانہ قوم بنا لیا تھا۔

شامیوں کی بڑھتی ہوئی اکثریت نے خود کو قومی اصطلاحوں کے بجائے مذہبی اصطلاح سے پہچانا اور اپنی تعریف متعین کی۔ انھوں نے عالمی ہم آہنگی کے لئے کوئی زیادہ گرم جوشی نہ دکھائی۔ آزادی کے لئے جس اتحاد کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس سے اس سے بہت کم اتحاد کا مظاہرہ کیا گیا۔

امریکہ نے اس استحکام کے حصول کے لئے ایک نمونہ مہیا کرنے کی پیشکش کی۔ ایک ایسا ملک جو کئی ریاستوں اور نسلوں سے جڑا ہوا تھا اس کی آزادی اور اس کی اکائی کے لئے حال میں جنگ بھی کر چکا تھا۔ بلس جس بات کی خواہش کیا کرتا تھا وہ پوری ہو چکی تھی کہ ترک سلطنت میں تمام عیسائی وہی جوش و جذبہ رکھتے ہیں جو جوش 1775ء میں امریکی رکھتے تھے۔ سیرین

پروٹسٹنٹ کالج کے پڑھے طلبا کی بڑھتی تعداد امریکی نمونے کے مطابق تھی جو خود کو عرب کے لئے وقف کر چکے تھے۔

اپنے مسلمان پڑوسیوں اور جن کے ساتھ ان کا ثقافتی ورثہ اور ماضی مشترک تھا ان کو ساتھ ملا کر یہ فعال کارکن تمام عرب زمین کو ایک ریاست بنانے کے لئے سرگرم تھے۔ مشہور مؤرخ جارج انٹونیس نے ایسا جوشیلا دانش ور طبقہ پیدا کر دیا ہے جو عرب کی بحالی کے لئے سرگرم ہے، اور یہ وہ طبقہ ہے جو اس خطے کی سیاست کو بنیادوں سے بدل دے گا۔ عیسائی مبلغین مقامی آبادی کو پروٹسٹنٹ عیسائی بنانے میں ناکام رہے لیکن انہوں نے امریکی لائحہ عمل کو پورا کر دکھایا۔ انہوں نے مشرقِ وسطی کو یکسر نئی پہچان دی شمالی افریقہ کے قزاقوں نے امریکہ کو دق کر کے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ڈھال دیا اس کے ٹھیک پچاس سال کے بعد، امریکی ماہرینِ تعلیم مشرقِ وسطی کے لوگوں کو فقید المثال عرب قوم بنا رہے تھے۔

بقول ولیم ہنری سیورڈ جو ان مقاصد کا خود بھی حامی تھا کہ مبلغین نے اپنے اصلی انجیلی مقاصد کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے ان مبلغین نے امریکہ کے ذہین لوگوں کی وساطت اور مدد سے لطف اندوزی کا عمل جاری رکھا۔ سیکرٹری آف سٹیٹ جو یہودی بحالی کے لئے بہت ہمدردیاں رکھتا تھا اس نے مشرقِ وسطی میں یہودیوں کے لئے امریکی حفاظت کے دائرے کو وسیع کیا۔ 1863ء میں مراکش میں یہودی قتلِ عام کے سلسلے کو دیکھ کر طنجہ میں اپنے سفیر کو تمام اثر و رسوخ استعمال کر کے یہودیوں کو بربری ظلم وستم سے محفوظ رکھنے کی ہدایات دیں۔

دیگر امریکیوں کی طرح سیورڈ اس عقیدے پر اصرار کرتا تھا کہ قوم کی تباہی کے باوجود مسیح کی واپسی قریب ہے۔ کچھ عیسائی مبلغین کے مطابق اس خونریزی نے امریکہ کو غارت کر دیا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صرف عقیدہ ہونا کافی نہیں۔ بہت لگن والے عیسائی سمجھتے تھے کہ ہمیں صرف رہائی کی خواہش نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے لئے سخت محنت کرنا چاہیے۔ اس احساسِ جرم نے ایک امریکی جارج ایڈمز کو مجبور کیا کہ وہ اپنے درجنوں پیروکاروں کو فلسطین لے کر جائے اس مقصد کے ساتھ کہ وہ وہاں جا کر اس ملک کو اپنی کالونی بنائے اور وہاں یہودیوں کی حکومت ہوتا کہ دنیا کو امن کے لئے تیار کر سکیں۔

شاہین کے پروں پر:

جارج ایڈمز کی زندگی کے بارے میں تمام تفصیلات بہت سرسری اور تشنہ ہیں بہترین رپورٹس کے مطابق اس کی جائے پیدائش نیوجرسی آکسفورڈ کی ہے وہ 1891ء یا 1893ء میں پیدا ہوا، ایک کسان کا بیٹا اور درزی کا شاگرد تھا۔ جب تیس برس کا ہوا تو جارج آدم نے اپنا پیشہ ترک کر کے شیسپیرین تھیٹر میں شمولیت کر لی اور اپنے گھر سے دور دور کے علاقوں میں گھومتا رہا۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے وہ ایک ذہین نظر آنیوالا، جھگڑالو، درمیانے قد سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والا آدمی تھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے اور آنجھیں اتنی چھوٹی تھیں کہ وہ تنگ سوراخ کی بوتل میں آنکھ بھینگی کیئے بغیر تہ تک دیکھ سکتا تھا۔ اس کا ایک شغل شراب نوشی بھی تھا جب شراب کے نشے میں دھت ہو کر وہ مسلسل سٹیج پر آنے لگا تو اس پر پابندی لگا دی گئی۔

اس مقام پر آدم بغیر کسی رغبت کے فلسطین میں بحالی کی تحریک کے ہراول دستے کا امیدوار نظر آتا تھا۔ وہ اورسن ہائڈ کا دوست بن گیا جو ایک عیسائی فرقے mormon مورمن کا یروشلم میں پہلا ایلچی تھا۔ آدم اس کی طرح مقدس زمین کے حج کی نقل کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ روانہ ہوتا آدم کو اس کی بے حیائی کے سبب دین بدر کر دیا گیا۔ وہ دوبارہ Spring Field سپرنگ فیلڈ، ریاست میساچوسٹس میں ظاہر ہوا۔ اسے وہاں سے ایک بار پھر بے اعتدالی کے سبب فرائض سے برطرف کر دیا گیا۔ اپنی بدنامی سے بچنے کے لئے آدم انڈین ریور کی طرف بھاگ گیا۔ جو Main میں تھا اس نے وہاں ایک مقامی عورت سے شادی کر لی جو مضبوط ارادے کی تھی۔ آدم نے وہاں Church of Messiah قائم کیا۔ اپنے خطبے کے مقام اور ماہانہ The Sword of Truth And Harbinger of Peace میں آدم نے بارِ دگر آمد، معاشی خوشحالی اور بھائی چارے کی پیش گوئی کی۔ اس سنہری دور کی شرطِ اول اس کے دعوی کے مطابق یہودیوں کی فلسطین میں بحالی تھی۔ زمیں پر مسیح کا دورِ حکومت اور یہودیوں کی کنعان میں واپسی بہت جلد ہونے والی ہے۔

جب یونین اور مرکزی قوتیں شلو کے میدان میں ایک دوسرے کو زخمی کر رہی تھیں۔ اس وقت آدم 1862ء میں ایک ریاست کی تبلیغ کر رہا تھا "فلسطین جلد صدیوں کی گرد جھاڑے گا اور شان وشکوہ سے اٹھے گا جس طرح وہ قدیم عہد میں تھا" وہ بحالی کی ریلیوں میں شیخی بھگار کر کہا کرتا

تھا۔اس کے بال ہوا میں لہرا رہے ہوتے اور آنکھوں میں ایک سیاہ نقطہ چمک اٹھتا تھا۔آخر کار وہ مقدس سرزمین کے لئے روانہ ہوا اس کے ہمراہ انڈین ریور کا پوسٹ مین بھی تھا جس کی وہ موزونی پرکھنا چاہتا تھا کہ وہ وہاں آباد ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ان کی طرف سے ملنے والی اطلاع ،تعریف سے بھری ہوئی تھی۔آدم نے دعوی کیا تھا کہ فلسطین کی مٹی بہت شاندار اور وہاں کا موسم کیلی فورنیا جیسا ہے۔امریکی بدعات اور جانسن کی وہاں کامیاب منتقلی کے بعد، ملک وہاں ہزاروں آبادکاروں اور بے شمار سیاحوں کی مدد کرسکتا تھا' یہودیوں کو دوبارہ کھیتی باڑی سکھائی جاسکتی تھی۔

اس بہترین خبر کو استعمال کرتے ہوئے آدم ،156 امریکیوں کو وہاں لے جانے کے قابل تھا۔جن میں کسان، ہنرمند اور تاجر تھے۔ان کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔آدم نے وہاں اپنا نام واشنگٹن آدم جوشوا رکھ لیا تھا اس نے دعوی کیا تھا کہ عظیم واپسی شروع ہوچکی ہے جس کے بارے میں انبیا اور ان کے خلفا نے بتایا تھا۔آدم نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ اپنی جمع شدہ رقم میں سے بیالیس ڈالر فلسطین کا رستہ طے کرنے کے لئے ادا کریں۔

آدم اگرچہ باہر کا آدمی تھا لیکن اس نے ایسے نظریات اور خیالات پیش کئے جس نے امریکی معاشرے کو متوجہ کرنا شروع کردیا۔ان میں کچھ ممتاز شخصیات بھی شامل تھیں۔1863ء میں کنیڈا کی سرکردہ شخصیت ہنری وینٹ ورتھ نے ابراہم لنکن سے ملاقات کرتے ہوئے اس حقیقت پر احتجاج کیا کہ سیاہ فام آزاد ہیں اور یہودی آزاد ہونا باقی ہیں دنیا میں کہیں بھی اس وقت تک امن نہیں ہوسکتا جب تک دو ہزار سال سے تعزیر میں آئے یہودیوں کو ان کی زمین فلسطین میں آباد نہیں کردیا جاتا۔صدر جو خدا ترسی کے لئے ذرا بھی نہیں پہچانا جاتا تھا اس نے اس بات سے اتفاق کیا کہ یہودیوں کو ان کے قومی گھر فلسطین میں آباد کرنا بہت بڑا خواب ہے وہ خواب جو امریکیوں کا مشترکہ ہے۔اس نے مزید بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ایک بار جنگ جیت لی گئی تو امریکی ایک بار پھر اس قسم کے خواب دیکھنے قابل ہوجائیں گے اور دنیا کی رہنمائی کریں گے کہ وہ ان کو حقیقت سمجھیں۔

لنکن کے جملے اس بات کا اشارہ ہیں کہ بحالی کے نظریے نے امریکیوں کی ایک بڑی تعداد کو جکڑا ہوا ہے اور اس سطح کا اندازہ ہوتا تھا کہ فلسطین ان کے لئے قومی جنون بن چکا ہے۔لنکن کے قتل کے دوسال کے بعد وکٹر بیو بوشر جو یروشلم میں امریکی نمائندہ تھا اسے محسوس ہو کہ پانچ سو

امریکی پچھلے آٹھ ماہ کے دوران میں فلسطین میں داخل ہوئے ہیں اور ملک کا داخلی راستہ بھرا ہوا اور پرہجوم تھا۔یونین کا سابقہ فوجی جس کی جنگ میں ایک ٹانگ ضائع ہوگئی تھی، بیو بوشر اس زائر کی عقیدت اور اس زمیں سے اس کی لگن سے بہت متاثر ہوا۔یہ پہلا ملک ہے جو مجھے اپنا گھر محسوس ہورہا ہے، میں آج تک اپنے گھر میں نہیں تھا اسی بات کو Henry White Warren نے جفا میں جہاز سے اترتے ہوئے 1888ء میں کہا''تم اس مقدس سرزمیں کی طرف اس احساس کے ساتھ آتے ہو جیسے تم اپنے گھر میں آئے ہو' خانہ جنگی کے جون رسل نے لکھا،''تم اسی زمیں سے تعلق رکھتے ہو' امریکیوں کا فلسطین کے بارے میں علم ان کی روزانہ بائبل کی قرات کے سبب ان کے رگ وپے میں شامل تھا اسے Palestine Exploration Society میں ممبرشپ کے ذریعے مزید وسیع کیا جاسکتا تھا۔

یہ سوسائٹی مقدس زمین کے جغرافیہ کے لیے وقف تھی۔اس کے ممبر فلسطین کا دورہ کرسکتے تھے جس میں فلسطین کے مقامات نزارتھ، بیت اللحم اور یروشلم کے نمونے قائم کیے گئے تھے۔ہرمین میلول نے ڈکن سن اور وارڈر کریسن کا جو مذاق اڑایا، اسے کئی مذہبی کلیساؤں اور بحالی کے حامیوں نے رد کردیا۔ریورنڈ وارن نے واضح طور پر فلسطین کو اپنا گھر محسوس کیا۔لیکن اسے ملکی یہودیوں نے اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنے بھائی سے ہمیشہ لڑتا رہے۔یونین تھیالوجیکل سیمی نری کے فلپ سیف نے 1878 میں یروشلم کی جھلک کو وجد آمیز انداز میں لکھا۔اور بعد میں ایک پیرے میں لکھا کہ یہودیوں کے ممنوعہ اور گندے شہر کو مسمار کردیا جائے۔وارن اور شیف کے نزدیک، یہودیوں کی خستہ حالت، بائبل کی پیش گوئی کے مطابق تھی اور یہ یسوع کو رد کرنے کی سزا تھی۔

لیکن پرنسٹن ریویو، ان کے لیے اور دیگر بنیاد پرست وزرا کے لیے بات کرتا محسوس ہوتا تھا۔جب اس نے 1866 میں نئی تورات کی تعلیم کے مقابلے میں بحالی کی تحریک کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتے ہوئے اعلانیہ لعنت ملامت کی۔اور اسے سچے مذہب کے لیے مضر قرار دیا۔

بحالی کی تحریک کے یہ مخالف اگرچہ بہت سخت تھے لیکن انہیں قوم کا دفاع کرنے والوں سی قوت اور مقبولیت نہ ملی۔اوہائیو کا وکیل، نتھانیل کلارک برٹ، 1867 میں فلسطین کے دورے پر یہ دعا مانگتا لوٹا کہ یہودیوں کو بھی ان کے گھر لایا جائے گا جو کبھی ان کا تھا۔جس کا خدا نے اس سے وعدہ کیا تھا۔اگلے سال فلاڈلفیا کے Reverened Henry Relay نے پیش گوئی کی کہ اس کے

لوگ بہت جلد، جو قوموں کے درمیان بکھرے ہوئے ہیں، اکٹھے ہوں گے۔ اور فلسطین میں اصلی گھر کے مالک بنیں گے۔ کتابوں میں خاص طور پر یہودی کی فلسطین پر حکمرانی کے حمایتیوں کو اپنے مخالفین پر سبقت حاصل تھی۔ سب سے اچھی بکنے والی، سوانح عمری میں حاجی اِن سیریا میں سارہ بار کلے نے جو James Turner barclay کی بیٹی تھی، اس بات کی امید ظاہر کی کہ ایک دن وہ دیکھے گی کہ عبرانی نسل اپنے قدیم شہر کو لوٹ رہی ہے جو ان کے آباؤ اجداد کی زمین تھی اور فلسطین کے اس صحیح حقدار کے پاس ہوگا۔ اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر پڑھی جانے والی، ولیم سی پرم کی یادداشت میں Tent Life in Holly Land کے نام سے شائع ہوئی اس میں مصنف کے فلسطین میں تجربات کی یادداشتیں ہیں۔ The Newyork Journal of Commerce کے ایڈیٹر پرائم، جوش و خروش سے کہتا ہے کہ فلسطین کا ماضی ایک مقدس چمک میں پڑا ہوا تھا۔ اور سوچ بچار کرتے ہوئے وہ مزید کہتا ہے کہ مستقبل کی اس یہودی ریاست کو کس طرح خوراک مہیا کی جائے گی۔ یہ جفا سے درآمد ہوگی، سمندر کے راستے آئے گی اور اونٹوں پر لاد کر ان کو پہنچائی جائے گی۔

امریکہ کا فلسطینی جنون، خانہ جنگی کے بعد آنے والی دہائیوں میں اور اس کے ساتھ یہودی بحالی کا رومان گہرا ہوتا گیا۔ نیویارک ٹائمز کے ایڈیٹوریل میں کہا گیا کہ یروشلم میں یہودی نسلوں کی ملکیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا لیکن یہ کام ایک دن کر دکھائیں گے۔ وہ یقینی طور پر یروشلم کے حق دار ہیں۔ لیکن جو جذبہ جارج ایڈمز اور اس کے پیروکاروں کا تھا وہ بہت کم امریکیوں میں تھا۔ اگست 1866 میں وہ اپنے پیروکاروں کے ہمراہ فلسطین کے لیے جہاز Nellie Chapin پر سوار ہوا اور دعویٰ کیا کہ افراہیم کے بیٹے اب اپنے گھر جمع ہو رہے ہیں۔

بوسٹن سے جفا تک کے سفر میں بیالیس دن صرف ہوئے۔ جو عام اندازے کے مطابق دوگنا وقت تھا۔ لیکن حامیوں نے کسی قسم کی شکایت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک آدمی قسمیں کھا رہا تھا کہ وہ خود ایک تختے پر بیٹھ کر سمندر میں سفر کرتا رہا کہ کہیں وہ فلسطین جانے سے نہ رہ جائے۔ لیکن Neille Chapin کے کنارے پر لگنے کے بعد بڑی مشکلات باقی تھیں۔ ڈکنسن کالونی کے گزرنے کے بعد، متحدہ امریکہ کے ساتھ جو تنازع کھڑا ہوا، اس کے حوالے سے عثمانی حکومت عیسائی مبلغین کو اجازت دینے پر رضامند نہیں تھی۔ Adams اور اس کے حامیوں کو کنارے سے دور، گندگی کے ڈھیر میں اور ہیضے سے مرنے والے دو سو لوگوں کی قبروں کے درمیان

خیمے لگانے کی اجازت دی گئی۔ ''اس ریت کے درمیان سانس لینا، بہت ناگوار کام تھا'' ایک روزنامچہ نویس نے لکھا۔ وہ کنارہ دنیا کا مخفی بیت الخلا تھا۔

ان مشکلات کے باوجود، امریکیوں کا حوصلہ بلند تھا۔ USS Ticonderoga جہاز کے عملے نے ستمبر 1866 میں جفا چھوڑا۔ انہوں نے دیکھا کہ تمام کالونیل اپنی کامیابی کے بارے میں بہت پرامید تھے۔ آدم Adams بڑے جوش سے تعمیرات کے منصوبے بیان کرتا تھا کہ امریکی طرز کا شہر ہوگا جس میں گرجے، ہوٹل اور دو کالج ہوں اور ٹیمپل کی دوبارہ تعمیر ہو جس میں روتھ شیلڈ فیملی کا فرد، بڑے پادری کے فرائض انجام دے گا۔

اس خیال کو عملی شکل دینے کی طرف 1867 میں پہلا قدم اٹھایا گیا جب ہرمن لوونتھل، جو یو ایس کا نائب سفیر تھا، وہ ایک جرمن یہودی تھا جو بعد میں عیسائی ہو گیا۔ ان لوگوں کو شہر سے باہر دس ایکڑ زمین خرید کر دی۔ تین ملین ایکڑ کے مقابلے میں یہ زمین بہت کم تھی۔ Adams نے ان سے وعدہ کیا کہ آبادکار کام شروع کر دیں گے۔ دنوں میں ہی سترہ دیدہ زیب گھر، جو main سے درآمد کیے گئے تھے جوڑ کر تیار کر دیے گئے اور ایک گھر اجلاس کے لیے بھی تھا۔ Adams نے اعلان کرتے ہوئے کہا کہ زمین پر قائم ہماری یہ کالونی ہر حکومت سے آزاد ہے۔ یہ شخص اب خود کو President Adams کہتا تھا اور ہر تہوار پر امریکی جھنڈا لہراتا تھا۔

کسانوں کی فصلیں بہت تیزی سے مردار خور جانوروں نے تباہ کر دیں اور موسم سرما کی آمد کے ساتھ، اس دھڑے کو قحط کا سامنا تھا، آدم اب اکثر نشے میں بگڑا اور اپنی بیوی سے بحث مباحثہ اور تلخ کلامی کرنا اور لوونتھل کو اکثر لعنت ملامت، جانور، بد اور مکار یہودی کہتا نظر آتا تھا، جو ترقی کی مخالفت کرتا تھا۔ مقدس سرزمین پر اترنے کے بعد چھ ماہ سے کم عرصے میں تقریباً 17 امریکی فوت ہو گئے، جو پیچش کا شکار ہوئے۔ بچ جانے والوں کو آدام بار بار کہتا تھا کہ خدا پر بھروسہ کرو اور وائن یا رم کم استعمال کرو۔ ان میں سے بہت سے لوگ Adams کی علاج کے بارے میں تشکیک کا شکار تھے۔

متضاد قسم کی رپورٹس ان آبادکاروں کے متعلق امریکہ پہنچ گئیں۔ نیویارک ٹائمز میں لکھے گئے خط میں ایک آبادکار نے ان الزامات کی صحت سے انکار کر دیا کہ یہ کمیونٹی ناکام ہو رہی تھی۔ بلکہ بصد اصرار کہا کہ مسٹر ایڈمز کی لاطینیوں، یونانیوں، آرمینیا کے لوگوں، میرونائٹس، ترکوں،

عربوں اور یہودیوں اور مسلمانوں سے بہت بنتی ہے۔ ایک اور شخص نے Bangor Times کو بتایا کہ عرب ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔ اس لیے اس نے سوچا کہ پیغمبروں، اولیاء کی زمین جہاں خود مسیح رہتے تھے، وہاں تو بہت عظمت ہے۔ دیگر مضامین میں Adams کے بدنام ماضی کو ابھارا گیا اور اسے ایک مہم جو، نیم حکیم اور آوارہ شخص کے طور پر پیش کیا گیا۔ متضاد قسم کی افواہوں نے آبادکاروں کو، یوں پیش کیا جیسے وہ چھوٹے درجے کی سول وار یا پھر آزاد محبت میں مبتلا رہنے والے لوگ تھے۔

آبادکاری امریکی سیاحوں کے لیے اس دوران میں کشش کا باعث بن گئی۔ کنکٹی کٹ کے صنعتکار چارلس ایلیٹ نے ان آبادکاروں کو اس طرح پیش کیا جیسے وہ اس طرح غیر محفوظ تھے۔ جیسے وہ ٹیکساس کے محاذ پر تھے۔ اور ریورنڈ ہنری وٹنی بیلوز نے ایڈمز کو مذہبی جنونی قرار دیا، جو ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ سفری نامہ نگار جون سافٹ کو امریکی طرز کے گھر، جن کے باہر باغات تھے، بہت دلکش محسوس ہوئے۔ اس کے نزدیک یہ کالونی ایک دلکش پھول کی طرح تھی کہ سب ذہین امریکی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ جن کے ہاتھ میں نیا مذہب اور دوسرے ہاتھ میں امریکی ہل تھے جو امریکی اصولوں کے تحت ایک نیا خطہ بنانے کے لیے ترس رہے تھے۔ اس نے Adams کے شوخی بھرے بیانات کو بھی درج کیا کہ جمہوریت اور یہودی ریاست پیدا کر کے ان شب گرفتہ عربوں کو مہذب کر دیں گے۔ آدم کی بیوی نے سوفٹ کو یقین دلایا کہ رہائی بہت نزدیک ہے کہ امریکہ کا آزادی کا شاہین اپنی پرشکوہ اڑان، نئی زمین سے قدم زمین کی طرف شروع کر چکا ہے۔

آدم نے امریکہ کے لیے فخر کا کام کیا ہے یا شرمسار کیا ہے۔ آخر یہ سوال سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے سامنے رکھا گیا۔ سیکرٹری آف سٹیٹ Savord نے اپنے دوست ریورنڈ والٹر بڈوِل کو کالونی کی تفتیش کرنے کے لیے بھیجا۔ بڈوِل مارچ 1867 میں جفا پہنچا، سوائے ایک پیلے چہرے والی راہن عورت کے، جو گھر واپس جانا چاہتی تھی، باقی تمام لوگوں کو ثمر آور مستقبل کے لیے مطمئن اور پراعتماد پایا۔ اس نے جفا بندرگاہ پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے سوا، کالونی کو بہت درخشاں اور تابناک محسوس کیا۔ ایک مختلف ہلا دینے والا تاثر، جسے آگسٹس جونسن نے تحریری طور پر جمع کروایا۔ وہ دمشق میں سفیر تھا اور سارہ بارکلے سے اس نے شادی کی تھی۔ جانسن عیسائی مبلغین کے معاملے میں غیر جانبدار تھا۔ لیکن اس نے جو کچھ جفا میں دیکھا اس سے اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ اس نے

واشنگٹن کو خبردار کیا تھا کہ امریکی شہری جلد عربوں سے بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ گلیوں میں فاقوں سے مرنے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں آدم کے جال سے نکالا جائے۔ اس سے ان کے بچنے کی امید ہو سکتی ہے۔

یہ بیداری موسم بہار میں پیدا ہوئی، جب مرنے والوں کی تعداد 60 کو پہنچ گئی۔ ان میں سے 22 لوگوں نے فلن تھراپی اینڈ کامن ہیومینیٹی کے نام، امریکی اخبار میں ایک اپیل شائع کی اور وفاقی حکومت سے اپیل کی کہ انہیں وہاں سے نکالا جائے۔ ''ہم کس طرح اس شخص کے ہاتھوں مطمئن رہ سکتے ہیں جو بہت زیادہ نشے میں ہوتا ہے۔'' انہوں نے سفیر بیو بوشر سے سوال کیا تھا۔ انہوں نے Main کے گورنر Josha Lawrance Umberlain کو خط لکھ کر دعویٰ کیا تھا کہ وہ بری طرح مفلسی، خوراک اور دواؤں کی کمی کا شکار ہیں۔ ان کی دولت بہروپیے آدم نے ہتھیا لی ہے۔ انہوں نے چیمبر لین کو گیٹس برگ کے ایک ہیرو کی یاد دلائی کہ ان میں سے کئی لوگوں نے جنوبی جنگی میدانوں میں، چمکدار ستاروں اور پٹیوں والے پرچم کے پیچھے چلے تھے اور جنگ کی تھی۔ اس لیے وہ اپنے ملک کی مدد کے مستحق ہیں۔

ان باتوں سے متاثر ہو کر، سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے، ان آبادکاروں کو نکالنے کے لیے 3000 ڈالر کی رقم دینے کی منظوری دی، لیکن یہ رقم صرف سولہ افراد کے لیے کافی تھی، دیگر لوگوں کو امریکی نیول شپ میں جگہ مل گئی۔ آدم ان لوگوں کو خبردار کرتا رہا کہ تم امریکہ جا کر بھکاری ہو جاؤ گے، لیکن اس کے ساتھ آدم نے بھی جفا چھوڑ دیا اور برطانیہ جا کر اپنے دھڑے کے لیے فنڈز جمع کرنے لگا۔ وہ دوبارہ 1873 میں فلاڈلفیا کے Beptist Church میں نظر آیا جو تورات کی تبلیغ کر رہا تھا اور جفا کے جارج واشنگٹن جوشوا آدم کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق سے انکاری تھا۔

موسم بہار کے اختتام تک پچاس سابقہ آبادکار چہرے پر شرمساری سجائے انڈس رور کو لوٹ آئے۔ ابراہم میکنزی اپنے ساتھ بدوؤں والا خیمہ لے آیا اور فلسطینی مٹی بیچنے کا کاروبار کرنے لگا۔ ان آبادکاروں میں چالیس لوگ جفا میں مقیم رہے اور ان میں سے صرف ایک شخص Rolla Flayed کو ٹورسٹ گائیڈ کی نوکری ملی، جو امریکی سیاحوں کو یروشلم تک لے جاتا تھا۔ یہ آبادکاری مقامی طور پر الما لکان، امریکی جگہ کے نام سے جانی جاتی رہی۔ اس کی زیادہ تر عمارتیں جرمن، عیسائی پیرو کاروں نے خرید لی تھیں۔ آدم کے گھر کی ملکیت روسی شخص Ustimove کو ملی جو نوادرات جمع

کرتا تھا اور اداکار پیٹر کا دادا تھا۔ اگرانتہائی برے طریقے سے انجیلوں کی، یہودیوں کو ان کے گھر فلسطین میں آباد کرنے کی کوشش ناکام ہوئی۔ جفا میں امریکیوں کی ناکامی، سابقہ ایک جیسے تجربات کو دہرانے کے سبب سے ہوئی۔ مقامی برطانوی سفیر، نوئل ٹیمپل مور نے مختصراً کہا: جس امریکی شاہین نے مسز آدم کے تصور میں یہودیوں کو ان کی قدیم زمین پر حاکمیت دینا تھی، اب اس نے اپنے پروں کو لپیٹ لیا تھا۔ ہیریٹ لیورمور، کلورنڈ مائنر Clorind Minor اور ڈکنسن فیملی کی کوششوں میں ناکامی نے کئی امریکی انجیل کے پیروکاروں کو مایوس کیا کہ وہ مستقل طور پر فلسطین میں آباد ہوں۔ لیکن ایک فیملی Spafford نے یروشلم میں کالونی بنانے کی ابھی کوشش کرنا تھی جبکہ دیگر سابقین نے ہسپتال، سکول اور کالج بنانے تھے۔ فلسطین میں امریکہ کی آمد، حقیقت میں پورے مشرقِ وسطیٰ میں آمد تھی، جو بڑھتی رہی۔ یہ صرف انسانی ہمدردی میں نہیں تھی بلکہ اس میں مہم جوئی کا بھی شوق تھا۔

امریکی حملہ

مشرقِ وسطیٰ کی سیاحت کو کبھی آوارہ گردی سے تعبیر کیا گیا تھا۔ لیکن خانہ جنگی کے بعد کے دور میں یہ ایک قابلِ احترام سیر و تفریح بن گیا۔ 1860 کے بعد کی دہائیاں گواہ ہیں کہ بیرون ملک جانے والے نہ صرف عیسائی مبلغین بلکہ امریکیوں کی تعداد میں دس گنا اضافہ ہوا۔ اسی زمانے میں، ریاست متحدہ امریکہ میں دو ہزار سفری کتابیں شائع ہوئیں۔ اور آرام دہ پرسکون دخانی جہاز بھی پہلے ہی سے سفر کے لیے حاصل کر لیے گئے۔ ان میں سے زیادہ تر مسافروں نے یورپ کا رخ کیا۔ لیکن ایک واضح تعداد نے مشرق وسطیٰ کی سیر و سیاحت کی۔ مصر کا دورہ کرنے والا ڈاکٹر جیکب فریس نے اس بات کی تصدیق کی کہ کسی بھی دوسری قوم کی نسبت، امریکی مسافروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ اس حقیقت کی تصدیق آرٹسٹ فریڈرک چرچ نے بھی کی تھی، جو Hudson River School کا بانی تھا۔ 1868 میں دمشق میں پہنچ کر چرچ کو معلوم ہوا کہ کسی بھی ہوٹل میں دستیاب کمرہ، امریکی حاصل کر چکے ہیں۔ چند ایک انگریز لوگ، اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس بات کا شکوہ کرتے تھے کہ یہاں امریکی لوگ بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ مصر میں بھی جنگ سے پہلے امریکی سیاحوں کی تعداد 60 آدمی سالانہ تھی جو بڑھ کر 500 ہو گئی ہے۔ 1870 کی ابتدا میں بدو رہنما جو

اہرام تک رہنمائی کرتے تھے وہ بھی مقصد کے تحت امریکی لہجے میں انگریزی بولتے تھے اور اپنے گدھوں کا نام یانکی ڈوڈل رکھا کرتے تھے۔

کرایوں میں نمایاں کمی اور نیویارک سے مصر تک کا سفر صرف 17 دن میں، اس نے کئی امریکیوں کو لبھایا اور انہوں نے مشرق کی طرف رخ کیا۔ جس طرح Pulnam's Magazine نے اسے خانہ بدوشی کے دور کی دریافت کہا تھا، ابھی تک اسے بے مثال امریکی ہجرت نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ امریکی مشرق وسطیٰ کے اساطیری تصورات سے کھنچے چلے آتے تھے۔ جس میں عرب کی خوشبوئیں اور جنت کے رنگ تھے۔

سفرنامہ نگار چارلس ڈوڈلے وارنر کے الفاظ میں یہ ایک مکمل طور پر تصوراتی خطہ تھا۔ پرانی سرحد کی ضد، امریکیوں کو کھینچتی رہی۔ خاص طور پر جب مغربی سرحد معدوم ہو رہی تھی۔ مزید متاثر کن بات، چار سال کی خونریزی کے بعد دنیا میں نکلنے اور زندگی کو قائم رکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی ضرورت تھی۔ مصر کے وزیر خارجہ نبار پاشا نے ہنری ایم فیلڈ جو 1878 میں ماس چوسٹس میں نامہ نگار تھا، کو بتایا کہ تم امریکی اصل میں سچے خانہ بدوش ہو۔

امریکی، مشرق وسطیٰ میں گھوم کر اپنے گھومنے کی ہوس کو، اپنی صحت کو داؤ پر لگائے بغیر پوری کر سکتے تھے۔ سیاح، راہزنوں کا آسان شکار تھے۔ سیاحوں کا حوصلہ ذاتی محافظ رکھ کر اور بغل میں سجنے والے ہتھیاروں سے بڑھایا جاتا تھا۔ اس خطرے اور تنبیہ کو بھول کر، نیویارک کے رہائشی Klein نے ندی کے ذریعے اردن جانے کی کوشش کی۔ لیکن مسلح بدوؤں نے اسے کہا کہ وہ 7000 ڈالر کی رقم وہاں جانے کی ادا کرے۔ جو کہ 1878 میں واقعی مقدر سنوارنے والی بات تھی۔ اس خطے میں سفر، ان خواتین کے لیے، جو اکیلی اور بغیر حجاب کے ہوتی تھیں، بہت خطرناک تھا۔ 1860 کے آخر میں، قومی طور پر مشہور اداکارہ روز آئٹنگ جو پورے مشرق وسطیٰ کے دورے پر تھی، اسے اپنے سر کو ڈھانپنے کی ضرورت پر جھرجھری آ گئی کہ جب گھر سے باہر جائے یا کسی مرد کی ہمراہی میں نکلے تو سر ڈھانپ کے رکھے۔ وہ یہاں کی رسوم کے بارے میں جان گئی کہ کسی امریکی عورت کے لیے بہت دلخراش اور اذیت ناک ہیں۔ کیونکہ وہ یہاں آنے جانے کی عادی تھی اور خوش بھی ہوتی تھی۔ امریکی سیاحوں کے لیے، یہاں لوٹ مار، راہزنی اور جنسی پریشانی کے علاوہ سب سے زیادہ پریشان کن بات بیماری تھی۔ پیچش سب سے مہلک اور جان لیوا قاتل بیماری تھی، جس نے مارتھا اور

ہیلن وولسے ، جو Yale کے صدر کی بیٹیاں تھیں، کی جان اس وقت لے لی تھی جب وہ 1870 میں لبنان عبور کر رہی تھیں۔

مشرق وسطیٰ کا موسم غیر ملکیوں کے حق میں نہیں تھا۔ اکثر سیاحوں کے لیے مہلک ثابت ہوتا تھا۔ دمشق کے سفیر جے آگسٹس جونسن کے مطابق، جس نے اس بات کی تصدیق کی کہ جدید سیاحوں اور مطالعاتی دورہ کرنے والوں کی قبریں، ڈان سے بیئرشیو اور یروشلم سے دمشق تک دیکھی جاسکتی تھیں۔ اسکندریہ کا سفیر یہی شکایت کرتا تھا کہ اس کا زیادہ تر وقت باقی بچے کھچے امریکیوں کو واپس بھیجنے میں صرف ہوا، جو مصر کے آثار قدیمہ کو دیکھتے ہوئے اپنی صحت تباہ کر بیٹھے تھے۔

ان خطرات کی پرواہ کیے بغیر، امریکیوں نے مشرق وسطیٰ میں بہت زیادہ سفر جاری رکھا۔ وہ امریکی جن سے لندن میں رہنے والی ایلیزا ابش مصر میں 1870 میں ملی، ایسا لگتا تھا کہ ان کے پاس کوئی نظریات نہیں ہیں۔ جبکہ اس کا اپنا ہم وطن جان میک گریگر اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ یہ امریکی کس طرح تیزی سے مقامات کا نظارہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مصر میں خدمات انجام دینے والے امریکی افسر، مصر میں آنے والے امریکیوں کی بڑھتی تعداد اور ان کے خالی دوروں پر حیران تھے۔ ایک افسر کا کہنا ہے کہ سب امریکی یہاں قافلے کی صورت میں آتے ہیں اور انہیں ہوٹل کے کمروں میں پونگوں کی طرح گھسیڑ دیا جاتا ہے اور گردونواح میں بکریوں کی طرح گھمایا جاتا ہے۔

صرف اس وقت ایسا محسوس ہونے لگا کہ امریکی مشرقِ وسطیٰ، صرف اس کی بے حرمتی کرنے یا اس کے آثار چرانے آتے تھے۔ اہراموں، مزارات، معبدوں میں تمام امریکی اپنے نشانات ستارے اور پٹیاں بنا کر چھوڑ آتے تھے۔ وہ دیواروں پر لکھائی میں مہارت حاصل کرتے۔ پاول ٹکر، جو نیویارک کا رہنے والا تھا، اس نے کئی قدیم مقامات کو سجا دیا۔ جن چیزوں کو چرا نہیں سکتے تھے، امریکی ان کو خریدنے پر تیار ہو جاتے تھے۔

ایک دفعہ مرکزی امریکی افسر نے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ امریکی اکثر ان اشیاء کے بارے میں اپنے بٹوے میں رکھی رقم سے سوچتے، اپنی چیک بکس کے ذریعے ان کی تعریف کرتے، اور اپنی خواہشات کے مطابق ان کو سراہتے تھے۔ مصر میں، نیوجرسی کا جلاوطن تاجر سمتھ، جو خود کو عہدِ رفتہ کہتا تھا، اس نے اس بات کا خوب فائدہ اٹھایا اور امریکیوں کو اصلی اور آدمی کے تیار شدہ نوادرات بیچ کر پیسہ کمانے لگا۔

امریکیوں نے مشرق وسطیٰ کے کلاسیکی ماضی کے لیے جس تحقیر کا مظاہرہ کیا اس میں بہت زیادہ اضافہ اپنے معاصر معاشرے کے لیے ان کے بنائے ہوئے ہم زمان قانون کی وجہ سے ہوا۔ اس خطے میں جنگ سے پہلے آنے والے سیاحوں کی طرح، مابعد جنگ آنے والے امریکی سیاحوں نے برا بھلا کہنا جاری رکھا۔م جسے وہ مشرقِ وسطیٰ کی زندگی کا ظلم اور پیدائشی محرومی خیال کرتے تھے۔ چارلس ڈوڈلے وارنر نے عورتوں سے ناروا اور برے سلوک کا مشاہدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر داؤد کے مزار پر واقع یروشلم میں ایک مسلم محافظ نے ڈاکٹر فریز کو روکا تو وہ شدید غصہ میں آ گیا، کہ یہ اس زمانے کی تہذیب کی ذلت ہے، جو اس مجبور و بے کس نے کی ہے اور عیسائی امریکہ کو پکارا اور کہا کہ اسے سفارت یا بزورِ شمشیر درست کرے۔

ایسے بدصورت امریکی مشرق وسطیٰ میں موجود رہے لیکن تمام امریکی مشرقِ وسطیٰ کی ثقافت کے لیے بے ڈھب یا تباہ کن نہیں تھے۔ دار چینی کے پیڑوں اور عربی فصلوں کے خواب دیکھ کر، ماورائی فلاسفر رالف والڈو ایمرسن نے مئی 1872 میں اس خطے کا دورہ کیا تھا۔ دریائے نیل میں سفر کرتے ہوئے اس نے دیکھا ”اس خطے کے لوگ اپنی اعلیٰ اور شاندار شباہتوں اور حرکت کے سبب بہترین مطالعہ ہیں۔“ کچھ سال بعد ہی سفر کرتے ہوئے، فریڈرک ڈوگلس نے تصور کیا تھا کہ ”اہراموں کی تعمیر کرنے والوں کی اولاد مختلف رنگوں کی انسانی نسل کے خلاف امریکی تعصب کا مقابلہ کرنے میں مدد کر سکتے ہیں۔“ عرب کتنے شدید قسم کے آزاد ہیں۔ یہ سیاہ فاموں کے نصف برادر ہیں۔ اور دیگر رنگوں کے لوگوں کی پرورش کر کے ایک بہترین نمونہ ہو سکتے ہیں۔

ایسے قسم کے مثبت جملوں سے، قبل از جنگ لکھا جانے والا سفری ادب تہی ہے۔ اور وہ ان نظریہ ساز بلند قامت لوگوں کی کشادگی اور برداشت کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ از حد عاجزی کو دوست رکھتے ہیں۔ وہ جنگ کے مارے ہوئے تھے۔ یہ انکسار، اشتیاق، توانائی اور زندگی کی خواہش سے جڑا ہوا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں امریکیوں کا آنا اصل میں تاریخی ورثے کے اثر کا نتیجہ ہے۔ ان میں وکلاء، اساتذہ، امیر، فارغ البال لوگ، کارکن اور کلرک تک شامل تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ بہت بڑی شخصیات سول وار کے ہیرو بھی شامل ہوں گے۔

دلکش، چمکدار ناٹک:

ولیم ہنری سیورڈ نے ایک بار بیان دیا کہ ”متحدہ امریکہ تو فلسطین ہے جہاں سے سیاسی

بخشش اور نجات ملتی ہے۔'' اب ستر سال کی عمر میں سابقہ سیکرٹری آف سٹیٹ خود کو ممتاز ترین امریکی بنانے کے لیے، جس نے کبھی مشرقِ وسطیٰ کا دورہ کیا ہو، مقدس زمین کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ یہ اس کا دوسرا دورہ بھی ہوسکتا تھا۔ اس کا پہلا دورہ سول وار سے پہلے ہوا تھا۔ تب وہ سینیٹر تھا۔ اس نے نوادرات کا ایک صندوق، تین عربی گھوڑے بغداد سے اور بدوؤں کا نیزہ حاصل کیا تھا۔ اگلے دس برسوں میں وہ ایک جھگڑالو عدم غلامی پسند کے طور پر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ بزرگ سیاستدان ہونے کے ناتے سے اس نے فرانس اور برطانیہ کو امریکی مرکزیت کو تسلیم کرنے کے لیے سمجھانے میں مدد کی اور مذاکرات کار کی حیثیت سے اس نے الاسکا خریدنے کی شرط رکھی۔ 1865 میں وہ ایک شدید حادثے سے بچ نکلا لیکن اسے اندرونی طور پر شدید چوٹیں آئیں جس کی وجہ سے وہ ایک سال کے لیے بستر سے لگ گیا۔ اس عرصے میں اس کی بیوی اور بیٹی کی اموات ہوگئیں۔ لیکن سیورڈ کو دوبارہ صحت ملی تو اس نے دوبارہ اپنے دفتر کو 1869 تک سنبھال لیا۔ ایک کمزور آدمی کو اس مقام پر ریٹائر ہو جانا چاہیے تھا لیکن سیورڈ اپنی کوتاہ قامتی اور لمبی تھوڑی کے باوجود کمزور نہیں تھا۔ جونہی اس نے حکومتی عہدہ چھوڑا، اس نے مصر کے لیے جہاز پکڑ لیا۔ نیل کی زمین پر اس کا بہت شاندار طریقے سے خیر مقدم کیا گیا۔ کلغی سجائے فوجیوں کا دستہ، ہراہرام تک اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ شاہی گاڑی میں، نیل کے تباہ شدہ کنارے اور جدید سویز کینال کو عبور کیا۔ اس توجہ کے باوجود، سیورڈ، مصری معاشرے کے کئی پہلوؤں کے معاملہ میں بہت سخت رہا۔ کئی کئی بیویوں اور افریقی غلاموں کو دیکھ کر اسے مورمن ازم اور کنفیڈریسی کی یاد آتی تھی۔ پھر بھی اس نے مصریہ خدیو کی سیاسی اور معاشرتی اصلاحات کو سراہا اور تعریف کی۔ نوجوان افسروں سے خطاب کرتے ہوئے، سیورڈ نے، مصر میں عالمی تعلیم کی ضرورت پر، اور مقامی لوگوں کو اس قابل بنانے کی ضرورت پر زور دیا کہ وہ حکومتی عہدے حاصل کرسکیں، جو اس وقت غیر ملکی لوگوں کے پاس تھے۔ صرف اسی صورت میں مصر، دہری مصیبت سے نجات پا سکتا ہے۔ ''پہلی عثمانی دربار سے اور دوسری یورپ کی عیسائی قوموں سے۔''

مصر کو چھوڑتے ہوئے، اس نے اپنا رُخ شمال مشرق کی طرف کیا اور جفا جا پہنچا، جہاں امریکی سفارتخانے پر امریکی پرچم لہرا رہا تھا۔ مضبوط پٹھوں والے عربوں نے اسے، اس کی کشتی سے کنارے پر اتارا، جہاں ایک شاہی نمائندے نے اس کا خیر مقدم بطور شمالی امریکہ کے متحدہ

ریاستوں کے وزیر اعظم کے طور پر کیا۔

عثمانی گھڑسواروں کے ہمراہ، اس نے یروشلم کا رخ کیا۔ وہاں اس نے مقدس مزار کے گرد آلود نیم تاریک ہالوں اور مغربی دیوار، جس کے پاس یہودی اپنی عبادات کر رہے تھے، کا دورہ کیا۔ اسے مقدس مناظر دکھائے گئے۔ سیورڈ کے لیے سب سے زیادہ متاثر کن مقام یہودی عبادت گاہ تھی۔ جس کی تعمیر امریکی یہودیوں کے پیسے سے ہوئی تھی۔ اس نے یہودیوں کو سبت کی عبادات کرتے حیرت زدہ ہوکر دیکھا۔ ایک ربی، جو راہبانہ شاندار لباس میں ملبوس تھا، اس نے عبرانی زبان میں سب سے پہلے صدرِ امریکہ کے لیے دعائیں کیں۔ وہ حیرت سے بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب اجتماع نے، مہمان مسٹر سیورڈ کی صحت کی دعا اور اس کی بحفاظت واپسی کی خواہش کی۔

سیورڈ نے امریکہ جانے سے پہلے، استنبول میں ایک یادگار قیام کیا۔ 4 جولائی 1870 کو اس نے رابرٹ کالج میں آزادی کی تقریبات کی صدارت کی۔ اس کے ہمراہ کالج کا صدر سائرس ہیملن بھی تھا۔ 150 طلبا نے اسے خوش آمدید کہا۔ لڑکوں نے سفید لباس اور تنکوں والے ہیٹ پہن رکھے تھے۔ لڑکیوں نے ریشمی گاؤن اور چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ وہ امریکی جنگی دعا کے مصرعے گا رہے تھے۔ طعام کے کمرے میں، ضرب کے نشان کی طرح امریکی اور ترکی پرچم لہرا رہے تھے۔ ترکی انداز میں امریکی کھانا کھا کر سیورڈ نے کہا، یہ خیال کیا جاتا تھا کہ تمام افکار مشرق سے مغرب جاتے ہیں لیکن اب آدمیوں نے دیکھ لیا ہے کہ افکار اب مغرب سے مشرق آ رہے ہیں۔ رابرٹ کالج نے اسی فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے امریکی جو کر سکتے تھے اور اسی ایثار پر جمے رہنے پر اصرار کیا کہ اب ان کی قوم متحد ہو چکی ہے۔ صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ ہمارے ملک کی موجودگی قائم ہے، اگر اس کا قومی جوش محفوظ نہیں ہے۔ بیس بال کا کھیل دیکھ کر، وہ چھ ماہ کے لیے یورپ چلا گیا، جہاں سے وہ اپنے گھر نیویارک پہنچا اور اگلے سال اس کی وفات ہوگئی۔

سیورڈ کے اس سفر نے دیگر سول وار کے دور کے لوگوں کے لیے مثال قائم کی اور وہ بھی مشرقِ وسطیٰ کے نیم سرکاری دوروں کے لیے رضامند ہوگئے۔ ان میں سب سے زیادہ مشتاق جارج بی میک لیلن تھا جو کبھی فوج کا کمانڈر تھا۔ اکتوبر 1874 کے آخر میں اسکندریہ پہنچ کر، سو دِن کے لیے نیل میں سفر کیا، جہاں اس نے نامعلوم زمانوں کی تباہی دیکھی اور بدوؤں کی مہمان نوازی کا نمونہ دیکھا۔ اسے، کسی بات نے متاثر نہ کیا، جتنا وہ دو امریکی افسروں Erasmus Purdy

Sparrow اور Raliegh Calslm کو اکٹھا دیکھ کر متاثر ہوا۔ اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''ان میں سے ایک فیڈرل آرمی کی طرف اور دوسرے نے کنفیڈریٹ کی طرف سے جنگ میں حصہ لیا تھا'' وہ دونوں نیل کے کنارے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

نقاد میک لیلن کو خوش وضع نفیس آدمی کہتے تھے لیکن اس نے مشرق وسطیٰ کے معاشرے کے بارے میں سخت تبصرے کیے تھے۔ تمام مصریوں کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ بہت محنتی اور ذہین نسل ہے۔ اسلام نے ان کو منتشر اور مذہبی شدت پسند بنا دیا ہے۔ اکثر مسلمانوں کے پاس سوائے جان دینے اور اس کا اجر اگلی دنیا میں پانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ دوسری طرف، دیگر مغربی قوموں نے مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کو نہیں سمجھا، جس طرح ہم نے اپنے اصول وضوابط کے مطابق ان کو سمجھا ہے۔ ان کے اصول وضوابط، ہم نے ان کے اعمال سے سمجھے۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ تبدیلی تعلیم کے ذریعے آہستہ آہستہ، اس خطے میں ضرور آئے گی۔

امریکی عوام نے McCellalan اور Seward کے مشرق وسطیٰ کے دوروں کی تفاصیل، کی تقلید ندیدے پن سے کی۔ اتنی سنسنی کسی اور دورے نے نہیں پیدا کی تھی جتنی خانہ جنگی کے ایک افسر کے بحری سفر نے پیدا کی۔ مارچ 1872 میں اس نے ورجینیا سے اسکندریہ مصر تک سفر کیا۔ اس کا نام شیرمین تھا۔

مصریوں کے بارے میں شیرمین کے پہلے تاثرات بہت پر جوش تھے۔ ''ان کا مذہب احکامات کے مطابق احترام کا تقاضا کرتا ہے۔'' یہ بات اس نے اپنے بیٹے ٹامی کو خط میں کہی، جو واشنگٹن میں طالب علم تھا۔ اس نے یاد کیا کہ بیس سال پہلے یہودی یا عیسائی کتوں کو پتھروں سے مارا جاتا تھا۔ اور نیک مسلمان سمجھتے تھے کہ اس کا اجر اگلی دنیا میں ملے گا۔ اب اگرچہ مصر نے مغربیوں کو خوش آمدید کہا ہے جو مختلف کاموں کے مستری اور ماہر ہیں۔ جو یہاں غریب مزدوروں کی مدد کے لیے سٹیم انجن لے آئے ہیں۔ صحرا میں ریلوے پٹڑیاں بچھائی ہیں۔ ٹیلی گرام کا نظام قائم کیا ہے جس سے قاہرہ سے سویز تک چند لمحوں میں پیغام پہنچ جاتا ہے۔ شیرمین نے پیش گوئی کرتے ہوئے کہا کہ جدید سائنس نے مغرب اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان رکاوٹوں کو توڑ دیا اور تمام تعصبات ختم کر دیے۔

شیرمین کا ابتدائی دوستی کا مظاہرہ جلد ہی مشرقِ وسطیٰ اور اس کے کردار کے منفی پہلوؤں کے

ساتھ بے صبری میں بدل گیا۔ قاہرہ کے بارے میں اس نے شکایت کی کہ سخت نظر آنے والا قصبہ ہے، جہاں گدھوں، اونٹوں، کتوں اور دیگر کیڑوں کی نسلوں کے ساتھ، مردوں، عورتوں اور بچوں کی نسلوں کا ادغام ہے۔ شیرمین کے لئے مصریوں کا یہ رویہ غصے کا باعث تھا کہ وہ مغربیوں کی نسبت خود کو برتر خیال کرتے تھے اور اس کے بجائے لفٹیننٹ فریڈرک کو بہت اہمیت دیتے تھے جو صدر کا بیٹا تھا۔

شیرمین کا غصہ وقتی طور جنرل لورنگ اور سٹون سے ملاقات کی وجہ سے اور سویز کینال کی سیر سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ خدیو اسمٰعیل نے اس کے لئے ایک ناٹک عابدہ کا انتظام کیا اور اسے دو لاکھ ڈالر کی مالیت کا ایک ہار پیش کیا۔ مصر میں اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اس پر بہت کچھ خرچ کیا گیا۔ سلطان عبدالعزیز نے اس کا استقبال بطور امریکی سربراہ کے کیا شیرمین کو وہاں سلامی پیش کی گئی۔ سلامی دینے والے فوجیوں نے امریکی ساز وسامان سجا رکھا تھا۔ امریکہ سے درآمد شدہ ٹرالی کار میں بھی اسے سیر کروائی گئی۔

شیرمین کے اس دورے میں، سیورڈ کی طرح، مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکی داستان خیالیوں اور اس کی بڑھتی ہوئی معاشی اور فوجی قوت کے میل ملاپ کو بھی نشان زد کرتا رہا۔ وہاں عام شہری جیکب فریس اور چارلس ڈوڈلے بھی آتے رہے اور اعلیٰ امریکی عہدیداروں کے دورے بھی ہوتے رہے۔ کسی کے دورے کو اتنا اجاگر نہیں کیا گیا جتنا آل یونین فورسز کے سابقہ چیف اور ماضی کے صدر یولیسز ایس گرانٹ کے دورے کو اجاگر کیا گیا تھا۔

گرانٹ نے زندگی میں بہت مشکل وقت دیکھا تھا۔ وہ ایک ناکام کسان، لکڑیوں کا تاجر، جائداد کی فروخت کا ناکام شخص تھا۔ بینک نادہندہ، شراب کا شوقین اور اس کے کئی سیکنڈل تھے۔ اسے پچپن برس میں عالمی پذیرائی حاصل تھی۔ اپنی صدارت کے دوران میں رشوت خوری کے لگنے والے الزامات سے بچنے کے لئے اس نے اور اس کی بیوی نے دنیا کا سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا آغاز انھوں نے مئی 1877ء میں یورپ سے کیا اور بتدریج مشرق کی طرف بڑھتے گئے۔ اس دورے کو تاریخ کا ممتاز سفر کہا گیا جیسے یہ کوئی رومان تھا۔

یہ رومان 5 جنوری 1878ء میں حقیقت کا روپ دھار گیا جب یو۔ ایس۔ ایس وینڈالیا جہاز نے انھیں اسکندریہ اتار دیا۔ جہاز چھوڑنے سے کئی گھنٹے پیشتر کئی سرکاری افسر عرشے پر استقبال کے لئے آئے، جولیا نے یاد کرتے ہوئے کہا، ''کوئی شخص آسانی سے محسوس کر سکتا تھا کہ ہم یہاں

تفریحی دورے کے بجائے بمباری کے لئے ہیں۔

جب ہم کنارے پر اترے اور ہمارا سفر شروع ہوا تو راستے کے دونوں اطراف ہزاروں لوگ استقبال کے لئے موجود تھے ان کے ہاتھوں میں پھول اور لالٹین تھے اور امریکی صدر کے لئے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک بہت بڑے بینر پر Welcome General Grant کا نعرہ درج تھا جس میں n الٹا لکھا گیا تھا اور یو بن گیا تھا۔

سیورڈ اور شیر مین کا بہت شاندار استقبال ہوا لیکن شیر مین کا استقبال صدرِ امریکہ کے طور پر ہوا۔ اس جوڑے کو رہنے کے لئے شاہی محل دیا گیا۔ وہاں چاق و چوبند اور باوردی عملہ تھا جولیا کا کہنا ہے کہ ہم صرف تالی بجاتے تھے اور اور خاموش قدموں سے چلتا باوردی ملازم حاضر ہو جاتا تھا۔ اس جوڑے کو عام جگہوں کی سیر کروائی گئی اور گدھوں پر بٹھا کر اہرام دکھائے گئے۔ انھوں نے نیل کی سیر بھی کی جہاں مگرمچھوں اور بھیڑیوں کا شکار کیا گیا۔

گرانٹ کے لئے مصر، تباہی اور شکوہ کا نمونہ تھا۔ Sphinx کے مجسمے کو دیکھ کر گرانٹ نے تبصرہ کیا ایسے لگتا ہے جیسے یہ کم بات کئے ابدیت کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اور مزید کہا میرے لئے مصر میں دلچسپی کا سامان بہت ہے جو کسی دوسرے سیاح کے لئے نہیں ہے جولیا مصر سے کم متاثر ہوئی، اس نے کہا ''مصر تہذیبوں کی آماجگاہ ہے لیکن اہرام، گنبد اور مینار بنانے والے معماروں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

گرانٹ قدیم خدوخال دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن اپنے ماضی کے پرانے احباب دیکھ کر پر جوش ہو گیا۔ اس نے لورنگ کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر کہا ہم تیس برس سے نہیں ملے۔ یہ وہ افسر تھا جو اس کے ہمراہ میکسیکن جنگ لڑ چکا تھا اور بعد میں شمال جنوب کی جنگ میں اس کے مخالف لڑا تھا۔ یہ رہا سٹون جو اپنے بال سیاہ رکھنے کے لئے رنگتا ہے۔ جنرل رابرٹ ای لی کی بیٹی میری اور گرانٹ کا سامنا ہوا تو اس نے گرانٹ کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ وہ اس کے باپ کا دشمن ہے۔ میری پر جوش خاتون تھی وہ اہرام پر چڑھ گئی اور کنفیڈریٹ کا جھنڈا لہرانے لگی۔

مشرقِ وسطیٰ میں دیگر امریکیوں کی روایت کی تقلید کرتے ہوئے گرانٹ نے مصر سے فلسطین کا رخ کیا۔ جولیا کو جفا بہت غریب اور گندی جگہ محسوس ہوئی، لیکن گرانٹ بہت پر جوش تھا اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ مقدس زمین پورے بحیرہ روم کے لئے رزق کا سامان بن سکتی

ہے۔ کاش اسے امریکی آباد کر سکتے۔ جولیا نے لکھا کہ رولا فلاڈ آدم کالونی کا ڈاکٹر تھا اس کی رہنمائی میں یروشلم کا سفر آغاز کیا۔ دیہاتی اور بدو جو بائبل کے بیان کردہ ملبوس میں تھے ان کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ گرانٹ کا سر تمام وقت ننگا رہا وہ مسلسل سلامی کا جواب دے رہا تھا۔ بہترین نظارہ قدیم شہر کی دیواروں کے دونوں طرف فوجی بینڈ کی سلامی کا تھا۔ یہ ایک شاندار ناٹک تھا۔

یولیسز ایس گرانٹ، فلسطین سے استنبول کے لئے روانہ ہوا وہاں بھی اس کا شاندار استقبال کیا گیا اس نے ترکی دستوں کا معائنہ کیا۔ اس کے دورے کی مصروفیت کافی تھکا دینے والی تھی لیکن اسے اپنی موجودگی کو یقینی بنانا ہوتا تھا، اس کے لئے سکون کا لمحہ لیٹ کر ایک کتاب کا مطالعہ تھا جو وہ گھر سے ساتھ لایا تھا۔ یہ کتاب مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں تھی، بائبل یا کسی عیسائی مبلغ کے خطوں کا مجموعہ نہیں تھی۔ یہ مارک ٹوین کا سفرنامہ تھا۔

گم شدہ معصومیت

مارک ٹوین کے لئے قاہرہ، امریکی ریاست الینوائے کے شہر جیسا تھا۔ جس کی سرحد مسیسی پی دریا کے ساتھ لگتی تھی۔ اس کے لئے عظیم ترک سٹیم بوٹ اور عربی، گودی پر کام کرنے والے ملازمین کا نام تھا۔ وہ کبھی کنفیڈریٹ سپاہی اور دریائی کشتی کا ملاح تھا۔ اس نے اپنی بتیس سالہ زندگی کا زیادہ وقت میسوری کے مغرب میں سفر کرتے گزارا۔ اس کے ذہن میں کبھی مشرق کی طرف سفر کرنے کا خیال نہ آیا اور مشرقِ وسطیٰ طرف تو بالکل نہیں۔ اس کے دل میں مقدس زمین کی زیارت کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ اگرچہ اس کی تربیت عیسائی گھرانے میں ہوئی وہ بائبل کا عالم تھا اس میں تبلیغی بننے یا مبلغ بننے کی کوئی صلاحیت نہیں تھی جو لوگوں کو جنت کے حصول کی طرف راغب کر کے قابل، رحم بنا دیتا ہے۔

ٹوین ایک بے چین طبیعت کا مالک تھا 1867ء کے بہار تک چالیس سمندری سفر کر چکا تھا اور ایک تازہ سفر ہوائی کا بھی شامل تھا۔ وہ ایک جگہ رہنے سے اکتا جاتا تھا۔ جب اسے سمندر کے راستے سفر کرنے والے ایک گروہ کے بارے میں علم ہوا جسے مراکش، مصر اور فلسطین میں رکنا تھا اسے بچپن میں پڑھی الف لیلہ کے کردار یاد آ گئے۔ اس نے اپنی ماں کو خط لکھا ''بحیرہ روم کی گرم زمینوں کی ہوا کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

عقاب کی طرح مڑی ناک اور مونچھوں والا ٹوین تیزی سے سان فرانسسکو میں شہرت حاصل کر رہا تھا وجہِ شہرت اس کی امریکی زندگی پر چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں اور اس کے دیے جانے والے مزاح پر لیکچر بھی اس کی شہرت کا باعث تھے۔ سمندری تفریحی سفر بہت اہم لوگوں نے ترتیب دیا تھا۔ اور اسے بڑے پیمانے پر تفریح کا نام دیا گیا تھا۔ اس میں شیرمین، ہنری وارڈ بھی شامل تھے اور یہ طنز و مزاح کے لئے نہایت مناسب ماحول تھا۔ ٹوین نے دو اخباروں سے درخواست کی کہ اگر اسے 1250 ڈالر کا ٹکٹ دلوا دیں تو جواب میں وہ اس سفر کے بارے میں لکھ کر بھیجتا رہے گا۔ کیا یہ دلکش منصوبہ نہیں ہے؟ پورے پانچ ماہ تک ہر قسم کے تفکرات سے آزاد اور ایسے لوگوں کا ساتھ جو تفریح کی غرض سے جا رہے ہیں جو کاروبار کے بارے میں ایک لفظ بھی ادا نہیں کریں گے۔ مدیر پہلے سے تیار تھے چنانچہ 8 جون کو سبز شیشوں کی عینک، چھتریاں اور مصر کے لئے حجاب لے کر Quaker City جہاز پر سوار ہوئے۔ اس میں ہر قسم کی سہولتیں تھیں اور سلامی کے لئے توپیں بھی تھیں۔

ہنری اور شیرمین شامل نہیں تھے صرف معصوم درمیانی عمر کے لوگ موجود تھے۔ دن کے وقت بندرگاہ پر لوگ شور و غل کرتے قہقہے لگاتے اور رات کو ناچ گانا اور محبت کا کھیل ہوتا تھا۔ مسافروں کو پلائی موتھ کی دعائیہ کتاب اور دعوت نامہ دیا گیا کہ وہ روزانہ ایک کیبن میں عبادات میں شامل ہوں۔ اس کیبن کو ٹوین نے معبد کہا مقدس زمینوں کی جانب تفریحی سفر کو اس نے بغیر لاش کے جنازہ کہا۔

پینسٹھ مسافروں میں سے صرف آٹھ کے ساتھ اس کی جان پہچان ممکن ہوئی۔ اسی اثنا میں جہاز نے بحرِ اوقیانوس کو عبور کیا اور اپنی پہلی منزل طنجہ کی جانب چل پڑا۔ جہاں سفیر جیمز ڈی لانگ نے پانچ سال پہلے کنفیڈریٹ سفیر میئرز اور ٹنسٹال کو گرفتار کر لیا تھا۔ سفر تنگ نظری، تکبر کے لئے بہت مہلک ہے۔ مراکشی بندرگاہ میں داخل ہوتے ہی ٹوین نے یقین دلایا۔

کیا یہ مشرق کی تصویر نہیں ہے؟ ٹوین نے شہر میں ہجوم، گنبدوں، اور انسانوں کے مکھیوں کے ہجوم کی طرح کی صراحت شروع کر دی۔ اس نے مشرقِ وسطیٰ کی حکومتوں کو الزام دیا جو بدعنوان تھیں اور ایسے شخص کو وہاں کا حاکم بتایا جو سخت بے رحم تھا۔ اپنی رعایا اور حتیٰ کہ اپنی بیویوں سے بھی برا سلوک کرتا تھا۔ اس کی پانچ سو بیویاں تھیں اور درجن بھر یا اس سے زیادہ کسی اور وجہ سے بھی تھیں۔

وہ عیسائی اور کتوں کو مساجد اور گھروں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ طنجہ ایک بدیسی زمین ہے جس کی اصل روح کسی کتاب میں نہیں ملے گی سوائے الف لیلیٰ کی کہانیوں کے۔

ٹوین اپنی تنقید اور عیش و مستی میں اپنے سے پہلے امریکی سیاحوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس کی تحریر کی ایک خصوصیت اسے دوسروں سے منفرد کرتی ہے کہ دیگر معاصرین نے خطے کو اپنی اپنی برداشت اور بردباری کے الٹ دیکھا اس کے ظلم و ستم کو دیکھا۔ لیکن ٹوین نے امریکیوں کو بھی آئینہ دکھایا کہ وہ بھی تنگ نظر اور ظالم ہیں۔ سول وار سے سات سال پہلے امریکی اس قسم کی تصویر کشی پر اعتراض کرتے لیکن 6 لاکھ فوجیوں کی اموات نے انھیں اپنا از سرِ نو جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے کیا امریکی کسی دوسری تہذیب کو اجڈ کہہ سکتے ہیں؟

ٹوئن اپنے ملک کے لوگوں کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں رہنے کے بجائے موت کی سزا کو ترجیح دیں۔ وہ مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کے لئے افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ جنھیں ایک جمِ غفیر نے فتح کر لیا ہے جو اپنے آپ کو امریکی کہتے ہیں اور یہ تصور کرتے محسوس ہوتے ہیں کہ انھیں اس بات پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔

کوئیکر سٹی کے ذریعے ٹوئن فرانسیسی بندرگاہ پر پہنچا وہاں سے ریل کے ذریعے بروقت پیرس پہنچا جہاں عثمانی سلطان کی آمد کے اعزاز میں نپولین سوم نے ایک پریڈ کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس واقعے نے ٹوئن کو ترکی سلطنت کے بارے میں اپنے تاثرات قائم کرنے کی بنیاد فراہم کی۔ کمزور فرانسیسی جابر حاکم کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے۔ ٹوئن نے عبدالعزیز کے خلاف گالیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

> ناٹا قد، سیاہ رنگت، کالی داڑھی، کالی آنکھیں، بے وقوف، ایسی حکومت کا نمائندہ جس کی تین عظمتیں ہیں ظلم، غارت گری اور خون بہانا۔ تاج و تخت کیلئے پیدا ہونا، کمزور، گنوار، جاہل، اپنے خادموں کی طرح بے وقوف، ایک بہت بڑی سلطنت کا سربراہ، جس کے ہاتھ میں لاکھوں لوگوں کی زندگیوں اور اموات کا اختیار، جو صرف کھاتا اور کھاتا چلا جاتا ہے جو سوتا ہے تو سوتا رہتا ہے، اپنی آٹھ سو بیویوں کے ساتھ سست، جو جنوں اور بونوں پر یقین رکھتا ہے۔ اور آج کے عظیم جادوگروں کے لئے

بہت کم احترام رکھتا ہے۔ ریل روڈز، سٹیم بوٹ اور ٹیلی گراف کی موجودگی
میں گھبراتا ہے۔

بطور طنز نگار اور سماجی تبصرہ نگار کے، ٹوین کے پاس لسانی اور مذہبی دھڑوں کے لئے اچھے الفاظ نہیں ہوتے تھے، اور اس کی مسلمانوں سے نفرت تو بے مثال ہے۔ وہ اللہ کے ان ماننے والوں کو گندے، ظالم، شقی، جاہل، توہم پرست کہتا ہے جو الف لیلہ کی جنگلی کہانیوں سے دھوکہ کھائے ہوئے ہیں۔ یہ باتیں اسلام کے خلاف امریکہ کا گہرا تعصب ظاہر کرتی ہیں۔ ٹوئن اصل میں مسلمانوں کو مشرقِ وسطیٰ کی اساطیر پر ایمان سے منسوب کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں ٹوئن پر صراحت سے واضح ہو جاتیں جب کوئیکر سٹی استنبول میں لنگر انداز ہوتا۔

اجنبی پن کے احساس نے ٹوین کو وحشت زدہ کر دیا۔ وہاں کی گلیاں ٹوین کو بھول بھلیوں جیسی محسوس ہوئیں اور لوگ پرانے پھٹے اور کچھ زرق برق لباس میں ملبوس تھے۔ اس نے وہاں قبرستانوں، مساجد اور جگہ جگہ دغا بازوں کی شکایت کی۔ تین ٹانگوں والی عورت، ایک ایسا آدمی، جس کی ایک آنکھ تھی اور وہ بھی گال میں تھی، بونا جس کے دونوں ہاتھوں میں سات انگلیاں تھیں، جس کے اوپر والے ہونٹ نہیں تھے، اور جبڑا ختم ہو چکا تھا۔ منفی صفات کی حد نہ تھی۔ اس بات نے ٹوین کی طبیعت مکدر کر دی۔ خاص طور پر ترکیوں کے حمام بہت مکروہ تھے جن کے وہ عرصے تک خواب دیکھتا رہا۔ کشادہ، ننگے اور اداس کر دینے والے تھے۔ جن میں کوئی رومان نہیں تھا۔ کوئی مشرقی حسن نہیں تھا۔ بازاروں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے، پھیری والوں اور حقہ پیتے شیوخ کے درمیان گھومتے ہوئے، وہ طلسم بھول چکا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا کہ ''تصویر میں کسی چیز کی کمی نہیں، یہ منظر، تمہیں بھولے ہوئے بچپن میں لے جاتا ہے اور تم دوبارہ الف لیلہ کے خواب دیکھنے لگتے ہو۔

مشرق وسطیٰ کے بارے میں ہر چیز کے لیے ٹوین کی نفرت، اس خطے میں گھومنے سے مزید گہری ہو گئی۔ دمشق کا شہر، جو اسے موتیوں کا جزیرہ لگتا تھا، اچانک اسے لگا کہ وہ گندگی کا ڈھیر ہے۔ جن شامی لوگوں سے اس کا پالا پڑا، وہ انسانی کیڑوں کی آماجگاہ تھے۔ وہ گندے غلیظ، پیلے چہروں والے، پھوڑوں سے بھرے اور ہڈیوں کے ڈھانچے تھے۔ عورتیں بدصورت تھیں۔ اس نے اپنے بدو رہنما اور ان کے مشکل ناموں کا تمسخر اڑایا۔

عربی زبان سے مایوس ہو کر، ٹوین نے ان کو فرگوسن اور ان کے قصبوں کو جونز بورو کہا۔ اس نے ناخوشگواری سے تسلیم کیا کہ صحرا کے ایک بیٹے کی جھلک، آپ کو ہمیشہ کے لیے رومان سے نکال دیتی ہے۔

ٹوین اور اس کے گروہ نے، عام امریکیوں کی طرح، شام سے فلسطین کا رخ کیا۔ ٹوین نے فلسطین کو تباہ حال، بنجر، خستہ اور ناامیدی کی زمین کہا۔ اس کے گاؤں گوبر کے اوپلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کی سڑکیں ٹوٹی پھوٹی اور خستہ تھیں۔ ٹوین نے کہا کہ اس خطے کے بارے میں ہونے والی شاعری کو جمع کیا جائے تو ضخیم مجموعہ ہوگا جسے آسانی سے جلایا جا سکتا ہے۔ ٹوین فلسطین کے نظاروں سے مایوس ہوا۔ اردن کے بارے میں اس کا اندازہ تھا کہ کسی امریکی گلی کا نصف بنتا ہے۔ گلیلی کا سمندر اتنا چھوٹا تھا کہ اس نے کشتی والے کو پار جانے کا کرایہ دینے سے انکار کر دیا۔ تین فلسطین صرف میسوری ریاست میں سما سکتے ہیں اور چوتھے کی جگہ بچ رہتی ہے۔

فلسطین میں ٹوین کی گستاخی بے حرمتی کرنے پر اتر آئی۔ یروشلم سے زیادہ بدنظمی اور کہیں نہیں تھی، یہاں کوئی تقدس نہیں تھا۔ شہر ماتمی اور مردہ تھا۔ ہر جگہ کوڑھ کے مریض، حرامی اور اندھے لوگ موجود تھے۔ وہ ان زائرین کا مذاق اڑا کر خوشی کشید کرتا محسوس ہوتا تھا۔ خاص طور پر پرسبائیٹرین عیسائی تو یہاں مقدس زمین کی رائگاں جستجو کرتے ہوئے آئے تھے جو، گندگی کا ڈھیر تھی۔

آخر میں جلا بھنا اور غصے میں آیا مارک ٹوین، مقدس سرزمین کے ویرانے اور فتنے کا سفر کرنے والے لوگوں کی تعریف کئے بنا نہ رہ سکا۔ ان زائرین نے سمندر میں محض اس سرزمین کو چومنے کے لئے سفر کیا۔ ٹوین نے استنبول سے چمڑے کی جلد والی بائبل خریدی اور پورے سفر میں اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ یروشلم سے اس نے اپنی ماں کے لئے بائبل کا ایک اور نسخہ خریدا۔ وہ اس اسرار، رائگانی اور گمبھیرتا کی نفی نہ کر سکا جو فلسطین میں اس پر حاوی رہی۔ میں وہاں کھڑا تھا جہاں خدا موجود رہا جو ندیوں اور پہاڑوں کو دیکھتا تھا اور وہ اسے دیکھتے تھے۔ میں ان مردوں اور عورتوں کے درمیان گھرا ہوا ہوں جن کے آباؤ اجداد نے اسے دیکھا اور اس سے روبرو باتیں کی تھیں۔

کوئیکر سٹی کے جفہ روانہ ہونے سے پہلے، اس پر نئے چالیس مسافر بزرگ، جوان، شادی شدہ جوڑے سوار ہوئے جو امریکی تھے۔ ان کے بارے میں ٹوین کا خیال تھا کہ انھیں شرمناک حد تک ان کے رہنما جان ایڈمز نے دھوکہ دیا ہے۔ یہ بھوک کے ستائے خستہ حال لوگ اس بات کی

علامت تھے کہ انھوں نے غلط فہم کے ساتھ مشرقِ وسطی کی جانب پیش قدمی کی۔اور خاص طور پر فلسطین کو درست طور پر نہیں سمجھا۔اس نے نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا کہ آج کی دنیا میں فلسطین کا کوئی وجود نہیں اور یہ خوابوں کی زمین ہے۔

ٹوین آخری بار مصر میں رکا جو تنزلی کا شکار تھا۔مسلم تہذیب کے خلاف زہر افشانی کرتے ہوئے اس نے زیادہ تر امریکی سیاحوں کو نشانہ بنایا جنھوں نے ہوٹلوں کو بھر رکھا تھا۔اور ان وحشی امریکیوں کو نشانہ بنایا جو پتھر توڑنے والے ہتھوڑوں سے ستونوں کے ٹکڑے توڑ رہے تھے۔اسکندریا کے بعد کوئیکر سٹی نے وطن کا رخ کیا۔مسافروں کے پاس بہت سامان تھا۔ایک آدمی کے پاس مالٹے کا درخت اور بیج تھے جس نے فلوریڈا میں اگایا تھا بہت سی ممیاں تھیں جو بعد میں عجائب گھر میں سجا دی گئی تھیں۔تمام امریکی 19 نومبر 1869ء میں نیو یارک میں اترے اور اس میں سب سے امیر زرخیز مارک ٹوین تھا۔اس سفر کے بارے میں اس نے جو کتاب لکھی اس کے سبب وہ امریکہ کا بہترین مصنف شمار ہونے لگا۔

اس نے جب The Innocent Abroad یا The new pilgrims Progress کے روزنامچوں کو مرتب کیا تو ان سے تین لاکھ ڈالر کی کمائی ہوئی۔ یہ سفر بمشکل حج تھا۔اس کا عنوان بہت طنزیہ تھا۔قارئین اس تضاد کو کبھی نہ سمجھ پائے جسے اس نے اخلاص کی نجیل کہا۔جس طرح ٹوین کے ابتدائی سوانح نگاروں نے اسے سمجھا۔پچاس سال پہلے بربری جنگوں نے امریکیوں کو خود کو سمجھنے اور اپنے کردار کو متعین کرنے میں مدد دی تھی۔اب ایک وسیع خونی جنگ کے بعد،مشرقِ وسطی میں،ایک امریکی اس تعریف کو کہیں بہت زیادہ اچھا اور کہیں سیاہ کر چکا ہے۔

The Innocent Abroad کی اشاعت نے ٹوین کا مستقبل مصنف بنا دیا۔وہ ایک کامیاب ناول نگار،مضمون نگار اور سماجی تبصرہ نگار کے طور پر سامنے آیا۔وہ خود پبلشر بن گیا لیکن اس نے دوبارہ کبھی اس خطے کے بارے میں کچھ نہ لکھا۔اس نے ایک مزاحیہ کہانی شروع کی جس میں ایک امریکی مسلمان ہو جاتا ہے اور مسیسی پسی میں اپنا ایک حرم قائم کرتا ہے لیکن یہ کبھی مکمل نہ ہوئی۔

مارک ٹوین نے امریکیوں کی مشرقِ وسطی میں داستاں خیالی کو کا مذاق اڑایا۔لیکن مشرقِ وسطی کی داستاں خیالیوں کو ختم نہ کر سکا۔26 ستمبر 1872ء میں Ancient Arabic Order of the Nobles of Mystic Shrine کے افتتاح پر انھیں خوب ہوا دی گئی۔جس کی بنیاد ڈاکٹر فلیمنگ والٹر

سول وار کا سابقہ سرجن اور اداکار بلی فلورینس نے رکھی جس نے قاہرہ اور الجزائر میں اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ان کا پہلا معبد مکہ تھا جس میں داخل ہوتے ہی ایک دوسرے کو السلام علیکم کہہ کر ملتے تھے اس تنظیم کا ابتدائی مقصد تفریح تھا لیکن جلد ہی اس کے پانچ لاکھ ممبر بن گئے تھے۔

اس دور کے امریکی عوام میں مشرقِ وسطی کے بارے میں یہی نظریات غالب رہے۔1876ء میں فلاڈلفیا میں منعقد ہونے والی نمائش میں سب سے زیادہ پرکشش مصر سوڈان کا خیمہ تھا جس کے بینر پر تحریر تھا کہ دنیا کے قدیم لوگ،نوجوان قوم کو سلام صبح کہتے ہیں۔ناظرین نے وہاں فرعون کے معبد کا ماڈل اور مصری کپاس کے دو سو نمونوں کو دیکھا۔ترکی کے خیمے کی طرف جاتے ہوئے وہ تلخ کافی کے گھونٹ لیتے اور ان سے اصل عثمانی اشیا جیسے قالین،تلواریں خریدتے تھے۔ The Innocent Abroad کے طنز پر ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو عربی میں خوش آمدید کہتے ہوئے امریکی ابھی مشرقِ وسطی کے سحر میں مبتلا تھے۔اساطیر کا شہر ان کے ذہنوں میں قائم رہا۔

حیاتِ نو:

امریکی اب قیاس کرنے کے متحمل ہیں: ایک اذیت خیز انشقاق کے بعد دوبارہ متحد ہو کر وہ وہ دوسرے صنعتی انقلاب کے کنارے کھڑے ہیں،جو کے پہلے سے کہیں زیادہ زور آور اور بڑا ہے۔ صنعتی پیداوار کا یہ تہلکہ مشینوں،تیل،اور کپڑے کی درآمدات میں ان کو دنیا کے سامنے پیشوا بنا کر کھڑا کر دے گا۔خانہ جنگی کے بعد آنے والی دہائیوں میں ملکی آبادی میں مہاجرین کی آمد سے 40 فیصد تک اضافہ ہوا جس کا پھیلاؤ 37 ریاستوں تک گیا،اتنے وسیع پھیلاؤ کے باوجود امریکی عوام 0.25 ملین سے زیادہ ریلوے لائینز،ٹیلی گراف لائینز اور 1880 تک قریب 133000 ٹیلیفونز کے ذریعے رابطے میں ہیں۔سٹیل کی پیداوار میں امریکی کارخانے عالی حوصلگی سے یورپی کارخانوں کے قریب آرہے ہیں اور اپنی پیداوار کا ایک بڑا حصہ جنگی ہتھیاروں پر لگا رہے ہیں۔ایندھن کے اس اسراف کو شمالی امریکہ بمشکل ہی سہہ پائے گا،اور اب، جب کہ مغربی سرحدیں خاصی مقرر ہو چکی ہیں،ملکی توجہ مرکزی امریکہ، Pacific اور Far East پر ہوگی۔فرانس اور برطانیہ اتحاد میں ایک اہم قوت نہ ہونے کے باوجود امریکہ بین الاقوامی امور میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مشرقِ وسطی میں امریکہ روایتی آزادی کے پیشوا کا کردار، اقلیتوں کے حقوق کی علم برداری اور یونان یا ہنگری جیسے صوبوں کی آزادی کے لئے کردار ادا کر رہا ہے۔ اپنے قومی وقار کی اتنی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد امریکی عوام خود کو اس بات کا حقدار بلکہ ذمہ دار سمجھتے ہیں کہ دوسروں کے لئے ان فوائد کو محفوظ کریں نیز، ایسا کرنے کے لئے عسکری اور معاشی پشت پناہی بھی ان کو حاصل ہے۔

نصف چاند کی سلطنت میں ستارے اور دھاریاں:

اگرچہ اس بارے میں پر دستاویزی رکارڈ مبہم ہے، مگر امریکیوں کی عربیوں کو آزادی اور خودمختاری دلانے کی پہلی کوشش 1868 کو ملک شام میں سامنے آئی جب خانہ جنگی کے آزمودہ کاروں نے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت میں 80 غربیوں کی قیادت کی۔ بندوقوں اور توپوں سے مسلح باغی شام کے شہر ہما کے قریب عظیم عثمانی قوتوں سے ٹکرا گئے۔ وہ جنگجو جابر تھے، اور جب باغیوں کے اونٹ مارے گئے تو Romer اور Lamar کو قیدی بنا کر خفیہ اندھیری کوٹھڑیوں میں دھکیل دیا گیا، اور پھر انہیں زنجیروں میں جکڑ کر استنبول بھیج دیا گیا جہاں کئی مہینوں تک وہ سلاخوں کے پیچھے سڑتے رہے۔ دمشق کے نائب Johnson J.Augustus کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ سانحہ مشرقِ وسطی کو تاثر دے گا کہ امریکیوں کی ہمدردی جابرانہ حکومتوں کو تہہ و بالا کرنے کی کاوشوں سے اور ان کو بغاوت پر اکسانے سے ہے۔ جس کے برعکس یورپی قوتوں پر جونسن نے یہ پرزور تاثر جمایا کہ اس علاقے میں امریکہ کا مقصد انسانیت ہے نا کہ سیاسی مصلحت اندیشی۔

جونسن کی اس تنبیہ سے امریکیوں کے آزادی کے علمبردار ہونے کے تاثر کو تقویت ملی۔ 1860 کے آخر تک قومیت کی حامی طاقتوں، جو کہ Crete کے جزیروں پر مصروفِ جنگ تھیں، کانگریس سے عسکری امداد کی اپیل کر رہیں تھیں۔ اپنے واجب التعظیم لیڈر بہا اللہ کی مدد کے لئے بغدادی بھائیوں نے امریکہ کی طرف دیکھا کہ وہ انہیں ترکی جلاوطنی سے بچائے۔ واشنگٹن سے اس دوران مشرقِ وسطی، فلسطین، فارس اور شمالی افریقہ کی مجبور یہودی برادریوں کے لیے تفکر کا اظہار ہوتا رہا۔ صدر Rutherford نے 1880 میں کانگریس کو بیان دیا کہ امریکہ نے مراکش کے

سلطان پر یہودیوں کے حقوق کے لئے دباؤ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، اور اب اس کا دارومدار امریکہ پر ہے، جو کہ آزادی اور مساوات کا اولین علمبردار ہے کہ قسمت کے مارے یہودی سر اٹھا کر جی سکیں۔ کاسابلانکا کے یہودیوں کا کہنا تھا کہ امریکی دھاریاں اور ستارے نصف چاند کی سلطنت میں جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ بیت المقدس کے رہنماؤں کا بیان ہے کہ متحدہ ریاست چنیدہ افراد کے لئے جگہ ہمیشہ مقدس رہے گی۔ مشرقِ وسطی کی تنگ نظری کا شکار ہونے والوں کے لئے امریکہ خاص طور پر بلغاریہ کے لئے فکرمند ہے، اگرچہ اسے مشرقِ وسطی کا حصہ کبھی نہیں سمجھا گیا مگر بلغاریہ بہرحال عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا کہ جب 1876 میں ترکی افواج نے قریب 15000 عیسائیوں کا قتلِ عام کیا تھا، اور اس حماقت کی تفتیش کرنے کے لئے Eugene Schuyler کو جو کہ ترکی کے مترجم اور پہلے Ph.D تھے صوفیہ اور اس کے مضافات میں بھیجا گیا تھا۔ "Paniguischte میں سپاہیوں کے ہاتھوں 3000 افراد کی ہلاکت" 14 اگست کو Schuyler کے ایک اخبار میں یہ واقعہ یوں پڑھنے کو ملا۔ اس ہی کی وضاحت MacGahan نے جو کہ عام سے مختلف امریکی تھا یوں کی کہ "تقریباً تمام خواتین یہاں تک کہ نوجوان لڑکوں اور بزرگوں کی عصمت دری کی گئی"۔ MacGahan کی اشاعتِ ثانیہ کے مطابق "سینکڑوں کی تعداد میں خواتین اور بچوں کی باقیات، اور دوشیزاؤں کے اجسام، جن کی عصمت دری کرنے کے بعد انہیں قتل کیا گیا چرچ میں پائے گئے" MacGahan کی شہادت جہاں عالمی رائے کو ترکی کے خلاف کرنے میں کارگر ثابت ہوئی وہاں اس نے روسیوں کو 1878 میں جرمنی پر حملہ کرنے کی ہمت بھی فراہم کی، یہ وہ جنگ تھی جس میں MacGahan اپنی جان سے گیا۔

14 اگست 1873 کو سلطنتِ عثمانیہ نے مشرقِ وسطی کا پہلا سفارت خانہ واشنگٹن میں اس وقت کھولا کہ جب امریکی جنگی جہاز استنبول پر مسلسل آگ برسا رہے تھے۔ ریاست ہائے متحدہ نے 67000 ڈالر مالیت کی افیون، مرچ، اور متفرق اشیاء سلطتِ عثمانیہ سے درآمد کی اور ان کو ۵.۴ ملین ڈالر مالیت کے تیل اور عسکری ساز و سامان کے ساتھ برآمد کیا۔ Cyrus Hamlin نے انکشاف کیا کہ ترکی کو اب Rhode Island اور New Heaven سے اسلحہ فراہم کیا جاتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ اپنے اثر کو دیگر دور دراز علاقوں تک بھی بڑھاوا دے رہی ہے دسمبر 1879 کو USS Ticonderoga نے Hormuz سے گزر کر خلیج فارس میں داخل ہونے والے

پہلے امریکی بحری جنگی جہاز ہونے کا اعزاز حاصل کیا جس کو اس سے پہلے بلاشرکتِ غیرے برطانوی جھیل سمجھا جاتا تھا، اور ۶۰ میل کا سفر طے کر کے یہ کشتی بصرہ کی بندرگاہ تک پہنچی امریکی طاقت کے اس دکھاوے کا مقصد محض نئی منڈیوں تک رسائی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر امریکی نظریے کی ترویج تھا ''دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں قوت کا مادی ظہور، شائستہ اقوام کے علم کی ترویج کے لئے اتنا اہم ہو،'' یہ وہی رابرٹ ولسن تھا جس نے اس سے پہلے بھاپ سے چلنے والی Quacker City کی کپتانی کی تھی۔

مشرقِ وسطی پر حق جتانے کی امریکی صلاحیت 1881 میں پیش آنے والے مصلحت انگیز سانحے سے سامنے آئی جس نے ممکنہ قحط کو جِلا دی۔ یہ سانحہ استنبول میں سلطان کے محل میں پیش آیا جہاں Lew Wallace اپنے دستاویزات، نئے امریکی سفارت کار کے طور پر پیش کرنے آیا تھا Wallace حیران کن طور پر سابقہ حلیف کمانڈر کو تبدیل کر چکا تھا جو اپنے ترکی میزبانوں پر اثر جمانے میں ناکام رہا تھا، اور اپنے عہدے پر کامیاب رہنے کے لئے کوشاں تھا، لیکن محل میں داخلے کی اجازت ملنے کی بجائے اس کو برآمدے میں منتظر رہنا پڑا، اور یہ بداخلاقی وہاں کا معمول تھی۔ اس کے مترجم نے مغربیوں کو ان کا مقام باور کرانے کے لئے واضح کیا:

کتابی عینک، اور مونچھوں کے باوجود یہ ایک جلالی وضع رکھنے والے Wallace نے کئی خونی جنگیں لڑی تھیں اور میکسیکو کے نئے گورنر ہونے کی حیثیت سے اس نے بیلی کیڈ کو بھی کھوج نکالا تھا۔ اور اس بہادری کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے مذہبی عقائد کی پختگی کا بھی اظہار کیا، عقائد کی یہ پختگی اور ذہن رسا تخیل کے ملاپ سے ہی اس نے Ben-Hur جیسا مشہورِ زمانہ ناول تحریر کیا، وہ عزت کرنے اور کروانے کا قائل تھا۔ نہ کہ اس بے قدری کا۔ حالتِ جنگ ہی کی طرح وہ محل کے دربانوں کو دھکیل کر تیر کی طرح سلطان تک جا پہنچا۔ اپنے پیش رو، عبدلمجید اور عبدلعزیز کے برعکس، موجودہ سلطان عبدالحمید دوم مغرب کے بارے میں انتہائی تشکیک اور قدامت پسندی کا شکار تھا۔ اس نے آداب بجالاتے قاصد کو جو اپنے آقا کی گستاخی کی معافیاں مانگ رہا تھا نظرانداز کیا اور اس بن بلائے مہمان پر قہر آلود نگاہ ڈالی، اس دوران Wallace اپنی جگہ تنا کھڑا رہا اور کئی ساعتیں یوں ہی گزر جانے کے بعد سلطان کی چڑھی ہوئی تیوری، دوستانہ تبسم میں تبدیل ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر Wallace کو اس بے باکی کی داد دی اور اس امریکی سے مصافحہ کیا۔

Wallace کو مشرقِ وسطی میں عثمانی اقدار کے خلاف احتجاج کرنے اور امریکی جوہر کو نمایاں کرنے کے کئی مواقع مل سکتے تھے۔ انیسویں صدی کی بقایا دہائیوں میں اس علاقے میں امریکی بڑھوتری کو اصل خطرہ یورپیوں سے رہا، نہ کہ دربارِ خلافت سے۔ خالصتاً یورپی کرہ پر اس پردیسی مداخلت کی خلش کے سبب یورپی قوتیں ہر طرح سے سلطنتِ عثمانیہ میں امریکی بڑھوتری کو روکنے کے در پے تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی اور اسی مزاحمت کی چاشنی مصر میں ملی، جہاں یورپیوں نے امریکیوں کی مشرقِ وسطی کی ایک یادگار حاصل کرنے، اور اپنے امریکی باشندوں تک پہنچانے کی کوشش کی مخالفت کی۔

عالمی سطح کی فیاضی:

William H. Vanderbilt کے علاوہ کوئی امریکی نہیں تھا جو مارک ٹوائن کے سنہری دور کی تجسیم کا اہل تھا جس میں دولت اور امید کا حصول ممکن تھا۔ ان اعزازات سے متاثر ہو کر جو مصر نے Grant کو پیش کئے تھے، اور یہ جان کر کہ لندن پیرس روم قدیم مصری مجسمے حاصل کر چکے ہیں، Vanderbilt نے نیویارک کے لئے بھی درخواست کی، جو منظور کی گئی اور اسکندریہ میں علی فرمان کو اس کے متعلق احکامات جاری کر دیئے گئے۔

فرمان نے خدیو کو مطلع کیا کہ ''ریاست ہائے متحدہ کی آبادی 50 ملین کو پہنچ رہی ہے، اور وہ وقت دور نہیں جب یہ تعداد دوگنی ہو جائے گی'' قونصل نے وضاحت کی کہ ان میں سے کئی آخرش نیویارک کا رخ کریں گے، ''کیا وہاں ایک ستون قائم ہونا چاہیئے، جس سے وہ اپنی قدیم تاریخ کے بارے میں کچھ سیکھ سکیں، اور یہ ریاست ہائے متحدہ کے باشندوں کے لئے ظلِ سبحانی کا ایک تحفہ تھا''۔ فرمان کا ایک چالیس سالہ دوست تھا جو Amherst سے تعلیم یافتہ تھا، چوڑی پیشانی اور فلسفیوں کی سی گھنی داڑھی اور باشعور آنکھیں رکھنے والا فرمان تیس سال امریکیوں کے ساتھ افریقی غلاموں کی ان کے مصری آقاؤں سے آزادی کے لئے کوشاں رہا تھا۔ فرمان اسماعیل کے تعلقات استوار کرنے میں بہر حال کامیاب رہا تھا اور اسے Vanderbelt کی درخواست اسماعیل تک پہچانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ قونصل کے مطابق ریاست ہائے امریکہ کے ذہن میں

دو مجسمے تھے، ایک Luxor میں اور دوسرا Karnak میں۔

امریکی افسروں اور معلموں کے احسان مند، جو مصری دفاع اور فلاح و بہبود میں مددگار تھے اسماعیل نے جو کہ یورپیوں کا ادھار اتارنے کا خواہاں تھا فوراً سرِ تسلیم خم کیا۔ اس نے ایک مجسمے کا ذکر کیا جو کہ Luxor اور Karnak کے مجسموں سے بہتر تھا۔ یہ تین ہزار سال قدیم یادگار تھی جو کہ اسکندریہ میں Caesar کے مزار میں آراستہ تھی اور Cleopatra's Needle کے نام سے مشہور تھی۔ اسے کسی قیمت کے بغیر وصول کیا جا سکتا تھا۔ بقول اسماعیل یہ ریاست ہائے متحدہ اور خدیو کی دوستی کی ایک اور نشانی ہے۔

اس پیشکش کی خبر امریکہ پہنچی۔ یہ بلاشبہ عمدہ یادگار تھی جو تاریخی حوالے سے بھی ان مجسموں سے بہتر تھی جو برطانیہ اور فرانس کو دیئے گئے تھے۔ اور اس کا نیویارک پہنچنا ایک تاریخی امر تھا صدر نے اس بات کا والہانہ اظہار کیا کہ ''پوری قوم کے لئے یہ تحفہ عالمی تحسین کا مظہر ہے۔''

بعد ازاں برطانوی اور فرانسیسی اس بات پر بضد رہے کہ مصریوں کے تمام تر اثاثے اس قرضے کے عوض ان کے پاس گروی ہیں جو اسماعیل نے ان سے لیا تھا۔ فرمان نے مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ یورپیوں کے لئے نہیں کہ جن کے اثاثے قدیم مصری خزانوں سے لبریز ہیں اور کہا یوں جانا چاہیئے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ریاست ہائے متحدہ تک نہیں جانی چاہیئے''۔ اس بارے میں ریاست ہائے متحدہ کے عوام نے بھی ناراضگی کا اظہار کیا۔ New York Herlad نے تنبیہہ کی کہ ''ہم پر انگلی اٹھانے میں تب تک کوئی بڑائی نہیں ہے جب تک ہمیں ہمارا مجسمہ مل نہیں جاتا''۔

مصر کے داخلی معاملات سے اس دوران میں یورپی مداخلت سے اسماعیل کو بے دخل کرنے کا مطالبہ طول پکڑ گیا۔ آخر کار حاکم کو خدیو کے نام لکھا گیا خط موصول ہوا جس میں اس کی دستبرداری کی اطلاع تھی۔ دھیمے لہجے کے اس واہمے کو، جس نے مصر کو آزاد مغربی طرز کے ملک ہونے کے خواب دکھائے تھے، جس نے تھیٹر اور نہریں بنائی تھیں، جو امریکی افسروں کو فوج میں جدت لانے کی غرض سے لے کر آئے اس کے زیادہ دھیمے اور نرم مزاج کے بیٹے، توفیق سے تبدیل کیا گیا۔ اور اس سے امریکیوں کے مجسمہ حاصل کرنے کے امکانات بھی ختم ہو گئے ۔ بہر

کیف Vanderbitl نے یورپ کے اشاروں پر رقص کرنے سے انکار کر دیا، اس نے سابقہ بحری افسر Henry Honeychurch Gorringe کو ان ہدایات کے ساتھ اسکندریہ روانہ کیا کہ وہ تمام رکاوٹوں کو ختم کر کے فوراً سے پیشتر مجسمہ حاصل کرے۔

Vanderbilt کی طرح Gorringe بھی اختراعی ذہن کا مالک اور روشن خیال تھا اس نے بھی نئے امریکی دور کی تجسیم کی۔ اس نے سول وار کے زمانے میں فوج میں کمیشن لیا اور لفٹیننٹ کمانڈر کے عہدے تک پہنچا۔ USS Gettysburg جہاز کا کپتان ہونے کی حیثیت سے یولیسز گرانٹ Ulysses Grant کو مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر لے گیا۔ وہ بھی میسنز Masons کا بہت پر جوش کارکن تھا اس نے بھی مشرقِ وسطیٰ کی قدیم یادگاروں اور مقبروں سے گہری لگن کا اظہار کیا۔ اکتوبر 1879ء میں مصر پہنچ کر اس نے اگلے نو ماہ 50 ٹن وزنی مجسمے کو نکالنے کی سخت محنت کی۔ اس نے 100 مقامی مزدوروں اور اوزاروں کی مدد لی جو کبھی بروکلن کے مشہور پل کے لئے استعمال ہوئے تھے۔ اس نے مجسمے کے گرد 1730 گز میں کھود ڈالی۔ اس مجسمے کو زمین پر کھینچ کر ایک دخانی مصری جہاز پر ایک سانچے میں رکھا گیا جو اسی مقصد کے بنایا گیا تھا اس پر ایک لاکھ ڈالر خرچ ہوئے جس کا انتظام Vanderbilt نے کیا۔ جولائی 1880ء میں مجسمہ سفر کے لئے تیار تھا۔

The New-York Herland کے مطابق ''کسی بھی شہر کا مصری مجسمے کے بنا خوشی کی امید رکھنا نری حماقت ہے''نیویارک کی بندرگاہ پر آتشبازیوں سے اس کا استقبال کیا گیا جہاں سے اس کو 32 گھوڑوں کی مدد سے شہر بھر میں پھرایا گیا نیویارک کے بیس ہزار باشندے Graywacke Knoll پر بے صبری سے مجسمے کے منتظر تھے۔

امریکی بورڈ کے سکریٹری کا بیٹا Evarts جو ایک متقی، اور مشرقِ وسطیٰ کا شدید حامی تھا، عوام سے خطاب کرنے کے لئے اٹھا، اس کا لہجہ اس بار مذہبی کم اور فلسفیانہ زیادہ تھا۔ لوگوں کے ہجوم پر نظر دوڑاتے ہوئے اسؑ نے کہا کہ ''کیا ایسا کوئی ملک بھی ہے جو خواہ وہ مجسمے کو خریدنے کی سکت بھی کیوں نہ رکھتا ہو، زوال کو روک سکتا ہے، کیا آپ ہمیشہ خوشحالی کی امید رکھتے ہیں، کیا آپ دولت کے کافی ہونے کی، انسان کے کبھی نہ مرنے کی امید رکھ سکتے ہیں''۔

Evarts کی شاہانہ آواز ہجوم کے شور اور خوشیوں میں دب گئی، لوگ ان تاریخی باتوں سے

زیادہ ان لمحات کی مسرت میں محو تھے۔ان کی توجہ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں ملکی کامیابی پر زیادہ اور آئندہ پر کم تھی۔خانہ جنگی کے دل گرفتہ ہو جانے والے امریکی ایک بار پھر متحد ہو کر دنیا میں نمایاں ہو رہے تھے۔باقی دنیا کی طرح مشرقِ وسطی میں ریاست ہائے متحدہ ایک عظیم معاشی اور عسکری قوت سمجھی جا رہی تھی۔اب یورپی اقوام امریکیوں کے اپنے مفاد حاصل کرنے کی کوشش اور وہاں کے حکام سے تعلقات بنانے سے روکنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔آتشبازیوں کے شور میں مجسمے کو اس کے ستون پر رکھا گیا اور اس مجسے کو مشرق کے رخ پر کھڑا کر دیا گیا۔

حصہ چہارم

سامراجی عہد

طلوعِ سلطنت

11 جولائی کی صبح، اسکندریہ کے باشندے بحیرہ روم کے افق پر ابھرنے والا زشت رو خاکہ دیکھ سکتے تھے۔ یہ سراب منظر جلد ہی منکشف ہوا اور متجسس لوگوں کا مجمع بندرگاہ کے گرد یہ نظارہ دیکھنے اکٹھا ہوگیا۔ کسان، منشی، تاجر سب ہی اس عفریت کو بندرگاہ کے نزدیک منڈلاتا دیکھ رہے تھے، جبکہ سپاہیوں کی پلٹنیں اپنی توپوں کے پاس سرک آئی تھیں۔ ان میں کئی جان گئے تھے کہ مشرقِ وسطیٰ نہیں تو کم از کم ان کی قوم کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ سیاسی انقلابات کے آتش فشاں، جنھوں نے مصر کے وقار اور آزادی کے خواب کو نگل لیا تھا اب پھٹنے والے تھے۔

تین برس میں حالات سخت تناؤ میں آچکے تھے۔ اس عرصے میں یورپی قوتوں نے مصر کے دیوالیے کا اعلان کر دیا، خدیو اسمعیل کو ہٹا کر ایک لچکیلے شخص توفیق کو لا بٹھایا۔ مصر میں اس ظاہری مداخلت نے حزبِ اختلاف کو بھڑکا دیا جو کہ بڑھتے ہوئے مصری قوم پرستوں پر مشتمل تھی جس کی قیادت چوڑے نتھنوں والا عرابی کر رہا تھا جو مقامی طور پر اعلی عہدے پر فائز تھا۔ مصر صرف مصریوں کے لئے ہے کی قسم اٹھاتے ہوئے اس نے ترک اعلی افسروں کو نکال دیا جو ابھی تک فوج کو کنٹرول کرتے تھے۔ اس نے مصر کو غیر ملکی قرضوں سے آزاد کروایا۔ خدیو اور اس کے یورپی اتحادیوں نے عرابی کو گرفتار کرنے کے لئے بہت سازشیں کی۔ کرنل عرابی کو خاموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ 1822ء تک اسے خدیو کو ہٹانے کی وجہ سے دھمکیاں ملنے لگیں عرابی کی حمایت میں قاہرہ اور اسکندریہ میں مظاہرے ہونے لگے جو سویز کینال تک پھیل گئے۔ مصر میں اپنے ہم وطنوں کی حفاظت اور بہت قیمتی نہرِ سویز کی حفاظت کے لئے، برطانوی مداخلت کرنے کو تیار ہو گئے۔

مصر کے ساحل سے بھاری بھرکم وجود، جولائی کی صبح واضح نظر آنے لگے۔ برطانوی جنگی بیڑے قریب آنے لگے۔ تقریباً صبح ساڑھے چھ بجے گودی روشنیوں سے جگمگانے لگی چند لمحوں کے وقفے کے بعد اسکندریہ شہر دھماکوں سے گونجنے لگا۔ شاندار باغات تباہ ہو گئے گودی پر جمع ہونے والے تماشائی بکھر گئے اور شہر کی بھری گلیاں خالی ہو گئیں لیکن مصری فوج نے جگہ سنبھال لی۔ اسکندریہ اس بمباری کے آگے نہ ٹک سکا۔ ساحل پر موجود فوجی دستے خاموش ہو گئے۔ اسی دن 5:30 بجے شام جنگ ختم ہوگئی اور مصر پر بہتر سالہ برطانوی قبضے کی ابتدا شروع ہوگئی۔

جذباتی سرمایہ:

مصر پر حملہ سامراجی عمل میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا، جس کی وجہ سے فرانس اور برطانیہ کے حصے میں کئی ملین مربع میل زمین کا حصہ آجاتا جو پوری زمین کا ایک تہائی تھا۔ زمین کے ایک بڑے حصے پر یورپی تسلط اور اور بہت سے لوگوں نے امریکہ کو بنیادی طور پر مشکوک قرار دیا۔ اگر یونان کی جنگِ آزادی کے دوران میں ترکی کے ساتھ جنگی مفادات اور اپنی جمہوری اصولوں میں سے کسی ایک کو چننا پڑا تھا تو اب انھیں اپنے دو میں سے کسی ایک عقیدے، مقدس یا شہریات کو چننا تھا۔ کیا انھیں اپنے مخالف زوال آمادہ اسلام کے خلاف عیسائی یورپ کا ساتھ دینا چاہیے یا کالونیل ازم کے شکار لوگوں کا، وہ کالونیل ازم جس سے امریکہ نے خود آزادی حاصل کی۔ کیا مشرقِ وسطیٰ میں آزادی کا علمبردار امریکہ یورپ کو ایسے وقت میں بے جھجک رد کر دے گا کہ جب امریکہ خود کو ایک برِاعظم کی حیثیت سے سامنے لا رہا ہے اور Caribbean اور pacific میں علاقوں کا متمنی بلکہ حریص ہے۔

امریکہ ان دہلا دینے والے سوال پر 1829 سے غور کر رہا تھا جب فرانسیسی الجزائر پر حملہ آور ہوئے تھے۔ ڈیوڈ پورٹر نے جس پر امریکی قونصل کی ذمہ داری تھی، فرانسیسیوں کو اپنی خدمات دینے سے انکار کر دیا تھا، کو استنبول کا وزیر مقرر کر دیا گیا۔ Porter کی جگہ Henery Lee کو دی گئی، جو کہ ایک محبِ وطن انقلابی کا پوتا تھا۔ نئے قونصل کے پاس ان فرانسیسیوں کے لئے تکریم و تعظیم تھی جو امریکہ کی طرف سے واشنگٹن میں لڑے تھے اور الجزائر کے قزاقوں کے لئے نفرت۔ Lee کے مطابق اس کے لئے اس سے زیادہ فخر آمیز منظر کوئی نا تھا جب اس نے فاتح عیسائی سپاہیوں کو

جابرخانہ بدوشوں کو اپنے آگے دھکیلتے ہوئے دیکھا۔

اگلے پچاس سالوں میں یورپیوں کا مشرقِ وسطی کے حصوں پر قبضہ جمانا امریکوں کی رائے کی تشکیل کرتا گیا۔ امریکی مہمانوں کی یادیں اس علاقے میں اس سلطنتِ عثمانیہ کو توڑنے اور اسے برطانیہ اور فرانس میں تقسیم کرنے کی حمایت کے ساتھ تازہ تھیں، امریکیوں کی یہ شدید خواہش تھی، ان میں سے کئی کو یورپی قونصل کی حمایت حاصل تھی، جو شاہی طاقتوں کو خداداد مانتے تھے۔ Jonas King نے مصر میں برطانوی اثر اور جنوب میں فرانس کی بے جا، مُداخلت کے بارے میں کہا کہ، ''یہ سب اسی ہاتھ کا کرشمہ ہوسکتا ہے جو دنیا کو گھماتا ہے''۔ مگر جب امریکیوں نے کھلے بندوں مشرقِ وسطی میں یورپ کے داخلے کی حمایت کی اس کو کچھ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ کمانڈر Richard J.Hinton نے بیان دیا کہ ''ایشیا کی حیاتِ نو میں ریاست ہائے متحدہ کو اس کی قیادت کرنی ہوگی، ہم اپنی یورپی بھائیوں کے نقشِ قدم پر نہیں چل سکتے''۔ Reverend George Potts نے مشرق میں یورپ کی اس خونی فتح کو ''قومی گناہِ عظیم'' کہا جو خوف ناک سزا کا مستحق ہے۔ نومبر 1852 کو New-York Times کو دئے گئے ایک انٹرویو میں اس نے امریکیوں کو یاددہانی کروائی کہ ''وہ ایک خداپرست قوم ہیں انہیں دوسری اقوام کے ساتھ پڑوسیوں جیسا سلوک کرنا چاہیئے، اور یورپ کی لالچ کو شہ نہیں دینی چاہیئے''۔

انیسویں صدی کے آخر میں، مشرقِ وسطی کے شاہی نظام کی طرف امریکی محبت اور نفرت کا ملا جلا جذبہ اور گہرا ہوا جب یہ علاقہ سیاسی بھونچال کا شکار تھا۔ یورپی اس مشرقی سوال میں الجھے رہے کہ آیا یورپ کے ''بیمار لوگوں کو''، وہ ترکوں کو اس ہی نام سے بلایا کرتے تھے، بچا لیا جائے یا اس کو ٹکڑوں میں بٹنے دیا جائے۔ قبرص سے بلقان تک قوم پرست تحریکیں عثمانی حکومت سے آزادی کے لئے کوشاں تھیں۔ تقسیم کو روکنے یا کم از کم ٹھیک سے سمجھے کے لئے دونوں عظیم طاقتیں 1878 کو برلن میں ملیں، جس کو قبرص سونپا گیا، روس نے بلغاریہ اور سربیا کو آزادی دلوائی۔ کچھ عرصے کے لئے بین الاقوامی صورتحال سنبھلتی دکھائی دی۔ جرمنی نے استنبول کو عسکری امداد بھیجنا شروع کردیں اور اطالوی لیبیا پر اپنا حق جماتے رہے۔ محض تین ہی سال بعد برلن معاہدہ ٹوٹ گیا جب 1881 میں فرانسیسی افواج الجزائر سے گزر کر تونس پہنچ گئیں اور پورے ملک کی امانت دار بن بیٹھیں۔

تونس میں امریکی قونصل کے George Washingtn Fish نے جو، پینسٹھ سالہ سابقہ فوجی سرجن تھا اور اپنی بیوی اور دو بچوں کی موت کے بعد سیاسی حکمتِ عملی کی طرف آیا تھا، اس خدشے کا اظہار کیا کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی یہاں قیام کی نیت سے آئے ہیں''، بیوی بچوں کی موت نے اسے کمزور تو کردیا تھا مگر فرانسیسی افواج کی اس پرامن شہر میں غارت گری نے اس پر گہرا اثر ڈالا اس کے مطابق فرانسیسی اس حکومت کو اپنے مفاد کو لئے استعمال کررہے تھے۔ امریکی رویہ اس کے برخلاف تھا، اخبارات کا کہنا تھا کہ جب بھی کوئی ملک جس کی حکومت میں بدنظمی ہو، یورپ کی حکومت میں آتا ہے اس کے عوام کو فائدہ ہوتا ہے۔'' Harprer کے رسالے میں تو یہاں تک کہا گیا کہ اس اچانک تبدیلی نے بہترین ماضی کی یاد تازہ کردی''۔

الجزائر اور تونس پر فرانسیسی قبضہ کے بارے میں امریکی ردِعمل تضاد کا اور مصر میں برطانیہ کے لئے کسی حد تک یکسانیت کا شکار تھا۔ شمالی افریقہ کے برعکس مصر نے کبھی امریکہ سے جنگ نہیں کی تھی اور دونوں کے تعلقات ہمیشہ سے اچھے تھے۔ جبکہ برطانہ سے اس کے دو جنگیں ہوچکی تھیں۔ دوسری طرف ریاست ہائے متحدہ، چند تعلیمی اداروں میں تھوڑی سی دلچسپی کے ساتھ مصر کو برطانوی میدان سمجھتا تھا۔ امریکہ نے برطانیہ کے خلاف مصر کی مدد کرنے سے ہر بار انکار کیا۔ 1870 کو ولیم ہنٹر نے بیان دیا ''مصری قرضوں کو اپنے ذمے لینا نری حماقت ہے، امریکہ کا ایک بھی شخص اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا''۔

اسکندریہ کی بمباری نے ایک بار پھر شاہی نظام کی طرف امریکی ہمدردی کو جگایا۔ نیویارک سے Philip Scaff نے برطانوی حملے کو ''مہتاب پر صلیب کو فتح''، سے تعبیر کیا۔ جبکہ Los Angeles Times سے اسے نری بربریت قرار دیا Ulysses Grant نے پیش گوئی کی کہ ''برطانیہ مصر کو نیگرو غلاموں کی طرح بری کردے گا''۔ جبکہ گرانٹ وارٹائیم اور میجر جنرل ایڈم نے اس حملے کی مذمت کی۔ اس افراتفری کی بدترین مثال نیویارک ٹائمز میں یوں دیکھنے کو ملی'' عربی جو کہ نا صرف جہاد میں ایک نئے خلیفہ کی پیروی کرسکتے تھے، بلکہ انگلستان کو بدنام بھی کرسکتے تھے، ٹیکسوں کی معافی کے لئے مصروفِ جنگ ہیں''۔

برطانیہ نے ایک بار پھر امریکہ کو استعمار پسندی کی مخالفت اور مغربی تہذیب میں سے ایک کو چننے پر مجبور کردیا۔ کیا وہ اپنے عالمی مفاد کے بدلے شاہی نظام کی مخالفت کریں گے، میلوں دور

سے کچھ امریکیوں کے لئے اخلاقیات کا یہ درس ایک پہیلی کی طرح تھا۔

مصری تغیرات:

Charles Chaille_Lon جو کہ ایک نفیس امریکی افسر تھا جو قانون کی تعلیم مکمل کر کے اسکندریہ میں اس وقت تعینات ہوا تھا کہ جب مصر مشکل دور سے گزر رہا تھا ریاست کی درخواست پر اس وہ بحری بیڑے میں شامل ہوا جس میں چار جنگی جہاز تھے جو امریکیوں کی ایک چھوٹی سی کمیونٹی کو وہاں سے نکالنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔امریکی جنگی جہازوں نے جنگ میں حصہ تو نہ لیا مگر اس کے باوجود مصری پانیوں میں ان کی موجودگی ان کے رویہ کی آئینہ دار تھی۔

پل پر سے Charles Chaille_Long برطانوی اور مصری گولا باری کو دیکھ رہا تھا۔ یہ تماشا تو ذرا دیر میں تمام ہو گیا مگر آگ اور بارود کے آسیب نے شہریوں کو شہر سے کھدیڑ کر سمندر کنارے لا پھینکا۔مصری فوج کے پسپا ہونے کے بعد شہر میں خونریزی کا بازار گرم ہوا،قتلِ عام اور لوٹ مار ہوئی۔فرانسیسی ، برطانوی، اطالوی، عسائی، اور یہودی جن کو شہر پر بمباری کرنے کا حکم تھا مگر قبضے کی اجازت نہیں تھی یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور کچھ نہ کر پائے۔مگر Charles Chaille_Long محض خاموش تماشائی نہ بن سکا۔اس نے 160 مسلح رضا کاروں کی مدد سے قونصل کی اور کئی زندہ بچ جانے والوں کی حفاظت کی۔

برطانوی حملے میں ساحل پر موجود افواج امریکی تھیں اور یہ ایک ہولناک منظر تھا۔ ''سطحِ سمندر پر مردوں عورتوں اور بچوں کی لاشیں تیر رہی تھیں جو گیس کی وجہ سے سوج گئی تھیں''۔Charles Chaille_Long کے مطابق ان میں زیادہ یہودی تھے جو اپنے جلے ہوئے مکانوں سے فرار ہوتے ہوئے بے دردی سے قتل کئے گئے تھے،مگر ان میں کچھ یونانی اور امریکی عیسائی بھی شامل تھے،مردوں عورتوں اور بچوں کو رسوں سے باندھ کر گلیوں میں گھسیٹا گیا تھا،اور بدترین تشدد کے بعد انہیں قتل کر کے ان کا ماس بیچنے کے لئے رکھ دیا گیا تھا،جس کی بولی لگائی جا رہی تھی۔

امریکوں کو جہنم میں دھکیل دیا گیا تھا،انہوں نے ہولناک آگ کو بجھانے کی کوشش کی اور قونصل کی عمارت کو پناہ گاہ بنایا۔انہوں نے شہر میں گشت کی اور چیزوں کو ممکنہ حد تک سدھارنے کی

کوشش کی اور آخر کار چار روز بعد برطانوی افواج شہر میں اتریں اس دوران قریب تین سو مہاجرین کو پناہ دی گئی، ریاست ہائے متحدہ کے ایک کپتان نے بیان دیا ''میں نے ان سب کو بھاڑ میں جھونکا،فرانسیسی، اطالوی، ترکی سب کے سب،کل ملا کر ہمارے پاس تین امریکی تھے، دو مبلغ تھے اور ایک قاضی''۔

ان باہمت اقدامات کے لئے یورپی ریاست نے ریاست ہائے متحدہ کا شکریہ ادا کیا۔عظیم برطانوی ان جہازیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے لگے جنہوں نے اسکندریہ میں اپنی خدمات انجام دیں،مگر Charles Chaille_Long کی نام تبدیل کرنے کی تجویز پر کسی نے غور نہیں کیا۔اس نے وہیں رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

برطانوی حملے میں اپنے کردار کی طرف سے بے دلی کے باوجود Charles Chaille_Long نے اس حملے کے بارے میں اپنی رائے کو محفوظ رکھا،اور حاکم کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔اس نے مصری قوم پرستوں کی بھی سخت مذمت کی۔مصر میں رہنے والے تمام امریکیوں کا خیال یہ نہیں تھا، اگر چہ دو افراد ایسے تھے جو اس کے برعکس تھے۔

عظیم برطانیہ کے لئے گہری نفرت رکھنے کے باجود اس کا جھکاؤ احمد عربوں کی طرف تھا۔وہ وہاں امریکی نمائندہ تھا جو وہاں کے قوم پرستوں کے ساتھ یورپی بادشاہت سے متنفر تھے۔وہ آزاد طبع عربی تصور کو پسند کرتا تھا اور وہاں اب تک آنے والے امریکیوں میں سب سے زیادہ اس ہی کو پسند کیا جاتا تھا احمد عربی، جس کے نام کا مطلب ہی 'صحرائی' تھا اس کا ہیرو تھا۔قونصل کے مطابق ''کسی محبِ وطن کو اتنی پذیرائی نہیں ملی، وہ اپنے لوگوں کے لئے بہترین نمونہ تھا''۔

اکیلا فرمان ہی عربی کا دلدادہ نہیں تھا۔ اس کا ایک پرستار سائمن ولف بھی تھا۔امریکی یہودیوں کو یہ عہدے دینے کی جو روایت قائم ہوئی تھی، سائمن ولف اس کی تازہ ترین مثال تھا، جو کہ ایک سوانح نویس اور وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ، لنکن اور گرانٹ سے گہرے مراسم رکھتا تھا اور صدر جیمز گرفیلڈ کے قتل سے ایک رات قبل واہیٹ ہاؤس میں مقرر کیا گیا تھا۔مقتول بھی ایک اور وکیل تھا جو سفارت نہ ملنے پر نالاں تھا۔ولف 9 ستمبر 1881 کو مصر پہنچا،اسی دن عربی نے بغاوت کی۔

ملک میں نیا اور اپنے معدے کے مرض کی وجہ سے، جس نے اس پورے عرصے میں اس کو

پریشان رکھا Wolf نے محتاط رہ کر اور بے حد آہستگی سے اپنا راستہ بنایا۔اس کے مطابق یورپی مصر میں ہلکی سی جنبش بھی برداشت نہیں کریں گے اور اسکا نتیجہ بہت بڑی خونریزی ہوسکتی ہے۔ اس نے اظہار کیا کہ ”اس چھوٹی سی بساط پر یورپی اپنے حصے کی تمام چالیں چل چکے ہیں“۔اس کے مطابق یہ امریکہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مصر میں اپنے لوگوں کی حفاظت کرے، اور اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے صدر سے تین جنگی جہاز وہاں تعینات کرنے کی گزارش کی اور ساتھ ہی عربی سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی۔

عربی سے اس کی ملاقات 11 نومبر لفٹیننٹ جنرل چارلس سٹون کے گھر پر ہوئی۔ جو کہ مصر میں امریکی مشیر تھا۔ گنجے سر، مضبوط جسامت اور گھنی مونچھوں والے ولف نے بھی اپنے اور عربی کے بیچ مطابقت کو محسوس کیا ہوگا، جو محض ظاہری نہیں تھی۔اس نے مصر کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا کہ مصر کی زمین پر پہلا حق مصریوں کا ہے، اور وہ آزادی کے حقدار ہیں۔اس نے یہ اطمینان دلانے کے بعد کہا کہ ریاست ہائے متحدہ اس سیاست میں کسی طرح بھی شامل نہیں ہے، اور وہ ایک ایسی آزاد ریاست کے فرد کے طور پر بات کر رہا ہے جہاں کے افراد یہ سب صعوبتیں برداشت کر چکے ہیں۔اس نے عربی سے میانہ روی اور ہوشمندی کا مطالبہ کیا اور فرانسیسی اور انگریزی اثر سے محتاط رہنے کی تائید کی۔ بعدازاں قونصل نے جو خطاب کیا اس کا مضمون انیسویں صدی کے لحاظ سے بھی انوکھا اور اچھوتا تھا۔”ایک اسرائیلی ہونے کی حیثیت سے میں اپنے مصری بھائیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔میں مسلمانوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری برادری کو اتنے سالوں تک مسلم ممالک میں پناہ دی۔

اس اعتراف سے خوش ہو کر عربی نے دانشمندی کا عہد کیا ، ولف نے اپنی خوشی ان الفاظ مین بیان کی کہ ”وہاں کا نہ ہونے کے باوجود ایک شخص ہے جو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ ان کی خیر خواہ، اور وہ وہاں مدد کرنے کی نیت سے موجود ہیں۔“ مگر یہ سب بے سود رہا، عربی کا یہ رویہ برطانوی مداخلت کے جواز کو رد کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہوا۔اور اس کشمکش اور افراتفری میں امریکیوں سے قاہرہ کو خالی کرا لیا گیا، صرف ایک خاندان کو چھوڑ دیا گیا جو کہ جنرل سٹون کا تھا۔

اپنی نقرئی ولندیزی داڑھی، سنہری وردی، اور روشن تمغوں کے ساتھ وہ ایک تجربہ کار شہری یا

کوئی سلطان معلوم ہوتا تھا۔اور اپنی اس ظاہری شخصیت کے ساتھ وہ اپنے عقائد کا پختہ اور اپنے فرائض سے مخلص شخص تھا۔اس نے مصر میں اپنے ساتھی امریکی افسروں کو برخاست ہوتے اور اسماعیل کو جلاوطن ہوتے دیکھا تھا۔وہ ان کا فرمانبردار کبھی نہیں رہا اور اس وقت بھی اپنی طرف رہا کہ جب عرب کے باغیوں نے محل کو نذرِ آتش کرنے اور مصر کے ساحلوں کے قریب آتے برطانوی جنگی جہازوں کو تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔

ایک اور بات اسے ممتاز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ اپنی بیوی کی موت کے بعد اس نے ایک اور عورت سے شادی کی جس سے اس کو چار بچے ہوئے، اس بحران نے اس کے خاندان کو الگ کر دیا۔وہ اپنے 13 سالہ بیٹے کے ساتھ اسکندریہ میں رہ گیا جبکہ اس کی بیوا اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ قاہرہ میں رہنا پڑا۔ یکدم ہی اس کے سامنے یہ بڑا مسئلہ آ کھڑا ہوا کہ وہ توفیق کا ساتھ دے کر اپنے پیاروں کے ساتھ رہے یا پھر خدیو کے ساتھ مل کر اپنے خاندان کو ان کے حال پر چھوڑ دے۔اس نے پرامید ہو کر رکنے کا فیصلہ کیا!اپنے بیٹے کو امریکی جنگی جہاز میں بحفاظت بھیجنے کے بعد اس نے 10 جولائی کا دن برطانوی افسروں سے گزارش کرتے ہوئے گزارا کہ وہ اس پار اپنی بری فوج سے رابطہ کریں۔ مگر اس کی کوئی سنوائی نہیں ہوئی اور برطانوی اس شہر میں خاموشی اور سکون سے رات کا کھانا کھاتے رہے۔اور ازراہِ مذاق ان بڑی توپوں کی تباہ کاری کا ذکر کرتے رہے جنہیں وہ اسکندریہ میں آزما چکے تھے۔Stone نے اندازہ لگایا کہ اگلے 24 گھنٹے میں یہاں حشر بپا کر دیا جائے گا اور شہر خالی کروانے کے لئے یہ وقت ناکافی ہے۔ایک اور تکلیف دہ مسئلہ اس کے سامنے یہ تھا کہ آیا وہ اپنی بیوی کو صورتحال سے آگاہ کر کے لوگوں میں بھگدڑ مچنے کا خطرہ مول لے یا خاموش رہ کر محض اچھے کی امید رکھے۔اس نے سوچا اس بھگدڑ میں چار خواتین کا ریل گاڑی میں اپنی جگہ بنانا ناممکن ہے سو اس نے مصلحت کوشی سے کام لیا اور خاموشی میں عافیت جانی۔

وہ ہسپتالوں اور بیرکس کی طرف دوڑا جہاں اس نے زخمیوں پر نظر ڈالی اور پولیس کو لوٹ مار کرنے والوں کے خلاف کاروائی کرنے کی تاکید کی۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔خواتین ایک بچے کو گود میں اٹھائے اور ایک کو ساتھ لئے کھلے مقامات کے طرف بھاگ رہیں تھیں، ان میں ناتواں اور ضعیف افراد بھی تھے جو بھیڑ میں راستہ نہیں بنا پا رہے تھے۔ جب ان سب میں اس کا دل نہیں لگا تو اس نے خدیو کو اپنی خدمات دینا شروع کر دیں اور اپنی عسکری ذمہ داریاں نبھانے لگا۔مگر

اس سب کے دوران اس کے دل میں اپنے خاندان کے لئے خدشات جوں کے توں رہے۔

اس کے پاس پریشانی کی کئی وجوہات ہیں قاہرہ سے باہر جانے کی بجائے اس نے خود کو فوجی ساز وسامان کے ساتھ مورچہ بند کرلیا۔ باہر گلی میں مصری خواتین نے اپنے گھروں کو پتھروں کی مدد سے بند کرلیا۔ عیسائیوں کے خلاف نعرہ بازی ہوتی رہی حتیٰ کہ پران کے پرانے ملازم بھی امریکہ پرلعنت ملامت کرتے رہے۔ چندفوجی افسروں کے سوا Stone کے خاندان کا ناتو باہری دنیا سے کوئی رابطہ ہوا نہ ہی Stone سے۔ اس کی چالیس سالہ بیوی مضبوط اعصاب کی عورت تھی اور بقول اس کے ''ایسا کوئی عربی پیدا ہی نہیں ہوا جو مجھے خوفزدہ کرسکے۔'' اپنی بیٹیوں کو باورچی خانے میں جمع کر کے اس نے ان کو بہادر سپاہیوں کی طرح رہنے کی تلقین کی اور ساتھ ہی کہا کہ وہ ہر قیمت پر اپنی عصمت کی حفاظت کریں، اور اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے نہ کریں، اور اگر ایسی صورتحال پیش آئے تو وہ خود اپنے سینے میں بندوق کی گولی اتارلیں اس سے پہلے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے ایسا کرنا پڑے۔''

دو ہفتوں سے زائد وقت گزر جانے کے بعد اسے لگا کہ بچنے کا واحد حل یہ ہے کہ خود اپنے بچوں کو لے کر باہر نکلے۔ افسران کو جب اس کی خبر ملی تو وہ خوف سے کانپ گئے۔ انہیں یقین تھا کہ ان چاروں خواتین کو نکلتے ہی قتل کردیا جائے گا۔ مگران کی تنبیہہ بے اثر گئی۔ سب سے چھوٹی بیٹی کے مطابق ان کی سواری شہر کے وسط میں سے گزرتی چلی گئی، تمام لوگ خوف اور حیرت سے ان چار عیسائی خواتین کو گلیوں سے بے خطر گزرتا دیکھ رہے تھے۔ 18 اگست کو یہ تھکا ہارا قافلہ منزلِ مقصود پر پہنچا جہاں Stone ان کا منتظر تھا۔

اسی مہینے جنرل گرانٹ ولسلی کی قیادت میں 20000 برطانوی فوجی اسکندریہ میں اتارے گئے، انہیں عربی باغیوں کے خاتمے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ فیصلہ کن لڑائی 13 ستمبر کو Tel El Kebri کے مقام پر لڑی گئی جس میں برطانیہ نے، پوری مصری فوج کو محض 40 منٹوں میں کچل کر رکھ دیا۔ عربی کو پہلے سزائے موت سنائی گی مگر بعد میں اسے قاہرہ منتقل کردیا گیا۔

فرمان اس صورتِ حال سے سراسیمہ تھا اس کے مطابق یہ کوئی جنگ نہیں بلکہ قتلِ عام تھا۔ مصر میں اپنی خدمات کے لئے خدیو نے اسے بھی سراہا تھا مگر اس کے باوجود وہ یہ سب نہ دیکھ سکا اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہی واپس نیویارک لوٹ گیا جہاں اس نے خود کو شہری امور

میں مصروف کرلیا۔ Charles Chaille_Long بھی مصر سے برادل کر کے لوٹا اس کے مطابق عربی نا تو ایک اچھا سپاہی تھا نا ہی ایک اچھا پیش رو۔ اور اس کا ''مصریوں کے مصر'' کا نعرہ بھی لایعنی تھا۔ Wolf بھی Cairo چھوڑ کر چلا گیا اور اس نے وکالت اور سخاوت شروع کردی، اس کے مطابق برطانیوں نے عربی سے غداری کی، ساتھ ہی اس نے پیشنگوئی کی کہ جلد ہی مصری دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے، اور یورپی ریوڑ کو ملک سے باہر ہانک دیں گے، مختصر یہ کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

سب سے آخر میں واپس آنے والے امریکیوں میں ایک Stone تھا۔ بغاوت کے دوران اپنی خدمات کے بدلے میں مصری اعزاز ملنے کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ مصر اب برطانیہ کا ایک حصہ ہے اور اس کی آزادی کی تمام امیدوں پر پانی پھر چکا ہے۔ اس نے اسکندریہ میں ہونے والے قتلِ عام اور عربوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے لئے برطانیہ کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ دسمبر 1883 کو وہ اپنے خاندان اور باقی بچ جانے والی لائبریری کے ساتھ اپنے گھر Long Island پہنچ گیا جہاں اس نے دوبارہ انجینیرنگ کا شعبہ اختیار کیا اور اپنے زندگی کے سب سے اہم امر میں جت گیا جو کہ امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کو ایک تاریخی علامت دینا تھا۔

دینا میں روشن خیالی پیدا کرنا:

یہ منصوبہ اس شخص کی ذہنی کاوش تھی جس سے Stone مصر میں ملا تھا، وہ Frederic Auguste Barthold تھا۔ اس کو یہ خیال Luxor کی سیر کے دوران وہاں کے قدیم مجسموں کو دیکھ کر آیا تھا۔ مرعوب سنگ تراش نے ان کو ''سنگِ مرمر کی پرسکون اور شاندار مخلوق۔'' کا نام دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ان کی پتھرائی ہوئی نگاہیں لامحدود مستقبل پر جمی ہیں۔ اور خود کو دوام بخشنے کی غرض سے گھنے بالوں والے خوش رو Frederic Auguste Barthold نے ویسا کچھ تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا اور نہر سوئیز کی تقریب میں ایک بار پھر اس پر وارد ہوا کہ وہ ایک مصری عورت کا مجسمہ تراشے گا جس کے ہاتھ میں آزادی کی شمع ہوگی۔ یہ مجسمہ اہرامِ مصر کے ابوالہول سے دوگنا بڑا ہوگا اور پانیوں پر کھڑا ہوگا۔ اس کے نام کا مفہوم ایشیا میں روشنی کرنے والا ہوگا۔

وہ دو سال تک اپنے خیال کے خاکے بناتا رہا اور اس سلسلے میں مالی امداد کا خدیو اسمٰعیل سے مطالبہ کرتا رہا۔ 1871 میں اسمٰعیل دیوالیہ ہوگیا اور اپنے قرضے چکانے کے قابل بھی نہیں

رہا۔ ریاست ہائے متحدہ میں بحری گشت کے دوران Barthold کی نظر Bedloe's Island پر پڑی اور اس نے اپنے مجسمے کے لئے نہ صرف نئی جگہ چن لی بلکہ نیا مفہوم بھی۔ اس نے سوچا کہ امریکی اس کے ستون کے لئے اور فرانسیسی اس مجسمے کے لئے پیسے دیں گے، Gustave Eiffel اسے تعمیر کریں گے اب اسے صرف ایک امریکی انجینئر کی ضرورت تھی، اسے Stone یاد آیا۔
وہ جنرل جسے یہیں قید رکھا گیا تھا اس علاقے کو بخوبی جانتا تھا۔ اس نے سیموئل لاکٹ اور اور جیمز مورگن کی مدد سے نواسی فٹ بڑا ستون کھڑا کرایا۔ جس میں تانبے کے 350 ٹکڑے تھے۔ اس امر کو امریکی یومِ آزادی پر مکمل ہونا تھا مگر یہ رسمِ یادگاری 1886 اکتوبر کو وقوع پذیر ہوئی، یعنی Stone کی موت سے ایک سال قبل۔

ہزاروں تماشائیوں نے صدر Stephen Grover Cleveland کو کہتے سنا کہ ''آزادی نے یہاں اپنی جگہ بنالی ہے۔'' اس کی نگاہیں اس عظیم مجسمے پر تھیں جو مصری مجسموں سے ذرا سی مشابہت رکھتا تھا۔ پہلے خیال کے برعکس اب وہ ایک مغربی عورت کا مجسمہ تھا جس کے نام میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کردی گئی تھی۔ صرف شمع ویسی ہی تھی۔ یہ امریکہ کا مجسمۂ آزادی تھا۔

اگلے چالیس سال تک امریکہ آنے والوں کے لئے آزادی کی یہ دیوی ان کے دلوں میں بہتر مستقبل اور آزادی کے خواب اجاگر کرتی تھی مگر مشرقِ وسطی کے لوگوں کے لئے معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ان کے دلوں میں مجسمے کو دیکھ کر جدت کا خیال تو آتا تھا مگر آزادی کا نہیں۔ ''اے آزادی کی دیوی! تو کب مشرق کی طرف دیکھے گی۔'' یہ سوال ایک عرب امریکی شاعر امین ریحانی کا تھا جس نے آگے جا کر ملک اور مشرقِ وسطی کے مابین تعلقات میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ''کیا اہرامِ مصر کے پاس کسی آزادی کی دیوی کا مجسمہ کبھی نہیں دیکھا جائے گا۔''

آزادی اور نجات کے پیغام کے ساتھ آزادی کے مجسمے کی پردہ کشائی نے بادشاہت کے لئے امریکی تذبذب کی نشاندہی کی۔ ساتھ ہی اس تقریب نے نوآبادکاری کے الزامات امریکی سلطنت کا افتتاح کیا۔ اپنی سابقہ تہذیب کے برخلاف جو کہ خاص کر بین الاقوامی امور میں انہیں یورپ سے ممتاز کرتی تھی، کئی امریکی اب اس نظریہِ ارتقا کی تائید کرنے لگے تھے جس کے مطابق کاکیشیائی باشندوں کو باقی تمام نسلوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس نظریہ کے زیرِ سایہ برطانوی اپنے گوروں پر فرانسیسی افریقہ اور ایشیا پر جبکہ امریکی نہ صرف اپنے برِاعظم بلکہ دنیا کے دیگر دور دراز

علاقوں پر بھی اپنی حکمرانی تصور کرنے لگا۔ مشرقِ وسطی کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ ایک عظیم قوت بننے کے لئے ریاست ہائے متحدہ کو ان زمینوں پر حکمرانی کی ضرورت نہیں تھی کسی خون ریزی کے بغیر انہوں نے یہ مقام تعلیمی اور طبی ادارے قائم کر کے حاصل کرلیا تھا۔ اور اگر وہ ایسا چاہتے بھی تو ان کو وہ علاقے جو یورپیوں کے پاس ہیں حاصل کرنے میں دشواری پیش آتی۔ ریاست ہائے متحدہ مشرق وسطیٰ میں شاہی مطمح نظر نہ ہونے کے باوجود سمندر پار وفاقی سلطنت کے پھیلاؤ میں مصروف کار تھا۔ عظیم محقق James Field کے مطابق مشرق کے قریب شمالی افریقہ نے امریکیوں کو غیر مغربی دنیا تک رسائی کی تجربہ گاہ فراہم کی۔ تبلیغی، سیاحی، اور تجارتی سرگرمیوں کو فوقیت دے کر امریکہ نے اپنی مشرقی اور کیریبین سلطنتوں میں اپنی بنیاد ڈالی۔

تمام امریکیوں نے شاہی نظام میں امریکی مداخلت کی حمایت نہیں کی Andreo Carnegie جیسے مشہور صنعت کاروں اور ویلیم جیمز جیسے فلسفیوں نے اس نظریے کو رد کیا اور مل کر اس کے خلاف ایک تنظیم بنائی۔ مارک ٹوائن جواب سے پہلے امریکی سلطنت حامی تھا اور امریکی عقاب کو بحرالکاہل پر محو پرواز دیکھنا چاہتا تھا۔ 1899 فلپائن میں ہونے والے مظالم سے بدخواہ ہوگیا تھا اسکے مطابق ریاست ہائے متحدہ اپنے بنیادی مقاصد کو فراموش کر چکی تھی لہٰذہ وہ بھی ان کی تنظیم سے جا ملا"اس نے کہا کہ اب وہ کسی بھی دوسری زمین میں امریکی عقاب کو اپنے پنجے گاڑتے نہیں دیکھ سکتا۔

بہر حال Twain کے مطمح نظر کو امریکیوں نے نہیں سراہا زیادہ تر اسکے خلاف اور جنونی جنگ جوئی کے حق میں تھے جس کو عثمانیوں کے خلاف برطانوی اقدامات نے جلا بخشی تھی۔ امریکی بہر حال شاہی نظام کو مشرقِ وسطیٰ کی ترقی کا ضامن اور اپنے مفاد میں سمجھتے تھے۔ یورپی اس علاقے کو اور زیادہ خطرناک امریکی تعاقب کی طرف ہانک رہے تھے جو کہ تجارتی، ثقافتی اور سب سے بڑھ کر مذہبی تھا۔

دیگر کسی بھی حصے میں امریکی شاہی نظام کو پسند نہیں کرتے تھے مگر صرف ان علاقوں میں جو آج بنیاد پرست ہیں ان علاقوں میں یورپی تسلط کا مطلب ترقی کے بہتر مواقع اور مسلمان حکومت سے نجات سمجھا گیا تھا۔ اور اس امید کو عیسائیوں نے اور امریکی یہودیوں نے جلا بخشی تھی۔ ان کے مطابق آزادی کے مجسمے کا رخ مشرق کی طرف تھا اور اس کا تخیل اس سے آگے فلسطین میں۔

خسروئی پارسائی

آزادی کا مجسمہ امریکیوں کے لئے نشانِ تصدیق بن گیا۔اس کے ستون پر کنندہ عبارت کا مفہوم بھی یوں ہی تھا: ''اپنے تھکے ہارے، غریب، بکھرے ہوؤں کو مجھے سونپ دو۔''، یہ بند امریکی شاعر Emma Lazarus کی تخلیق تھا جو کہ امریکی یہودی اور کھری محبِ وطن تھی اور مشرقِ وسطیٰ میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

Lazzarus کی یہ بے نیازی 1881 میں رفع ہوئی جب زار روس نے روس میں ہونے والے قتلِ عام کو پسند کیا۔ یہ سب اس تیس سالہ شاعر پسند نہیں تھا۔ وہ سترہ سال کی عمر سے شاعری کر رہی تھی مگر اب جا کر اسے عوام و خواص میں مقبولیت ملی۔

Lazarus نے اپنے یہودی اسلاف کی وراثت کو ٹھکرایا تو نہیں تھا مگر کبھی اس کا فائدہ بھی نہیں اٹھایا تھا مگر روس میں ہونے والے قتلِ عام اور اس کی طرف دنیا کی بے اعتنائی نے اس کو اپنی وراثت کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا، جسے یہودیوں کا مسئلہ کہا گیا تھا۔ جس کا حل اس کے مطابق بے گھروں کے لئے ایک گھر بنانا تھا، بے مقصدوں کے لئے ایک مقصد، بے آسروں کے لئے آسرا اور ان کے لئے ایک قوم جن کی کوئی قومیت نہیں تھی۔ پھر یکدم ہی اس نے مختلف انداز میں شاعری کی ابتداء کی۔

شمع اور سنہرا دروازہ:

Lazarus یہ وہ واحد یہودی نہیں تھی جو 1880 میں اس تبدیلی کا شکار ہوئی تھی۔

صیھونیت، یعنی یہودیوں کو اسرائیل میں آباد کرنے کا منصوبہ مشرقی یورپ میں جڑ پکڑ رہا تھا۔اس اس نظریئے کے ماننے والے اب فلسطین کا رخ کر رہے تھے اور وہاں آباد ہو رہے تھے، ان 26000 یہودیوں کے برخلاف جو پہلے ہی وہاں موجود تھے، ان میں سے زیادہ تر دیہاتی یا تجارت کار تھے۔ اس نو آبادی نے یہودیوں کو نئی زندگی دکھائی تھی۔ امریکہ میں انجیل کے پیروکاروں نے بھی یہی حکمتِ عملی اپنائی جن میں Clorinda, اور جارج ایڈمز جیسے افراد شامل تھے تا کہ وہ آنے والی عظمت کے لئے تیار ہو سکیں۔

صیھونیت بہر حال یورپ تک محدود رہی۔ امریکی یہودیوں میں اس کا کوئی جود نہیں تھا 1800 کی دہائی نے ریاست ہائے متحدہ میں بہت بڑی یہودی آبادی کا افتتاح کیا۔ ڈھائی ملین سے زیادہ یہودی ملک میں داخل ہوئے ان میں سے کئی آزادی کے مجسمے کے قریب سے گزر کر آئے۔ نئے آنے والے یہودی ان پرانے یہودیوں سے جن کا تعلق جرمنی سے تھا زیادہ روایتی تھے، وہ اس پرانی کے بجائے اس نئی سرزمین میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ امریکی یہودیوں نے فلسطین میں اپنی برادریوں کو رکھنے کی لئے خاصی کوششیں کیں۔ judah Touro,. نے، جو کہ New Orlean سے تھا اس سلسلے میں مالی مدد کی۔ Macy کی آدھی ملکیت رکھنے والے Nathan Straus نے وہ زمین خریدی جہاں پر Natanya نامی شہر جو کہ اب تک اس کے نام سے منسوب ہے قائم کیا گیا، اس کے باوجود زیادہ تر امریکی یہودی صیھونیت کے لئے اپنی زندگی صرف کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کو امریکی دکانیں فلسطین کے صحراؤں اور دلدلوں سے زیادہ عزیز تھیں۔ لزارس کہنا تھا کہ یورپی یہودیوں کو فلسطین میں پناہ ملے گی، نہ کہ آزاد امریکی یہودیوں کو۔ وہ امریکہ کے بہتر شہروں میں رہتے رہیں گے۔ اس کا ماننا تھا کہ یہ نئی جگہ تمام یہودیوں کے لئے اہم کردار ادا کرے گی اور ملکوں کی عدالت میں انہیں سرخ رو کرے گی۔ یہاں انسانیت اور مساوات کا درس دیا جائے گا، اس نے لکھا کہ ''اسرائیل کے فائدے سے دنیا کو فائدہ ہو گا''۔

مگر Lazarus کی باتوں میں ان امریکی یہودیوں کے لئے کوئی چاشنی نہیں تھی جو سامی نسل کے مخالف تھے اور صیہونیت سے ڈرتے تھے کہ اس سے وہ ریاست ہائے متحدہ کے لئے مشکوک ہو جائیں گے۔ 1885 کو منعقد کردہ کانگریس نے واضح کیا کہ ''ہم خود کو ایک قوم سے زیادہ ایک مذہبی برادری سمجھتے ہیں، سو نہ تو ہم فلسطین لوٹنے کے حق میں ہیں نا یہ یہودی ریاست کو بحال

کرنے کے،''۔ یہودی مفکر Abram S. Issac کے مطابق علیحدہ قومیت کی وکالت کرنے والی Lazarus کم عقل تھی۔خاص کر اس وقت جب سامیت کے ماننے والے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ یہودی محض فلسطینی، سامی یا شرقی ہیں،''۔اس نے یاد دہانی کرائی کہ یہ نظریہ عیسائیوں جیسا ہے، کہ جس میں تمام یہودیوں کو عیسائی بنا لینے کی بات ہے۔

ان باتوں کی پرواکئے بنا Lazarus نے تن تنہا ہی یہودیوں کو ان کے اپنے سیاسی نظام میں فنکار، کسان اور جنگجو بن کر کام کرنے کے حق کی حمایت کی اور اس کے لئے کوششیں کیں۔ان نے ایک سوسائٹی قائم کی اور اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے اس مقصد کو جلا بخشی۔اپنے ایک دوست سے اس نے کہا ''کہ یہ نظریہ ایسا شاندار اور زندہ ہے کہ اس نے میرے ذہن سے باقی تمام سوچوں کو بے دخل کر دیا ہے''۔اس کی نظریں مشرقِ وسطی میں یورپ کی آئندہ کوششوں پر تھیں جس سے ریاست ہائے متحدہ کو اس مقدس سرزمین کی آزادی کے بوجھ سے نجات ملتی تھی۔اس کو یقین تھا کہ امریکی یہودیوں کی ہچکچاہٹ جلد ختم ہو جائے گی اور وہ اس شمع کو اٹھانے میں اس کا ساتھ دیں گے۔اس کی نظم New Colossus کی آخری سطر کی تشریح بھی یوں ہی تھی اور وہ سنہرا دروازہ فلسطین ہی تھا۔

Lazarus کا یہ خیال اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اس کی تحریک امریکی یہودیوں میں مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ان کی پہلی کانگریس کے 1200 راکین میں سے جو کہ Barsel میں 1897 میں جمع ہوئے، اور Philadelphia سے ہوتے plymouth Rock تک پہنچے صرف چار ہی شمالی امریکہ میں سراہے گئے۔اس خواب کو ابھی امریکی یہودیوں کے دلوں میں گھر کرنا تھا، کروڑوں افراد اس سے نابلد رہے اور ان کے دلوں میں یہودیوں کی محبت بہر حال ویسی ہی رہی، خاص کر عیسائیوں کو وہاں سے واپس بھیجنے کے لئے۔

مدفون یادگاریں:

عیسائیت، ریاست ہائے متحدہ میں سن 1890 تک، مفکرین کی دی گئی اصطلاح ''پروٹیسٹنٹ صدی'' کے عروج تک پہنچ چکی تھی۔اس دور میں مذہب معاشرے کی تمام اقدار میں سرایت کر چکا تھا۔چرچ کی مختلف سرگرمیاں، اجتماعات، اتوار کے سکول امریکی زندگی کا خاصہ بن

چکے تھے اور دور دراز علاقوں سے پیسے خرچ کر کے مذہبی مبلغ اور واعظ بلوائے جانے لگے تھے۔اور قومی سطح پر بھی مذہب اہمیت کا حامل ہوتا جا رہا تھا۔پریس کی مدد سے یہ سب روزانہ نہیں تو وقفے وقفے سے کروڑوں لوگوں تک پہنچایا جا رہا تھا۔

منبر پر براجمان ان شاہزادوں میں سب سے مشہور T.D Witt Talmage تھا۔گہری آنکھوں، اور نوکدار ناک والا یہ شخص صدر Grover Cleveland کے روحانی مشیر اور مشہور Brooklyn Talmage کے پاسٹر ہونے کی حیثیت سے اس کے بہت سے مداح تھے۔اس کے خطبات جسم اور روح کے درمیان رابطے سے لے کر گرمیوں کی چھٹیوں کی تحریص تک ہوا کرتے تھے مگر اس کے لئے سب سے زیادہ اہم موضوع فلسطین تھا اس کے مطابق ''میں نے اس کے بارے میں پڑھا، کہا، سنا، لکھا، سکھایا، گایا، اور اس ہی کے متعلق خواب دیکھے جب تک میری توقعات ہمالیہ کے برابر نہیں ہو گئیں۔

1 دسمبر 1889 کو Talmage کی خواہشات بروئے کار آئیں جب اس نے ایک دخانی جہاز سے Jaffa کے ساحل پر قدم رکھا۔وہ اپنے وقت کے پادریوں کی طرح اس عذاب کے لئے سخت نفرت لے کر ظاہر ہوا جو صدیوں سے قوموں پر مسلط ہے، وہ مسلمانوں کو اور سلطنتِ عثمانیہ کو مغربی تہذیب کا متضاد ٹھہراتا تھا۔وہ فلسطین کی موجودہ صورتحال سے زیادہ آنے والے دنوں میں اسے ایک یہودی ریاست کے طور پر دیکھنے کے متعلق فکرمند تھا۔ اس نے یقین دہانی کرائی کہ ''تمام عاقبت اندیش اسرائیل کے ہاتھوں فلسطین کے دوبارہ بازیابی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں''، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس سرزمین کو تہذیبی اور تجارتی بہشت بنا دیا جائے گا۔

اگرچہ وہ اس سب کے بارے میں فکرمند تھا، اس کی سوچ اور نظریات Emma جیسے ہی تھے۔وہ بھی یہودی مہاجرین کے آسرے کی سخت ضرورت کو محسوس کر چکا تھا، جو روس اور مشرقی یورپ سے آئے تھے، اس کے مطابق وہاں سامیت کی مخالف بہت جلد چار گنا، پھر سو گنا بڑھ جائے گی۔ایسا کی طرح وہ بھی سمجھتا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ میں مقیم یہودیوں سے ہجرت کی امید رکھنا بے کار ہے وہ کبھی اپنے خوشحال شہروں کو نہیں چھوڑیں گے، جہاں وہ پرسکون زندگی گزار رہے ہیں اور اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔وہ دو سمندر پار کر کے ایک اجنبی علاقے میں کیونکر اپنی زندگی کا از سرِ نو آغاز کریں گے۔اس کی بجائے وہ عیسائیوں کے ساتھ مل کر کلیسائی نظام کے

مطابق مشرقِ وسطیٰ میں حکومتی حکمتِ علمی پر توجہ دیں گے، کم از کم اس لحاظ سے وہ Lazarus سے مختلف تھا۔ شاعر سوچتا تھا کہ یورپ فلسطین سلطنتِ عثمانیہ سے چھیننے گا جبکہ پادری کو یقین تھا امریکہ تمام دنیا کو اسلام کی مقدس سرزمین سے الجھا دے گا۔

یہ قیاس کہ ریاست ہائے متحدہ عالمی سطح پر فلسطین کو مسلمان حکومت سے چھٹکارا دلانے اور وہاں یہودیوں کو آباد کرنے میں کارگر ثابت ہوگی خانہ جنگی کے دوران محض قیاس ہی لگتا تھا۔ مگر انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں امریکہ ایک مختلف ملک بن کر سامنے آیا تھا۔ وہ ایک صنعتی دیو کی طرح دنیا پر اپنے تسلط کو ثابت کر چکا تھا۔ اس صورتِ حال میں Talmage کو اپنے خواب کی تعبیر پانے کے لئے William Eugene Blackstone جو کہ اس اقتصادی صورتحال میں اہم کردار ادا کر رہا تھا، کا انتظار تھا۔

1841 میں پیدا ہونے والا Eugene Blackstone ایک خوددار شخص تھا جس نے خود تعلیم حاصل کی تھی اور خود ہی اپنی شخصیت کی تشکیل کی تھی۔ تیس سال کی عمر میں اس نے املاک کی خرید و فروخت میں نام کمایا تھا اور اپنے اصل مقصد کے حصول کے لئے وہ 1778 کو Niagra Conference میں شریک ہوا تھا جس کا مقصد یہودیوں کو فلسطین میں واپس لانا تھا۔ اور اس کا نتیجہ اس کی کتاب ''مسیح آ رہے ہیں'' تھی جس میں اس نے یہودیوں کے عیسائیت کی طرف جانے کی ضرورت کو رد کیا تھا۔ اس نے سوال اٹھایا کہ کیا ہم یہودیوں کو اس لئے رد کر دیں کہ ''وہ اس حکم کو رد کرتے ہیں کہ عیسائی ہی مسیحا ہیں، اور ایسا کر کے ہم اس دوسرے حکم کو از خود رد کر دیں کہ وہ عنقریب دوبارہ وارد ہونے والے ہیں''۔ اس کتاب کو بہت مقبولیت ملی۔ 36 زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے مگر Eugene Blackstone کو اس سب سے غرض نہیں تھی۔ پرکشش شخصیت Eugene Blackstone کے کچھ اور ہی منصوبے تھے جن پر کام اس نے 1888 کے اپنے فلسطینی دورے کے بعد شروع کیا۔

اس تحریر کے مطابق جو Eugene Blackstone نے صدر Harrison اور James G. Blaine کو 5 مارچ کو دی تھی، کہا گیا تھا کہ ''ہم سمجھتے ہیں کہ یہی وقت ہے جب تمام اقوام کو خاص کر عیسائیوں کو اسرائیل سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ قریب 2000000 روسی یہودی ہماری ہمدردی اور ہمارے انصاف کے منتظر ہیں۔ وہ فلسطین میں پناہ ملنے کے متمنی ہیں جیسے

برطانیہ نے شام کو عثمانیوں سے نجات دلائی ویسے ہی امریکی فلسطین کو بھی آزادی دلوا سکتے ہیں۔

400 عظیم لوگوں کے ساتھ جن میں مذہبی پیشوا بھی تھے، کاروباری افراد بھی، صحافی بھی اور سیاست دان بھی Talnage نے اس یادگار پر اپنے دستخط کئے۔ یہ شخصیات متنازعہ نہیں تھیں بلکہ امریکی سیاست، تجارت، اور تہذیب کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

اپنی تعریف سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود یہ یادگار امریکی حکمتِ عملی سے مطابقت رکھتی تھی۔ 1881 کو روس میں ہونے والے قتلِ عام کے بعد سے Washigton نے فلسطین کو یہودیوں کے لئے کھول دینے کا مطالبہ کیا۔ استنبول میں امریکی سفیر Lew Wallace کو یہ احکامات دیے جا چکے تھے کہ وہ ذاتی طور پر سلطان عبدالحمید دوم سے اس بارے میں بات کرے، اور اس زمرے میں اس نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کے جانشین Oscar straus اور Solomon Hirsch نے بھی اس کا ساتھ دیا مگر یہ سب بے سود رہا۔ عثمانیوں نے آنے والے یہودیوں کے لئے سخت ترین اقدامات کئے۔ امریکیوں نے ان اقدامات کو حیران کن اور بیجوڑ کہا مگر یہ بھی بے سود، یورپی طاقتوں نے اپنے طور مداخلت کرنے میں کوئی رغبت ظاہر نہیں کی۔

یورپیوں کے اس رویے اور عثمانیوں کی اس مخالفت کو دیکھتے ہوئے Hariison نے اس مسئلہ پر کوئی خاطر خواہ قدم نہیں اٹھایا Blackstone اپنے حصے کا کام کرتا رہا اور مشرقِ وسطیٰ کی طرح یہاں بھی ایک آدمی کا یقین دوسرے کے لئے واہمہ بنا رہا جبکہ حکمتِ عملی کو طاقت کے زور پر طے کیا گیا۔

ان قوتوں سے رد کئے جانے کے باوجود عیسائیوں نے اس نظریئے کی ترویج سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ کچھ نے Blackstone کو پسند کیا اور کچھ نے تو خود کو صہونی کہنا شروع کر دیا، مگر اس زمرے میں عوام کا ردِ عمل ویسا نہیں تھا۔ وہ چرچ جو اب سے پہلے صفِ اول میں تھیں تجدید کے حامیوں سے دور ہوتی دکھائی دے رہیں تھیں۔ اگرچہ یہ سب اب تک امریکی یہودیوں کا خواب تھا مگر اس کے حصول کی کوششیں ٹھنڈی پڑ گئی تھیں

یہ نرم پڑتے ولولے اور انجیل کی عبادتوں سے روایتی عبادتوں کی طرف منتقلی فلسطین میں امریکی کالونی بننے کی آخری کوشش میں سامنے آئی۔ یہ داستان Spafford خاندان اور اس کے پیروکاروں کے گرد گھومتی ہے، Selah Merrill بھی اس ہی کا ایک کردار ہے۔

میری روح کے لئے یہ بہتر ہے:

وہ ایک عزت دار جوڑا تھا جو باقاعدگی سے چرچ جایا کرتا تھا، وہ Blackstone کے قریبی دوست تھے۔ وہ 1871 کی آتشزدگی میں بچ جانے والوں میں تھے۔ Anna کی چار بیٹیاں ایک حادثے میں ہلاک ہوگئیں تھیں۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ان کا اکلوتا بیٹا بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔ ''آفات طوفان کی طرح یکا یک آئیں اور میرا سب کچھ بہا کر لے گئیں''۔ بکھرے ہوئے Haratio نے لکھا، ''تم نے مجھے کہنا سکھایا کہ میری روح کے لئے یہ بہتر ہے''، اور اس کے لکھے اس بھجن کو بہت مقبولیت ملی۔ اس کا ذاتی حادثہ ایک حکایت کی شکل اختیار کر گیا۔ بعدازاں انہوں نے بیت المقدس میں مقیم ہونے کا فیصلہ کیا۔

ایک دہائی گزر جانے کے بعد یہ خاندان اپنے 12 پیروکاروں کے ساتھ Jaffa میں اترا اور وہاں سے بیت المقدس کی طرف روانہ ہوا۔ ان کے پاس بدنصیب Adam کی سواری تھی۔ ماضی میں ہونے والے اندوہناک واقعے نے اس خاندان کو بیت المقدس میں اپنی کالونی کے قیام کی کوشش سے باز نہیں رکھا۔ انہوں نے پرانے شہر کے باہر ایک بڑا مکان کرائے پر لیا اور خود ہی اس کی تعمیر میں جت گئے۔ انہوں نے وہاں لڑکیوں کا ایک اسکول اور مقدس اشیاء کی ایک دکان کھولی۔ یہ نئی امریکی کالونی سیاحوں کی دلچسپی کا باعث بنی۔ وہاں پر جرنل Charles اور Gordon جیسے عظیم لوگ بھی آئے۔ Gordon کے بارے میں، جو کہ بعد میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا Spafford خاندان کے ایک فرد نے بتایا کہ اسی نے اسے قسم کھانا سکھائی تھی۔

فلسطین میں نئے آنے والوں نے یسوع مسیح کی تقلید کی کہ جس نے دنیا میں صعوبتیں اٹھائیں مگر آخرت میں کامیابی حاصل کی۔ وہ انجیل میں کی جانے والی پیشنگوئیوں کے پورا ہونے کے منتظر تھے، جس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ ایک دن اپنے پرانے وطن لوٹ کر آئیں گے۔ Spafford خاندان کے لوگ نہ تو نئے آنے والوں میں کوئی دلچسپی لیتے نہ ہی اسطرح کا کوئی اور کام کرتے، وہ تو روز صبح ہوتے ہی زیتون کے ٹیلوں پر چائے ناشتہ لے کر پہنچ جاتے اور یہ امید کرتے کہ آنے والے مسیحا کو سب سے پہلے وہ ملیں گے اور ان کی تواضع کریں گے۔

امریکی کالونی اس وجہ سے بھی ممتاز تھی کہ وہ پہلے کی طرح کبھی نہیں اجڑی تھی نہ اس پر قحط

ٹوٹا تھا نہ ہی کوئی بیماری یا وبا وہاں پھوٹی تھی۔ مغرب کے سخت مخالف عبدالحمید کی خلاف ہونے کے باوجود خاندان کے مراسم بیت المقدس کے گورنرز سے اچھے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ شہر کے دیگر مذہبی حلقوں سے بھی ان کے مراسم اچھے تھے۔ ان کا ایک یہ سنجیدہ مخالف تھا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ایک امریکی تھا۔

ایک مشنری اور Civil-War کے دوران افریقی امریکی پادری ہونے کی حیثیت سے Selah Merill آنے والوں سے کافی مناسبت رکھتا تھا۔ 1882 سے ابتداء کر کے وہ بیت المقدس میں امریکی قونصل کے لئے اپنی خدمات انجام دے چکا تھا اور اس کے بعد کئی کتابوں کا مصنف رہا تھا۔ ان سب کے باوجود اس کا مہربان چہرہ، معلم جیسا عینک اور داڑھی اس کے کنجوس کردار سے مناسبت نہیں رکھتے تھے اس کے مطابق اس سرزمین میں کسی امریکی کالونی کی گنجائش نہیں تھی۔

اس نے اس خاندان پر چور اچکے ہونے کا الزام لگایا اس کے مطابق یہ نوجوانوں کو ورغلاتے تھے، اور ایک دفعہ انہوں نے اس پر بھی جان لیوا حملہ کیا تھا، وہ انہیں Spaffordities کہتا تھا۔ اس نے بیت المقدس کے لوگوں سے کہا کہ وہ ان سے خرید وفروخت نہ کریں اور سیاحوں کو بھی ان سے دور رہنے کی تلقین کی اس نے کہا کہ یہ لوگ ریاست ہائے متحدہ کے کی حکومت سے اور یہاں بسنے والے دوسرے تمام امریکیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس نے اس کالونی کے سابقہ رہائشیوں سے بھی اپیل کی کہ وہ ان کے غیر اخلاقی اعمال کے خلاف شہادت دیں اور بتائیں کہ یہ لوگ کیسے غیر شادی شدہ جوڑوں کو اندھیرے کمروں میں بند کر دیتے ہیں اور بعد میں ان سے ان کی بداخلاقی کا اعتراف مانگتے ہیں۔

تناؤ اس وقت مزید بڑھ گیا جب کہ ناتجربہ کار ماہر آثارِ قدیمہ Merill نے پرانے شہر کی دیوار کے باہر اس حصے کی کھدائی کی جہاں ان لوگوں کا قبرستان بھی تھا۔ بعدازاں اس نے دعوی کیا کہ یہ سب اس نے قصداً Spafford خاندان کو ڈرانے کے لئے کیا تھا اس نے یہ بھی کہا کہ اسے Horatio Spafford کی ہڈیاں اس زمین میں بکھری ہوئی ملیں۔ امریکی کالونی کی حمایت کرنے والوں کی مخالفت اور گلے کے سرطان سے تنگ آ کر آخر کار اس نے استعفی دے دیا۔ اس وقت تک کالونی ایک سوڈانی گروہ کے ساتھ مل کر اپنی ممتاز امریکی شناخت کھو بیٹھی تھی۔ مکان کو دوبارہ تعمیر کیا گیا، وہاں پر ہوٹل بنایا گیا جو کہ سیاحوں اور غیر ملکیوں کی توجہ کا باعث بنا رہا اور اسطرح Merill کی

محنت پر پانی پھر گیا۔

امریکی کالونی کے خلاف Merill کی کینہ پروری کو اس کی یہودیوں کے لئے بغض اور صیہونیت کے لئے عداوت کہا گیا۔ سابقہ عبرانی پروفیسر ہونے کی حیثیت سے اور اپنے نام کی وجہ سے شاید اس کو یہودی مہاجرین کے لئے ایسی نفرت نہیں رکھنی چاہئے تھی مگر اس کا ماننا تھا کہ یہودیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ان میں پوری غلطی خود ان کی ہے۔ ان کے کردار، اخلاقی قدروں کی پامالی اور دیگر برائیاں ہی روس میں قتلِ عام کا سبب بنی، اور دیگر کسی جگہ بھی ایسا ہوا تو اس کی اصل وجہ یہ ہی تھی۔ جب Blakstone کی یادگار کے بارے میں اس سے سوال کیا گیا تو اس نے اس کو ایک بہت بڑی سازش کہہ کر رد کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ لالچی یہودی کبھی مالی نفع کے بغیر اس فلسطین میں نہیں بسیں گے جہاں ان کے مفاد کا کچھ نا ہو، نیز اس نے ریاست ہائے متحدہ کو بھی خبردار کیا کہ یہ ایسی کمزور اور بے فیض قوم ہے جس سے ہمدردی بے سود ہے، نہ تو ان سے وفا کی امید کی جا سکتی ہے، نہ ان میں سے اچھے سپاہی یا شہری بنائے جا سکتے ہیں۔

اس عداوت میں اس کے نظریات کچھ کچھ ویسے ہی تھے جیسے امریکہ میں سامنے آتے ہوئے امریکی پروٹیسٹنٹس کے تھے۔ اس کے باوجود عبادت کے نئے اطوار پوشیدہ ہونے کے باوجود بھی مقبولیت پا رہے تھے فلسطین میں یہودیوں کو بحال کرنے کا نظریہ دم توڑ چکا تھا اس باب میں عوام کی نمائندگی Merrill کم اور ہر دل عزیز مارک ٹوائن زیادہ بہتر کرتا تھا۔ اگرچہ وہ اکثر نثر میں انجیلیوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا مگر وہ پرانے مذہب کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس کی تحریروں میں اکثر یہودیوں کی مخالفت ہوا کرتی تھی مگر وہ کبھی اس مذہب کے مطابق کوئی ایسی بات نا کرتا تھا۔ صیہونیت کے متعلق اس کی کیا رائے تھی اس کا پتا 1897 تک نہ چل سکا جب وہ Vienna میں دو سال کے لئے قیام پذیر تھا، وہاں اسے یہودی سمجھ کر کئی بڑے لوگوں سے ملاقات کا موقعہ دیا گیا، جن میں صیہونیت کا بانی Theodor Herzl بھی تھا جو کہ ایک صحافی اور ڈرامہ نگار تھا۔

Twains کے وہاں آنے کو Dreyfus کے مسئلے سے جوڑا گیا جو کہ ایک فرانسیسی فوجی کپتان تھا اور اس پر جرمنی کی جاسوسی کرنے کا جھوٹا الزام تھا، یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ ایک کٹر یہودی ہے مگر اپنے آپ کو فرانسیسی زیادہ اور یہودی کم مانتا تھا۔ Alfred Dreyfus اس وجہ سے سامیوں کے خلاف ہونے والے فوجی آپریشن کا مرکزِ نگاہ بنا۔ اور یہ خبر پورے یورپ میں پھیلی خاص کر آسٹریا

میں جہاں سامی مخالفت کو خاصی فوقیت مل چکی تھی اور اس کے سیاسی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

یہودی ہونے کی غلط فہمی سے مبرا ہو کر بھی Tawain کو Dreyfus سے جوڑا گیا۔ وہ وہاں اپنی بیٹی Clara سے ملنے آیا تھا جس کی شادی آسٹریا کے ایک یہودی موسیقار سے ہوئی تھی، اس ہی کی بدولت وہ شہر کے ممتاز یہودیوں سے مل پایا جن میں سگمنڈ فرائڈ بھی شامل تھا۔ اس نے سامی مخالفت کے بارے میں کافی کچھ سیکھا مگر وہ ایسا مکمل طور پر خود اس کا شکار ہو جانے کی وجہ سے نہیں کر پایا۔ پریس نے کہا کہ اس کا نام Samuel یہودیوں کا پسندیدہ ہے اور انہوں نے اس کی موٹی ناک کی وجہ سے بھی اسے کئی نام دیئے۔

Twains نے اس کا منہ توڑ جواب اپنے ایک مضمون ''یہودیوں کے متعلق،'' سے دیا جس میں اس نے کہا کہ بہت کم عیسائی ان کے لئے عوامی سطح پر کھڑے ہوئے ہیں۔ Dreyfus کا مقدمہ خاصہ مختلف نوعیت کا تھا، کیوں کہ وہ غیر انگریزی تھا، غیر امریکی تھا، اور فرانسیسی تھا۔ اور اس نے اپنی بات کو یہودیوں کی دولت کی طرف رغبت اور جنگ میں اپنے ملک کا ساتھ نہ دینے کی عادت سے تقریباً واضح کر دیا، بعدازاں اس کی معافی مانگ لی گئی اور یہودیوں کے فہم و فراست کی تعریف کر کے اس کا ازالہ کیا گیا۔ ''ایک اوسط درجے کے یہودی اور ایک اوسط درجے کے عیسائی کے دماغ میں اتنا فرق ہے جتنا ایک مینڈک اور معلم کے دماغ میں ہوتا ہے۔''، اس نے کہا، ''یہ ایک عظیم قوم ہے، پرانے وقتوں سے اب تک پیدا ہونے والی اقوام میں سب سے عظیم۔''

یہ تبدیلی Tawain کے Herzl میں دلچسپی لینے سے اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی۔ Dreyfus کے بارے میں ایک اخبار میں لکھتے ہوئے Herlz نے کہا کہ یہودی کسی قیمت پر بھی یورپ میں مداخلت نہیں کر سکتے، اس کی بجائے ان کو یہاں سے ہجرت کر کے اپنی ایک قوم کی تشکیل کرنی چاہیئے۔

اس نے پہلی صیہوانی کانفرنس میں حصہ لیا اور اپنے مستقبل کی سیاست کے بارے میں اپنے خیالات کو چھاپا۔ Tawain سے اس کی ایک ملاقات 1894 میں ہو چکی تھی، اور وہ اس ملاقات میں Tawain کی ظاہری شخصیت سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس نے Tom Sawyer اور Huckleberry کے خالق کو ایک انگریز سمجھ کر اس کی غلط شناخت کی تھی۔

چار سال بعد ہونے والی ان کی اگلی ملاقات دونوں ہی کے لئے زیادہ اطمینان بخش

تھی۔ Tawain کو اس کی آنکھیں دیکھ کر Michelangelo کا تراشا ہوا موسیٰ کا مجسمہ یاد آیا۔
Herzl کے ڈرامے The New Ghetto کا ابتدائیہ دیکھ کر جس میں Samuel نامی ایک یہودی کردار کی عیسائی معاشرے سے ٹھکرائے جانے کی کہانی تھی وہ بہت محظوظ ہوا اور اس نے اس کا ترجمہ کرنے کی پیشکش کی، تاکہ اسے نیویارک میں بھی دکھایا جا سکے۔ اس نے Herzl کی تحریک کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا، اور بظاہر یہودی ریاست کے قیام کی مخالفت کے بجائے اس کی حمایت کرنے کی حامی بھری۔ اگر یہ چالاک ترین دماغ ایک آزاد ملک میں اپنی ریاست کا قیام چاہتے ہیں تو ان کو روکنا اچھا نہیں ہوگا اگر گھوڑے کو یہ پتا چل جائے کہ اس میں کتنی طاقت ہے تو وہ کبھی کسی کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے گا۔

Tawain نے اس ڈرامے کا ترجمہ کبھی نہیں کیا، اس کی ساری توجہ فلپائین میں ہونے بغاوت پر امریکی دباؤ پر تنقید کرنے پہ تھی۔ اس کے باوجود وہ فلسطین میں صیہوانیت کو غلط نہیں گردانتا تھا۔ نا ہی وہ مشرقِ وسطیٰ کے اور کسی حصے میں فرانسیسی اور برطانوی مداخلت کی مخالفت کرتا تھا اس زمرے میں بھی اس کی رائے روائیتی تھی۔ اس کے مطابق زیادہ تر افراد اس امید سے تھے کہ ایک دن مشرقِ وسطیٰ بھی ریاست ہائے متحدہ کی طرح آزاد ہوگا اور یہ تبدیلی فتح حاصل کرنے سے نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت سے آئے گی جس میں اساتذہ، مذہبی پیشوا وغیرہ اہم کردار ادا کریں گے۔

اسلام کے حواری:

1885 سے 1895 تک محض ایک ہی دہائی میں مشرقِ وسطیٰ کے لئے بجٹ سات گنا بڑھ گیا۔ یہ پیسہ چار سو سے زیادہ اسکولوں اور نو کالجوں پر، جن میں 20000 سے زیادہ طلباء کا اندراج ہوا، اور اس کے علاوہ سالانہ 40000 سے زیادہ مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والے نو ہسپتالوں اور دس دواخانوں پر خرچ ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ رسائل، اخبارات، مقدس انجیل، اور امریکی پریس کے ذریعے ترویج پانے والے اخلاقی فلسفے، فلکیات، اور دیگر موضوعات کی کتابوں کی تشہیر کی گئی۔

تبلیغ کرنے والوں نے مشرقِ وسطیٰ کی تعلیمی اور اخلاقی قدروں کو بلندی بخش کر اس کو امریکہ کے لئے فخر کا باعث بنایا تاکہ وہ اس کو برطانوی لالچ کے آگے بے نفسی اور ایثار کا پیمانہ اور

نمونہ بنا کر پیش کر سکیں۔ امریکہ کے سائمن ولف نے قاہرہ کے قونصل خانے سے بیان دیا کہ۔
"ان خواتین کی تعریف نہیں کی جا سکتی جو اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہیں، سو خوف کھاؤ آگ برسانے والے سورج اور ان کی بنجر زمینوں سے، میں، ایک امریکی، ان مصریوں کی رحم دلی اور اعتماد کی داد دیتا ہوں"۔ اس کے ساتھی Lewiss Idding, نے کہا کہ امریکہ مصر میں ایسے ہی ہے جیسے انگلستان، برطانیہ نے ملک کی معاشرتی صورتحال بہتر بنائی جبکہ امریکہ نے اس کے لوگوں کو باوقار شہری بنایا"۔ ان کامیابیوں میں تبلیغ کرنے والوں کا ہاتھ بھی تھا مگر ان کی ناکامی یہ تھی کہ وہ اپنا اصل مقصد فراموش کر گئے تھے۔ لبنان میں انجیل کے ایک پیروکار نے کہا کہ اسلام کے خلاف جنگ میں ہم نے اب تک صرف اپنی ڈھال استعمال کی ہے اور ہم اب تک فتح کا پرچم نہیں لہرا سکے ہیں"۔ اس بات سے وہ اس امر کی نشاندہی کر رہا تھا کہ کئی سو کلیساؤں کی تعمیر اور تبلیغیوں کی محنت کے باوجود تبدیل ہونے والوں کی تعداد قابلِ ذکر نہیں۔ کئی ریاست ہائے متحدہ تک بعد میں آئے ہیں اور اتنی تعداد میں آئے ہیں کہ شام پروٹیسٹنٹ کالج کے پروفیسروں کو اپنے لیکچر کی زبان تبدیل کرنی پڑی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تہذیبی یا مادی سطح پر کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو پروٹیسٹنٹ امریکیوں کو اضافی حقوق سے دور لے جا سکے۔ مشرق کے برعکس مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کو انجیل کے پیروکاروں سے ہدایت لینے کے ساتھ اپنی بنیاد پر قائم رہنے میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ایک ڈاکٹر نے بیان دیا کہ ہسپتال میں کوئی شخص یسوع مسیح کے بارے میں سیکھنے کے لئے اتنی چاہ کے ساتھ نہیں آتا جتنی چاہ سے وہ اپنا آدھا حصہ وصول کرنے کے لئے آتا ہے۔

ان کی ناکامی Alexander Web کے معاملے میں دیکھی جا سکتی تھی جو کہ نیویارک سے تھا اور فلپائین کی قونصل میں اپنی خدمات انجام دیتا تھا۔ 1888 میں اسلام قبول کر کے پانچ سال بعد وہ اپنے آبائی شہر لوٹ گیا جہاں اس نے پہلی مسجد تعمیر کی اور مسلمانوں کا پہلا اخبار نکالا، ریاست ہائے متحدہ میں اسلام کے لئے اس کی کوششیں اتنی کامیاب نہیں تھیں جتنی مشرقِ وسطیٰ میں عیسائیت کے لئے عیسایوں کی مگر اس کی مشکلات بھی عیسایوں سے کم تھیں۔

ان رکاوٹوں کے پیشِ نظر کچھ امریکیوں نے "جدید تبلیغ" کی طرف رجوع کیا، یہ اصطلاح Howrad Bliss کی ایجاد کی ہوئی تھی جو کہ اپنے والد کے بعد شام پروٹیسٹنٹ کالج کا صدر بنا تھا۔

ان کا مقصد ''معاشرتی انجیل'' پڑھانا تھا جس میں کسی تبدیلی کے بغیر یسوع مسیح کا ہر ممکن ذکر کیا گیا تھا۔ اس مطلب Howrad Bliss اور اس کے ساتھیوں کے لئے یہ تھا کہ تعلیم اور صحت کے ادارے ایسے ہی بڑھتے رہیں گے اور ان میں انجیل کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ مشرقِ وسطی اس طرح سیاسی اور شعوری سطح پر امریکہ جیسا ہو جائے گا اور آئینہ داری مسلسل ہی رہے گی۔

ان میں سے کسی نے بھی عرب کے علاقے میں قدم نہیں رکھا جہاں کی زمین خشک اور رقبہ کم و بیش ریاست ہائے متحدہ کی مغرب Mississippi کے برابر تھا۔ اب اس علاقے میں سعودی عرب، آزاد امارات اور خلیج فارس آتے ہیں پہلے یہ پورا عرب عثمانیہ سلطنت کا حصہ تھا۔ یہ علاقہ جس میں مسلم دنیا کا دل مکہ اور مدینہ جیسے مقدس شہر بھی تھے شدت پسند وہابیوں کی آماج گاہ تھی۔ اس تحریک نے ایک سعودی خاندان کے ساتھ مل کر اور اس کے وہابی جنگجوؤں کو دوسرے صحرائی قبیلوں سے جنگوں میں متحرک کیا یہ ماحول مسلمانوں کو تبدیل کرنے کے لئے مناسب نہیں تھا۔

ولندیزی (Dutch) وزیر Zwemer کے 13 بیٹوں میں سے ایک کا یہ یقین تھا کہ وہ سمندر رپار انجیل کے دعوت دینے کے لئے پیدہ ہوا ہے۔ اسکول میں وہ گھنٹوں تال ناپ کو گھورتا رہتا جسے اس کے استاد نے جماعت کے آگے رکھا تھا۔ وہ انجیل کی اس آیت پر یمان لا چکا تھا، مگر اس کی حکومت نے اس کام میں مالی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور Zwemer کو تمام انتظامات خود کرنے پڑے۔ اس نے نقشہ پڑھنے، علمِ طب اور عربی زبان کے بارے بہت کچھ سیکھا اور آخر کار ۱۸۹۰ کو وہ اسلام کے دل کی طرف روانہ ہوا۔

وہ پہلے قاہرہ اور پھر وہاں سے جدہ کے سمندروں کی طرف گیا۔ اس نے اپنے ساتھ بہت کم زادِ سفر رکھا تھا، جس میں Charles M. Doughty کی لکھی ہوئی کتاب، ''عربی صحرا کا سفر'' کی دو جلدیں تھیں۔ ان کتابوں کو اس نے بعد ازاں ایک نوجوان برطانوی افسر T.E Lawrence کو فروخت کر دیا۔ اس کا دعوی تھا کہ وہ یہاں آنے والا پہلا مغربی ہے۔ جزیرہ نما کے گرد چکر کاٹنے کے بعد وہ خلیج فارس سے بصرا کی طرف روانہ ہوا، جہاں اپنے پرانے دوست James Cantine کے ساتھ مل کر اس نے پہلی بار سکونت اختیار کی۔

امریکیوں پر کھلا کہ مسلم علاقوں کے وسط میں اپنی تعلیمات کو عام کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ دراز قامت اور گھنے بالوں والے Zwemer کو اس جرم کی پاداش میں گھر میں محصور کر دیا گیا

اور اس پر پابندی لگا دی گئی لیکن جیسے تیسے وہ وہاں سے نکل آیا اور بصرا آ گیا۔ اس نے عمان میں قیام کیا۔ اسے وہ جہازی یاد تھے جو چھپکلیوں کو مار کر کھاتے، جو خانہ جنگی میں شامل تھے اور فارسی سونے کے امریکی متلاشی تھے۔ اپنے سفر کے دوران اسے کئی بار لوٹا گیا، اسے سر قلم کر دینے کی دھمکی ملی اور سخت گرمی میں پیاسا رکھ کر اس پر تشدد کیا گیا۔ ''اونچی نیچی زمینوں میں پہلا سفر مشکلوں کے بنا نہیں ہو سکتا،'' اس نے کہا، اس کا بھائی Peter اس سے آملا، اس کے ساتھ ساتھ کامل اعتانی اور برطانوی تبلیغی Amy Wilkes بھی اس سے مل گئے، بعد میں اس ہی سے Zwemer نے شادی کی جس سے اس کے چھ اولادیں ہوئیں اور اس خاندان نے ساتھ مل کر اپنا کام جاری رکھا۔

امریکی تبلیغیوں کی ایسی خدمات مشرقِ وسطی میں روایت بن چکی تھی مگر اس خاندان کو اسکی قیمت چکانی پڑی، Zwemer کی دو بیٹیاں اور اس کا بھائی سخت بیمار ہو گئے، کامل بھی فوت ہو گیا اور ساتھیوں کے مطابق اسے اس کے اپنے باپ نے زہر دے کر قتل کیا تھا۔ یہ سب قربانیاں دینے کے بعد آخر کار Zwemer کو تسلیم کرنا پڑا کہ عربوں کو کسی اور مذہب کی طرف راغب کرنا بے حد مشکل ہے۔

اس نے وہاں دوسرے تبلیغیوں کی طرح سکول قائم نہیں کئے اس کا ماننا تھا کہ یہ سکولؒ کبھی ترقی نہیں کر سکتے لیکن اس کا کہنا تھا ایک دن عرب میں تعلیم کا معیار وہی ہوگا جو آج امریکہ میں ہے۔ Baltimore سے لائے جانے والے حکیم Paul Harrison نے کہا، ''سب تبلیغی یہ کر سکتے ہیں کہ خیال کرنے والوں کو عیسائی زندگی کا ایک تصور دیں اور ان کو بھی ایسی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کریں''، اس حقیقت نے کہ آج تک وہاں آنے والا کوئی بھی مریض عیسائی مذہب کے مطابق پاک پانی میں غوطہ زن نہیں ہوا ان کے یقین کو کمزور تو کیا مگر ختم نہیں کیا۔

اس نے ایک اور کام مشرقِ وسطی اور امریکہ کے درمیان رابطے کا بھی کیا، اس نے مسلم دنیا کے بارے میں، اس کی ساخت اور اس کے عقائد کے بارے میں کئی کتابیں لکھیں۔ عرب سے واپس آ کر اس نے Princeton University میں تعلیم دی اور وہاں پر مشرقی تعلیم کا شعبہ قائم کیا جہاں پر کئی پشتوں تک طلباء نے تعلیم حاصل کی اور مشرقِ وسطی میں اپنی خدمات دیتے رہے۔ کہا گیا کہ ''امریکی مذہبی فلاحی اداروں کے پاس یہ صلاحیت ہے کہ وہ فلاحی اور مذہبی سرگرمیوں کے ساتھ کاروبار میں بھی ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔'' عرب ان خدمات کو اگلی صدی کے اوائل میں یاد کریں گی جب

انہیں تیل کے لئے برطانیہ اور امریکہ میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا۔

پہلے مشنریز کے برخلاف ان Zwemer کا مقصد ریاست ہائے متحدہ کا اقتصادی اور سیاسی مفاد بھی تھا۔ امریکی مذہبی عقائد کی عرب میں تخمداری امریکہ کے لئے خوش آیند ہو سکتی تھی۔

امریکی صلیبی جنگ کے سپاہی:

انیسویں صدی کے آخر میں مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مداخلت بہت واضح تھی۔ وہ وہاں با قاعدگی سے اپنی حکمتِ عملی کو روا رکھتے تھے۔ جبکہ عالمی سطح پر شاہی نظام کو جنگ کا آلہ کار بنایا گیا تھا۔ Josiah Strong نے دعدہ کیا کہ ”دنیا میں برائی کے خاتمے کے لئے امریکہ خدائی ہاتھ کا کردار ادا کرے گا، ہماری زمین اس فیصلہ کن عیسائی جنگ میں نمایاں کردار ادا کرے گی،“۔ اور اس دوران تبلیغی، سپاہی اور شہری ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے، نہ صرف عرب میں بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں۔

خارجہ پالیسی میں یہ تبدیلی اور انجیلی گرم جوشی خاص کر ایران میں دیکھنے کو ملی۔ امریکی تبلیغی ہمدان اور تبریز میں پہلے ہی سرگرمِ عمل تھے مگر ریاست کو ان علاقوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ 1856 میں ریاست ہائے متحدہ اور ایران کے درمیان ہونے والا تجارتی معاہدہ کبھی بروئے کار نہیں آیا۔ نا ہی دونوں اقوام نے اپنے سفیر ایک دوسرے کی طرف روانہ کئے۔ یہ صورتحال 1883 میں تبدیل ہوئی کہ جب قاچار کے حاکموں نے امریکہ سے درخواست کی کہ وہ وہ برطانیہ اور فرانس کی ایران پر قابض ہونے کی کوششوں کے خلاف ان کی مدد کریں۔ Chester Arthur نے فوراً اس بارے میں اقدامات کئے جس کی وجہ محض ہمدردی نہیں بلکہ اس دوران وہاں موجود تبلیغیوں کی حفاظت بھی تھی۔

ایران میں ہونے والے پہلے پہلے سرکاری اقدامات Wheeler کی قیادت میں ہوئے جو کہ 86 سالہ تبلیغی سیموئل گرین کا بیٹا تھا۔ وہاں اس کا استقبال شاہی وفد نے کیا جس میں چھ گورنر اور ایک ہزار شاہسوار موجود تھے اس کے مطابق یہ سب سے بہترین یورپی وردیاں تھیں جن میں کچھ کچھ شرقی جھلک بھی تھی۔ ایک مصور کی نظروں سے اس نے ملبوسات اور دیگر انتظامات کو بغور دیکھا، خاص کر شاہ نصیر الدین کے لباس کو جس میں ہیرے جڑے تھے۔ قاصد نے ان تمام اشیاء

کے بارے میں جن میں لوہا، تانبا، پیتل، گنا، چاول، تمباکو، کوئلہ، اور گرم ملکوں کے پھل شامل تھے بتایا جو وہ امریکی جدید اسلحہ کے بدلے میں دینے کے خواہاں ہیں مگر ریاست ہائے متحدہ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا، تبلیغیوں کی حفاظت کے علاوہ ان کی وہاں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے بعد بھی مشرقِ وسطیٰ میں مشنریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف کام کرنے پر ریاست ہائے متحدہ کو مجبور کیا کہ وہ اس علاقے کے لئے بہتر منصوبہ بندی کریں۔ Baskerville کی ہلاکت نے جو کہ ایک دیہاتی تبلیغی تھا اور تبریز میں تبلیغیوں کا دفاع کرتے ہوئے مارا گیا ایران میں سیاسی احتجاج کو جلا بخشی اور یہ محض ایران تک محدود نہیں رہا بلکہ ریاست ہائے متحدہ نے ترکی میں بھی ڈیوڈ پرٹر کی پالیسی کو رد کر دیا۔ لفٹیننٹ چارلس سپیری نے 1885 فروری کو لکھا کہ ”ترکوں پر ایک تبلیغی کو زندہ نذرِ آتش کرنے کا الزام ہے، کیا اب بھی ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے سلطان کو مطمئن کرتے رہیں گے؟“۔ چرچ اور ریاست کے درمیان اختلافات مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کے لئے پریشان کن تھے۔ Sperry کو Lew Wallace کے ساتھ عیسائی مقامات کے دورے پر بھیجا گیا۔ Sperry کے مطابق اس دورے کا خرچہ عوام نے برداشت کیا۔

مذہبی اور سرکاری عوامل کی درمیانی لکیر کو تبلیغیوں کے امریکہ کی خارجہ پالیسی پر اس طرح اثر انداز ہونے نے اور بھی مٹا دیا۔ اب ان کی رسائی تہذیبی اداروں تک بھی تھی۔ انہوں نے مشہور امریکی یونیورسٹیوں خاص کر پرنسٹن کے ساتھ روابط بنائے رکھے۔ ساتھ ہی Morgans اور Roosevelts جیسے بااثر خاندانوں سے بھی ان کے روابط تھے۔ وہ اسی معاشرتی ماحول کو اپناتے چلے گئے۔ سیاسی شخصیات اپنے بچوں کو ان ہی کے تعلیمی اداروں میں بھیجا کرتیں، وہ ان ہی کے ساتھ شادیاں کیا کرتے۔ فیصلہ کرنے والوں سے ذاتی روابط کی بنا پر یہ تبلیغی اپنے مقاصد کو امریکی خارجہ پالیسی میں اولیت پر رکھواتے، خاص کر مشرقِ وسطیٰ کے لئے۔ قونصل سے ایک نے بیان دیا کہ اس کے وقت کے دس میں سے نو حصے انہیں تبلیغیوں کے اغراض و مقاصد کی دیکھ ریکھ میں صرف ہوتے ہیں، ان کے سربراہان کو دیکھ کر ہمارے سربراہان لرز جاتے ہیں۔

امریکہ اس سب سے چاہے خوش ہو مگر اس علاقے کے حکمران اس سے خوش نہیں تھے۔ بڑھتی ہوئی شدت کے ساتھ عثمانیوں نے تبلیغیوں کی بے ادبی اور ساحل پر ریاست ہائے

متحدہ کے جنگی جہاز کی موجودگی کی شکایت کی۔ یہ تناؤ بڑھتا گیا اور آخر کار 1890 میں اس کا نتیجہ امریکیوں کا قتلِ عام ہوا۔

قدیم اجداد سے تعلق رکھنے والے آرمینی جو Black Seas اور Caspian کے درمیانے خطے میں ایک اقلیت کی حیثیت سے پھل پھول رہے تھے عیسائی تھے، جو بظاہر محفوظ تھے مگر عثمانیوں کے ہاتھوں اکثر ستائے جاتے تھے۔ اعلیٰ عہدیداروں سے تعلقات کی بنا پر ان کو ان پر عیسائی طاقتوں اور روس سے ملے ہونے کا شک بھی تھا جو سلطنت کے خلاف سازشوں میں مشغول تھے۔ یہ مخالفت اس وقت کھل کر سامنے آئی جب ترک افواج ایک علاقائی باغی کو کچلنے گئیں اور انہوں نے تمام بستیوں کو تحس نہس کر دیا اور وہاں کے تمام رہنے والوں کو قتل کیا۔ Trebizoned نے بیان دیا، ''ہر آرمینی کو قتل کیا گیا اور تمام گھر جلا دئے گئے، گلیوں میں لاشوں کے انبار لگے تھے جو خوفنات موت کی شہادت دے رہے تھے، 20000 آرمینی قتل کئے گئے اور کئی گھر جلائے گئے''۔

New-York Times نے ستمبر 1895 میں اسے ''آرمینی ہالوکاسٹ'' کہا اور وہ لفظ استعمال کیا جو بعد میں قتلِ عام کے لئے اصطلاح بن گیا۔ پورے امریکی پریس نے آرمینیوں کو بچانے، اور ترکی سلطنت کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ پادری بھی متحد ہو کر آرمینیوں کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، باوجود اس کے کہ ان میں سے بہت سے مشرقی راسخ الاعتقاد عیسائی تھے۔ کہا گیا کہ ''عرب کے تمام عطر مل کر بھی ترکوں کے ہاتھ صاف نہیں کر سکتے جنھوں نے عیسائی علاقے پر بھی تسلط رکھا ہے''۔ Newton Blanchard نے مطالبہ کیا کہ امریکہ کو مداخلت کر کے یہ سب ختم کرنا چاہئے۔ اس ہی کے ساتھ Shelby نے کہا کہ نفرت کے اس عفریت نے تباہی، بربادی اور خونریزی کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ 1896 میں صدر بننے کے بعد William McKinley نے بھی اعلان کیا کہ وہ آرمینیوں کا دفاع کرے گا۔

آرمینی قتلِ عام کی طرف امریکہ کے ردِعمل کی دیگر وجوہات بھی تھیں۔ ان کی اسلام دشمنی اور عیسائیوں کا مسلمانوں کے تسلط میں ہونا۔ ریاست ہائے متحدہ کی خواہش تھی کہ وہ ان محنتی خاندانوں کو ترقی کرتا دیکھیں اور آخر کار امریکی اس خیال سے آپس میں جڑ گئے جس کے لئے ابتک ان کی تربیت ہوئی تھی۔ ان تربیت گاہوں میں سے کچھ کو اس غارت گری کے دوران نقصان پہنچا۔ مطالبہ کیا گیا کہ آرمینیوں کے ساتھ ساتھ انجیل کے پیروکاروں کو بھی بحال کیا جائے جنھوں

نے اب تک ان کی خدمت کی ہے۔

انجیل کے پیروکار Frederick Davis Greene کے مطابق عالمی بحران میں جہاں تک انسانیت کا سوال تھا امریکی حکمتِ عملی قومی وقار کے حساب سے بے اثر تھی آرمینی مفاد کے لئے بیحد نقصان دہ تھی، اس خیال کا اظہار اس نے اپنی تحریر ''آرمینی قتلِ عام'' میں کیا۔ مدد کے لئے تبلیغیوں نے اپنے اختیارات، اور امریکی صدر سے تعلقات کو استعمال کیا۔ صدر نے رابرٹ اور جارج واش برن کو حکم دیا کہ وہ اس بارے میں ترکوں سے وضاحت طلب کریں۔ اس دوران James B.Anglle جس کا تعلق کانگریس سے تھا نے عسکری اقدامات کرنے کی درخواست کی۔

یہ دباؤ کارگر ثابت ہوا اور 1900 میں امریکی 8 جنگی جہاز ترکی کی طرف بڑھا۔ پچاس توپوں سے لیس جنگی جہاز سمرنا پہنچا اور اس کے کپتان نے گورنر کو تنبیہ کی کہ ''اگر قتلِ عام نہ روکا گیا تو میں احکامات کو بھول کر بسنے والے ہر ترک کو بھون کر رکھ دوں گا''۔ مترجم نے اس کی بات کو ذرا نرمی سے آگے پہنچایا۔ سلطان نے 38000 ڈالر کا ہرجانہ تبلیغیوں کو ادا کیا۔

آرمینیا کے لئے اپنی فکر کا اظہار امریکہ نے صرف طاقت سے ہی نہیں کیا۔ اس قتلِ عام کی خبر جلد ہی امریکہ پہنچی جہاں کے ہر بڑے شہر سے مدد گار روانہ کیئے گئے Boston سے Julia Ward Howe جس کے شوہر نے رضا کارانہ طور پر 1825 کو آزادی کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور اس کی وجہ شہرت اس کا لکھا گیا ایک نغمہ تھا نے آرمینیا میں افراد کو منظم کیا۔ نیویارک میں بھی ایسی ہی ایک تنظیم بنائی گئی۔ ایک گرہ جس میں سپریم کورٹ کے جج Justice David Josiah Brewer, Jacob Schiff اور Chauncey Depew شامل تھے نے مالی امداد کی۔ جبکہ کم استطاعت کے لوگوں نے اپنے اپنے طور پر امداد کی۔ خاص کر امریکی خواتین نے۔ امداد مل چکی تھی اور اب مسئلہ اس کو وہاں تک پہنچانا تھا، اور اس امر کے لئے نہ تو ریاست کی مدد لی گئی نا ہی فوج کی بلکہ تنظیم نے ایک 74 سالہ زبردست امریکی عورت کی طرف دیکھا۔

کرسمس کے روز پیدا ہونے والی Clara Barton کے ایک فارم میں پلی بڑی تھی اور بعد ازاں واشنگٹن میں ایک استانی کی حیثیت سے زندگی گزار رہی تھی خانہ جنگی نے اسے ایک نیا پیشہ فراہم کیا تھا۔ وہ زخمی سپاہیوں تک ادوایات اور دیگر سامان پہنچایا کرتی تھی۔ اس کو Angel-of-Batlefield کا اعزاز دیا گیا تھا۔ جنگ کے بعد اس نے Frederick Douglass اور

B.Anthony کے ساتھ مل کر خواتین کے حقوق اور نسل پرستی کے خلاف کام شروع کیا، اور یورپ میں ریڈ کراس کے لئے بھی رضا کارانہ کام کیا۔ وہ ریاست ہائے متحدہ واپس آئی اس کی نیت تھی کہ یہاں بھی تنظیم کی شاخ کا اجراء کیا جائے مگر 1881 میں اسے اندازہ ہوا اور اس نے امریکہ میں ریڈ کراس کی بنیاد ڈالی۔

پچاس سال بعد جب وہ اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار ہونے کی عمر میں ایک ایسی عورت تھی کہ جس کی مسکراہٹ دلفریب تھی اور اسکے مطابق یہی مسکراہٹ مخالفین کے مظالم کے خلاف اسکا واحد ہتھیار تھی اس نے خفیہ طور پر ریڈ کراس کے لئے یہ کام کیا اور فوج کی نگرانی میں استنبول میں بھی کام کرتی رہی اس نے عثمانی حکام سے وعدہ کیا کہ نا تو وہ کوئی غلط کام کریگی اور نہ ہی ان سے ایسا کرنے کی امید رکھے گی۔

بالآخر وہ حکمرانوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی اور بلا امتیاز اپنے کام میں جت گئی اس نے آرمینیا کے دور دراز علاقوں میں اپنی مدد پہنچائی جس کی کسی حد تک مخالفت بھی کی گئی اس نے وضاحت کی کہ اس کا کام دنیا میں رحمدلی کی اعلیٰ مثال ہے اور عثمانی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔

یہ امریکی مدد اور سیاسی اور مذہبی اجراء سب کے لئے بلا امتیاز رہا۔ مشرق وسطیٰ میں بسنے والے ہر مظلوم کی مدد کئی دہائیوں تک امریکہ نے کی ان کا یقین تھا کہ جہاں وہ دنیا کے بڑے حصے پر حکومت کے حقدار ہیں وہ انسانیت کی مدد بھی کرتے ہیں انہوں نے ان الفاظ میں امریکہ کی تعریف کی" آزادی، عیسائیت اور ثقافت کا اعلیٰ ترین علم بردار جو انسانیت کی مدد کے لئے بھیجا گیا"۔ آنے والی کئی دہائیوں تک Barton اپنے کام میں جتی رہی مشرق وسطیٰ میں امریکی روابط شاہی نظام اور انسانیت کے علم برداروں، اور Barton کے درمیان جھولتے رہے۔

اس عظیم رابطے میں قیاس کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی پھر بھی اس بارے میں خوش گمانیوں نے امریکہ کو گھیرے رکھا امریکی ذہنوں میں ان حسین خیالات نے اپنا رنگ جمایا اور ان خیالات کو مشرق وسطیٰ کے بارے میں لکھے گئے ناول اور سیاحت نے جلا بخشی۔

شاہی اساطیر

کیلی فورنیا کے ایک جوڑے نے اپنے براعظم میں ایک شاندار نظارہ کیا جس نے

600 ایکڑ زمین کو جاپانی پھولوں ہوٹلوں نشستوں اور دیگر چیزوں سے سجایا گیا تھا۔ سینچری میگزین کے مطابق زمین انسانیت کو روشنی سے روشن تھی جو سمندر پار شمع سے آرہی تھی اور ساری دنیا کو جگمگانے والی تھی۔

یہ جشن کولمبیا کی 400 سالہ دریافت کے ساتھ ساتھ امریکہ کے ذرعی ملک سے صنعتی ہونے کا تھا اس نے بہت سے مزدوروں کی توجہ حاصل کی اور اس کا مقصد تمام امریکیوں میں فخر کے جذبات کو ابھارنا تھا جوق در جوق امریکی شکاگو پہنچے 27.5 ملین افراد جو کہ 43 علاقوں اور ریاستوں سے آئے تھے اس جشن میں شامل تھے

دیگر افراد کی طرح وہ بھی ریل سے وہاں پہنچے بعد ازاں وہ جوڑا مشرق کی طرف اس عظیم شہر میں بڑھا جس میں 200 بڑی عمارتیں تھیں جن میں سے سب سے بڑی کی چھت کو صرف George Ferris کے 264 فٹ کے پہیے سے دیکھا جا سکتا تھا وہ وہاں سے دیگر عظیم شاہکار دیکھنے گئے جن میں 23 ملکوں کی تہذیب اور امریکی خواتین محنت کی نمائش کی گئی تھی وہ اس نقشے کو دیکھ کر حیران تھے اور Thomas Edison کے کائنٹک سکوک کا نظارہ کر رہے تھے وہ موت کی سزا کے جدید آلے الیکٹرک چیئر کو دیکھ کر بھی حیران تھے انہوں نے مشی گن کی ندی کے کنارے ناشتہ کیا اور 200000 برقی قمقموں سے روشن شہر کو دیکھا۔

آگے جانے کی بجائے یہ جوڑا جنوب میں واقع باغ کی طرف گیا جہاں ان کی تفریح کے لئے بہت کچھ تھا جن میں سب سے زیادہ دلچسپ غبارے کی سیر تھی پھر یہی جوڑا مشرق وسطیٰ تک پہنچا۔

الجزائر:

1893 میں چند امریکی ہی سولہ سال پہلے ہونے والی نمائش کو یاد کر سکتے تھے اور بہت سے اسے دوبارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ Sol Bloom جو 1876 میں بچہ ہی تھا مشرق وسطیٰ کو امریکہ میں دیکھنے کے خواب دیکھتا تھا اور اس کے یہ خواب پیرس میں اجاگر ہوئے تھے۔

پولینڈ سے آنیوالے یہودی جوڑے کی وہ چھٹی اولاد تھا اس نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور سات سال کی عمر سے نوکری شروع کر دی تھی اور بہت جلد وہ تھیٹر تک آ پہنچا تھا انیس سال کی عمر تک اس کے پاس خاصی دولت تھی اس نے یورپ کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ عالمی

نمائش میں پہنچا جہاں پر قدرتی اور تیکنیکی عجائب اس کے منتظر تھے اس کے لئے سب سے دلچسپ وہ اشیاء تھیں جن کا تعلق مشرق وسطیٰ سے تھا۔اس نے کہا" مجھے پتہ چلا کہ عرب سے آنیوالے اس شعبدہ گر کی تہذیب جو تلواریں نگلتا ہے ان دیہاتیوں سے بہتر ہے جو پنیر اور مٹھائیاں بناتے ہیں" ساٹھ سال بعد تک اس نے اس تماشے کو یاد رکھا۔

اس تجربے نے اس کی کاروباری حس کو بھی جلا بخشی مجھے پتہ تھا کہ مغرب میں شیشہ چبانے والا بچھو کھانے والا تلواریں نگلنے والا کوئی تماشہ گر نہیں ہے لہٰذا ان کے ذریعے میں بہت دولت کما سکتا ہوں"۔

فرانسیسی زبان سے نابلد بڑی ناک اور چھوٹی آنکھوں والا یہ شخص بظاہر پیرس میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا پھر بھی امریکہ میں کمائی گئی دولت کے ذریعے اس نے الجزائر کے ایک گاؤں میں وقدم جمائے اس نے کہا" کہ باقی دنیا کو تھوڑا انتظار کرنا پڑیگا جب تک میں الجزائر کے اس گاؤں کو امریکہ تک نہیں لے آتا" فرانسیسیوں کو اس میں حصہ دلانے سے زیادہ مشکل Bloom کے لیئے شکاگو سے میزبانی حاصل کرنا تھا منتظمین اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے ان کے مطابق اس شخص کو تفریحی ذمہ داریاں سونپنا ایسا ہے جیسے البرٹ آئن اسٹائن کے ذمہ کسی سرکس کا لگا دیا جانا مگر Bloom نے ان کو غلط ثابت کیا اور ثابت کیا کہ نا صرف الجزائری بلکہ مصری مراکشی سوڈانی اور ترک بھی ایسا کر سکتے ہیں۔انکی مسلم دنیا میں نمائش کی جا سکتی ہے۔تونس میں Edwin اور مصر میں Morvecia کے آنے کے بعد ریاست ہائے متحدہ نے اپنے یہودی شہریوں کو مشرق وسطیٰ جانے کا راستہ سمجھا یا ایک اور امریکی یہودی ایسا ہی کام کر رہا تھا Bloom کی نیت نا تو اپنے ملک کی طاقت مشرق وسطیٰ پر مسلط کرنا تھا نہ ہی وہاں کے امریکیوں کو محفوظ کرنا تھا اس کا مقصد صرف مشرق وسطیٰ کے عجائب کو امریکیوں تک لانا تھا۔

مڈوے کا مشرق وسطیٰ:

Grovercleveland کی تقریب سے پہلی مئی 1893 سے اس نمائش کا آغاز ہوا ابھی اس میں کام باقی تھا مگر مشرق وسطیٰ کا حصہ بے حد پسند کیا جا رہا تھا خوشنما لباسوں میں درجنوں عورتوں نے صدر کو الجزائری گاؤں خوش آمدید کہا جس نے بیان دیا کہ اس نے اس سے پہلے ایسا کچھ نہیں

دیکھا صدر نے یہ اقرار بھی کیا کہ اس وقت وہ مسائل کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا نہ ہی اس امریکی مجمع کے بارے میں جو یہاں کھنچا چلا آیا تھا ان کا اصل مقصد وہاں کی قیاس آرائیوں کو یہاں پیش کرنا تھا جس میں وہ کامیاب رہے تھے۔

Mrs. Stevens جو کہ اس کے سحر میں تھیں نے یہ اندازہ لگانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ آنیوالوں میں سے کتنے صرف تماشہ گر ہیں اس کو شعبدہ گروں کا سب سے بڑا جتھا قرار دیا گیا تھا اور Kodde جو کہ سب سے بڑا درویش مانا جاتا تھا کو امریکی قرار دیا گیا تھا۔

کچھ نے مشرق وسطیٰ کی عورتوں مردوں اور بچوں کو نوکری کا موقع دیا تھا اور انہوں نے وہاں جیسا ماحول بنا دیا تھا جس کو امریکی دیکھ سکتے تھے وہ ان چالیس دکانوں سے گذر سکتے تھے جن کو عظیم بازار کہا گیا تھا اور ترکی ڈرامے سے لطف اندوز ہو سکتے تھے اس کے علاوہ حقہ اور مکی کافی بھی وہاں دستیاب تھی۔

ترکی حصہ جو Jozeph Levy کے زیر نگرانی تھا بھی بہت شہرت پا رہا تھا اور شیشہ گھر اور مومی عجائب خانے کے ساتھ مراکش کا حصہ بھی اتنا ہی مشہور تھا اس کے علاوہ لکڑی بالکونیوں فواروں مساجد کے ساتھ مصری بھی شامل تھے جن میں سے 180 درویشوں فقیروں نجاشیوں کے لباسوں میں ملبوس تھے گدھے کتے بندر اور اونٹ بھی وہاں لائے گئے تھے۔

اس نمائش میں قدیم مقبروں اور مصری عبادت گاہوں کی نقل بھی کی گئی تھی جو کہ کم دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی حیران کن تھا Mrs. Stevens نے کہا کہ جب چاندنی ان مقبروں اور قبروں کو روشن کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم واقعی مصر میں ہیں

اس نمائش میں اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ تھا وہاں پر تھیٹر موجود تھے اور ایرانی شامیانے میں خواتین محو رقص تھیں جنہوں نے علاقائی ملبوسات پہنے ہوئے تھے وہ سانپوں اور موم بتیوں کے ساتھ بانسری کی دھن پر رقصاں تھیں Mrs. Stevens نے لکھا کہ رقص کا یہ شاندار انداز دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شیریں وجد کے عالم میں ہو اس نے اس رقاصہ کو یاد کیا جس نے خود کو دیکھنے والوں کی طرف اڑا کر موسیقاروں اور تماشائیوں کو حیران کر دیا تھا۔

یہ تمام نمائشیں مردوں کے لئے خاصی دلچسپ تھیں کیلیفورنیا کا دولہا اب اپنی بیوی سے جدا ہو کر تھیٹر کے باہر استانی سے مل رہا تھا کسی نے کہا کہ یہ مشرق کا خاصہ ہے کہ نا کہ عیسائی زمینوں کے

جذبات۔ رقاصہ کے جسم کی ہر حرکت حیوانیت کی یاد دلاتی ہے ان میں سے ہر کوئی شام کے فرید مظہر کی طرح نہیں تھا اس کا رقص ہوشربا تھا جس کا ساتھ ہلکی موسیقی نے دیا تھا وہ اپنے تماش بینوں کو حیران کر دیتی خاص کر مردوں کو ایک تماشائی کے مطابق وہ لہراتی تھی بل کھاتی تھی اس کی نیم وا آنکھیں اور خوابیدہ مسکراہٹ اس کے سفید دانتوں کو نمایا کرتی تھی اس کے جسم کی ہر حرکت جذبات کو ابھارتی تھی آدھے چہرے پہ نقاب لئے وہ سانپ کی طرح محورقص تھی۔

تمام تماش بین اس رقص سے محظوظ نہیں ہوئے تھے اور ان میں ایک Anthony Comstock بھی تھا جس نے اپنی کتاب "ایک ہزار ایک عربی راتیں" میں لکھا کہ ایسے تماشوں کو غیر قانونی قرار دینا چاہیے عمر رسیدہ جولیا نے بھی اس رقص کی مذمت کی اور اسکو انتہائی غیر اخلاقی ٹھہرایا مگر زیادہ تر افراد اس سے محظوظ ہوئے۔

یہ نمائش بے حد کامیاب رہی اور ساٹھ فیصد سے زیادہ آمدنی کا باعث بنی قریب پچاس ہزار لوگوں نے اونٹ کی سواری کی اور بہت سے سیاحوں نے اس تجربے کو پسند کیا نیویارک کے سنیٹر نے کہا کہ ان غیر تہذیبی تشدد پسند لوگوں کو اس طرح کے تماشوں میں دیکھنا اچھا ہے جبکہ Mrs. Stevens نے کہا کہ یہ سب نئے بیت الاقدس کا نمونہ ہے بہ ہر حال بہت سے لوگوں کے لئے یہ تفریح کا موقع تھا جیسا کہ Jhon Hay Bloom کے پاس خوش ہونے کی تمام وجوہات تھیں اس کے ہاتھ سونے کی کان لگ گئی ہے وہ نیو یارک تک پہنچا اور کانگریس میں اس نے اہم کردار ادا کیا مشرق وسطیٰ سے تعلقات بنانے میں بھی اس کا اہم کردار رہا اس نے سپیرن کے گانے کو کاپی رائٹ کروایا اور کہا کہ وہ اس الجزائرئی کو بھی یاد کرتا ہے جو کہ اس دوران اسکا محافظ تھا۔

شکاگو کا یہ میلہ صرف چھ ماہ تک رہا مگر Bloom کے مشرقِ وسطی کی یادگار جسے ''ہارون الرشید کا نیا خلیفہ۔'' کہا گیا تھا آنے والی کئی دہائیوں تک لوگوں کے ذہنوں میں رہی۔ رقص کو اور زیادہ دل فریب بنا دیا گیا اور اس رقاصہ کی کئی جگہ نقل کی گئی، وہ ایک طرح کا معیار بن گئی۔ امریکیوں کی ایک نسل یہ نغمہ گاتی رہی کہ ''اس نے دوبارہ وہ گلی نہیں دیکھی،'' جب کہ بچے اس کی مشرقی دھن کے گرویدہ رہے۔ اس سب سے متاثر ہو کر دنیا کے تمام میلوں میں مشرقِ وسطہ کا حصہ رکھا گیا اور کے نام بھی ویسے ہی رکھے گئے، جیسے ''ایران، سب سے دلفریب نمائش'' وغیرہ، مشرقِ وسطی کا قیاس کرنے کے لئے اس طرح کی کسی بھی جگہ کا ایک دورہ، ''ایک ہزار ایک

عربی راتیں،'' پڑھنے جیسا تھا، ایسی ہی اور قیاس آرائیوں کو امریکی اذہان پر نقش کر دیا گیا۔

Mid-Way کی بڑی کامیابی نے اس قیاس کو جنم دیا ہوگا مگر منتظمیں اپنا اصل مقصد نہیں بھولے تھے۔ اور زیادہ دلچسپیوں اور تفریحات کے ساتھ انہوں نے معاشی، معاشرتی اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر چھ ہزار سے زائد لیکچر دلوائے۔ جن میں پرنسٹن کے نوجوان پروفیر ایڈرو ولسن اور T. De Witt نے بھی شرکت کی، Wilson نے تعلیمی اداروں کی تعمیر پر جبکہ ولیم بلیک سٹون نے یہودیوں کی حمایت میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اور فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام پر بات کی، اس نے عالمی تضادات کے خاتمے کے لئے بھی اپنی رائے دی اور کہا کہ ان کو پنچائیتی طریقہ کار سے حل کیا جا سکتا ہے۔ مارک ٹوائن کو بھی اپنے افسانوں پر گفتگو کرنے کی دعوت دی گئی مگر وہ معدے کی بیماری کے سبب بستر سے نہیں اٹھ پایا۔ آخرِ کار ان سب کو نہ تو تخیل سے کام تھا نا ہی اعتقاد سے ان کا مقصد امریکی تسلط تھا۔

بتیس سالہ Fredrick Turner نے جو کہ ایک مبلغ تھا اور Harvard کا تعلیم یافتہ تھا کہا کہ ''وہ ایک غیر محتاط پیمبر ہوگا جو امریکہ کی گراں قدر زندگی سے باز رہے گا،'' اس نے کہا کہ امریکی متحرک قوت ان کو انکے اپنی سرحدوں تک لے آئی ہے اور یہ کرختگی اور طاقت سمندر پار وسیع وعریض علاقوں تک جانے میں مددگار رہنے گی۔ لڑکا سادہ دکھائی دینے والے Turner نے کہا کہ ان کو بے نام مگر جارحانہ شہنشاہی نظام کی طرف غور کرنا چاہیئے۔ یہ بیان Twain اور شاہی نظام کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف جاتا تھا جو کہ امریکہ کو یورپ سے مختلف اور بہتر دیکھنے کو خواہاں تھے۔ اس کے باوجود جب ملک نے اکیسویں صدی میں قدم رکھا تو اس کے ساتھ Turner کی آواز تھی نہ کہ Twain کی۔ کہا گیا کہ ''امریکی قوتوں کو مشق کے لئے اس سے بڑے میدانوں کی ضرورت ہے،''۔

خطے کا نیا نام اور اس کی ازسرِ نو تنظیم

مشرقِ وسطی کی اصطلاح سب سے پہلے لندن سے چھپنے والے National Review میں ستمبر 1902 میں دیکھنے کو ملی۔ یہ رسالہ برطانیہ میں شروع کیا گیا تھا۔ مگر اس مضمون کا مصنف امریکی تھا۔ 1867 میں ایک امریکی جنگی جہاز کے افسر Alfred Thayer Mahan نے عربی

ساحلوں کا دورہ کیا تھا اور وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ یہ علاقہ تین برِ اعظموں کے ساحلوں سے ملتا ہے۔کئی صدیوں سے بغداد کابل اور بالغاریہ یا جیسی زمینوں کو جو مسلم حکومت میں تھی مغربی لوگ مشرق کا حصہ کہتے آئے تھے۔اور چین کے مغرب کے لئے کھل جانے کے بعد اور ایشیا میں شاہی نظام کے خلاف جدوجہد شروع ہو جانے کے بعد ان علاقوں کو Far East اور Near East کے نام سے الگ الگ پہچان دینے کی ضرورت پیش آئی تھی ساتھ ہی اور Near East میں عربی اور ایرانی علاقوں کو شامل کیا گیا۔

Mahan نے محض اس ضرورت کو پورا نہیں کیا بلکہ اس نے ایک نئی حکمتِ عملی پیش کی۔بحری اصول مقرر کرنے میں وہ طاق تھا اس نے 1897 میں آنے والی اپنی کتاب،"امریکہ اور بحری طاقت،" میں بڑی قوتوں اور عالمی تجارت کے درمیانی رابطے پر زور دیا۔مشرق اور مغرب کے درمیان رابطوں اور تجارتی راستوں کو برقرار رکھنے کے لئے، بڑی طاقتوں کو افریقہ اور ایشیا کو ملانے والے زمین کے اس حصے پر حکومت کرنا پڑتی تھی جس میں ایشیائی ترکی، مصر، ایران، اور اوقیانوس کے مشرقی علاقے بھی شامل ہیں۔یہ وہ علاقہ تھا جسے وہ مشرقِ وسطیٰ کہتا تھا۔جو قوم اس مشرقِ وسطیٰ، اس کی ساحلی پٹیاں، اس کے کوئلے کے علاقوں پر قابو پا لے گی وہ بہت دور دراز کی انسانی نسلوں اور پوری دنیا پر راج کرے گی۔

Mahan کی سفارشات براہِ راست برطانیہ کے لئے تھیں جو اس وقت خطے کی بڑی نیول طاقت تھی، تاہم امریکہ کا بھی سروکار پیدا ہو رہا تھا۔نیا ملک ہونے کے باوجود، برطانیہ کو توانائی کے استعمال، دیگر اشیا کی پیداوار، میں پیچھے چھوڑ دیا اور بیرونی تجارت میں بازی لیتا جا رہا تھا۔اس کی 64 ملین آبادی جو روس سے صرف دوسرے نمبر پر تھی، دنیا میں کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ کوئلہ، چاندی، سونا کانوں سے نکالتی تھی۔سب سے زیادہ لکڑی کاٹتی تھی۔برطانیہ اور جرمنی سے زیادہ فولاد پیدا کرتی تھی۔جس کے دوسرے ملکوں میں کوئی زیادہ دشمن بھی نہیں تھے۔صدر اس ملک کو چلاتا تھا جس کے پاس خارجہ پالیسی کے لئے وسیع اختیارات تھے۔امریکہ اب یورپی لوگوں کو مشرقِ بعید میں فضیلت حاصل کرنے کے چیلنج کرنے کو تیار تھے۔

خطے میں امریکی اثر ورسوخ بڑھانے کے لئے تجارت میں تنوع اور اس کا حجم بڑھانا ضروری تھا۔یہی امریکہ جسے 1900 میں سب سے بڑا مشرقِ وسطیٰ کے تیل کا خریدار بننا تھا، اب وہ

مشرقِ وسطیٰ کو پٹرولیم اور کیروسین تیل مہیا کر رہا تھا۔امریکہ جو کبھی اپنے تمباکو کے ذائقوں کے لئے مشہور تھا اب ترکی تمباکو اپنے ملک کے قومی برانڈ کے سگریٹ کے لئے برآمد کرنے لگا تھا جس پر اونٹ کا نشان بنا ہوتا تھا۔اس کی برآمدات اور درآمدات کا توازن ایک اور چودہ کا تھا۔انگلینڈ، جرمنی، اور آسٹریا توجہ دلانے لگے کہ ایک خوفناک تجارتی حریف میدان میں آ گیا ہے۔چارلس ایم ڈکنسن Charles M Dickonson نے استنبول میں امریکی سفارت خانے میں خبر دیتے ہوئے کہا کہ امریکن اور یٹنٹل ایجنسی پر دستیاب اشیا گھریلو اور دفتری فرنیچر، ملمع کاری والی اشیا، کچھ دیگر اور ٹائپ رائٹرز ہیں، جو خوبصورت طریقے سے سجائی گئی ہیں۔

رابطوں اور راستوں کے اپنے ہاتھ میں رکھ کر ایک اور اصطلاحی نام بنایا: ماہرِ مشرقِ وسطیٰ۔
اس مہارت کو نومبر 1872 سے دیکھا جا سکتا تھا، جب چودہ سالہ نوجوان جسے پیار سے Teddie بلایا جاتا تھا اپنے خاندان کے ساتھ مصر، شام اور فلسطین تک آیا۔

تمام آنے والوں کی طرح وہ بھی مشرقِ وسطیٰ کے خیال کا شیدائی ہو گیا۔اس نے اپنی ڈائری میں لکھا،"میں اس سرزمین کو دیکھتا تھا، وہ مصر تھا، میرے خوابوں کی سرزمین، وہ زمین جو اس وقت بھی قدیم تھی جب روم اپنی آب وتاب پر تھا، وہ اس وقت بھی قدیم تھی جب Troy لڑی گئی، یہ نظارہ ہزار خیالات کو اجاگر کرتا تھا"۔اس نوجوان کا اسکندریہ کے بارے میں وہی خیال تھا جو انیسویں صدی میں وہاں آنے والے ہر امریکی کا تھا۔وہاں کی ہر شے پراسرار حد تک دیدہ زیب تھی اس نے کہا کہ اس کے بارے میں الفاظ کی مدد سے کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اس خاندان نے نیل کی سیر بھی کی اور ساتھ ہی Ralph Waldo Emerson کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا، اور امریکی تہذیب کے عین مطابق دریا میں شکار کھیلا جہاں Teddy نے ایک چھوٹی چہچہانے والی چڑیا کا شکار کر کے اسے محفوظ کیا، یہ اسطرح محفوظ ہونے والا اس کا پہلا نمونہ تھا۔اس نے ان صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جو ایک دن سیاست میں اس کے بہت کام آنے والی تھیں۔اس نے کہا کہ عرب باتیں بہت بناتے ہیں اور مارک ٹوائن کی طرح گھوڑے کی پشت پر وہ شام اور فلسطین تک گیا۔عام بچوں کی طرح یہ عبادت گاہیں نا صرف عیسائی چرچ بلکہ مسجدِ عمر بھی اس کے لئے دلچسپی کا باعث تھی مگر ساتھ ہی Twain کی طرح اس نے ان خیالات کا اظہار بھی کیا کہ بیت المقدس بہت چھوٹا اور دریائے اردن بہت تنگ ہے، اس نے سوال کیا کہ اتنی تنگ نہر کو

یہاں امریکہ میں کیا نام دیا جاتا ہے۔

روز ویلٹ اس دورے سے واپس لوٹا تو اسے دمے کا مرض ہو چکا تھا مگر وہ اپنی جسمانی طاقت اور قوتِ مدافعت کو یکجا کرنے میں اور بھی زیادہ انہماک سے جت گیا۔ وہ وہاں سے مشرق وسطیٰ کے خیالات بھی لایا تھا جن کو فرضی داستانوں میں اس کی دلچسپ اور رنگین کر دیا تھا۔ 1998 کو کیوبا میں ہونے والی لڑائی میں رضا کارانہ طور پر شرکت کرتے ہوئے اس نے بیان دیا کہ، ''Spain اور ترکی دو ایسی قوتیں ہیں جنہیں میں کچل دینا چاہتا ہوں''۔

Alfred اور Josiah کے مشترکہ دوست روز ویلٹ کا بحری طاقتوں پر اور امریکہ کے ان پر قابو رکھنے پر عجیب اعتقاد تھا۔ اس کے نزدیک اقوام افراد کی طرح انفرادیت رکھتی ہیں کچھ کمزور ہوتی ہیں باقی مضبوط اور اگلی اقوام پر سابقہ کا دفاع فرض ہوتا ہے۔ ان میں کچھ بربریت پسند اقوام ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی زمینوں پر غیر ملکیوں کے حقوق کا دفع نہیں کر پاتیں یا پھر غیر ملکیوں سے اپنی قوم کا دفاع کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ اس نے کہا کہ اس صورتِ حال میں منظّم اقوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان اقوام کی دیکھ ریکھ کریں ساتھ ہی اس نے برطانیہ کو 1898 میں Gordon کے اسلامی حکومت ہاتھوں قتل کی مذمت پر اور مظلوموں کی حمایت پر خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کے مطابق امریکہ کو بھی مشرقِ وسطیٰ میں اور آرمینیا میں ایسی ہی حکمتِ عملی اپنانی چاہیئے اور وہاں کے لوگوں کو ترکوں کے مظالم سے بچانا چاہیئے۔

اس کو پتا چلا کہ ڈاکوؤں نے ایک تبلیغی اور اس کی حاملہ بیوی کو اغوا کر لیا ہے۔ اغوا کرنے والے جو ترکیوں جیسا لباس پہنے تھے اور ٹوٹی پھوٹی ترکی بول رہے تھے دراصل عیسائی باغی تھے جو اپنے مقصد کے لئے مالی مدد چاہتے تھے۔ پچھلی امریکی خدمات کو فراموش کرتے ہوئے انہوں نے حکومت سے اٹھارہ دن کے اندر اندر 100000 ڈالر کا مطالبہ کیا۔

اس حادثے نے Roosevelt کے خیالات تبدیل کر دیئے اور اس کو بد تہذیب عثمانیوں کی آزادی کے لئے کوشاں آرمینائی باشندوں کے خلاف مدد کرنے پر مجبور کیا۔ اس نے کہا کہ امریکی ایک حاملہ عورت کے اغوا کی خبر سن کر کانپ گئے ہیں۔ اس نے وہاں بحری جنگی جہاز بھیجنے پر بھی غور کیا اور کچھ سپاہی وہاں بھیجے بھی مگر اس بارے میں امریکہ کا ردِعمل ایک سوال تھا جس کا کوئی واضح جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کو خطرہ تھا کہ فوج کے بھیجنے سے اغواہ کرنے والے دونوں مغویوں

کی جان لے لیں گے اور وہ کانگریس کے اصول کے مطابق پیسے بھی ادا نہیں کر سکتا تھا، اس انتظار کے سوا کہ عوام اپنے طور پر پیسے اکھٹے کریں، وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

خوش قسمتی سے پیسوں کا انتظام جلد ہو گیا، ا، امریکہ نے مغویوں کے لئے رحم دلی کا مظاہرہ کیا Robert. کالج کے صدر George Washburn نے اغوا کرنے والوں سے بات کی اور ان سے مدت کو بڑہانے کا مطالبہ کیا، اور پہلی مارچ کو ان کے رہا ہونے کی خبر سے تمام امریکیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مگر صدر نے سوچا کہ خواتین کو ایسے علاقوں میں تبلیغ کے لئے نہیں جانا چاہیئے۔

ایک ہی سال بعد دوبارہ مشرقِ وسطیٰ میں Roosevelt کے سامنے ایسا ہی ایک مسئلہ کھڑا تھا۔ 27 اگست 1903 کو یہ خبر امریکہ پہنچی کہ امریکی Vice Counsul کو مار دیا گیا ہے، مقتول ایک پادری کا تیس سالہ بیٹا William Magelssen تھا، یہ خبر سننے کے بعد صدر نے دیر نہیں کی اور تین جنگی جہازوں کو جلد سے جلد لبنان پہنچ جانے کا حکم دیا۔ اس کا مقصد قاتلوں کی جلد از جلد گرفتاری تھا اور اس سے ظاہر ہوا کہ صدر کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ جہازوں کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی امریکہ کو پتا چل گیا کہ Magelssen زندہ ہے، عربی شادی میں چلی والی ایک گولی غلطی سے اس کے کان کو چھوتی ہوئی گزری تھی مگر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ اس بات سے Roosevelt کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا Magelssen کے محفوظ ہونے کے باوجود دیگر تبلیغی وہاں پر غیر محفوظ تھے۔ جنگی جہاز بیروت کے ساحل کے قریب لنگر انداز ہوئے۔ اپنی روشنیاں جلا کر انہوں نے تب تک محاصرے کی دھمکی دی جب تک تبلیغیوں کے محفوظ ہونے کی یقین دہانی نہیں ہو جاتی، اور انکار کی صورت میں قریب پانچ سو فوجی شہر میں اترنے کے لئے تیار رکھے گئے۔

متوقع حملے کی خبر پا کر امریکہ میں موجود عثمانی سفیر بنا بتائے ریاست کے سکریٹری کے دفتر میں داخل ہوا اور اس نے احتجاج کیا کہ ہم نے تبلیغیوں کو اچھی خاصی آزادی دے رکھی ہے اور اس کا یہ نتیجہ ہے؟ شکر گزار ہونے کی بجائے ہمارے ملک کو نقشہ سے مٹانے کے اقدامات ہو رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ فرض کریں کہ میں آپ کے ملک میں ایک سکول کھولوں جہاں نیگرو افراد کو قتل و غارت کی تعلیم دوں تو کیا میں اور میرا اسکول بخشے جائیں گے؟۔

مگر یہ سب بے سود رہا، جنگی جہاز کئی ہفتوں تک وہاں رہے اور آنے والے سال میں ان کو مشرقِ وسطیٰ میں سمرنا بھیج دیا گیا، صدر نے حکم دیا کہ یہ جہاز مسلسل ان ہی پانیوں میں گشت جاری

رکھیں اور مشرقِ وسطیٰ میں بسنے والوں کو امریکی حفاظت کا احساس دلاتے رہیں۔

یہ محض ابتداء تھی ، Roosvelet کے لئے مزید کڑے امتحان آرہے تھے۔طنجہ میں اصل تماشہ 18 مئی 1904 کی شام شروع ہوا جب قریب 200 افراد نے ایک کاروباری Ion Perdicaris کے گھر پر دھاوا بول دیا جس کو سب سے بااثر امریکی شہری کہا جاتا تھا۔حملہ آوروں نے ملازمین پر تشدد کیا اور وہ Ion Perdicaris کو اس کے بھتیجے ساتھ ان پہاڑوں میں اٹھا لے گئے جہاں پہنچنا ناممکن تھا۔وہ اب احمد بن محمد کے قیدی تھے جس کو امریکہ میں Raisuli کہا جاتا تھا۔

Raisuli نے بیان دیا کہ میں قیدیوں کی حفاظت کی قسم کھاتا ہوں ان کو تب تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا جب تک انہوں نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔اس نے کہا کہ اسے جو ریاست ہائے متحدہ سے کچھ نہیں چاہیئے وہ محض مراکش کے سلطان عبدلعزیز سے انصاف طلب کرتا ہے جو مسلسل اس کو نقصان پہنچا رہا ہے،اس نے یہ سب روکنے کا مطالبہ کیا اور ماضی کے نقصان کا ہرجانہ طلب کیا۔توقع کے عین مطابق مراکش کے سلطان نے بات کو کوئی اہمیت نہیں دی جس پر Raisuli نے کہا کہ قیدیوں کو تب تک رہا نہیں کیا جائے گا جب تک امریکہ مراکش پر زور نہیں ڈالتا۔

John Hay نے جو کہ چین میں باغیوں کا مقابلہ کر چکا تھا اور مشرقِ وسطیٰ میں امریکی تجارت کے لئے دروازے کھول دینے کی بات کرتا تھا Raisuli کو بالکل رد کر دیا اور طنجہ میں امریکی قونصل کو بھی ہدایت کی کہ وہ اس طرح کی کسی بات کو ہوا نہ دیں، Roosvelet نے بھی اس کا ساتھ دیا اور براطانیہ اور روس کو ساتھ مل کر اسلحے کے زور پر قیدیوں کی رہائی کا بندوبست کرنے کا مشورہ دیا جس کو برطانیہ نے رد کر دیا اور فرانس نے الٹا طنجہ کی اس متوقع امریکی حملے سے حفاظت میں مدد کی۔

30 مئی کی صبح طنجہ کے ساحل پر سفید امریکی جنگی جہاز دیکھا جا سکتا تھا۔فوجیوں کا دستہ قونصل کے ساتھ بندرگاہ پر اترا، 1200 فوجیوں کو تیار رکھا گیا کہ وہ ضرورت پڑتے ہی شہر کو گھیر لیں۔اس صدی میں چوتھی بار امریکی افواج مشرقِ وسطیٰ میں مداخلت کر رہی تھیں۔مگر Roosevelt کے مطابق یہ محض ایک تنبیہ تھی، جس کی وضاحت اس نے سلطان کو لکھے جانے والے خط میں کی۔

یہ Roosevelt کے کردار میں واضح تبدیلی تھی اور مشرقِ وسطیٰ کی طرف اس کا مزاج بدلا ہوا

تھا۔مراکش کی حکومت پر اس دباؤ کا اثر پڑا اور اسے Raisuli کا مطالبہ پورا کرنا پڑا اور 23 جون کو Ion Perdicaris رہا کر دیا گیا۔ران کی ہڈی کے علاوہ جو گھوڑے سے گر کر ٹوٹی تھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا تھا۔وہ اپنے اغوا کرنے والوں کی تعریف کرتا کہ اس نے آج تک ایسی شاندار شخصیات نہیں دیکھیں۔مگر اس کی زیادہ تعریف اس ملک اور اس ملک کے صدر کے حصے میں آئی جسے وہ چھوڑ آیا تھا، جنہوں نے اسے بازیاب کروایا۔

Roosvelet کی مراکش میں مداخلت کی داستان نے ذہنوں پر ایک بار پھر مشرقِ وسطیٰ کے لئے دلچسپ نقوش لوگوں کے ذہنوں میں ابھارے جو کہ کچھ سال بعد آنے والی ایک Hollywood کی فلم میں بھی دیکھنے کو ملے۔اگرچہ Roosevelt پر تنقید کرنے والوں نے کہا کہ وہ اپنے اقدامات مین حد سے بڑھ گیا مگر اس نے ان کا کوئی اثر نہیں لیا۔اس نے کہا کہ کیا ان کو اس بات کی شکایت ہے کہ امریکی جہاز بیروت کے ساحل پر نظر آئے جبکہ ایک امریکی کو مارنے کی دھمکی دی گئی تھی یا اس بات کی کہ امریکی جہاز حرکت میں آئے جب ایک حاملہ عورت کو اغوا کر لیا گیا تھا، یا ان دونوں واقعات کے نتیجے کی؟۔انہوں نے اس سے پہلے تو کوئی شکایت نہیں کی۔

مشرقِ وسطیٰ نے Roosevelt کو ایک اور موقع فراہم کیا۔ایک بار پھر مراکش میں جہاں جرمنی اور فرانس کے درمیان افضلیت کے مقابلے نے پورے یورپ کو جنگ میں کھینچ لیا تھا۔اپنے آپ کو اس سے الگ رکھنے کے لئے ریاست ہائے متحدہ نے غیر جانب دار ہونے کا اعلان کیا۔ Roosevelte کو جس نے ابھی ابھی نوبل انعام جیتا تھا یقین تھا کہ وہ یہاں بھی روس، جاپان جنگ کی طرح امن لانے والے کا کردار ادا کر سکے گا مگر ریاست ہائے متحدہ نے جس نے عالمی طاقتوں کی کانفرنس میں بھی حصہ نہیں لیا تھا مراکش کے معاملے سے دور رہنے کا فیصلہ کیا۔

امریکی حکام کو ملنے والے احکامات مختصر تھے: کسی کی طرف داری نہ کریں، محض تماشین بنے رہیں، امن اور بھائی چارے سے ہمدردی کے سوا کسی دلچسپی کا اظہار نہ کریں۔Roosvelt نے چالاکی سے خفیہ طور پر اپنے داؤ پیچ آزمائے۔وہ ذاتی طور پر صدر Wilhelm دوم کو پسند کرتا تھا، جس نے برطانیہ اور فرانس کی دلچسپی میں اضافہ کیا تھا اور جن کو Roosevelt امریکہ سے قریب مانتا تھا، اس نے کہا، ''مراکش کے لوگوں کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ فرانس ان پر قابض ہو کر وہی کچھ کرے جو انہوں نے الجزائر میں کیا تھا''۔اس کے ذہن میں مراکش کی بہتری سے بڑھ کر بھی کچھ

تھا اس نے الجزیرہ میں ہونے والے معاہدے کے ذریعے اپنے ملکی مفاد کو بھی مدِ نظر رکھا، جنوبی افریقہ میں موجود اپنے لوگوں کی حفاظت اور اور کاروباریوں کے فوائد کی بات بھی منوائی۔
مشرقی علاقوں میں ریاست ہائے متحدہ کی شمولیت کا پہلا قدم اس کا یہی معاہدہ تھا۔ وہ قوانین جو اس نے Anglo-french اتحاد کے لئے اور امریکی تجارت کے فائدے کے لئے بنائے تھے اگلے پچاس سال تک ویسے ہی رہے، اس نے ثابت کر دیا کہ امریکیوں نے نا صرف مشرقِ وسطیٰ کی اصطلاح ایجاد کی ہے بلکہ خطے کا جغرافیہ بھی بہتر بنایا ہے۔

محبت اور نفرت کی واپسی:

Roosevelt کی صدارت کے ختم ہونے تک امریکہ کو ایک بڑی طاقت کے طور پر دنیا بھر میں منظور کر لیا گیا تھا اور 25000 میل تک اس کا جشن منایا گیا تھا، چودہ سو کارندوں کے ساتھ اکیس جہاز عربی سمندر کی سیر کر کے سوئیز تک پہنچے۔ یہ مشرقِ وسطیٰ میں داخل ہونے والی اب تک کی سب سے بڑی امریکی فوج تھی۔ ابتک نہر سوائیز میں آنے والا سب سے بڑا بحری بیڑا بھی یہی تھا جس نے پہلے دن میں باقی تمام آمد و رفت بند کر دی تھی۔ جب یہ جہاز کوئلہ بھرنے کی بندرگاہ پر رکے تب کارندے اتر کر قاہرہ میں پھیل گئے وہ اہرامِ مصر کے پاس تصویریں بناتے اور گدھے کی سواری کرتے۔ ان میں سے ایک جہازی نے کہا کہ ہم نے اس شہر کو دوبارہ زندگی دے دی، جیسی اسے بہت عرصے سے نہیں ملی تھی۔ ہمارے اردگرد مختلف قوموں کے تماشہ گر، فقیر، جمع ہو گئے، جن میں گورے بھی تھے کالے بھی، سانولی اور گندمی رنگت والے بھی، اور زرد بھی ان میں سے کچھ کے بال بہت لامبے تھے اور کچھ برہنہ تھے وہ سب ہی ہم پر کود پڑے۔ یہ دورہ اس زیادہ دوستانہ موڑ پر ختم ہوا کہ جب سیکڑوں امریکیوں اور عربوں نے مل کر ان جہازوں کو وہاں کے ساحلوں کی ریت سے پانی میں دھکیلا۔

یہ بیڑا ایک سال بعد پھر مصر سے گزرا، اس بار Roosevelt خود اس میں شامل تھا۔ چار دہائیوں پہلے کے مقابلے میں جب وہ یہاں آیا تھا یہ سرزمین خاصی تبدیل ہو گئی تھی۔ برطانوی فوج نے جس کو عارضی طور پر یہاں لایا گیا تھا مگر وہ پھر واپس نہیں لوٹی اس خطے پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس نے وہاں مصری قوم پرستی کو ہوا دی تھی۔ اور اس کے زیرِ اثر طلبہ، معلموں افسروں اور مذہبی پیشواؤں

نے آزادی کا مطالبہ کیا وہ اکثر برطانوی فوجیوں سے بھڑ جاتے یہ چپقلش اکیس فروری 1910 کو اپنی چوٹی پر پہنچی جب ایک مسلمان نے مصری وزیر کو قتل کر دیا وہ ایک عیسائی تھا پانچ سال بعد Theodore Roosevelt وہاں پہنچا۔

اگرچہ اب وہ صدر نہیں تھا مگر اس کے بہت سے حمایتی اس کو پسند کرتے تھے اس کے باوجود اس کے بیان میں ان سب کو مایوس کیا جب ملک کو جمہوریت اور محنت کی نصیحت چاہیے تھی تب Roosevelt نے پیشن گوئی کی کہ کچھ سالوں کی یا شاید کچھ نسلوں کی بات ہے کہ مصر خود اپنا حاکم ہو جائے گا اس نے طلبہ کو برطانوی حکام سے اور آرمی کے افسروں سے تعاون کرنے کی نصیحت کی اور سیاست سے دور رہنے کو کہا اگر برطانیہ مصر کو چھوڑ دے تو خواتین کو ان کے حقوق نہیں ملیں گے اور عیسائی قتل کئے جائیں گے قوم پرست حکمران زیادہ تر جذباتی ہیں اور تعمیر کی صلاحیت نہیں رکھتے اس نے برطانوی George Otto جو کہ امریکی انقلاب کا ایک محقق تھا سے یہ سب کہا اس نے کہا کہ مغرب کے لئے یہ سب ایسا نہیں کہ اس سے خوف زدہ ہوا جائے مسلمان باہر سے آنے والے اور وہاں بسنے والے عیسائیوں کا خون بہا رہے تھے جیسا کہ وہ اب سے پہلے کرتے آئے تھے۔

شاید روز ویلٹ اس حقیقت سے آشنا نہیں تھا کہ ان جذباتی حکمرانوں میں سے زیادہ تر نے شام کے پروٹیسٹنٹ کالج میں تعلیم پائی تھی اور کچھ مصری حکام خانہ جنگی کے دوران قائم ہونے والے اسکولوں سے پڑھے ہوئے تھے آزادی کی یہ چاہ انہوں نے ریاست ہائے متحدہ سے ہی لی تھی سینکڑوں کی تعداد میں قوم پرست سابقہ صدر کے ہوٹل کے پاس جمع ہوئے اور یہ امریکہ کے خلاف مشرق وسطیٰ میں پہلا مظاہرہ تھا وہ روز ویلٹ مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ علی یوسف نے جو کہ اک مدیر تھا روز ویلٹ پر الزام لگایا کہ وہ ایک طرف مصر کے خود مختار ہونے کی بات کرتا ہے اور دوسری طرف ان طاقتوں کی حمایت کرتا ہے جو مصر کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اس نے کہا کہ یہ دوغلا پن سارے خطے میں پھیلایا جائے گا بلکہ اس کے باہر بھی، مصر کی بے حرمتی سب مسلمانوں کی بے حرمتی ہے سابقہ صدر کے برخلاف یوسف نے مشرق وسطیٰ کی آزادی کے لئے امریکی امداد کو یاد کیا اس نے کہا کہ ہمیں یقین ہے کہ امریکی اب تک آزادی کے دوست ہیں اور ان اقوام کے دوست ہیں جن پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت کی جا رہی ہے۔

اس سب نے اس حکمران پر گہرا اثر ڈالا جس نے Raisuli کو جرمنی یا عثمانیہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا نیل کے اس سفر کو یاد کرتے ہوئے جو سابقہ صدر نے بچپن میں کیا تھا ، برطانوی دانش قابلیت اور فرض شناسی کی داد دی جس کی مدد سے انہوں نے ساتویں صدی کو انیسویں سے ملایا، اور یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جسے ایک عظیم قوم ہی سرانجام دے سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ مصر میں برطانوی اور مغربی افریقہ میں فرانسیسی اپنی کوشش میں کامیاب پائیں گے یانہیں۔ اس نے وہ کام کرنے کے بارے میں بھی قیاس کیا جو یوروپی نہیں کر سکے۔

1911 اکتوبر کو اطالوی افواج نے Tripoli اور Darna پر حملہ کیا اور لیبیا پر حکومت کی 20 سالہ خونی مہم چلائی۔ اس کے اگلے سال فرانس نے Roosevelt کی مدد سے مراکش پر قبضہ جمایا، اب پورا مشرقِ وسطی غیر ملکی تسلط میں تھا۔ جرمنی نے خفیہ طور پر اپنے اقدامات جاری رکھے اور ترکی افواج کو اسلحہ اور امداد پہنچاتا رہا اور سلطنتِ عثمانیہ میں فوجی راستے ہموار کرتا رہا۔ Mahan کے مطابق مشرقِ وسطی اب ایک مختلف خطہ تھا جو نا صرف جغرافیائی لحاظ سے مختلف تھا بلکہ تہذیبی، مذہبی اور لسانی اعتبار سے بھی جس کے گرد یورپی ہر لحاظ سے اس کی حفاظت پر مامور تھے۔

ریاست ہائے متحدہ نے اس صورتِ حال کو ایک بڑی طاقت ہونے کے حساب سے خوش آئین نہ سمجھا۔ صدر ولیم ہاورڈ کی انتظامیہ کو مراکش اور لیبیا کے قتلِ عام سے زیادہ امریکہ کے مشرق بعید اور شمالی امریکہ میں اپنی موجودگی کی فکر تھی، وہ ترک جرمن معاملہ سے زیادہ توجہ غیر ملکی تجارت پر دے رہے تھے، جبکہ واشنگٹن 1908 میں نوجوان ترکوں سے لگنے والی فیصلہ کن ضرب اور ایران کی تشکیلِ نو کی کوششوں سے خوش تھا جسے اس کو تجارتی فوائد حاصل ہونے کی امید تھی، جب عثمانیوں نے صدر Taft سے Roosevelt کی مثال کو اپنانے کی درخواست کی اور ان تضادات کی ختم کرنا چاہا جس نے انکو ان کی سلطنت سے 400000 میل دور کر دیا ہے صدر نے غیر جانب رہنے کا عہد کیا۔

مشرقِ وسطی کی جانب امریکہ 1909 میں کھل کر سامنے آیا جب N-E-A کا قیام عمل میں لایا گیا۔ علاقے کے تعلیم یافتہ طبقے نے Middle-Eastern کہنا شروع کر دیا۔ امریکی اس بات پر بضدر ہے کہ علاقے کا روایتی نام کو برقرار رکھا جائے۔ ان کا کوئی بھی افسر وہاں کی کوئی زبان جانتا تھا، نہ ہی وہاں کا نقشہ بنانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اور سلطنت کے لئے کچھ کرنے کی بجائے ان کی

توجہ وہاں امریکی مفاد کی طرف رہی۔ ایک ممبر کی درخواست پر اس مقام کو خریدنے کے امکانات پر غور کیا جانے لگا جہاں یسوع مسیح نے خطبہ دیا تھا۔

جولائی کی اس صبح کو تیس سال گزر چکے تھے جب یورپی جنگی جہاز مصری ساحل پر نمودار ہوا تھا۔ تب سے اب تک امریکہ شاہی نظام کے گن گا رہا تھا،، کچھ امریکی Roosevlt کی طرح اس کو امریکی مفاد میں سمجھتے تھے جبکہ کچھ Tawain کی طرح اس کے خلاف تھے اور اسے انتہائی غیر امریکی گردانتے تھے۔ جیسے جیسے دنیا جنگ کی طرف چلتی چلی گئی امریکہ کو مشرقِ وسطی مین توجہ دینی پڑی، جہان اسے کئی چیزوں کے درمیان فیصلے کرنے تھے۔

حصہ پنجم

امریکہ، مشرقِ وسطیٰ اور جنگِ عظیم

آفات کے تماشبین

تاریخ میں رقم ہے کہ ناول نگار Philp Roth وہاں ہوتا ہے جہاں سب کچھ حیران کن ہوتا ہے اور کاغذ پر اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ کچھ مشاہدین نے پیشن گوئی کی کہ سربیا کے خلاف Austria-Hungary جنگ کے اعلان کے کئی ردِعمل سامنے آئیں گے، روس سربیا کی طرف جبکہ جرمنی Austria کی مدد کو جائے گا جبکہ فرانس کا دارومدار روس پر ہوگا اور برطانیہ فرانس کے ساتھ ہوگا۔ کچھ نے یہ بھی کہا کہ ترکی کے لئے کنارے رہنا ممکن نہیں ہوگا اور اس کو روس، برطانیہ اور فرانس کے خلاف جرمنی اور Austro-Hungry کے ساتھ ملنا پڑے گا۔ اس سب نے پہلی جنگِ عظیم کو ہوا دی اور یہ بدقسمتی آنے والے کئی سالوں تک اقوام کے سروں پر منڈلاتی رہی اور اس نے مشرقِ وسطیٰ کا نقشہ بدل دیا، Roth نے اس کا خلاصہ یوں کیا کہ: آنے والی ہیبت کو تاریخ ہمیشہ چھپا کر رکھتی ہے اور تباہی کو عظمت میں بدل دیتی ہے۔

امریکی یہ سب دیکھتے رہے اور وہ بھی اس پر حیران تھے، مگر یورپی اور ترکوں کی طرح انہوں نے تنگ نظری سے کوئی نقصان نہیں اٹھایا۔ اور صدر نے یہاں بھی غیر جانبدار رہنے کا عہد کیا اور سب کے ساتھ بہتر مراسم رکھنے کی بات کی۔

ترکی کے ساتھ ایسا کرنا مشکل تھا کیوں کہ ان کے تعلقات ریاست ہائے متحدہ سے خراب تھے جس کی وجہ آرمینائی عیسائی تھے۔ حلانکہ کہ نوجوان ترکوں کے ایک گروہ نے 1908 نے برابری اور مساوات رکھنے کا عہد کیا مگر وہ بھی اس میں ناکام دکھائی دیتے تھے۔ اناطولیہ میں ترکوں کے ہاتھوں قریب تیس ہزار افراد کا قتل ہوا۔ ان میں اور پرانے ترکوں میں فرق صرف یہ تھا کہ وہ ان سے

زیادہ تیز اور ظالم تھے۔ احتجاج کے لئے ریاست ہائے متحدہ نے اپنا جنگی جہاز ترکی ساحل پر بھیجا۔

اس قتلِ عام کا اثر ترک امریکہ روابط پر ہونا چاہیئے تھا مگر اس دوران ان کے درمیان تجارتی تعلقات بحال رہے۔ اور 1914 تک اور زیادہ بہتر ہو گئے۔ 23 فیصد ترکی برآمدات کا تعلق امریکہ سے تھا۔ دیگر اشیا کے ساتھ ساتھ امریکہ مشرقِ وسطیٰ سے تیل بھی حاصل کر رہا تھا۔ امریکہ خود بھی پیٹرولیم اور اس کی دیگر مصنوعات کی تجارت کرتا تھا مگر مشرقِ وسطیٰ کے تیل کے کنویں اس کے لئے ناکافی تھے اور اب ان کی نظریں عراق پر تھیں۔ تین سال بعد ان کو شام اور فلسطین اور ایشیا کے دیگر علاقوں میں کھدائی کی اجازت مل گئی، اور کھدائی جلد شروع کر دی گئی۔

مشرقِ وسطیٰ میں امریکی حکمتِ عملی میں اس نے اہم کردار ادا کیا مگر ایسا پہلی جنگِ عظیم کی ابتداء تک رہا۔ وہاں موجود مشنریز شاندار ہسپتال اور اسکول قائم کئے جو نہ صرف وہاں کے عیسایوں کے خدمت گزار تھے بلکہ ترکوں کے بھی۔ ترکی سے William Bryans نے لکھا کہ یہ سب خوش آئند ہے خاص کر یہ جاننا کہ ترکوں کو امریکی تعلیم دی جا رہی ہے امید ہے کہ ہم آگے جا کر پرانے تضادات کو فراموش کر دیں گے اور پرانے روابط بحال کر لیں گے۔

جنگ نے استنبول میں افواج کو مضبوط کیا جس سے وہاں کے امریکی اداروں کو خطرہ لاحق ہوا۔ Wilson کی انتظامیہ نے جو کہ انسانیت کے لئے کوشاں تھی نہ کہ کسی سیاسی مفاد کے لئے ترکی سے کہا کہ وہ اس باب میں غیر جانبدار رہیں۔ مگر یہ بے سود رہا۔ جلد ہی ترکی نے تمام فرانسیسی اور برطانوی شہریوں کو بے دخل کر دیا اور انگریز دشمنی مول لی۔ اس سے مشرقِ وسطیٰ کے حالات امریکہ کے لئے خراب ہوئے۔

اس غارت گری سے گھبرا کر تبلیغیوں نے واشنگٹن رجوع کیا۔ Danial Bliss نے وہاں پر امریکیوں کی حفاظت پر زور دیا اور امریکی جنگی جہاز روانہ کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ ایسا ہی مطالبہ Jaffa اور بیت المقدس سے بھی ہوا جب ترکی فوج نے وہاں غارت گری کے بازار گرم کئے اور جواباً Uss North Carolina اور Tennesse کو مدد کے لئے بھیجا گیا۔ 12 دسمبر کو Wilson نے امریکیوں کو مشرقِ وسطیٰ کے غیر محفوظ علاقے چھوڑ دینے کے لئے کہا۔

سیاسی بنیادوں پر یہ رکاوٹیں بڑھتی چلی گئیں اور کہا گیا کہ ترک حکومت کا اگر یہی جارحانہ رویہ رہا تو ریاست ہائے متحدہ اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھے گی، ساتھ ہی یہ تنبیہ کی گئی

کہ اب اگر جان و مال کا زیاں کیا گیا تو اس کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی۔شام کے فوجی عہدیدار دجمال پاشا نے کہا کہ ہم ایک مسلمان کی جان کا بدلہ تین برطانوی یا فرانسیسی جانوں سے لیں گے۔اس کا سخت جواب امریکی پریس نے بھی دیا۔

ترک امریکی تعلقات حیران کن طریقے سے بہتر ہوئے اور یہاں تک کہا گیا کہ انہوں نے امریکی دوستی پر کبھی شبہ نہیں کیا اور امریکہ وہ واحد قوت ہے جو ان سے کسی مفاد کی دوستی نہیں رکھتی انہوں نے تبلیغیوں کے ساتھ ہونیوالی ناانصافی کی معافی مانگی اور امیریکی کاروباریوں کی تعریف کی انگریزوں کو بہرحال دور رکھا گیا مگر امریکی باشندوں کو چھوٹ دی گئی واشنگٹن نے مشرق وسطیٰ سے اخراج کا منصوبہ بدل دیا اور وہاں پر 13 ریڈ کراس ہسپتالوں کے قیام کو یقینی بنایا ترکی میں کام کرنے والے 48 امریکی کونسلر وہاں موجود رہے اور ترکی کے نمائندے امریکہ میں موجود رہے جیسے ہی یہ سال ختم ہوا ترکی میں متحدہ افواج اتاری گئیں اور مشرق وسطیٰ میں ہونے والی لڑائی کو سالوں کا طول دیا گیا مگر، امریکہ کنارے پر ہی رہا۔

تاریخ کا انسانیت سوز جرم:

عیسائیوں کے قتل عام کی پہلی خبر دسمبر 1914 میں آئی اور کئی سو افراد کو ارض روم کی گلیوں میں پھانسی دے دی گئی لوگوں کو زبردستی مزدور بنایا گیا اور ایسے ہی دیگر مظالم ہوتے رہے۔روس سے ہار جانے کے بعد ترکوں نے آرمینیا میں غارتگری کا بازار گرم کیا اور وہاں قتل عام ہوا جو استنبول تک پہنچا جہاں پر 250 افراد کو پھانسی دی گئی اور گھر جلائے گئے وزیر طلعت پاشا نے اطلاع دی کہ ترکی میں عیسائیوں کی کوئی جگہ نہیں ہے جلد سے جلد ترکی کو صاف کیا جائے۔

یہ محض دھمکی نہیں تھی دیکھا گیا کہ مسلمانوں نے عیسائی آبادی کو تہس نہس کر دیا ایک امریکی Anna Birge نے شہادت دی کہ اس نے بوڑھے مردوں اور عورتوں چھوٹے بچوں کے ساتھ جوان ماؤں کو بھیڑ بکریوں کی طرح کٹتے ہوئے دیکھا ایک اور جگہ سے 800 دیہاتیوں کے مرنے کی اطلاع آئی گورنر جاوید بے جو اپنے قیدیوں کو گھوڑوں سے روند کر خوش ہوا کرتا تھا ان مظالم کے لئے مشہور تھا وہ فاقہ کشی دانت اور ناخن نکالنے اور سلاخوں سے داغے جانے یا سر اور داڑھی کے بالوں کو جلانے جیسے تشدد کیا کرتا تھا۔ایک اور جگہ سے اطلاع آئی کہ ماؤں نے بچوں کو میدانوں

میں چھوڑ دیا کیونکہ وہ انہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔

اس دوران ترکی حکمران بضد رہے کہ یہ تشدد جوابی ہے انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ روس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا تھا اس وقت کے زیادہ تر مشاہدہ کرنے والے اس بات پر متفق تھے کہ اس قتل عام کا تعلق جنگ سے ہے اور یہ وہاں موجود تمام عیسائیوں کو ختم کرنے کا منصوبہ ہے وہ 25 سال بعد ہونے والے نازی سلوک کی سایہ داری کر رہے تھے۔

عثمانیہ سلطنت میں اب سے پہلے ہونے والے ایسے واقعات کے برخلاف اس قتل عام کی خبریں ٹیلی فون اور ٹیلی گرام کے ذریعے مسلسل مغرب میں پہنچتی رہیں 24 مئی کو برطانیہ فرانس اور روس نے مشترکہ طور پر ترکی حکمرانوں کو اس سب کا ذمہ دار ٹھہرایا مگر وہ اس بارے میں کچھ کر نہیں سکتے تھے وہ Pope Benedict XV نے سلطان محمد سے رحم کی اپیل کی۔

اس سب کے بارے میں کچھ کرنے کی سکت رکھنے والوں میں امریکہ شامل تھا Harpot میں موجود ایک تبلیغی جوڑے نے خفیہ طور پر کچھ افراد کو وہاں سے بچا کر کردستان پہنچایا دیگر افراد نے بھی وہاں موجود زخمیوں کی مدد کی ان میں سے ایک Elizibeth Ussher بھی تھی جو روس میں فوت ہوئی اس نے امریکہ پیغام بھجوایا تھا کہ یہاں پر امریکی زندگیاں خطرے میں ہیں اور اس بارے میں امریکی اقدامات ہونے چاہئیں۔

ریاست ہائے متحدہ کی اس معاملے میں پڑنے کی کوئی نیت نہیں تھی امریکی پریس بہرحال اس قتل عام کے بارے میں لکھتا رہا اور آہستہ آہستہ حکومت نے اس بارے میں اقدامات شروع کئے انتظامیہ نے اندازہ لگایا کہ ترکوں پر بے جا تنقید مشرق وسطیٰ میں ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے وہ اس بارے میں ہونے والے عوامی اقدامات سے بھی خوف زدہ تھے انہوں نے جرمنی حکومت سے غیر مسلموں کی حفاظت کے لئے مدد مانگی۔تاہم جنگ میں گھسیٹ لئے جانے کا خوف بہرحال موجود تھا مگر اس کا موازنہ اخلاقی اقدار سے بھی کیا جانا تھا اور یہی تعلیمات امریکی تبلیغی اسکول مدت سے دیتے آرہے تھے

امریکیت کا ایک انجیلی پیروکار:

ایک امریکی Henry Morgenthau ان مسائل کے حل کے لئے کوشاں تھا۔وہ اپنے ملک

کی مشرقِ وسطی میں حکمتِ علمی کو بہتر بنانا چاہتا تھا۔ایسا کرنے کے لئے اس کی قابلیت غیر معمولی تھی۔وہ جرمنی میں پیدا ہونے والا ایک یہودی تھا، جو نیویارک آیا تھا اور انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔

دو سال بعد اس کا داخلہ وہاں کے کالج میں ہوا اور اس نے قانون میں گریجویشن مکمل کی۔بعدازاں ترقی کر کے وہ وہاں کے یہودی ریفورم کا پیشوا بنا۔وہ معاشرتی عدل اور سخاوت کو پسند کرتا تھا۔اس نے کہا کہ اس کا اصل مذہب جمہوریت ہے۔

Wilson کے ابتدائی حامیوں میں شامل Morgenthau کو امید تھی کہ اس کو 1912 میں عہدہ دیا جائے گا، مگر صدر نے اس کے لئے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔Morgenthau کو ترکی میں امریکی سفیر ہونا تھا۔اپنے سے پہلے آنے والوں کے برخلاف جو یہ سمجھتے تھے کہ یہودی مسلمان ترکوں اور امریکی عیسایوں کے درمیانی پل کا کردار ادا کرتے ہیں، اس کو بتا گیا کہ اس کے لئے ایک جگہ رکھی گئی ہے۔ Wilson نے اس کو یقین دلایا کہ استنبول ایسی جگہ ہے جہاں امریکی یہودیوں کا مفاد، فلسطینی یہودیوں کے مفاد سے جڑا ہے، اور یہ ضروری ہے کہ یہ عہدہ کسی یہودی کے سپرد کیا جائے۔اس نے یہ عہدہ بخوشی قبول کیا۔

پہلے پہلے اس کے لئے سلطنتِ عثمانیہ کا دارالخلافہ دل فریب تھا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اور ترکوں کے انداز دیکھ دیکھ کر اس کی رائے تبدیل ہوگئی۔کچھ عرصے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ تبلیغیوں کے نمائندے کو طور پر کام کر رہا ہے۔آرمینی باشندوں کے بارے میں بھی اس کی رائے تبدیل ہوئی، وہ اس نے انہیں یہودیوں کے قریب دیکھا، جو اپنے مذہب سے بہت لگاؤ رکھتے تھے۔

ترکی عہدیدار، امریکی تبلیغی اور آرمینیوں کے درمیان Morgenthau کو خاصے داؤ پیچ لڑانے پڑتے تھے۔اس نے کہا، ''یہ میں تھا، ایک یہودی، جو دنیا کی سب سے بڑی عیسائی قوم کی نمائندگی، مسلمان ریاست کے دارالحکومت میں کر رہا تھا، جو بہت جلد عالمی سیاست کا گڑھ بننے جا رہی تھی، پرامن حالات میں بھی یہ سب اس کے لئے آسان نہ تھا اور جب جنگ پھوٹ پڑی تو سب کچھ اس کے لئے بے حد مشکل ہو گیا۔

اول اول روزانہ اور پھر ہر گھنٹے اس کی میز پر مختلف خبریں آتی رہتیں۔ Lewis Einstien نے، جو استنبول میں ایک امریکی یہودی تھا، ایک ترکی عورت کو پستول کے ساتھ دیکھا،

جس نے محض تفریح کی خاطر ایک آرمینی باشندے کے سر میں گولی داغ دی، ایسی دیگر خبروں کو چھپا لیا جاتا یا پھر ان کو افواہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا۔حکومتی عہدارون نے کسی بھی قسم کا کوئی قتلِ عام ہونے کو سرے سے رد کیا، اور اس کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی۔Morgenthau کے دفتر تک آ جانے والے آرمینی باشندوں نے اس کو حکومتی پالیسی سے آگاہ کیا جس کی اطلاع اس نے Robert Lansing کو دی۔

امریکی پالیسی غیر جانب دار ہی رہی۔ Lansing کی جانب سے بھی ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔انتظامیہ ان کو ان معاملات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے امریکی جذبات بتایا چاہتی تھی جس سے ان کی ترکی کے متعلق اچھی رائے کو خطرہ تھا۔Morgenthau کی بات شاید پوری طور پر آگے نہیں پہنچ سکی اس کے مطابق عملی طور پر کچھ کیا جانا چاہیئے تھا اور اس نے خود ہی کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔

Morgenthau نے بتایا کہ ہمارے لوگ اس قتلِ عام کو کبھی فراموش نہیں کریں گے، یہاں پر انصاف کی تمام اقدار کو پائمال کیا جا رہا ہے۔مگر یہ بھی بے سود رہا۔طلعت نے کہا کہ وہ تین ماہ میں وہ مسئلہ حل کر دے گا جو سلطان عبدالحمید سے تیس سال میں حل نہ ہو سکا، اس نے سوال کیا کہ وہ، جو کہ خود یہودی ہے، عیسایوں کے بارے میں اتنا فکر مند کیوں ہے، Morgenthau نے بتایا کہ وہ وہاں ایک یہودی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ریاست ہائے متحدہ کے سفیر کی حیثیت سے موجود ہے، اور اس نے بڑھ کر ایک انسان کی حیثیت سے۔مگر طلعت اس کی بات سے زیادہ اس انشورنس پالیسی میں دلچسپی رکھتا تھا جو کئی آرمینیوں نے امریکہ سے لے رکھی تھی، اس نے کہا کہ وہ سب اب مارے جا چکے ہیں اور اب ان کا پیسہ حکومت کو ملنا چاہیئے۔

یہ سرد مہری Morgenthau کے لئے نا قابلِ برداشت تھی۔اس نے لکھا کہ میرے لئے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا مگر وہاں پر میں مجبور تھا، اور ایک معقول قوم کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا نہ ہی کسی قسم کی مداخلت کر سکتا تھا۔وہ زیادہ سے زیادہ James Barton کی مدد کر کے زیادہ سے زیادہ افراد کو وہاں نے نکال سکتا تھا۔Morgenthau نے کھانے پینے کپڑے اور رہنے کی جگہ کا بندوبست کرنے کے لئے فنڈ جمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ Barton اور Doge نے اس کا ساتھ دیا۔انہوں نے David H. Greer کو اور Isaac

seligman کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا۔اور Rabbi Stephan کو Charles Crane کے ساتھ رکھا،اوراسطرح سوملین ڈالر کی رقم جمع کی گئی،جواب ایک بلین ڈالر کے برابر ہے۔

Morgenthau یہاں بھی نہیں رکا، New York Times کے مدیر Andolph سے دوستی کی بنیاد پر اس نے یہ تسلی کی کہ قتلِ عام کی خبروں کو اجاگر کیا جاتا رہے گا،اور صرف 1915 یہ میں 145 آرٹیکل سامنے آئے۔اس نے ذاتی اساسے سے بھی ایک ملین ڈالر کی رقم مہاجرین کے لئے دی۔Morgenthau نے کہا کہ ریاست ہائے متحدہ ان افراد کے لئے موسیٰ کا کردار ادا کر رہی ہے۔اس نے کہا کہ وہ ایک صاف ستھری باشعور قوم ہے۔

یہ ہولناک مناظر اکثر دیکھے جانے کے قابل نہیں تھے۔Walter M Geddes نے جس کا تعلق نیویارک سے تھا اور حلب میں کاروبار کے سلسلے میں موجود تھا کئی ہزار آرمینیوں کو فاقے سے مرتے دیکھا۔وہ سمرنا آیا جہاں اس نے اپنا بیان تحریر کیا اور خود کو گولی مار لی۔ایک امریکی تبلیغی جس کا نام Leslia تھا اپنا دماغی توازن ان بچوں اور عورتوں کو بچاتے ہوئے کھو بیٹھا۔

Morgenthau کے لئے بھی یہ سب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔پاشا کا کہنا تھا کہ آرمینی امداد ان کو بغاوت پر ابھار رہی ہے۔اس نے لکھا کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ ہولناک اور کچھ بھی نہیں ہے۔وہ ترکی جو اس کے لئے دلفریب ہوا کرتا تھا اب ایک ہولناک جگہ بن گیا ہے۔اس نے کہا کہ میں اب تھک چکا ہوں میرے پاس کچھ بھی کرنے کے اسباب نہیں بچے ہیں اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔

قتلِ عام جاری رہا اور Morgenthau کی جگہ ابراہیم الکس نے لی،وہ بھی ایک یہودی تھا جس کا تعلق نیویارک سے تھا۔اس نے بھی ترکوں کے مظالم اور ان کے ارادے کی اطلاع ریاست کو دی۔اب تک 1.5 ملین افراد کا خون بہایا جا چکا تھا۔الکس کے پاس دوسری آفات بھی تھیں جن پر اس کو نظر رکھنی تھی،جیسا کہ ترکیوں کے یونانی آبادی پر حملے West Anatolia پر حملے اور عربوں کا سرحدوں سے اخراج۔ترکی شام کو بھی اپنے تسلط میں لینا چاہتے تھے اور عربی بولنے والے دیگر ممالک کو بھی۔قریب 250000 عربی خاندانوں کو وہاں سے نکالا گیا۔

دل دہلا دینے کے لئے یہ ہی کافی تھا کہ قریب 200000 افراد صرف استنبول میں ہلاک کئے گئے،اس کے علاوہ اتنے ہی مصر اور شام کے صوبوں میں بھی۔فضا میں جنازوں کی،اور بچوں

کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔امریکہ ایک بار پھر حرکت میں آیا اور Uss de Moines کے ذریعے امداد روانہ کی گئیں،یہ انسان دوستی کا ایک اور نمونہ تھا۔لاکھوں لوگوں کے لئے یہ امداد زندگی کی امید لے کر آئی تھیں۔ argaret McGilvary کے مطابق وہ لوگ بس امید پر جی رہے تھے،ہم شام میں وہی کچھ کر رہے تھے جو ہمارے ساتھی مغربی سرحدوں پر کر رہے تھے۔ترکی نے کسی بھی مدد کی ضرورت سے انکار دیا اور اکثر وہ مدد کے لئے آنے والوں کا راستہ روک دیتے تھے،نتیجہ یہ ہوا کہ امداد بھیجے جانے کہ باوجود مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

فعال یا غیر فعال

25 فروری 1917ء کی رات بحر اوقیانوس کے پار Lacomia جہاز بھاپ اڑاتا لیور پول کی طرف جا رہا تھا۔اس میں اٹھارہ سوٹن جنگی سامان اور دیگر اشیا،216 عملے کے ارکان اور تہتر مسافر تھے جن میں سولہ امریکی تھے۔اس پر سوار سب لوگوں کو علم تھا کہ سفر پریشان کن ہے۔جرمنی نے حال میں ہی امریکی تجارتی جہازوں پر حملے کا فیصلہ کیا تھا بر بری جنگوں کے بعد یہ سب سے بڑا خطرہ امریکہ کو لاحق تھا۔10:30 بجے جب جہاز آئرش ساحل کے قریب تھا Lacomia جہاز کے اگلے حصے سے دو تارپیڈو ٹکرائے اور انجن روم میں جا کر پھٹے،کپتان نے مسافروں کو فوراً جہاز چھوڑنے کا حکم دیا۔شکاگو ہیرالڈ ٹربیون کے نامہ نگار Floyd Gibbons نے اسے یاد کرتے ہوئے لکھا”یہ ایک پاگل خانہ اور ڈراؤنا خواب تھا۔چالیس منٹ میں جہاز ڈوب گیا اور یوں ڈوبا کہ اس کے اگلے حصے کی نوک ہوا میں ابھری ہوئی تھی۔پھر یہ بھی تھوڑی دیر کے بعد سب کچھ غائب ہو گیا۔اس حملے میں 22 لوگ مارے گئے جن میں دو ماں بیٹی امریکی تھے۔

2 اپریل کو دوسری بار کے نومنتخب صدر ولسن نے کانگریس سے جنگ کی اجازت چاہی اور اس حرکت کو مردوں،عورتوں،بچوں اور غیر جنگی لوگوں کی تباہی کہا۔اس نے جرمنی پر انسانیت کے خلاف جنگی معاملات کا الزام لگایا اور غلط اقدامات کرنے کا جس سے انسان کی قدریں ختم ہو جاتی ہیں۔ولسن نے امریکہ کے علاقائی یا دیگر مادی مفادات اور عزائم سے انکار کیا۔یہ فقط عالمی حقوق اور جمہوریت کی حفاظت چاہتا ہے اور مستقبل میں جمہوری قوموں کا امن چاہتا ہے۔

عالمی رواج کے مطابق اور پہلی جنگِ عظیم کے طرز پر جب ایک ملک نے کسی دوسرے ملک

کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو اس نے دشمن کے اتحادیوں کے خلاف بھی جنگ کی۔ امریکہ کے لئے اس کا مطلب جنگ کی وہ حالت جس میں میں تمام مرکزی قوتیں بشمول بلغاریہ ہنگری اور ترکی شامل تھے۔ صدر کی تقریر میں واضح طور پر سوائے ترکی کے دیگر سے جنگ کا انکار تھا۔ ہم جنگ میں تب شامل ہوتے ہیں جب ہمیں اس پر مجبور کیا جاتا ہے اور ہمارے پاس اپنے حقوق کے دفاع کا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ صدر کی بات کا مفہوم بہت جامع تھا کہ امریکی دستوں کو یورپ کی دلدلوں میں لڑنے پر مجبور کیا گیا تھا، مشرقِ وسطیٰ کے صحراؤں اور ساحلوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

تجریدی اصولوں میں ترکی کے خلاف جنگ نہ کرنے کا امریکی فیصلہ دراصل تلخ حقیقت کا ادراک تھا۔ Willson امریکہ کے پاس اس جنگ کے اسباب ہونے پر قائل نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ترک طے شدہ حکمتِ عملی کی راہ میں حائل نہیں ہیں دوسری جانب صدر اور اس کے ساتھیوں کا یہ سوچنا تھا کہ استنبول براہِ راست برلن سے حکم حاصل کرتے ہیں، اور ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا تفاوت مصنوعی ہے۔ مرکزی حکومت Baltic سے دردانیال تک پھیلی ہوئی ہے، Adward Mandell کے مطابق ترکی کابینہ سے آنے والا ہر حکم مشکوک ہے، اور یہ بات ثابت بھی ہوئی جب امریکہ نے جرمنی سے اعلانِ جنگ کیا تو ترکی نے اس کے ساتھ اپنے تعلقات بگاڑ لئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے امریکی سفیر کو اپنے دارالحکومت سے خارج کر دیا۔ انہوں ریاست ہائے متحدہ کو زک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جاوید پاشا کے مطابق ریاست ہائے متحدہ کے خلاف جنگ کر کے ہمیں کیا حاصل ہوگا، کچھ نہیں! ۔ اس نے یاد دہانی کروائی کہ واحد امریکہ ایک ایسی طاقت ہے جس نے ترک علاقے میں کبھی دخل اندازی نہیں کی اور یہ بات تعمیر نو کے حوالے سے آخری امید ہے، اس نے زور دیا کہ ترک امریکہ دوستی، امریکہ کی جنگ میں شمولیت کے باوجود جاری رہے گی اور ریاست کے تابع تمام پریس کو اس نے حکم دیا کہ امریکہ کے خلاف منفی جذبات کو کم کیا جائے۔ اس نے کہا کہ ترکی کے ساتھ ہمارے روابط ماضی کی نسبت زیادہ دوستانہ ہیں اور ترکی امریکہ کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کرے گا۔

اگر ترکی ریاست ہائے متحدہ کے خلاف سخت گیری کا مظاہرہ کرتا بھی اور اس کے جرمنی کے ساتھ گٹھ جوڑ پر نظر نہ بھی کی جاتی تو بھی یہ غیر واضح تھا کہ امریکی سپاہی مشرقِ وسطیٰ کی جنگ میں کیا حکمتِ اپناتے ہیں۔ اس کو اعتماد تھا کہ ترکی کے بڑے شہروں پر آسانی سے بمباری کی جا سکتی تھی

اور پوری حکومت بہت آسانی سے گرائی جا سکتی تھی اس نے کہا کہ ترکی مرکزی طاقتوں میں سب سے کمزور ہے اور تباہی کے دہانے پر ہے، ترکی کے عوام کو بھی حکمرانوں کو امن معاہدے پر دستخط کروانے کا جواز چاہیے تھا۔ کچھ امریکی جرنلوں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا کہ مشرقِ وسطیٰ کی جنگ میں ملک کو سیاسی اور عسکری فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔

Willson کے مطابق مشرقِ وسطیٰ میں دخل اندازی اتنی سہل نہیں، فوج اس کے لئے تیار نہیں گھر سے دور، یورپ سے دور اجنبی ماحول میں جنگ ان کے لئے دشوار ہے۔ رسد اور رابطوں کا نظام درہم برہم تھا اگر سپاہیوں کو مشرقِ وسطیٰ میں اتارا بھی جاتا تو فتح کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگرچہ سن 1917 کی جنگ میں یہی فوج فاتح تھی پھر بھی ترکی فوج کو شکست دینا آسان نہ تھا۔ ریاست ہائے متحدہ کے اعلانِ جنگ کے خطرے کے پیشِ نظر ترکی جرمنی کے ساتھ زیادہ بڑی طاقت کی شکل میں جارحیت کی مذمت کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر Willson کو اینگلو امریکی فتح کا اندازہ ہوتا تو وہ مشرقِ وسطیٰ کے صحراؤں میں لاکھوں سپاہیوں کے دفن ہونے کی پرواہ نہ کرتا۔

ترکی پر حملہ کے راستے میں حائل پیچیدگیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اور ترکی کی طرف سے سخت گیری میں کمی کو دیکھتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ کے لئے حملے کا بہترین جواز انسانیت تھا۔ ترکوں نے کئی لاکھ انسانوں کو خاموشی سے قتل کیا تھا اور یہ خونریزی تب ہی رک سکتی تھی جبکہ امریکہ اس کو روکتا، Van H. Engert نے کہا کہ فلسطین اور عراق میں اس قتل و غارت گری کو امریکہ کے بھرپور حملے سے روکا جا سکتا ہے۔ William Nestbid کی خواہش تھی کہ ریاست ہائے متحدہ کی ہیبت ایسی ہونی چاہیئے کہ ترکوں کی ایسا سوچنے کی بھی جرأت نہ ہو، امریکہ ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں مقدس کتاب لے کر آرمینیوں کی حفاظت کر سکتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ پرزور John H. Finely تھا جو فلسطین میں Red-Cross کی سربراہی کر چکا تھا اس نے کہا کہ امریکیوں کو یہاں محض Red-Cross ہی نہیں بلکہ مسیحا کے پیغام کے مطابق تلوار بھی بھیجنی چاہیئے اور پوری طاقت سے بدی کے خلاف جنگ کرنی چاہیئے۔

اعلان جنگ کی خواہش کا اظہار صرف یہیں نہیں بلکہ دونوں ہی جانب سے ہوا، Henry Cabot Lodge نے جو کہ Senate Foreign Relation Commitee کا چیرمین تھا کہا کہ اگر جنگ کے بعد بھی ہم ترکی کے دوست رہے تو مجھے امریکی کہلانے پر افسوس ہوگا۔ James

Clark نے کہا کہ موجودہ صورتِ حال اطمینان بخش نہیں ہے، اور آدھے دشمن سے مقابلہ کر کے آدھے کو نظر انداز کرنا حماقت ہے۔ اقلیتی سربراہ Fredrick Gillette نے کہا کہ جنگ میں ترکی کا کردار قابلِ مذمت ہے، ہمیں اس کے خلاف جنگ کرنے میں ہچکچانا نہیں چاہیئے۔ New-York Times نے لکھا کہ اب کوئی ایک کانگریسی یا سینیٹر بھی ایسا نہیں ہے جو ترکی سے امن چاہتا ہو۔ سابقہ صدر Theodore Roosevelt نے اس سے بڑھ کر بیان دیا کہ ہمیں ایک گھنٹہ ضائع کئے بنا ترکی سے جنگ کرنی چاہیئے اس نے زور دیا کہ اگر کچھ نہ کیا گیا تو امریکہ کا عالمی امن اور جمہوریت کا مقصد کبھی پورا نہیں ہو پائے گا اس نے کہا کہ اگر ہم ناکام رہے تو یہ ہماری قوم پر ہمیشہ کے لئے دھبہ ہوگا۔

جنگ کی تجویز کو ایک امریکی نے رد کیا جو کہ جنگ سے پہلے عثمانی سلطنت کے خاتمے کے لئے دعا گو تھا۔ اس نے ایک خط میں لکھا کہ میں ریاست کے معاملات میں دخل دینے سے بچتا ہوں اور اپنی بے صبری کی معذرت کرنے کے بعد Dodge نے ترکی کے خلاف جنگ کی مخالفت کی، اس نے کہا کہ اس میں بڑی خونریزی کا خطرہ ہے اور ان امریکیوں کو بھی خطرہ ہے جو وہاں کام کر رہے ہیں، اس نے کہا کہ ترکی ہمارے لوگوں کے ساتھ ہر لحاظ سے اچھا سلوک کر رہے ہیں اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی رائے کا اس کی بیٹی سے جو کہ Robert College میں پڑھا رہی ہے کوئی تعلق ہے نہ ہی اس کے بیٹے سے جو کہ بیروت میں مقیم ہے۔ اس کا مقصد محض بہت سارے تبلیغی اور فلاحی کام کرنے ولوں کی حفاظت ہے۔

خط کا جواب Wilson نے رحم دلی سے دیا اور لکھا کہ میں نے تمہارے پیاروں کے بارے میں متعدد بار بہت سوچا ہے اور میں دل سے تمہارے ساتھ ہوں لیکن دوسرے امریکیوں نے اس کے اس خوف کو جلا نہیں دی۔ کہا گیا کہ آرمینیوں کا قتلِ عام ایک عظیم جنگی گناہ ہے، اور ترکی کے خلاف کچھ نہ کرنا اس گناہِ عظیم کو نظر انداز کرنا ہے۔ سابقہ کمانڈر ان چیف، جو کہ دو بار مشرقِ وسطیٰ میں امریکی جنگی جہاز تبلیغیوں کی حفاظت کے لئے بھیج چکا تھا اب چرچ پر نالاں تھا اور ان پر بھی جو موقع ہوتے ہوئے وہاں سے نہیں نکلے۔ اس نے Dodge سے کہا کہ ہمارے تبلیغیوں کی موجودگی وہاں پر موجود آرمینی، یونانی اور یہودی قتلِ عام کو نہیں روک پائی، اور اور ہماری جنگ سے اس کا ایک فیصد نقصان بھی نہیں ہوگا جتنا نقصان ماضی میں جنگ نہ کر کے ہم نے برداشت کیا ہے۔

DoDge اور Roosevlt جس دوران جارحیت سے بچنے کی بہترین راہ ڈھونڈ رہے تھے اور ہر لحاظ سے تبلیغیوں کی بہتری اور ملکی مفاد سوچ رہے تھے اس دوران عام امریکی کا سوال یہی تھا کہ کس طرح امریکہ انسانیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟

آخرِ کار سن 1917 کے دسمبر میں Austro-Hungry کے خلاف جنگ کا اعلان کیا گیا اور بلغاریہ سے جنگ کرنے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اس فیصلے نے برطانیہ اور فرانس کو حیران کیا کہ امریکہ کس طرح غیر جانبدار رہ کر اپنا مفاد حاصل کر سکتا ہے، اور اس نے اپنے دشمن کو شکست دینے کے لئے ان کی مدد کیوں نہیں کی۔ Wilson بہر حال اپنے موقف پر اڑا رہا اور اس کی کوشش رہی کہ وہ کانگریس کو ترکوں سے جنگ کرنے سے باز رکھے۔

جس وقت Wilson جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کر رہا تھا ٹھیک اس ہی وقت یورپ کی متحدہ طاقتیں عثمانی ریاست کو خود میں تقسیم کرنے کی سازش کر رہی تھیں۔ خفیہ معاہدوں کے سلسلے میں جس کی شروعات Sykes-picot معاہدے سے مارچ 1916 میں ہوئی تھی، برطانیہ نے دریائے اردن اور خلیج فارس کے درمیان ایک بڑے علاقے کا دعویٰ کیا اور فرانس نے شام اور موصل کا، ساتھ ہی روس اور اٹلی نے مشرقی اور شمال مشرقی اناٹولیا کا۔ ان معاہدوں سے یہ ثابت ہوا کہ جنگ کے بعد عثمانیہ سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا اور ترکی کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا۔

جنگ میں شمولیت نہ کرنے کی بنا پر اس گفتگو میں ریاست ہائے متحدہ کا کوئی حصہ نہیں تھا، اس سے بڑھ کر یہ کہ ریاست ہائے متحدہ نے وہاں کے رہنے والوں کی مرضی کے خلاف علاقوں کے اس بٹوارے کی مخالفت ہی کی،

تصوراتی امن:

امریکہ کے جنگ میں حصہ نہ لینے کا نتیجہ سن 1917 میں سامنے آیا جب ترکی نے آزاد خارجہ پالیسی کو اپنانے کے خواہش کی۔ ایک ذریعے سے یہ بھی پتا چلا کہ ترکی کو دردانیال سے آبدوزیں گزارنے کی اجازت دی جائے گی تا کہ جرمن جہازوں کو تباہ کیا جا سکے۔

اس گفتگو میں Henry Morgan نے خوش دلی سے حصہ لیا، اگرچہ اس کا ماننا تھا کہ دنیا کے لئے ترکی ایک ناسور ہے جس کا مناسب علاج ہونا بہت ضروری ہے، اس کا ماننا تھا یہ علاج سیاسی

ہوسکتا ہے نہ کہ عسکری۔ یہ تسلی ہونے کے بعد کہ ترک اب اپنے جرمن آقاؤں سے اکتا گئے ہیں اس نے ایک خفیہ مشن کا ارادہ کیا جس کے بدلے ترکی اپنی افواج کو جنگ سے واپس بلا لے۔ Lansing کو کامیابی کی امید کم تھی مگر اس نے Wilson کو بتایا کہ اگر پچاس میں سے ایک امکان بھی ایسا ہے کہ جس سے جرمنی کی طاقت کو کم کیا جاتا ہے تو اس کے لئے بھی کوشش کرنے کو تیار ہے۔ صدر کو بھی اس میں یہی خطرہ تھا مگر اس کا ماننا تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کامیابی کی صورت میں فائدہ ہے اور ناکامی کی صورت میں اتنا ہی نقصان جتنا وہ ابھی برداشت کر رہے ہیں۔

Morganthau ریاست ہائے متحدہ سے 21 جون سن 1917 کو Felic Frankfuerter کے ساتھ روانہ ہوا جو کہ ایک مشہور صیہونی تھا، ان کا مقصد ترکی کو جنگ سے فرار ہونے سے روکنا تھا۔ ان کے مطابق مقدس سرزمین پر جلد ہی برطانیہ قابض ہوگا جو بعد میں اسے یہودیوں کے لئے مخصوص کر دے گا۔ Weizmann جو کہ روس میں پیدا ہونے والا ایک صیہوانی لیڈر تھا برطانوی Balfour کے ساتھ خاص روابط رکھتا تھا جو کہ مانتا تھا کہ اگر فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دیا جائے تو وہ برطانیہ کے لئے سودمند ہوگا، اس کا ماننا تھا کہ ترکوں کو برطانیہ کے یروشلم پہنچنے سے پہلے جنگ ختم کر دینی چاہیئے، اس نے Wiezmann سے کہا کہ وہ Morgenthau سے اس بارے میں بات کرے اور اس وقت تک کرتا رہے جب تک وہ اسے قائل کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

اس سے صرف امیر کی تبلیغیوں کو یہی نہیں بلکہ صیہوانیوں کو بھی فائدہ پہنچا تھا لیکن اب سے پہلے اگر ان کے مفاد یکجا تھے تو اس بار وہ الگ الگ وجوہات کی بنا پر خوش تھے۔ تبلیغیوں کے لئے جنگ کا خاتمہ تمام عرب کی سرزمین کی آزادی تھی جس میں فلسطین بھی تھا۔ اور صیہوانی اسرائیل کے لئے خوش تھے ان کے ساتھ ہی امریکی عیسائی اور کچھ امریکی یہودی بھی شامل تھے۔

امریکی تحریک کی پیدائش:

امریکی یہودیوں کا صیہوانیت کی طرف جانا ایک سست اور مشکل عمل تھا اس کا فلسطین میں موجود دیگر لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ سوئی ہوئی سامی مخالت کو جگا دینے کے خوف کی بنا پر اب بھی کچھ یہودی اس کو خطرناک سمجھتے تھے۔ صیہوانیت نے Rudolf Grossman کو اس بارے میں تنبیہ کی تھی۔

کمیونٹی کے ایک چھوٹے سے حصے کو جدا کرنے کے لئے بھی تہلکہ خیز حادثات کی ضرورت تھی، سن 1880 میں ہونے والے روسی قتلِ عام نے جس نے ہزاروں یہودی زندگیاں لیں امریکی یہودیوں پر واضح کیا کہ اب ٹھوس اقدامات کرنے کی اشد ضرورت ہے جبکہ فرانس میں Drefus کے مقدمے نے ان کو یاد دہانی کروائی تھی کہ صہوانیت کی مخالفت جدید یورپ میں بھی جڑ پکڑ رہی ہے، امریکی یہودی لیڈروں نے اپنے لئے نئی جنتیں کھوجنا شروع کر دیں جن میں سے ایک فلسطین کی سرزمین تھی جو کہ موسم کے اعتبار سے سخت اور سیاست کے اعتبار سے دشوار تھی۔ Oscar Straus نے اسکندریہ میں امریکی مشیر کو لکھا کہ روسی صورت حال سے بڑھ کر کوئی بھی ناکامی نہیں ہوسکتی خواہ وہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو۔ مگر روسی عیسائیوں کو وہاں آباد کرنا اور بات تھی اور اس ریاست کو یہودی ریاست بنانا ایک بالکل مختلف بات۔

صیہوانیت نے بہرحال نئے آنے والی مشرقی یورپی یہودیوں میں مقبولیت حاصل کر لی تھی اور سن 1897 میں امریکی صیہوانی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ روس اور پولینڈ کے برخلاف اس فاؤنڈیشن نے امریکی یہودیوں کو فلسطین جانے پر نہیں اکسایا۔ Gotheil کے ہونہار شاگرد Stephen S. Wise نے کہا کہ امریکی یہودی فلسطین کی نہیں بلکہ اس ہی سرزمین کی طلب رکھتے ہیں جو اکیلی ان کو آزادی کا احساس دلا سکتی ہے۔ جن یہودیوں نے ریاست ہائے متحدہ کو فلسطین کے لئے نہیں چھوڑا تھا ان میں Golda Meyerson اور Henriette Szold بھی شامل تھے۔

خود کو نئی تعریف کے تابع کرنے میں کامیابی کے باوجود بھی اس نظریے نے کچھ ہی امریکی یہودیوں کو متاثر کیا۔ سن 1914 میں امریکہ میں رہنے والے تین ملین یہودیوں میں سے صرف پندرہ ہزار نے ہی فیڈریشن کو واجبات ادا کیئے۔ برلن میں ہیڈکوارٹر کے ہوتے ہوئے صیہوانیت کی تحریک ایک کامیاب یورپی تحریک رہی جس کے بانی Theodor Herlz کا سوال تھا کہ کیا امریکی یہودی اپنی برادری پر ہونے والے ظلم پر چپ ہی رہیں گے؟ سوال ہی رہا۔ اپنی تعداد کے برعکس Gottheil,Wise,Felix Frank جیسے باصلاحیت لیڈر یہودیوں کی مدد میں صیہوانیت کا ساتھ دے رہے، اور ان ہی میں ایک Louis Dembitz Brandeis بھی تھا جو Kentucky میں پیدا ہوا تھا، اس کا یہودی روایات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ خود کو خالص امریکی مانتا تھا Wise نے اس کے بارے لکھا کہ ہوشمندی، عقل، وضاحت، شفافی، اور اعلیٰ ظرفی، سب اس میں

موجود تھی، میں نے جب جب اسے دیکھا مالک کا شکر ادا کیا، وہ دیکھنے میں بھی خوبصورت تھا۔ وہ ایک کامیاب شخص تھا۔

اس کا اعتقاد بالکل صیہوانیت سے ملتا تھا، ہاورڈ میں تعلیم کے دوران اس کو اس بات کا پہلے پہل اندازہ ہوا جہاں مخالفت کے باوجود صیہوانی سوسائٹی تشکیل دی گئی تھی۔ یہودی قومیت کے مسئلے پر وہ مشکل سے ہی ویسا سوچتا تھا جیسا اسے سوچنا چاہیئے تھا اس کا ماننا تھا کہ امریکہ کی وفاداری اور یہودیت کی وفاداری میں کچھ مماثلت نہیں ہے، اس نے کہا کہ ہر وہ امریکی جو فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے میں مدد کرتا ہے خواہ وہ وہاں کبھی نہ رہے ایک بہتر امریکی اور ایک بہتر یہودی ہے۔ اس نے وہاں کے یہودیوں کو وہ دیا جس کی انہیں سب سے زیادہ ضرورت تھی، اور وہ تھی طاقت۔ Wilson کے قریبی مشیر ہونے کے ناطے سے اور جلد ہی چیف جسٹس بن جانے سے اس کی رسائی اعلیٰ عہدیدران تک تھی اور اس سے وہاں یہودیوں کو بے حد فائدہ ہوا۔

جدید صیہوانی کی قدیم صیہوانیت کو مدد:

فلسطین کے یہودی کافی عرصے سے مصائب کا شکار چلے آ رہے تھے وہ دباؤ اور بے اعتباری کا شکار تھے۔ ترکی حکام تمام یہودیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے درباران کی یہاں ہجرت اور آمد اور املاک کی خریداری کو محدود کرنے کو مناسب سمجھتا تھا۔ یہودی مخالف، قدریں فلسطین میں 1914 کی طرف بڑھتے سال میں فلسطین میں موجود تھیں جو جنگ کے دوران میں شدید ہو گئیں۔ آرمینیا کے لوگوں کی طرح، یہودیوں پر اتحادیوں کے پانچویں ستون کے طور پر کام کرنے کا الزام لگایا گیا۔ Lansing کی پیش گوئی کے مطابق وہاں یہودی قتلِ عام کا خطرہ تھا۔

فلسطین کے حالات کسی بڑی مصیبت کی طرف جا رہے تھے Reverend Otis Glazebrook جو کہ یروشلم میں امریکی سفیر تھا، نے ایک بڑی نقصان کی وضاحت کی جو ان کے بینک بند کئے جانے سے اور ان کی املاک چھن جانے سے ان کو ہونے والا تھا، اور اس سے ان کا دفاع کمزور پڑ گیا تھا، نیز قریبی عربی قبایل کو ان کے خلاف جہاد پر اکسایا جا رہا تھا جو سے صورتِ حال اور خطرناک ہو گئی تھی اور ان سب میں سب سے زیادہ نقصان دہ بات پچاس ہزار روسی یہودیوں کو وہاں سے نکالنے کا منصوبہ تھی، یہ تعداد پوری یہودی کمیونٹی کی ایک تہائی تھی جس کو ترکی

اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اس کے خدشات جلد ہی سچ ثابت ہوئے۔

دوسری مغربی ریاستوں کے علاوہ جن میں سے کچھ مصروفِ جنگ تھیں اور کچھ ترکی کے ساتھ مل چکی تھیں اور خود اپنی بقا کے لئے کوشاں تھیں یہودی محض ایک ہی طاقت کی طرف رجوع کر سکتے تھے اور وہ تھی ریاست ہائے متحدہ۔

مگر یہودیوں کی مدد ریاست ہائے متحدہ کے لئے مشکلات کا سبب بن سکتی تھی جو کہ ایک غیر جانبدار قوم تھی اور اس کے پاس عثمانی مسائل میں مداخلت کا اچھا جواز نہیں تھا۔ دوسرے علاقوں میں تہذیبی اور تبلیغی سرگرمیوں کے برعکس فلسطین میں امریکیوں کی موجودگی بے حد محدود تھی۔

Wilson کا وعدہ جلد وفا ہوا۔ اس نے کہا کہ اپنے مذہب کے لئے کیا جانے والے ہر اقدام کا اثر امریکہ پر ہوگا اس نے Morgenthau سے کہا کہ وہ اپنی مدد کے لئے انتظامیہ پر پورا بھروسہ کر سکتا ہے۔ اور یہ مدد اس وقت سخت ہو گئی جب یہودیوں نے ہزاروں لاکھوں ڈالر کا فنڈ فلسطین کے لئے جمع کیا اور اسے پہنچانے سے انہیں روک دیا گیا۔ Wilson کی اجازت سے Brandeis نے امریکی خارجہ امور کو اس زمرے میں فعال کیا۔ آخرِ کار یہ امداد ریاست ہائے متحدہ کے جہازوں میں Jaffa پہنچی۔

فلسطین سے ساز و سامان لانا اور لے جانا سخت دشوار تھا مگر اس سے بھی زیادہ دشوار وہاں سے ان کے دشمنوں کو نکالنا تھا۔ Morgenthau کی مداخلت سے یہودیوں کو ایک ماہ کی مہلت دی گئی، اور ان میں سے بہت سے یہودیوں نے اس کو قبول کیا مگر باقی نے یا تو اسے رد کیا یا پھر وہ اس کے لئے دس ڈالر ادا نہ کر پائے، بہرحال ان کو مصر میں جو کہ اب برطانوی تسلط میں تھا پہنچا دیا گیا۔ اس میں چار امریکی جہازوں کے ساتھ کئی غیر جانب دار جہاز بھی شامل تھے جو کہ سات ماہ تک جفہ اور اسکندریہ کے درمیان سفر میں رہے۔ اگست 1815 کو چھ ہزار یہودیوں کی طرف سے Uss Tenessee کے کپتان کو تمغہ دیا گیا انہوں نے کہا کہ یہودیوں کے اذہان میں تا دیر اس عمل کا اثر رہے گا جس کے بدلے میں کپتان نے صیہوانیت کو دنیا کی عظیم ترین تحریکوں میں سے ایک کہا۔

اٹھو! جاگو! عرب:

یونیورسٹیوں میں، عرب کی گلیوں بازاروں میں، اخبار کے صفحات پر، اور ادبی بیٹھکوں میں

اس خیال نے جڑ پکڑی کہ عرب قومیت ہمیشہ ہی موجود رہی ہے، اندرونی بغاوتوں اور بیرونی سیاست سے بہت جلد یہ اپنے آپ کو ایک آزاد ریاست کے طور پر سامنے لائے گی۔ عربیت کے نظریئے کی ابتداء قومیت کے نظرئے کی پیداوار تھا جس نے مغرب میں جنم لیا اور تبلیغی اسکولوں اور کالجوں کے ذریعے مشرقِ وسطی تک آیا جن میں سے اکثر امریکی تھے۔ جمال پاشا نے کہا کہ میں جانتا ہوں اس مللک میں ترکوں کو ناپسند کیوں کیا جاتا ہے ان کے نصاب میں اور کتابوں میں قومیت کو جلا بخشی جاتی ہے۔ وہ اس وقت شام کا گورنر تھا۔

عرب کے مسلمان جو تبلیغیوں کی مذہبی تعلیم کو پہلے ہی رد کر چکے تھے اس بے دین مغربی نظریئے کے حق میں نہیں تھے، وہ پہلے ہی ایک قومیت کے حامل تھے جو کہ امتِ اسلامیہ تھی اور ان میں سے کچھ وہیں رہتے ہوئے اضافی حقوق کے طلبگار تھے بجائے اس کے کہ وہ کسی بیرونی فلسفے کی طرف جائیں وہ اپنے اسلام سے ہی اس کے متمنی تھے اور خود کو عرب سے زیادہ مسلمان مانتے تھے اور مشرقِ وسطی میں رہنے والے عربوں سے مختلف تھے جو اپنے مذہب کے باوجود ایک علیحدہ ریاست چاہتے تھے، مگر وہ تعداد میں زیادہ نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ شام کے عیسائی تھے اور کچھ یورپ میں بسنے والے عرب۔ "اٹھو! جاگو! عرب" کا نعرہ پروٹیسٹینٹ کالج کے ابراہیم نے سن 1868 میں لگایا تھا۔

سن 1908 کے ترکی انقلاب تک عثمانی سلطنت جس نے صدیوں تک اسلام اور عربی زبان ی حفاظت کی تھی بے دین ترکی شناخت کی سواری میں تبدیل ہوگئی اس سے پہلی بار عرب مسلمانوں کے ذہنوں میں استنبول سے ملاپ کے بارے میں سوال ابھرا۔ مسلمان فلسفیوں، جیسے کہ عبداللہ الندیم اور نوری السعدی نے عرب کی آزادی کے بارے میں عیسائیوں سے گفتگو کا آغاز کیا۔ اسی سال اس نے برطانوی حکومت کے خلاف مصر اور فلسطین میں پیش رفت دیکھی۔

بڑھتے ہوئے نوکری کے مواقع اور تجارت میں فائدے کے باوجود فلسطین میں آباد عرب وہاں بڑھتے ہوئے یہودیوں سے پریشان تھے خاص کر ان کی املاک سے۔ اس ہی دوران حیفہ میں کرمل کے نام سے نجیب نثار نے ایک اخبار نکالا جس کا مقصد صیہوانی خطرے کو بے نقاب کرنا تھا۔ نثار کی طرح صیہوانیت کی مخالفت کرنے والے زیادہ تر عیسائی ہی تھے ان کے مطابق صیہوانیوں سے فلسطین میں موجود عربوں کو ہی نہیں بلکہ تمام عربوں کے خطرہ تھا۔

عرب مسلم بھی اس سے پریشان تھے ان کو اسلامی قوم سے کٹ جانے کا خطرہ تھا اور یہ خطرہ تھا کہ اس کے بعد وہ یہودی ریاست میں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے۔ خلیل السکاکنی نے لکھا کہ یہودیوں کا فلسطین پر حق وقت کے ساتھ ختم ہوگیا ہے جبکہ ہمارا باقی ہے، وہ کیا کریں گے اگر عربوں میں قومیت کا احساس اجاگر ہوگیا، ایسی صورت میں وہ کہاں جائیں گے، عربیوں کا مقابلہ کیسے کریں گے۔

جنگ کے دوران مسلمانوں نے ترکی کا ساتھ دیا اور ان میں سے ہزاروں ترکی میں کام آئے جبکہ اس دوران برطانیہ ترکی میں عربی بغاوت کو جلا دینے میں کامیاب ہوگیا جس کا مقصد خلافت کا نفاذ تھا جو کہ مغرب زدہ ترکوں سے آزاد ہو۔ شریف حسین کا بھی یہی ماننا تھا کہ عرب اسلام کے سبب ہی متحد ہیں نہ کہ تہذیبی یا نسلی وجوہات کی بنا پر۔

قاضی اور پیمبر:

سن 1880 سے 1914 کے درمیان تقریباً 100000 عربی بولنے والے ریاست ہائے متحدہ پہنچے، ان میں سے زیادہ تر شام سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے مگر کچھ فلسطین، مصر اور اناطولیا سے بھی تھے، ان میں سے نوے فیصد عیسائی تھے، ان کے لئے امریکہ ویسا ہی تھا جیسا امریکیوں کے لئے مشرقِ وسطی، وہ آزادی، اور امید کی سرزمین تھی۔

وہ ہجرت کر کے خوش تھے مگر وہ اپنی تہذیب اور ثقافت سے جڑے رہے۔ 1892 میں نیو یارک سے پہلا عربی اخبار نکالا گیا اس کے بعد پہلی جنگ کے ختم ہونے تک امریکہ میں نو عربی رسائل گردش کر رہے تھے اس ہی دوران عربی شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کی تربیت کی گئی۔

ان میں سب سے زیادہ شہرت خلیل جبران کو ملی جس کا تعلق لبنان سے تھا وہ 1895 میں بوسٹن آیا، اس نے لبنان جا کر اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر جنگ کے دوران واپس امریکہ آگیا جہاں اس نے عربوں کے لئے کام کیا۔ اس نے عرب عیسائیوں اور مسلمانوں سے یک جہت ہو کر ترکی حکومت کے خلاف کوشش کرنے کی بات کی اس نے کہا کہ آخر کب تک چاند اور صلیب خدا کی نظروں میں الگ الگ رہیں گے۔ وہ اس سرزمین میں اپنی سیاست سے زیادہ اپنی شاعری کے لئے مشہور تھا جو محبت، قدرت اور خدا کے بارے میں تھی۔ پڑھنے والے اکثر اس کی تحریروں میں

آزادی کی جستجو کو نظر انداز کر جاتے تھے۔

جبران کا قریبی دوست امین ریحانی ادبی لحاظ سے زیادہ مشہور نہ ہوسکا مگر سیاسی اعتبار سے اس کو شہرت ملی، جبران کی طرح وہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ اس وقت امریکہ آیا تھا جب اس کی عمر بارہ سال تھی، مگر اپنی تعلیم مکمل کرنے بیروت چلا گیا تھا۔ وہ جبران کی کی طرح آزادی کا دیوانہ تھا۔

ریاست ہائے متحدہ کے لئے اس کی محبت عرب دنیا کی بنسبت لامتناہی تھی، وہ مشرقِ وسطی پر تنقید کرنے سے نہین چوکتا تھا۔ Howard Bliss کا کہنا تھا کہ یہ بدقسمتی ہوگی اگر آپ اسلام کی کچھ خامیوں کو دیکھیں گے جب کہ قوم سلطنت کے فائدے کے لئے یکجا ہو رہی ہو۔

عربوں کی تبدیلی میں جو ریحانی نے دیکھی تھی کافی رکاوٹیں تھیں، جن میں سے سب سے سنگین سن ۱۹۱۷ میں ہونے والی Balfour Declaration تھی، ریحانی نے فلسطینی یہودیوں اور یورپی صیہونیوں میں تفریق شروع کر دی تھی اس کے مطابق فلسطین کی بجائے روس کے یہودی مہاجرین کو Texas کا رخ کرنا چاہیئے تھا جہاں ان کے لئے زیادہ گنجائش تھی۔

اس کے بعد آنے والا مہنہ بھی ایسا ہی ایک جھٹکا لے کر آیا بولشوک حکومت نے مراکش میں اپنے پہلے قدم کے طور پر خفیہ معاہدے کو نشر کر دیا اور صورتِ حال سب کے سامنے سامنے آ گئی۔ اس سے ریحانی کے نظریہ کو ٹھیس پہنچی اس کا متحدہ عرب کا خواب ایک ایسی سلطنت میں تبدیل ہو گیا جس کی مددگار امریکی پیسہ اور انگریز تھے، اس نے برے حالات کی پیشنگوئی کی اگر عرب آزادی کو رد کرتے ہیں، اس کا ماننا تھا کہ اس کے نتیجہ میں ہونے والی جنگوں سے امریکہ بھی متاثر ہوگا۔

ریحانی ایک مفکر تھا جو ریاست ہائے متحدہ سے بھی وفادار رکھتا تھا اور اپنے لوگوں کے بارے میں سوچتا تھا اور یہ بات اسے Brandeis سے ممتاز کرتی تھی جس کے اپنے سیاسی مقاصد تھے۔

Colonel House نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ وہ عربوں کے بارے میں نیک جذبات رکھتا ہے اور اس کے احساسات وہیں ہوں گے جہاں وہ ٹھیک ہوں گے۔ مگر صدر کے مشیر کے ساتھ بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ چند صنعت کار اور تجارت کار Anglo_French مقابلے سے خوفزدہ تھے اریاست ہائے متحدہ اور عرب قومیت کے ملاپ کو بہتر سمجھتے تھے ان کے مطابق یہ امریکہ کے حق میں تھا اور اس کی بہترین مثال Charles Crane تھا جو کہ ایک کاروباری اور فلاحی کام کرنے والا شخص تھا اور امریکہ میں عرب کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔

شکاگو میں سن 1888 میں پیدا ہونے والا چارلس جلد ہی اپنے خاندانی کاروبار سے اکتا کر ایشیا کی طرف آیا۔ یہ ایک مذہبی آدمی بھی تھا جو چرچ کے ساتھ وفادار تھا، یہ دو چیزیں مشرقِ وسطی میں اس کے کام آئیں جہاں اس کے دو کالجوں کے لئے کام کیا اور ایک نئے مشن کے لئے پیسے جمع کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ وہ Taft کا حامی تھا اور بہت جلد ہی Wilson کے قریب ہو گیا تھا اس کا بیٹا Robert Lansings کا سیکریٹری رہا۔

Crane ابتداء میں عرب کی آزادی کا حامی تھا اور اس سلسلے میں اس نے عربی تہذیب اور تاریخ کے حوالے سے سن 1914 میں لیکچرز بھی دئے تھے۔ عرب کے لئے اس کی محبت کے سوا ویہودیوں کے لئے نفرت بھی رکھتا تھا اور اس پر فخر کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے صدر Taft نے اس کو اس کے عہدے سے برخواست کیا تھا۔

اس نفرت نے عربی قومیت میں تقویت نہیں پائی تھی یہاں تک ہوا تھا کہ عربی بغاوت میں سیکڑوں یہودی عربیوں کے ساتھ مل کر لڑے تھے، اور اکتوبر 1918 کو ترکی نے آخر کار ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

اس کے ایک ماہ بعد پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی اور اس کے بعد مشرقِ وسطی کا، عربی قومیت کا اور صیہونیت کا سوال دوبارہ سامنے آیا۔ امریکہ کے ساتھ برطانیہ اور فرانس بھی مشرقِ وسطی پر حق جمائے تھے۔ سب ہی اس خطے کو اپنے حساب پر ڈھالنے کے خواہاں تھے مگر یہ فیصلہ Wilson سے ہوا۔

مشرقِ وسطی میں امن کی ابتداء

مشرقِ وسطی میں ہونے ولی جنگ اور آنے والے انقلاب کو پیرس میں ہونے والی امن کانفرنس جو سن ۱۹۱۹ میں ہوئی کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے، خاص کر اس کے شرکاء کے لئے Woodrow Wilson پیرس محض صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ذاتی خوشی سے آیا تھا اس کی زندگی کے شروع کے سال جنگ سے ملنے والی مشکلات میں کٹے تھے سو وہ امن کا خواہش مند تھا اور جنگ سے نفرت کرتا تھا اس کے اجداد نے بھی اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا اور وہ عیسائی عقائد پر یقین رکھتا تھا وہ Anglo-Saxon تہذیب سے اور اس دنیا کو تبدیل کر دینے کی صلاحیت سے بے حد متاثر تھا اور ریاست ہائے متحدہ کو ٹھیک سمجھتا تھا بلکہ اس پر ایمان رکھتا تھا، اس کا ماننا تھا کہ امریکہ

کا مقصد تمام عالم میں جمہوریت کا قیام ہے۔

اسے مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں سے ہمدردی تھی جنہوں نے جنگوں کی وجہ سے بہت قربانیاں دی تھیں اوران انہیں آزادی کا حق تھا اوراس مقصد کے حصول کے لئے وہ اقوام کو یکجا کرنے کا خواہاں تھا۔

مگر وہ پیرس میں خیالات کے سوا بھی کچھ لایا تھا، وہ ہرطرح کے یورپی تسلط کو ناپسند کرتا تھا حتیٰ کہ برطانیہ کو بھی، وہ سلطنتِ عثمانیہ اورترکوں کے بھی خلاف تھا اس کا ماننا تھا کہ اگر جنگ رہی تو ترکی نہیں رہے گا۔

وہ ایک الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ پیرس آیا تھا۔ ایک طرف تو وہ سلطنتِ عثمانیہ کے ٹکرے اوراقوام کی آزادی چاہتا تھا خاص کرترکی سے، جواس کے مطابق تمام دنیا کے لئے فائدہ مند تھی اور یہ اس کے چودہ نکات میں سے بارہواں نکتہ تھا اور دوسری طرف اس کے برعکس اس کا کہنا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے عوام کو اپنا فیصلہ آپ کرنے کا حق ہے مگر اس حق کو کیسے پہچانا جاسکتا تھا کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا جتنا اس نے پڑھا تھا۔

مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں Wilson کے تذبذب کا اندازہ Walter Lippmann کو ہوا جو پیرس کانفرنس سے چھ ماہ پہلے New Republic کا ایڈیٹر تھا۔ اس نے کہا کہ ممکن ہے امریکہ جنگ جیت کر امن ہار دے۔ حکومت نے ایک خفیہ وفد تیار کیا جس میں ایک سو سے زیادہ مفکرین شامل تھے انہوں نے تمام چیزوں پرغور کر کے مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں پالیسی تشکیل دی James Barton کا کہنا تھا کہ پوری سلطنتِ عثمانیہ امریکی ہو جانی چاہیئے۔

انہوں نے ایسے کئی چیزیں سوچی تھیں جن کو بعد میں مشرقِ وسطیٰ پر آزمایا گیا۔ Westermann کا ماننا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ میں یورپ کا خفیہ منصوبہ غلط ہے اوراس میں ریاست ہائے متحدہ کو آگے آنا چاہیئے۔ استنبول میں عالمی نظام ہونا چاہیئے شام اورعراق میں بھی مذہبی آزادی ہونی چاہیئے اورفلسطین کو یہودیوں کے حوالے ہونا چاہیئے۔ اس خطے کے رہنے والے، عربی، یہودی آرمینی کرد، اورترکی ان چودہ نکات سے متاثر تھے۔

مالِ غنیمت:

Wilson نے دسمبر 21 سن 1918 میں پہلی بار Western Hemisphere سے باہر دورہ کیا

اوراسے خوش آمدید کہا گیا۔ فرانس اور برطانیہ بظاہر تو ترکوں سے تنگ لوگوں کی مدد کرنے کی خواہاں تھے مگر اس خطے کے بارے میں دونوں کے اورمنصوبے تھے برطانیہ کا ارادہ مصر سے خلیج فارس تک اپنی ریاست کو پھیلانے کا تھا اوراس کے لئے وہ امریکہ کو استعمال کرنا چاہتا تھا جبکہ George Clemenceau شام کو فرانس کے لئے رکھنا چاہتا تھا۔ اور یہ دونوں ہی اناطولیہ کو توڑنے پر متفق تھے گو کہ مشرقِ وسطیٰ پروفیسر Westmanns کے الفاظ میں اس کانفرنس کے تمام شرکاء کے لئے جنگ میں ملنے والے مالِ غنیمت کی طرح تھا۔

Wilson کے مطابق ریاست ہائے متحدہ یورپی معاہدوں کو رد کرتا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ سے امریکی معاشی اور ثقافتی فوائد تو چاہتا تھا مگر کوئی بھی سیاسی یا عسکری ذمہ داری قبول کرنے کا خواہاں نہیں تھا اورصرف WIlson ہی کا ملک تھا جو جنگ کے اثر میں نہیں تھا Westermann نے یاد دلایا کہ ترکی سے جنگ نہ کرکے ہم ابتک اس معاملے سے باہر ہیں اوراس کے برعکس 200000 برطانوی سپاہی مشرقِ وسطیٰ میں موجود ہیں اور بغداد سے دمشق تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ایک کانفرنس میں Smuts نے مینڈیٹ کا خیال پیش کیا جس کے مطابق متحدہ اقوام مختلف علاقے کے اپنے لوگوں کو حکومت کے لئے اپنی نگرانی میں تیار کریں گے اس خیال کو برطانیہ نے بھی تسلیم کیا اوردس اقوام نے آرمینیا، شام، فلسطین اورعرب کے لئے مینڈیٹ تیار کئے جس میں تقسیم کا کم ہی خیال رکھا گیا اوراس بات کا اس سے بھی کم کہ ان علاقوں میں بسنے والے اس کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ برطانیہ اب بھی فرانس کو نہر سوئیز سے دور رکھنے کا خواہاں تھا Wilson کے لئے مینڈیٹ کی خاص اہمیت نہیں تھی مگر وہ آرمینیا میں دلچسپی رکھتا تھا۔

اس بحث کے شرکاء میں فیصل بھی شامل تھا جو کہ عرب بغاوت کا کمانڈر اور شریف حسین کا بیٹا تھا Frankfurter نے اسے تسلی دلائی کہ یہودی عربوں سے کچھ نہیں چھینیں گے اور یہ دونوں قومیں ایک ساتھ رہ سکتی ہین وہ فیصل کے حسنِ سلوک سے اس وقت اور متاثر ہوا جب اس نے یہودیوں کو اپنا بھائی کہہ کر اپنے گھر میں خوش آمدید کہا اور کہا کہ شام ان دونوں کے لئے کافی ہے اور دونوں کا فائدہ ساتھ مل کر رہنے میں ہے، بعد میں وہ اپنی باتوں سے مکر گیا لیکن اس دوران میں اس سے صیہونیت کو بہت فائدہ ہوا۔

حصہ ششم

تیل، جنگ اور غلبہ

بائبل سے تیل کے کنویں تک

جنگ خطے میں استحکام نہ پیدا کرسکی جس طرح اس کے معماروں نے سوچا تھا۔1920ء میں مصراورعراق میں برطانیہ مخالف بغاوت شروع ہوئی اورشام میں فرانسیسی تسلط کے خلاف بھی بغاوت پھیل گئی۔فلسطین اس قتل و غارت کا مرکز تھا۔اس نازک موڑ سے بچتے ہوئے کالونیل طاقتیں اورقوم پرست جزیرہ نمائے عرب کوفراموش کربیٹھے۔یہ چقماقی ریت نمک اور پہاڑیوں کا خرابہ تھا جوبنیادی معدنی ذرائع سے محروم نظرآتا تھا۔اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ مکہ اور مدینہ آنے والے مسلمان حاجی تھے۔یہ دونوں شہر ضلع حجاز میں تھے۔برطانوی اس خطے کے ہاشمی حکمرانوں سے مطمئن تھے اورفرانسیسی لاتعلق تھے۔

یورپیوں کی طرح امریکہ بھی عرب میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔1923ء میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس وقت کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا جب عبدالعزیز ابنِ سعود کی قیادت میں کئی قبیلوں نے مل کرمقدس شہروں کو فتح کرلیااور ہاشمیوں کو بے دخل کر دیا۔عبدالعزیز کو وہابی عسکری تنظیم کی حمایت حاصل تھی۔مشرقی معاملات کے ایک ماہر نے کہا''اس علاقے کی کوئی تجارتی اہمیت نہیں۔ایک اورشخص نے کہا کہ سعودیوں کے جنگی رویے سے یہ ظاہر ہوا کہ عربوں نے کوئی ترقی نہیں کی جس طرح یہ تیرہ سوسال پہلے تھے ویسے ہی یہ آج ہیں۔عبدالعزیز ابنِ سعود نے خودکو سعودیہ کا بادشاہ قرار دے دیالیکن امریکہ نے اسے ابتدائی طور پر تسلیم نہ کیااور اپنا سفیر مقرر کرنے سے انکار کردیا۔

سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی سعودیہ کی طرف سے بےفکری میں سبھی امریکی شامل نہیں تھے

۔عیسائی مبلغ پوری رغبت سے خطے میں مصروف تھے۔صدی تبدیل ہونے سے پہلے سیموئل ویمر نے جزیرہ نمائے عرب میں پہلا جدید کلینک کھولا اورایک امریکی فزیشن پال ہیریسن کوامریکہ سے بلوا کر سربراہ مقرر کیا۔پال ہیریسن شاندارشخصیت کا مالک تھااسے بدو رہن سہن اور اس کے پہناوے پر لکھنے کا شوق تھا۔لیکن مقامی ثقافت سے اسے ذرا بھی لگاؤ نہیں تھا۔اور مذہب سے تو بالکل نہیں۔مذہب جو یہاں کے لوگوں کوایک مستحکم ریاست میں طویل عرصے کے لئے متحد کرسکتا تھا۔اس نے عربوں کی چھوٹی بڑی جنگوں سازشوں بغاوتوں اور کشت و خون کی تاریخ پڑھی تھی۔لیکن کوئی چیز اسے اپنے فرایض سے غافل نہ کرسکی۔وہ مقامی لوگوں کی طبی ضرورتیں پوری کرتا رہا۔اس نے تسلیم کیا کہ وہ وہاں کے لوگوں کوعیسائی بنانا چاہتا تھالیکن عرب میں یہ عمل بہت سست تھا۔اس عمل کوتیز کرنے کے لئے جنگِ عظیم اول سے ایک سال پہلے اس نے اپنی طبی سہولیات کو دورتک توسیع دی اور کویت،عمان اور بحرین میں اپنے کلینک کی شاخیں قائم کی تھیں۔اس نے نئے ڈاکٹر شامل کیے۔جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ایلینور کالورلی نے 1912ء میں اپنی عرب آمد پر کہا تھا کہ اس لمحے سے پہلے یہاں آنا ایک المناک قربانی نظر آتی تھی۔لیکن اب ایسے لگتا ہے جیسے میں یہی کام دنیا میں کرنا چاہتا تھا۔ایک اورفزیشن نے جدہ پورٹ پر کہا تھا یہاں اتر کرایسے لگا جیسے میں نے نیا جنم لیا ہے۔

ایلینس کا تجربہ بہت عمدہ تھا۔کئی عیسائی مبلغ یہاں کے لوگوں کے مذہبی تضادات،صحرا کی خوبصورتی اورقبائل کے رومان سے مسحور ہوکر کھینچے چلے آئے تھے۔شاہ ابنِ سعود سے زیادہ مسحورکن شے امریکیوں کے لئے نہیں تھی۔شاہ کا قد چھ فٹ چار انچ،لمبے لباس میں ملبوس،گوندھے ہوئے بال،چمکتے دانت اورآنکھوں میں آبنوسی چمک نے مبلغین کواپنا اسیر کرلیا۔اس کی ہر چیز اور ہر بات سے ذہانت،عزم اورقوت عیاں ہوتی تھی۔حقیقت یہ تھی کہ ابنِ سعود کی125 بیویاں تھیں مشین گنیں تھامے ہٹے کٹے باڈی گارڈز اس کے ساتھ ہوتے تھے۔اس کا اتحاد،وہابیوں سے تھا۔

شاہ سعود کومغربی لوگوں سے کم سروکار تھاوہ صرف موثر میڈیکل کیئر کا خواہاں تھا۔اس نے پہلی بار امریکی ڈاکٹرز کے بارے میں1911ء میں سنا تھاجب بحرین میں ایک ڈاکٹر نے اس کے دس آدمیوں کی جان بچائی تھی جنھیں گولی لگی۔1914ء میں شاہ نے کویت میں ملیریا زدہ آدمی علاج کی غرض سے بھیجے۔تین سال بعداس نے ہیریسن کو ریاض میں بلوایا تھا۔مجھے علم ہے تم ایک

عیسائی ہو لیکن معزز لوگ ہمارے دوست ہیں ان کا جو بھی مذہب ہو۔نومبر 1923ء میں اپنے چہرے کی جلد پر سوزش کی وجہ سے ایک اور ڈاکٹر لوئیس ڈیم کو بلوایا جس نے ایک ہفتے کے اندر شاہ کو صحت یاب کر دیا۔ پون صدی کے اندر، ہیریسن، ڈیم اور دیگر مبلغین نے عرب کے تین لاکھ سے زائد لوگوں کو صحت یاب کیا ان میں سے کئی بہت امیر سعودی بھی شامل ہیں۔

اس احسان مندی نے جلد ابن، سعود کو مغربی اتحادی چننے میں سہولت دی برطانیہ نے عراق اور اردن میں مدید توسیع کو ترک کر دیا۔ سعودی زمین صرف پہاڑ اور ریت کے علاوہ دنیا کی اہم ضرورت تیل بھی رکھتی تھی اس پر سب کی نظر تھی۔

ہم آہنگی اور منافرت

سابقہ ابواب میں ہم تفصیل سے ان طریقوں کا جائزہ لے چکے ہیں کہ امریکہ 1776ء سے اب تک کس طرح مشرقِ وسطیٰ کے معاملات کرتا آیا ہے۔اس کا مقصد تاریخ کی زرخیزی اور مواد کو ظاہر کرنا ہے اور ان بنیادوں کو عیاں کرنا ہے جن سے امریکہ آج بھی مشرقِ وسطیٰ میں دخیل ہے۔اس کا مقصد 150 برسوں کے امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے تعلقات کے حوالے سے تاریخ کے اس خلا کو بھی پر کرنا ہے۔ جو انقلابی جنگ اور جنگِ عظیم دوم کے خاتمے تک محیط ہے۔

یہ آخری حصہ پچھلی چھ دہائیوں سے معاملہ کرتا ہے، جو سرد جنگ سے عراقی جنگ تک محیط ہے یہ دورانیہ اصل میں امریکی شمولیت کا سخت تناؤ والا دور ہے 1776ء سے 1945ء تک کے دور کے بارے میں بہت کم کوئی کام موجود ہے۔معاصر دور میں بہت سی کتب اور مضامین لکھے گئے ہیں۔1973ء کی جنگ کے فوری بعد عرب اسرائیل امن کے لئے امریکی کوششوں کے لئے بہت مطالعاتی دور منعقد کئے گئے۔مثال کے طور پر یو۔ایس سعودی اتحاد جو 1950ء اور 1960ء کی دہائی میں ہوا اس پر بہت کچھ موجود ہے۔کھری تحقیق کے حوالے سے اس میں کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا۔دوسری طرف پچھلے تیس برسوں کے واقعات میں وزارت خارجہ کی دستاویزات کی عدم دستیابی مزاحم ہے۔ یہ دستاویزات سنجیدہ تحقیق کی بنیاد ہیں جو ابھی تک مختلف خانوں میں تقسیم ہیں اور عوام سے مخفی رکھے جاتے ہیں۔1948ء سے آج تک مشرقِ وسطیٰ میں امریکی شمولیت کے جائزے کی کوئی کوشش میں پہلے سے لکھی گئی باتوں کے دہرانے کا خطرہ ہو گا یا جو کچھ ابھی معلوم نہیں اس پر سوچ بچار ہو گی۔

ناکارہ ترین شخص

خارجہ امور میں ماہر نہ ہونے کے سبب آئزن ہاور نے مشرق وسطی اور زیادہ تر دنیا سے متعلق ذمہ داری جان فاسٹر ڈلس کو دے دی۔ سنجیدہ اور غیر دلچسپ مزاج کا یہ شخص اپنی جذبات سے عاری نگاہیں اسٹیل کے فریم والی عینک کے پیچھے چھپائے رکھتا جب کہ ایک پائپ سے اپنی مسکراہٹ روکے رکھتا۔ وہ اپنے رکھ رکھاؤ سے عاری رویہ کے سبب بدنام تھا۔ ونسٹن چرچل جو 50 کی دہائی میں دوبارہ برطانیہ کا وزیر اعظم بن گیا اسے تین لفظوں میں یوں بیان کرتا ہے، نااہل، نااہل ترین۔ پرنسٹن سے گریجوایٹ اور ایک (Presbyterian) فرقے کا فرد ہوتے ہوئے بھی ڈلس نوآبادیاتی نظام کی مخالفت میں ولسن کا پیروکار جب کہ امریکی مفادات کے تحفظ کے اپنے عزم میں جیکسن کا پیروکار تھا۔ اس نے سوویت یونین کو عالمی برائی قرار دیا اور غیر وابستہ ممالک جیسے انڈونیشیا اور انڈیا کو اس برائی کے مددگار کی حیثیت سے دیکھا۔ اس نے سینیٹ کو بتایا کہ سوویت یونین نے بے چینی پھیلانے والی قوتوں کو تسخیر کر لیا ہے۔ سخت موقف رکھنے والے قوم پرستوں کو چاہیے وہ چین، برما، مراکش، مصر، عرب یا ایران کہیں بھی ہیں ڈلس نے ایک خطرہ ہی سمجھا۔ ڈلس کے بھائی ایلن نے پہلے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا اور پھر CIA کے سربراہ کی حیثیت سے ذمہ داری اٹھائی۔ دونوں بھائیوں نے مشرق وسطی کو ان لوگوں سے نجات دلانے کا عزم کیا۔ جنہوں نے روس کا راستہ ہموار کیا تھا تاکہ وہ مشرق وسطی میں آ سکے۔

ڈاکٹر مصداق اس کی مہم کا پہلا نشانہ تھا۔ مصداق اپنے دوستانہ رویے کے ساتھ 1953ء میں ایران کے مضبوط فرد کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اس نے فوج کا کنٹرول سنبھال لیا۔ کمیونسٹ تودہ پارٹی سے اتحاد کیا۔ اثر و رسوخ نہ رکھنے والے مگر مغرب کے حامی شہنشاہ کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ڈلس کے خیال میں یہ واقعات خلیج فارس کے ایک قوم پرست کمیونسٹ اتحاد میں جانے اور اس کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کے تیل کو کھونے کا واضح اشارہ تھے۔ اس تباہی کو روکنے کے لئے ڈلس نے برطانیہ سے مل کر مصداق کو ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔ CIA کے کرمیٹ روزولٹ ، لوینڈرسن امریکہ کا تہران میں سفیر اور جنرل نورمن ایچ سوازکوف کو مدد سے Ajax نامی ایک منصوبہ بنایا۔ خاص بات یہ کہ ماضی میں یہ سب ایرانی قوم پرستوں کو سپورٹ کرتے رہے تھے۔

انہوں نے ایران کے پریس میں مصدق پر سخت حملے کروائے اور ملک کی گلیوں میں حکومت مخالف تحریک شروع کروائی۔ آخر شاہ نے دوبارہ حکومت حاصل کر لی جبکہ مصداق کو نظر بند کر کے اس کے سینکڑوں حامی قتل کر دیئے گئے۔ مصداق اپنی موت 1967ء تک نظر بند ہی رہا۔

ایران میں بغاوت CIA کے لئے ایک مثال ثابت ہوئی جس پر عمل کرتے ہوئے CIA نے گوئٹے مالا کے صدر کو 1954ء میں ہٹایا۔ البتہ جن ملکوں میں کمیونسٹ خطرہ اتنا زیادہ نہیں تھا وہاں قوم پرستوں کی حمایت جاری رکھی اور اس معاملے میں اپنی یورپی اتحادیوں کی ناراضگی کی پرواہ بھی نہ کی۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے 1955ء میں واضح کیا کہ ہم مقامی لوگوں کی مخالفت مول لئے بغیر فرانس کی شمالی افریقہ میں ہونے والی سیاست کی حمایت نہیں کر سکتے۔ جارج میلون جس نے فرانس کی مدد سے امریکہ کو نوآبادیاتی غلامی کے تباہ کن جال میں جانے سے روکا اس نے بھی سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فرانس شمالی افریقہ میں پولیس اسٹیٹ چلا رہے ہیں۔ امریکہ نے درحقیقت مراکش کے بادشاہ شاہ محمد اور حبیب بورقیبہ کی واپسی پر اصرار کیا۔ جنہیں فرانس نے جلاوطن کر دیا تھا۔ امریکہ نے ہی ان ملکوں کی 1956ء میں آزادی کے حصول میں مدد کی۔ امریکہ نے فرانس کی طرف سے الجزائر کے قوم پرستوں کو دبانے کا سلسلہ ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ عربوں کی حمایت میں دور تک جاتے ہوئے امریکی صدر نے کہا کہ امریکہ شمالی افریقہ میں فرانس کی ایسی پوزیشن کو سپورٹ نہیں کر سکتا جو ہماری اچھائیوں کو مٹی میں ملا دے۔

مصدق کے خلاف بغاوت میں امریکی کردار پر کئی ایرانیوں کو غصہ تھا جبکہ دوسری طرف برطانیہ اور فرانس ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ایک اعلیٰ برطانوی افسر نے کہا کہ امریکی انقلاب کی ہر تحریک میں ایک نیا جارج واشنگٹن دیکھتے ہیں۔ ایک اور افسر نے آزاد مسلم ریاستوں کی اٹلانٹک سے بحر ہند تک ایک زنجیر بنانے کے امریکہ خواب کو (تعاون حاصل کرنے کا خواب) غیر اہم قرار دیا۔ الفانسو جون نے جو ایک فرنچ جنرل تھا اس سازش پر جس کے تحت امریکی نو آبادیاتی مخالف رویہ کو مشرق وسطیٰ میں پائی جانے والی مذہبی انتہا پسندی سے جوڑ کر فرانس کو شمالی افریقہ سے نکالا جانا تھا۔

امریکہ کی مشرق وسطی سے متعلق غیر یقینی سیاست نے یورپ کو مشکل میں ڈال دیا جس کا نتیجہ مصر میں نکلا۔ آئزن ہاور کی انتظامیہ نے مصر میں آزاد فوجی افسروں کے تعلقات کو مضبوط کیا۔

مئی 1953ء میں قاہرہ میں مشرق وسطیٰ سے واپسی پر ڈلس نے برطانوی فوجوں کی مصر سے واپسی کے مطالبے کی کھل کر حمایت کی۔ آئزن ہاور نے چرچل کو لکھا کہ ہمیں اپنی کم سے کم دفاعی ضروریات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مصر کی حکومت اور عوام کے گہرے قوم پرستانہ جذبات سے سمجھوتہ کرنا چاہیے۔ ڈلس کو یقین تھا کہ ایک مرتبہ آزاد ہو کر مصر اپنی مرضی سے مشرق وسطیٰ ڈیفنس آرگنائزیشن کو جوائن کر لے گا۔ ڈلس کو شکایت تھی کہ پرانا نوآبادیاتی رویہ مقامی لوگوں کو روس کے ہاتھ میں دھکیل دے گا۔ ڈلس نے برطانیہ پر دباؤ میں اس وقت اضافہ کر دیا جب مصری گوریلے برطانوی فوجوں پر شدید حملے کر رہے تھے۔ جس کا نتیجہ سول وار کے دوران کپاس کی قیمتوں میں اضافے سے ہوا۔

لیکن مصر نے MEDO کو قبول نہیں کیا۔ ناصر نے واضح کیا کہ اسرائیل سے تنازع مصر کی MEDO کی شمولیت میں رکاوٹ ہے۔ برطانوی فوج کی واپسی سے مصر اور اسرائیل میں کشیدگی بڑھ گئی۔ ناصر نے ڈلس سے اسرائیل کو محدود رکھنے اور امن کی ضمانت کے طور پر زمین دینے کا مطالبہ کیا۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے کئی دوسرے عیسائی افسروں کی طرح ڈلس کو بھی یہ بات اچھی لگی۔ اس نے یہودی ریاست پر تنقید کی اور عربوں سے ہمدردانہ رویہ رکھا۔ اس نے کہا کہ امن قریب ہے وہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اس تجزیے سے اتفاق کرتا تھا کہ اسرائیل زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے عربوں کے حوالے کر کے ہی امن حاصل کر سکتا ہے۔ مگر امن اس کے نزدیک مشرق وسطیٰ میں امن کی بحالی کا نام نہ تھا، بلکہ اپنی مذہبی تربیت اور فلسطین سے وابستگی کی وجہ سے بہت بلند مقام کا حامل تھا۔ وہ خود کو ارض مقدس میں بحالی امن کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

مذہب اور اسٹریٹجک مفادات ہی کے سبب ڈلس نے برطانیہ کو ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے راضی کیا تھا جس کا مقصد اسرائیل اور مصر میں سمجھوتہ کروانا تھا۔ اس سے چند ہفتے پہلے اس نے مصر سے برطانیہ کو نکالنے والوں کی مدد کی تھی۔ 1954ء کے آخر تک اینگلو امریکن منصوبہ سازوں نے الفا نام کا منصوبہ بنایا جس کا مقصد تھا کہ اسرائیل زمین کے بڑے خطے مصر کو دے اور مصر اسرائیل کی مخالفت نہ کرنے کا عہد کرے۔ اسرائیلی وزیر نے منصوبہ مسترد کر دیا اس کا کہنا تھا کہ 1948ء کی جارحیت کرنے پر مصر کو نوازا جا رہا ہے۔ مگر ڈلس بن گوریاں کو آمادہ کرنا چاہتا تھا اسے

ناصر کو خوش کرنا تھا۔

مصر کے لیڈر نے عربوں کی باہمی سیاست میں اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ایک مشکوک پلان قبول کر لیا۔ وہ جو جواہر لال نہرو کے ساتھ غیر وابستہ تحریک میں اپنی اہمیت برقرار رکھنا چاہتا تھا، پہلے مقصد نے ایسے کسی امکان کو ناممکن بنایا کہ ناصر عربوں کے دشمن کے ساتھ کسی طرح سمجھوتہ کرے گا۔ الفا کی شرائط کو مسترد کر کے ناصر نے برطانیہ، ترکی، پاکستان، ایران اور عراق کے درمیان ہونے والے نام نہاد بغداد پیکٹ کو مسترد کر دیا اور سرخ چین کو تسلیم کرنے کو بھی مسترد کر دیا۔ اس نے بڑے پیمانے پر سوویت اسلحہ چیکوسلواکیہ سے خریدا۔ ڈلس دوسرا امن منصوبہ سامنے لے آیا جس کے تحت صدر کے خصوصی سفیر کو ناصر اور بن گودیاں کے درمیان مسلسل سفر کرنا تھا تاکہ ان میں ملاقات کروا سکے۔ رابرٹ بی اینڈرسن 1956ء کے موسم بہار میں قاہرہ پہنچے تو ان کو پتہ چلا کہ ناصر نہ امن کی بات کرنا چاہتا ہے نہ امن کا حصول چاہتا ہے۔ ڈلس جو اس ذلت آمیز برتاؤ پر غصے میں تھا۔ اس نے آپریشن اومیگا کے نام سے ایک نئے منصوبے کا آغاز کر دیا جس کا مقصد قتل سے کم کسی بھی طریقے سے مصر میں حکومت کی تبدیلی تھا۔ اردن اور لبنان میں دوستانہ حکومتوں کو مضبوط کرنا اور شام میں مغرب نواز حکومت کا قیام اس منصوبے کے حصے تھے۔ اس منصوبے کے تحت شاہ سعود کو پوپ کی طرح کے ایک روحانی رہنما کے طور پر پیش کیا گیا تاکہ وہ ناصر کی جگہ عرب لیڈر کے طور پر ابھر سکے۔ سب سے خطرناک کام امریکہ کی طرف سے مصر کی امداد روکنے کا منصوبہ تھا۔

ناصر نے پابندیوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا 23 جولائی 1956ء کو ناصر نے نہر سویز کو تحویل میں لے کر دنیا کو حیران کر دیا۔ ناصر نے وضاحت کی کہ اس قوم کا اصل نشانہ، استعماری ممالک اور ان کا ساتھ دینے والے ہیں جنہوں نے مصر کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی ہے اور اسوان بند کی تعمیر کے لئے امداد روکی ہے۔ برطانیہ کی نظر میں سویز نہر کا بنیادی حصہ دار ناصر بالکل ہٹلر جیسا اور سویز کینال کی بندش خطرناک جیسا واقعہ تھی۔ انتھونی ایڈن نے قسم اٹھائی کہ ہم ناصر کی حکومت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ناصر الجزائر کے گوریلوں کی پشت پناہی بھی کر رہا تھا۔ جس کے بعد فرانس اسے کیسے پسند کرتا۔ فرانس کے وزیر خارجہ Christian Pineau نے اعلان کیا کہ اگر مصر قوم پرستی میں دور تک چلا گیا تو فرانس صرف تیسرے درجے کی طاقت رہ جائے گا جبکہ یورپ کا انحصار

عربوں پر ہوگا۔ فرانس اور برطانیہ نے مصر کے خلاف فوجی حملے کی تیاریاں شروع کر دیں جو امریکہ کے واضح یا خفیہ اشارے کے منتظر تھے۔

سویز کینال کے بحران نے امریکہ کے سامنے پھر مشکل آپشن رکھ دیے کیا ایک غیر وابستہ قوم پرست حکومت جس کے ماسکو سے بھی تعلقات تھے کا ساتھ دے یا پھر ان طاقتوں کا جو مشرق وسطیٰ کی حفاظت کر سکتی تھیں۔ امریکہ نے اخلاقی اصولوں پر فوجی مفادات کو ترجیح دی تھی جبکہ اس نے ایران میں مصدق کو نکالنے میں برطانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن مصر میں ان کا نظریہ غالب تھا۔ ڈلس نے دعویٰ کیا کہ تنازعہ ناصر اور مغرب کا نہیں بلکہ مصر کے قوم پرستوں اور یورپ کی توسیع پسندی کا ہے۔ امریکہ خود کو دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی مکمل طور پر نہیں جڑ سکتا چاہے وہ نو آبادیاتی طاقتیں ہوں مکمل آزاد و خود مختار ہونے کی خواہش مند ریاست، اگر خفیہ طور پر اس نے برطانیہ اور فرانس کو بتا دیا کہ وہ مصر کے خلاف طاقت کا استعمال مسترد نہیں کرے گا مگر کھلے طور پر فوجی حل کے خلاف ہے۔

اتحادیوں سے ایسا رویہ سچی شراکت داری کو تباہ کر دے گا، ایڈن نے احتجاج کیا۔ فرانس نے امریکہ پر الزام لگایا کہ اس نے ناصر کو اقتدار میں رکھنے اور مصر میں حقیقی جمہوریت کو روکنے کے لئے سوویت یونین سے ساز باز کر لی ہے۔ ڈلس کے دوغلے رویے پر ناراض ہو کر فرانس نے اسرائیل کو ہتھیار دینا اور مصر پر حملے کے لئے اس کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔ برطانیہ جس نے اسرائیل پر خود سے کوئی مصالحت نہ کی تھی شروع میں ہچکچایا مگر اب وہ بھی سازش میں شامل تھا کہ اسرائیل سویز کینال کے علاقے پر چڑھائی کر کے اینگلو فرانس مداخلت کا راستہ ہموار کرے۔

29 اکتوبر 1956ء کو دن نکلتے ہی سینا کے پاس جو کہ سویز نے 25 میل دور تھا، وہاں پیراشوٹ ہی پیراشوٹ فضا میں تھے اسرائیل کے پیراٹروپرز نے مصر کے دستوں کے ساتھ جو پاس میں موجود تھے شدید لڑائی کی جبکہ شمال میں کچھ آگے ایک محفوظ فارمیشن نے غزہ سے سویز تک مصر کا دفاع توڑ دیا۔ فرانس اور برطانیہ نے اسرائیل اور مصر کے دستوں کے نہ نکلنے کی صورت میں مداخلت کی دھمکی دی، توقع کے مطابق مصر نے الٹی میٹم مسترد کر دیا۔ اینگلو فرنچ بحری دستوں میں سمندر میں چلنے کی تیاری شروع کی۔ ایڈن نے ڈلس کو یقین دلایا کہ یہ معاملہ کسی طرح سابقہ نو آبادیاتی دور یا قصے کی طرف واپسی کا نہیں بلکہ کمیونزم کے خلاف اپنے کمزور نقطے کو مضبوط کرنا

ہے۔ ڈلس غصے میں بہر حال تھا۔

فرانس اور برطانیہ نے جونہی مصر پر بمباری کا آغاز کیا۔ امریکہ اور سوویت یونین نے جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد پاس کرا لی جس میں سوویت یونین اور امریکہ نے مصر پر جارحیت کی مذمت کی اور نہر سویز پر اقوام متحدہ کے امن دستے تعینات کرنے کا کہا۔ برطانیہ اور فرانس کی فوج ایک ہفتہ میں نہر پر قبضہ کے ارادہ سے 5 نومبر کو اتری، مگر ان باتوں سے مجبور ہو کر اینگلو فرانس اتحاد کو سویز نہر مصر کے حوالے کر کے واپس جانا پڑا۔ اسرائیل نے بھی امریکہ طرف سے پابندیوں کے خدشے کے سبب اپنی فوج ہٹا لی اور غزہ اور سینا کے علاقے خالی کر دیئے۔

نو آبادیاتی مخالف رویہ اور مشرق وسطیٰ کے نیشنل ازم سے حوصلہ افزائی پا کر امریکہ نے اپنے یورپی اتحادیوں کے خلاف سوویت یونین کا ساتھ دیا۔ برطانیہ اور فرانس غصے کے ساتھ اور عربوں کے غیر دوستانہ رویے کے ساتھ امریکہ کے حصے میں سوویت یونین کی طرف سے بھی توہین آئی۔ اس قوم نے بھی اس کی قدر نہ کی جس کو اس نے بچایا تھا۔ ناصر نے مشرق وسطیٰ میں امریکہ کو نئی سامراجی طاقت قرار دے دیا۔ ناصر کے نوجوان ترجمان انور سادات نے الزام لگایا کہ امریکہ کہ تاکید کی جا رہی ہے کہ وہ برطانیہ اور فرانس جیسے نااہل اور دیوالیہ ملکوں کی جگہ لے کر مشرق وسطیٰ پر اثر انداز ہو۔ سویز تنازعہ کے ایک سال کے اندر ناصر کا احتجاج علاقے کی مغرب نواز حکومتوں کی اہمیت کم کر رہا تھا۔

امریکہ اس موقع پر حملہ کی واقعی مزاحمت سے قاصر تھا۔ ٹرومین کی طرف سے مشرق وسطیٰ کو یورپی استعمار سے چھڑانے کا کام شروع ہوا۔ آئزن ہاور نے خود کو اپنے اتحادیوں کے ساتھ مشکل صورتحال میں پایا جس میں اسے اپنے ساتھیوں کی مدد حاصل نہ تھی۔ امریکہ کے پاس مشرق وسطیٰ میں مداخلت کے لئے کافی فوج تھی نہ کوئی قانونی اڈہ تھا جس کے ذریعے خطے میں مداخلت ہو سکتی ''اب ہمیں عمل کرنا اور مشرق وسطیٰ سے نکلنا ہے'' اس نے ڈلس کو بتایا۔ اس علاقے کو بے عملی کے سبب کھونا چین کو کھونے سے بھی برا ہوگا، کیونکہ اس کی فوجی اہمیت بہت ہے۔

ٹرومین کی طرح آئزن ہاور کو کسی ڈاکٹرن کی ضرورت تھی جس کے سلسلے میں صدر نے کانگریس سے 400 ملین ڈالر مانگے تاکہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو کسی بھی ریاست کے خلاف تیار کیا جا سکے۔ امریکہ کا اشارہ ان ریاستوں کی طرف تھا جو کمیونسٹ ہیں۔ اس کے ساتھ مشرق وسطیٰ

کے علاقے کے دفاع کے لئے فوجی دستے بھیجنے کی اجازت مانگی گئی۔ تاریخ میں کبھی کبھار ہی کسی قوم کا عزم اس طرح پرکھا گیا جس طرح کہ ہمارا عزم، اس نے کہا اور کانگریس نے اس سے بھرپور اتفاق کیا گیا۔ امریکہ کا عزم 1958ء میں جانچا جا سکا جب ہجوم نے عراقی حکومت کو الٹ دیا۔ اس کے بادشاہ اور وزیراعظم کو سرعام قتل کر دیا۔ اردن اور لبنان کی روایتی حکومتیں بھی مغری مخالف بغاوتوں کا سامنا کر رہی تھیں۔ مصر کی طرف سے سوویت یونین کی حمایت سے خطے کا کنٹرول سنبھالنے کو ذہن میں رکھ کر آئزن ہاور نے کچھ سوچا۔ امرکی فضائیہ کے طیارے برطانوی پیراٹروپرز کی مدد کے لئے روانہ کئے۔ جولائی کی ایک جلتی صبح بیروت کے ساحل پر 8500 GIs اترے۔ امریکہ کی زمین اور پانی میں پہلے آمدورفت کے برعکس کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ ہزاروں لوگ جو موقع پر موجود تھے وہ صورتحال کے لئے تیار نہ تھے اگرچہ پھر بھی ہزاروں خوراک کے برتن اور سویٹر کو سپاہیوں کو دیا گیا۔

پہلے امریکہ نے برطانیہ سے ایک مقبول ایرانی حکومت کے الٹنے میں تعاون کیا پھر برطانیہ پر مصر خالی کرنے کے لئے دباؤ ڈالا۔ اس نے شمالی افریقہ کے قوم پرستوں کو فرانس کے خلاف حمایت دی پھر ان کا تختہ الٹا۔ اس نے ناصر کو اینگلو فرنچ جارحیت سے بچایا، مگر پھر عرب حکمرانوں کو ناصر سے بچانے کے لئے ملوث کیا۔ اصولوں کے محور اور حقیقی سیاست میں گھرے ہوئے آئزن ہاور انتظامیہ نے خطے میں اپنے اقدامات سے ہٹنے کا عجیب سلسلہ شروع کیا۔ اپنے اتحادیوں سے ناراض ہوتے ہوئے اور اپنے دشمنوں کو اکساتے ہوئے۔ امریکہ کے متعلق عام طور پر مانا جاتا تھا کہ اس نے صحیح طور پر اور محتاط طریقے سے ایران، شمالی افریقہ اور مصر میں اپنے بنیادی مفادات کی حفاظت اور اپنے جمہوری آئیڈئیلز کا دفاع کیا ہے۔ وہ اسی طرح تھے جیسے مارک ٹوین ان کے متعلق کہتا ہے۔ اگر ......مشرق وسطیٰ کی حد تک مگر انہوں نے بعض اوقات امریکی وحشیوں کا کردار ادا کیا۔

جس ایمانداری کے ساتھ امریکیوں نے بڑھتی ہوئی پیچیدہ صورتحال اور اخلاقی طور پر مختلف مفہوم رکھنے والی صورتحال کو دیکھنا شروع کیا۔ اس کا ایک ثبوت 1959ء میں بنائی گئی ''بن حر'' سے ملتا ہے۔ ایک امریکی سفیر کے قلم سے یہ کہانی 80 سال پہلے لکھی گئی Lew Walbee مصنف کا نام تھا۔ فلم ایک خاموش فلم کی طرز پر تھی یہ ایک سیاہی پیغام بھی رکھتی تھی اس کا مرکزی کردار Judah Ben-Hur تھا جو کہ ایک یہودی شہزادہ تھا اور جو ایک عرب شیخ Ilderim سے دوستی کرتا ہے اور دونوں

اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ Ilderim اپنی لائنیں مشرق وسطیٰ کے لہجے میں ادا کرتا ہے لیکن بن حر مڈ ویسٹ کے لہجے میں بات کرتا ہے۔ ایک بار پھر نئے امریکی اور پرانے یہودی کے اتحاد کی بات۔ رومن اگرچہ برطانوی لارڈز کی طرح لگتے ہیں۔ بن حر اور Ilderim ہی فاتح کے طور پر ابھرتے ہیں۔ جذبہ انتقام کو اعتدال پر لاتے ہوئے جیسا کہ دونوں کرتے ہیں اگرچہ حقیقی طور پر مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور امریکہ کے درمیان زیادہ قریبی اور مضبوط تعلق نہ تھا اور ایسا ہی عربوں کے معاملے میں تھا۔ اب علاقے کے لوگوں کے کان سامراجی قوت کے طور پر برطانیہ نہیں بلکہ امریکہ کے نام سے آشنا تھے۔ پھر بھی مشرق وسطیٰ کے لوگوں نے امریکہ سے لفظوں کی ایک نئی ترتیب سنی۔ جس نے پرانے لفظوں کو سہارا دیتے معاشرتی پوزیشن جیسی جدید چیز سے جوڑ دیا۔ اس آواز سے امریکہ کے علاقے سے تعلقات کا مختلف دور سامنے آیا۔ یہ ایک ایسی شراکت تھی جو غلبہ کی بجائے برابری کی بنیاد پر تھی اور جو پرامن عزم اور دوطرفہ احترام کی بنیاد پر رہنماؤں کے تعلقات کی قائل ہو۔ مصر، اردن، فلسطین اور اسرائیل کے لوگوں کے لئے جان ایف کینیڈی کی یہ آواز یکساں اطمینان بخش تھی۔

صدر کینیڈی کی آمد

اگرچہ کینیڈی کی پرورش ایک رومن کیتھولک کے طور پر ہوئی مگر اس نے Puritan فرقے کے امریکہ کے متعلق پہاڑی پر واقع شہر کا نظریہ قبول کر لیا ساتھ ہی امریکی اقدار کو دنیا بھر میں پھیلانے کا عزم کیا اور مقامی قوموں کی خودمختاری کی حمایت کا فیصلہ کیا ''ہماری خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا ٹیسٹ یہ ہے کہ ہم کیسے سامراجیت کے چیلنج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس امتحان پر کسی بھی قوم سے زیادہ ہماری قوم کو گزرنا ہوگا کیونکہ ایشیا اور افریقہ کے لاکھوں لوگ اس حوالے سے ہمیں جانچیں گے''۔ ایک سینیٹر کی حیثیت سے کینیڈی نے اعلان کیا امریکہ نے مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اس امتحان کو آزادی کی تحریکوں کی حمایت کر کے پورا کیا، جو ابھی یورپ سے چھٹکارے کی کوشش میں مصروف تھیں، اور ان نو آزاد حکومتوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے جو غیر وابستہ تھیں۔ 1961ء میں عہدہ سنبھالنے کے بعد کینیڈی نے فرانس سے آزادی کے لئے الجزائر کی حمایت کی اور امریکہ کی ناصر سے نفرت پر نظر ثانی کی۔

کینیڈی کے پہلے اقدامات میں سے مصر کے صدر کو لکھنا اور اسے دوستی کی دعوت دینا تھا۔ سول وار کے متعلق کینیڈی نے ناصر کو لکھا کہ ہمارا ملک بھی کبھی عرب دنیا کی طرح تھا۔ آزاد کالونیز کا ایک گروہ جو ایک متحدہ دولت مشترکہ بننا چاہتا تھا۔ اس نے ناصر کو متحدہ عرب ری پبلک کی تخلیق پر مبارکباد دی، جو کہ 22 فروری کو شام اور مصر سے الحاق سے وجود میں آئی اس اشارے کا جواب گرم جوشی سے دیا گیا۔ ناصر نے انتہائی اطمینان اور تعریف کے ساتھ کینیڈی کے خط پر اپنے جذبات ظاہر کئے۔ اس نے اس محبت کا تذکرہ کیا جو وہ اور اس کے ہم وطن امریکہ کے لئے رکھتے تھے۔ اس نے مشرق وسطیٰ سے تعلقات کے باب میں نیا اور شائستہ باب کھول دیا۔ اس شائستہ رویے کا واضح ثبوت بے تحاشا معاشی امداد اور گندم کے ذخائر کی فراہمی تھی۔ 60 مصری اپنی روزانہ خوراک امریکہ سے لے رہے تھے۔ اس نے امریکہ اور ناصر کے درمیان دوستی بڑھا دی۔ ناصر اور امریکہ کا مسلسل رومانس فلمی دنیا میں 1962ء کی کلاسیک فلم ''لارنس آف عریبیہ'' کی شکل میں سامنے آیا۔ ایک اہم منظر میں ایک زرد امریکی صحافی صاف طور پر Lowell Thomas کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنی حمایت عرب کی آزادی اور شہزادہ فیصل کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ جبکہ پہلی جنگ عظیم چل رہی ہوتی ہے۔ وہ فیصل سے کہتا ہے کہ جناب ہم امریکی کبھی غلام تھے اور ہر اس قوم کے لئے (خواہ وہ کہیں بھی ہو) جو آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہے ہم گہری ہمدردی رکھتے ہیں۔

مگر اسی سال 1962ء میں ہالی وڈ کی متھ اور مشرق وسطیٰ کے حقائق پھر الگ ہو گئے۔ کیونکہ کینیڈی کا مصر میں فیصلہ کام نہ آیا۔ یہ پیشرفت اس وقت ہوئی جب یمن میں ناصر سے رابطہ رکھنے والے آزاد افسروں کے ایک گروہ نے مغرب کے حامی امام کا تختہ الٹ دیا۔ جب سعودی عرب نے شاہ کو بحال کرنا چاہا تو ناصر نے اپنے دسیوں ہزار فوجی یمن میں بھیج دیے۔ مصر کے طیاروں نے سعودی عرب میں مخصوص جگہوں کو نشانہ بنانے کا منصوبہ بنایا۔ سوویت ہتھیاروں سے مسلح اور سوویت یونین سے مشورہ لینے والی ایک فوج جو تیل کے ذخائر سے اتنی قریب تھی جس تیل کے ذخائر پر امریکہ کا بے حد انحصار تھا۔ ایسا نظارہ کینیڈی انتظامیہ کے لئے پریشان کن تھا۔ جو حال ہی میں کیوبا کا میزائل بحران حل کر کے ہٹی تھی۔ کینیڈی کو ناصر کے لئے اپنے پسندیدگی کے جذبات اور خلیج فارس کے دفاع کے درمیان چلنا تھا۔ اس کو واضح پتہ چل گیا کہ اب کیا کرنا ہے جب ناصر نے ایک سیز فائر معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ اپنے پہلے خط کے دو سال بعد ناصر نے جنگی

جہاز ریاض کا دفاع کرنے کے لئے بھیج دیئے۔

اپنی توانائیاں ناصر کے ساتھ معاہدے پر ضائع نہ کرتے ہوئے کینیڈی نے دوبارہ سے اپنی توجہ کا مرکز اسرائیل اور اس کے عربوں سے جاری تنازعہ کو بنا لیا۔ آپریشن الفا کے بعد سے بلکہ آپریشن گاما کے بھی بعد سے جو 50 کی دہائی میں ناکامی سے دوچار ہوئے امریکہ کے پالیسی سازوں کو پتہ چل گیا کہ خطے میں امن کا کوئی امکان نہیں۔ انہوں نے عرب اسرائیل تنازعہ حل کروانے کی بجائے اسے آئس باکس رکھنے کا فیصلہ کیا تا کہ دوبارہ جنگ روکی جا سکے۔ کینیڈی جو 1939ء میں یروشلم میں ہونے والے تشدد آمیز واقعات نہیں بھولا تھا اس کا خیال بہت مختلف تھا پہلے قدم کے طور پر اس نے تنازعہ کے حل کے لئے ہزاروں فلسطینی مہاجروں کی اردن کی وادی میں آباد کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس وادی کو دریائے اردن سے سیراب کیا جانا تھا۔ لیکن بن گودریاں اسرائیل کے پانی کے بنیادی ذخیرے کو دشمنوں کے ساتھ بانٹنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ جب کہ عرب لیڈروں نے اسرائیل سے سمجھوتے کا امکان مسترد کر دیا۔ امن کے لئے اپنی کوششوں کی ناکامی سے پریشان کینیڈی نے نئے عرب اسرائیل تنازعہ کو روکنے کی کوشش شروع کر دی۔ جس سے مزید خون بہنے کا امکان تھا۔ وہ اسرائیل کی طرف سے ایٹمی ہتھیاروں کی خفیہ تیاری سے بھی پریشان تھا۔ اس کے خیال میں مشرق وسطیٰ میں ہتھیاروں کی نئی دوڑ شروع ہو سکتی ہے۔

''ایک عورت کو صرف پاکباز ہی نہ ہونا چاہیے بلکہ اسے ایسا نظر بھی آنا چاہیے'' نیو یارک کے والڈرف اسٹوریا ہوٹل میں کینیڈی نے بن گودریاں سے کہا۔ کینیڈی نے اس بات کو مسترد کر دیا کہ اسرائیل پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے اور اس نے بن گودریاں کی طرف سے امریکن انسپکٹروں کے معائنہ سے روکنے کا مطالبہ مسترد ہونے پر شکایت کی۔ اسرائیل کے مقاصد کا پتہ امریکی انسپکٹر ہی لگا سکتے تھے کہ یہ کتنے اچھے ہیں۔ ''ہمارا مشترکہ مفاد اسی میں ہے کہ دنیا کے کسی ملک کو یقین نہ ہو کہ اسرائیل ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد تیزی سے بڑھا رہا ہے۔ کینیڈی نے اپنے سے کہیں کم جسامت اور زیادہ بوڑھے شخص یعنی بن گودریاں سے کہا''۔ مگر تجربہ کار اسرائیلی سیاستدان نے کینیڈی کے خدشات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے اسرائیل کے پرامن ارادوں کا یقین دلایا۔ وہ ساتھ ہی پوچھ رہا تھا کہ اگر ناصر جیت گیا تو کیا کرنل ناصر یہودیوں سے وہی سلوک نہ کرے گا جو ہٹلر نے کیا۔

اسرائیل کی ایٹمی صلاحیتوں کا مسئلہ حل طلب اور کینیڈی کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات میں تنازعہ کا باعث تھا۔ اس نے بن گودیاں کے مصر سے متعلق خدشات کم کرنے کی کوشش کی اور اسے زمین سے فضا تک مار کرنے والے ہاک میزائل دینے کی بھی پیش کش کی۔ جو امریکہ کی اسرائیل کو ہتھیاروں کی فروخت کی ایک مثل تھی۔ بن گودریاں نے ہاک میزائل دیمونہ کے گرد نصب کر دیے اور امریکہ اسلحہ انسپکٹروں کو روکنا جاری رکھا۔ 1963ء کے موسم گرما میں کینیڈی نے اسرائیل کو اکتا کر وارننگ دی کہ نیوکلئیر ایشو پر ان کی ضد سے امریکہ اور اسرائیل کے تعلقات خطرے میں پڑ جائیں گے۔

صدر کینیڈی نے اپنے سے پہلے صدور کی مشرق وسطیٰ کے متعلق پالیسیوں کو بغور جانچنا شروع کیا مگر اس نے اسے پریشان ہی کیا۔ اس نے ناصر سے مصالحت کی کوشش کی اور اسرائیل کے ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد پر معاہدہ کرنا چاہا مگر دونوں نے صاف انکار کر دیا۔ عرب اسرائیل مصالحت اب بھی صرف امریکہ کا ہی خواب تھی۔ اس قسم کی باتوں سے مایوس ہو کر کینیڈی نے مشرق وسطیٰ سے متعلق اپنی پالیسیاں بدلنا شروع کر دیں حالانکہ اس کی پالیسیاں درست تھیں۔ اس نے آئزن ہاور دور کی خطے کو کمیونزم سے بچانے کی پالیسیوں کی طرف واپسی شروع کر دی۔ یا پھر اس پالیسی کا دوسرا پہلو خطے سے تیل کی سپلائی کو یقینی بنانا تھا۔

صدر جو 22 نومبر 1963ء کو ڈیلاس کی لوفیلڈ پر اترا۔ وہ کسی بڑی پیشرفت کے امریکہ اور مشرق وسطیٰ تعلقات میں نہ ہونے سے مایوس تھا۔ کینیڈی کا اسی دن قتل امریکی تاریخ کا ایک اور رخ بدلنے والا واقعہ تھا جس نے امریکی معاشرے میں لاتعداد تبدیلیوں کو جنم دیا اور اس کا ایک سلسلہ خارجہ پالیسی میں شروع ہو گیا مگر اس کا امریکہ کا مشرق وسطیٰ سے تعلقات پر زیادہ اثر نہ پڑا۔ آزادی کے بعد شام، مصر اور عراق میں نوآبادیاتی نظام کی جگہ فوجی ڈکٹیٹروں نے لے لی۔ واضع طور پر سوویت نواز جیسے مصر کا صدر ناصر اور امریکہ نواز جیسے شاہ ایران اور اردن کا بادشاہ الگ الگ نظر آ رہے تھے۔ برلن دیوار کے خاتمہ سے پہلے سرد جنگ کا فرنٹ یا محاذ ویت نام کے جہنم سے گزر کر نخلستان اور بلکہ مشرق وسطیٰ کے ریت کی پہاڑیوں پر آ گیا تھا۔

ہسپانیہ سے مصری قصبے تک:

36 واں صدر رومانوی مزاج کا نہیں تھا۔ گہرائی کی حد تک غیر واضح جیسا کہ وہ داخلی طور پر

سول رائٹس کی جنگ میں پرعزم رہا یا پھر جنوبی ایشیا میں کمیونزم کے خلاف اپنی بدقسمت جدوجہد کے معاملے میں ڈٹا رہا۔ لنڈن بھی جانس کو مشرق وسطیٰ کے حوالے سے کینیڈی کی متھوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ ہی خطے کے واقعات اس کی اجازت دیتے تھے۔ ناصر سعودی عرب اور اردن کی امریکہ نواز حکومتوں کے خلاف بدترین پروپیگنڈہ کر رہا تھا۔ اس نے سوویت یونین کے ساتھ پر شور اتحاد کیا اور لیبیا میں ہوائی اڈہ کے بند کرنے کا مطالبہ کیا۔ نومبر 1964ء میں احتجاج و ہنگامہ کرنے والوں نے قاہرہ میں امریکی سفارتخانے کی لائبریری جلا دی۔ جب امریکی سفیر نے اس پر احتجاج کیا تو ناصر نے اسے ٹھنڈا ہونے کا کہا اور یہ بھی کہ جو کوئی مصر کے خلاف بات کرے گا اس کی زبان کاٹ دی جائے گی۔ ہم کاؤ بوائے کی بدمعاشی قبول نہیں کریں گے۔ ناصر نے واضح کہا۔ اشارہ امریکی صدر کی طرف تھا جو ٹیکساس سے تھا۔ جانسن نے جواب میں گندم کی فراہمی روک دی۔

جانسن کی سخت سوچ بھی اسرائیل کے حوالے سے اس کی شدید جذباتیت کے مظاہرے نہ روک سکی۔ ''تم نے ایک عظیم دوست کھو دیا''۔ اس نے کینیڈی کے قتل کے کچھ دیر بعد ہی اسرائیل سفارتکار سے کہا ''ہاں مگر تمہیں ایک اور بھی اچھا دوست مل گیا ہے''۔ نئے صدر کے چند قریبی مشیر جیسے Eugene Rostow...... سیکرٹری آف اسٹیٹ اور آرتھر گولڈ برگ امریکی یہودی تھے اور اسرائیل نواز خیالات پر ان پر شدید تنقید بھی ہوئی۔ جانسن کی اسرائیل کے لئے گرم جوشی اس کا ہی رویہ تھا اور یہودی بڑی تعداد میں کھل کر ڈیموکریٹک پارٹی کو سپورٹ کر رہے تھے اور جب امریکی یہودیوں نے ویت نام جنگ کی مخالفت کی پھر بھی یہ گرم جوشی قائم رہی۔ اس کی بنیادیں دراصل جانسن کے مذہبی اعتقادات میں تھیں۔ ''یہودیوں کا خیال رکھو وہ خدا کے منتخب لوگ ہیں''۔ اس کے پکے...... گاڈ فادر نے اسے بتایا۔ اس کی ایک آنٹی کہتی ''اگر اسرائیل تباہ ہوا تو دنیا ختم ہو جائے گی''۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ مسلسل بتاتا رہا کہ امریکہ کے اسرائیل سے تعلقات عربوں کو دور کر دیں گے اور تیل کی سپلائی کو خطرہ لاحق ہو گا۔ مگر صدر پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اسرائیل کو موجودہ دور کا Alomo سمجھتا جو عادی دشمنوں میں گھرا تھا۔ ناصر کو تو وہ Sonta Ana کا دوسرا جنم سمجھتا تھا۔ جس نے کہ یہ قلعہ چھینا تھا اور جو میکسیکو کا جنرل تھا۔

یہ بات اس وقت واضح ہوئی جب 15 مئی 1967ء کو ناصر نے اپنا قدم جنگ میں رکھ دیا الفتح کی مدد سے جس کی مدد شام کر رہا تھا فلسطینیوں نے اسرائیل میں کئی گوریلہ حملے کئے۔ جس میں

کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ الفتح کو ایک سابق انجینئر یاسر عرفات لیڈ کر رہا تھا۔ مصر کی لیڈر شپ کو درپیش چیلنج کا جواب دیتے ہوئے ناصر نے PLO کو ہدایت کی کہ یہ اپنے آپریشن شروع کرے۔ ان حملوں پر اسرائیل کے جواب سے شام کے ساتھ اسرائیل کا شدید تصادم گولان کے پہاڑوں پر ہوا۔ جس میں شمالی اسرائیل کو نظرانداز کر دیا گیا اور آخر میں نتیجہ سوویت دعوی تھا جس میں اسرائیل پر شام کی سرحدوں کی شدید خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا۔ ناصر کو جلد اندازہ ہو گیا کہ الزامات غلط ہیں پھر بھی اس نے ان الزامات کو امن فوج کو خطے سے نکالنے کے لئے استعمال کیا۔ جنہیں اقوام متحدہ نے سویز تنازعہ کے بعد سے صحرائے سینا اور غزہ کی پٹی میں رکھا تھا، ایک ہفتے بعد ناصر نے ایک اہم بندرگاہ کو بند کر کے اسرائیلی جہاز رانی روک دی اور اردن، شام اور عراق سے فوجی معاہدے کئے۔ عرب دنیا میں کھلی جنگ کا مطالبہ عوامی مظاہروں میں ہو رہا تھا۔ عراقی صدر نے صاف کہا ہماری منزل اسرائیل کو دنیا کے نقشے سے مٹانا ہے۔

مگر پہلے نشانہ کون لے گا عرب فوجی اسرائیل کی سرحدوں پر گشت کر رہے تھے اور سوویت ان کی حملے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اسرائیل اپنی وجود کی بقاء کے لئے لڑ رہا تھا۔ اسرائیل کے ہسپتال پٹیوں اور خون کے نمونوں سے بھر گئے۔ عربی لوگوں کی اتھارٹیز نے جنگ کے مظالم کا حساب لگا کر ہزاروں قبریں تیار کر لیں۔ فرانس جو اسرائیل کا اہم اتحادی تھا اس کی طرف سے عربوں کو پیچھے دھکیلنے کا اچانک فیصلہ واضح طور پر اسرائیل کی فوری ضرورت تھا تاکہ ناصر کو روکا جا سکے۔

جانسن اگرکئی معاملات میں اسرائیل سے متعلق تھا اور اس کے خدشات کو جائز سمجھتا تھا مگر پیشگی حملے کے خلاف تھا۔ جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ اس سے سارا مشرق وسطیٰ جنگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ بلکہ شاید یہ دنیا کی جنگ بن جائے ''اگر اسرائیل خود اکیلا جانے کا فیصلہ نہ کرے تو وہ تنہا نہیں ہوگا''۔ ایک خطرناک جنگ سے بچنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے صدر نے 2 درجن قوموں کے جہازوں پر مشتمل قافلہ بنانے کا منصوبہ پیش کیا ''اگر مصریوں نے قافلے پر حملہ کر دیا تو امریکہ کے چھٹے فلیٹ کے طیارے مصر میں اہم تنصیبات کو نشانہ بنائیں گے''۔ صدر نے واضح کہا خفیہ طور پر بنائے گئے منصوبے کو Regatta کہا گیا جس نے اسرائیل کو متاثر کیا۔ انہوں نے جانسن کو اسے عملی جامہ پہنانے کا وقت دیتے ہوئے اپنا حملہ ملتوی کر دیا۔ کانگریس جو پہلے ہی ویت نام میں امریکہ کے پھنس جانے سے بے چین تھی اس نے کسی آپریشن سے روک دیا۔ یورپ

نے ایک طرح حسب عادت اپنے آباؤ اجداد کی یاد تازہ کی اور جیسے بربری مہم میں شامل ہونے سے انکار کیا تھا اسی طرح اب بھی امریکہ کے ماتحت کسی بھی اتحاد کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔

جانسن کے لئے واحد سکون بخش خبر انٹیلی جنس سے آئی کہ اسرائیل مصر کو فوری شکست دے دے گا یا عربوں کے کسی بھی اتحاد کو۔ اسرائیل کو یہ بات پہلے ہی پتہ تھی۔ ایک حیران کن حملے میں جو جون 5 کو شروع ہوا۔ اسرائیلی جنگی طیاروں نے صبح کے آٹھ بجے حملہ کر دیا۔ انہوں نے مصر کے جیٹ طیاروں کو نشانہ بنایا اور ان میں سے 286 کو تباہ کر دیا۔ اسرائیل کے ٹینک اور مشینی یونٹ نے مصر کی سینا اور غزہ میں مضبوط دفاعی لائن کو زک پہنچائی۔ ناصر کے ساتھ معاہدے کے احترام میں اردن اور شام کی فوج جنگ میں داخل ہو گئی۔ اسرائیل کے اسی قسم کے حملوں سے دوچار ہونا اس کا بھی مقدر بن گیا۔ مصری گاڑیوں کی تباہ حال قطاریں سینا کے صحرا کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ پسپائی کے دوران اردن اور شام نے بھی جلے ہوئے ٹینکوں کا سلسلہ اور گولان کی پہاڑیوں پر گرے لوگ چھوڑ دیئے۔ یہی حال جو گولان میں ان فوجوں کا ہوا مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم میں بھی تھے۔ یہودی فوجی ہرمن پہاڑ پر اسرائیل کا جھنڈا لہرانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ رائفلیں لہراتے سویز کینال میں چل رہے تھے۔ ان کے فوجی مغربی دیوار کے سامنے دعا کی چادر کی بجائے بیلٹ بیلٹ باندھے ہوئے تھے۔

ذاتی طور پر جانسن نے اسرائیلی فتح کی تعریف کی جبکہ سوویت یونین کو یقین دلایا کہ امریکہ لڑائی روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ صدر نے اقوام متحدہ میں جنگ بندی کی منظوری میں تاخیر سے کام لیا۔ یہاں تک کہ عربوں کی شکست یقینی ہو گئی۔ 8 جولائی کو اسرائیلی طیاروں اور میزائل سے لیس کشتیوں نے امریکی جاسوسی جہاز کو نشانہ بنایا۔ جس کا نام US Liberty تھا۔ جس میں 34 فوجی مارے گئے اور 171 زخمی ہو گئے۔ صدر کی پوزیشن پھر بھی اسرائیل کی حمایت میں تھی۔ اس کے عقیدت کا اگلے دن پھر امتحان ہوا جب سوویت یونین نے 1956ء کے بحران کی یاد دلانے والی حرکت کی اور اپنے فوجی مداخلت کے ارادے کو ظاہر کیا۔ مگر جانسن نے کچھ کرنے سے انکار کیا۔ ''تلاش کرو چھٹا بحری بیڑہ کہاں ہے''۔ اس نے اپنے ایڈوائزر سے کہا اور اس کو واپس مڑنے کا کہا۔ سوویت یونین نے غلطی کا اعتراف کر لیا اور اسرائیل کو اس کے راستے پر دیکھنا جاری رکھا۔

6 روزہ جنگ جیسا کہ اسے کہا جاتا ہے نہ صرف اسرائیل بلکہ مغرب کی طرف سے بھی یہ

مشرق وسطیٰ میں فوجی فتح تھی۔ اسرائیل نے اپنے سائز سے تین گنا علاقہ لے لیا اور 2 ملین فلسطینیوں کو جو غزہ، مغربی کنارے کے ایک چھوٹے مگر اہم حصہ میں رہ رہتے تھے یا مشرقی یروشلم میں تھے ان کو مخصوص علاقے تک محدود کر دیا۔ جغرافیائی، سیاسی اور انسانی نقطہ نظر سے جنگ کے نتائج جانسن کی مرضی کے تھے۔ امن کوششوں میں بھی ایسا ہی ہوا جو جنگ کے بعد ہوئیں۔ جیسے ہی سیز فائر قبول ہوا صدر نے سیکرٹری آف اسٹیٹ Restow کو امن منصوبہ تیار کرنے کی ہدایت کر دی۔ جس نے اپنے اسٹاف کو بتایا ''مت بھولو کہ بحران ایک موقع ہے کئی سر پرستی کرنے والوں نے نقصان اٹھایا ہے اور دروازے کھلے ہیں''۔

امریکی فارمولے میں اسرائیل سے مقبوضہ علاقوں سے واپسی کا مطالبہ کیا گیا جس کے بدلے عرب خطے میں موجود تمام ریاستوں کے حقوق کو تسلیم کریں گے ''ایک محفوظ اور مانی ہوئی حد بندی کے اندر اندر'' اس منصوبے میں فلسطینی مہاجروں کی منصفانہ آبادکاری پر زور دیا گیا۔ انہی بنیادوں پر اقوام متحدہ کی قرارداد 242 نافذ ہوئی۔ جو کہ اسی سال نومبر میں ہوئی۔ یہاں امن عمل کا نقطہ آغاز تھا۔ فیصلوں کی عملداری کے امکانات کم تھے۔ گو اسرائیل نے گولان کی پہاڑیاں اور سحرائے سینا سے امن کے عام معاہدوں کے بدلے دستبردار ہونا قبول کر لیا جو شام اور مصر سے ہونے تھے۔ اس نے مشرقی یروشلم کو اپنے ملک میں یک طرفہ طور پر شامل کر لیا۔ خرطوم میں عرب سربراہاں کے اجلاس میں تین اصولوں پر اتفاق ہوا۔ اسرائیل کے ساتھ بات چیت نہیں۔ اسرائیل کے ساتھ کوئی امن نہیں۔ اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ فلسطینی قرارداد 242 میں اپنے حق خودارادیت کے مطالبے کو شامل نہ کرنے پر غصے میں تھے اور مسلح جدوجہد سے اسرائیل کا خاتمہ چاہتے تھے۔ اس کی قیادت PLO کے پاس تھی جو مصر کے کنٹرول سے آزاد ہو کر الفتح کے زیر اثر آ گئی اور اس کے چیئرمین عرفات تھے۔

مصر کی قیادت میں 6 عرب ریاستوں نے واشنگٹن کے ساتھ تعلقات سخت کر دیئے۔ ناصر نے اسرائیل کو جنگ کے لئے تحریک دینا جاری رکھا۔ جس میں دونوں فوجیں نہر سویز سے پار ایک دوسرے پر دھماکہ خیز مواد کے شیل، نشانہ لے کر فائر اور فضائی حملے روزانہ کی بنیاد پر کر رہی تھیں۔ اردن سے PLo اسرائیل کے سرحدی قصبوں اور آبادیوں کو نشانہ بنا رہی تھی۔ اگر اس کا مقصد اسرائیل کو واشنگٹن سے دور کرنا تھا تو ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے الٹ ہوا۔ جانسن نے اسرائیل کو

150 جنگی جہاز دیئے۔ جس کے ذریعے امریکہ نے اسرائیل کو سب سے بنیادی اور زیادہ ہتھیاروں کے سپلائی کے طور پر فرانس کی جگہ لے لی۔ رابرٹ ایف کینیڈی جو سابق امریکی صدر کے چھوٹے بھائی تھے ان کے قتل سے ایسے کسی فیصلے کو کم اہمیت کا حامل سمجھا جا رہا تھا۔

1967ء کی جنگ جس کے نتائج نے خطے کو متاثر کیا ایک بنیادی موڑ تھا جس سے نئے مشرق وسطیٰ نے جنم لیا۔ عرب قوم پرستی، ایک زیادہ سیکولر نظریہ کو نقصان ہوا۔ جس سے یہ سنبھل نہ سکے۔ جس سے اسلامی بنیاد پرستی کو فروغ ملا۔ اسرائیل کے لوگوں کی یروشلم اور مغربی کنارے سے جذباتی وابستگی مذہبی جوش جذبے کے نتیجے میں بڑھی۔ جنگ امریکہ کے خطے سے تعلقات کے لئے بھی بہت اہم تھی کیونکہ کئی ملین ایوانجلسٹ نے اسرائیل کی ہمیشہ قدر کی اور بائبل کی پیشنگوئیوں کا ظہور قرار دیا۔ چھ روزہ جنگ کو مسیح کی آمد کے لئے خدائی منصوبے کا حصہ قرار دیا گیا۔ مگر اس فتح نے امریکہ کے ان پالیسی میکرز کو بھی جو یہودی ریاست سے تعلقات بڑھانے کے خلاف تھے آمادہ کیا کہ اسرائیل کو امریکہ کا سرد جنگ میں اہم دولت تصور کیا جائے۔

امریکی ماہرین مشرقِ وسطیٰ میں

رچرڈ نکسن کے دور میں مشرق وسطیٰ ایک پریشان کن جنگ کا شکار اور نظریاتی طور پر تقسیم شدہ خطہ بن گیا لیکن نکسن کی خشک اور بے ربط شخصیت اس صورتحال کا سامنا کرنے کے لئے بہتر تھی۔ اگرچہ اس کی پرورش کوئیکر فرقے سے تعلق رکھنے والے مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی مگر اس نے مشرق وسطیٰ کے متعلق جو رویہ اختیار کیا اس میں مذہب کا عمل دخل بہت ہی کم تھا۔ اس کی پالیسیاں صرف سوویت یونین سے خطے کو لاحق خطرات کو سامنے رکھ کر بنائی گئیں۔ ان پالیسیوں کی شدت بھی امریکہ کی ضرورت کے مطابق تھی۔ نکسن نے عرب اور اسرائیل کے درمیان امن سمجھوتے اور عرب امریکہ تعلقات کو وسعت دینے جیسی اہم ضروریات کو بھی سرد جنگ سے لاحق خطرات کے تابع کر دیا۔

دنیا کے متعلق نکسن کے خیالات سے بڑی حد تک اس کا ذہین مشیر ہنری اے کیسنجر بھی متفق تھا۔ کیسنجر ایک جرمن یہودی تھا جس نے نازیوں کے خوف سے امریکہ میں پناہ لی تھی۔ وہ نہ صرف سیاسی بے چینی کے خطرات سے واقف تھا بلکہ سیاسی استحکام کی اہمیت سے بھی آگاہ تھا۔ ہاورڈ

یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران اس نے مقالے کا موضوع آسٹریا کے ماہر شہزادے (Metternich) کو بنایا۔ جس نے نپولین کے بعد کے یورپ میں اپنی سلطنت کے مفادات کا تحفظ کیا تھا۔ وہ اس کی حکمت عملی کو عالمی سطح پر استعمال کر کے امریکہ کے عالمی کردار کو مضبوط کرنا اور ماسکو کے ساتھ ایک طویل مدتی توازن قائم کرنا چاہتا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے معاملے میں یہ آسان چیلنج نہ تھا۔ نکسن نے واضح کیا کہ ہمارے اور سوویت یونین کے مشرق وسطیٰ سے متعلق رویہ کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم امن چاہتے ہیں جبکہ وہ مشرق وسطیٰ پر کنٹرول چاہتے ہیں۔ امریکی انتظامیہ نے اس صورتحال میں ایک اور عرب اسرائیل جنگ کا خطرہ روکنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں کیونکہ اسرائیل کے جنگ کی صورت میں عربوں کا انحصار سوویت اسلحے اور مشیروں پر بڑھ جاتا۔ صدر نے اسرائیل کی حفاظت کے متعلق پہلے ہی سوچ رکھا تھا جس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسے یہودیوں کے ووٹ کی ضرورت تھی کہ صرف مشکل سے 8% یہودیوں نے ہی اسے ووٹ دیا تھا، نہ ہی اس کی وجہ نکسن کا کوئی فرقہ سے تعلق ہونا تھا۔ نکسن نے قانون سازوں کے ایک وفد کو بتایا کہ اسرائیل مشرق وسطیٰ میں سوویت خطرے کو کم کرنے کا باعث ہوگا میں اسرائیل کو اس لئے سپورٹ کرتا ہوں کہ ایسا کرنا امریکہ کے مفاد میں ہے۔ مگر نکسن کو یقین تھا کہ اسرائیل کا امریکہ سے اتحاد امن کے امکانات کو خطرے میں ڈال دے گا۔ صدر نے اپنے سیکرٹری ولیم پی راجر کو اختیار دیا کہ وہ اسرائیل اور مصر کی لڑائی روکنے کے لئے ثالثی کرے اور اسرائیل پر زور دینا شروع کیا کہ وہ قرارداد 242 کے مطابق زمین دے کر امن کا حصول ممکن بنائے۔ نکسن نے سوویت یونین کو اس سلسلے میں مل کر کام کرنے کی دعوت دی۔

نکسن نے مشرق وسطیٰ کے سلسلے نپے تلے انداز میں کام کرنا شروع کیا۔ مگر واقعات کے الجھ جانے سے یہ پالیسی کام نہ کر سکی۔ لیبیا میں جنگجو اور دھوکہ دہی کے ماہر قذافی نے شاہ...... کا تختہ الٹ دیا۔ سوویت یونین کا اسلحہ الجزائر اور سوڈان میں بڑے پیمانے پر آنے لگا سرخ فوج کے ہزاروں مشیر مصر، جنوبی یمن، شام اور عراق پہنچ گئے۔ ناصر نے جنگ بندی زون میں اپنے سوویت ساختہ میزائیلوں کو حرکت میں لا کر راجر کی طرف سے مصر اور اسرائیل کے درمیان کروائی گئی جنگ بندی کی خلاف ورزی کی۔ اسرائیلی وزیر اعظم گولڈا میئر کو جنگ بندی کے لئے راجر کی امداد سے خوشی ہوئی، وہ نکسن کی اضافی اسلحے کی فروخت کی آفر پر بیتاب تھی۔ لیکن اس نے 1967ء میں

اسرائیل کی طرف سے چھینے گئے علاقہ کو امن سے کم کسی بھی قیمت پر واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن ناصر نے امن تو کیا مصالحت کی بات کرنے پر بھی آمادگی ظاہر نہ کی۔

انتظامیہ کی مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اپنے کم از کم مقاصد کے حصول کی پالیسی کی ناکامی کی واضح مثال اردن میں بڑھتی ہوئی لاقانونیت تھی۔ PLO نے عملی طور پر ریاست میں ریاست بنا رکھی تھی۔ یہ گوریلوں کے دستے دریائے اردن کے پار بھیجتی اور اسرائیل کی سرحدی بستیوں پر راکٹ فائر کئے جاتے۔ اسرائیل نے ایسے حملوں کا بھرپور جواب دیا جو مسلسل بڑھتے ہوئے تشدد کا نیا دور تھا۔ لیکن عالمی حوالے سے کشیدگی میں اضافہ 1970ء کو اس وقت ہوا جب PLO کے گوریلوں میں TWA، سوئس ایئر اور پان امریکہ کے تین مسافر طیارے اغواء کر لئے اور انہیں زبردستی اردن کے صحرا میں اتارا گیا۔ ہائی جیکروں نے 34 عورتوں سمیت 54 لوگوں کو یرغمال بنا لیا اور انہیں محفوظ پناہ گاہ میں لے گئے پھر طیاروں کو دھماکہ خیز مواد سے اڑا دیا۔

ان واقعات نے PLO اور اردن میں موجود طویل عرصے سے چلی آ رہی کشیدگی کو بہت بڑھا دیا۔ فلسطینی اس دور کو بلیک ستمبر کے نام سے جانتے ہیں۔ شاہ حسین کی فوج اور PLO کے گوریلوں میں زبردست لڑائی پھوٹ پڑی۔ شاہی فوجوں نے گوریلوں پر قابو پا لیا۔ لیکن تب شام نے فلسطینیوں کی طرف سے مداخلت کی دھمکی دی۔ شدید پریشان شاہ حسین نے شام کی برتر فوج سے مقابلے کے لئے امریکہ سے مدد مانگی۔ نکسن نے حسین کی تعریف کی اور سرد جنگ میں اردن کے کردار کو سراہا مگر وہ خوفزدہ تھا کہ اردن کی فوجی مدد کرنے پر سوویت یونین شام کا دفاع کرے گا۔ جو سپر پاورز کے تصادم پر منتج ہوگا۔ صرف ایک صورتحال ممکن تھی وائیٹ ہاؤس اور اسرائیلی سفارت خانے کے درمیان ایک حصہ فون لائن کا استعمال کرتے ہوئے نکسن نے اسرائیلی سفیر Litzhak Robin سے درخواست کی کہ اسرائیل اپنی فوجوں کو شمالی اردن میں شام کا راستہ روکنے کے لئے حرکت دے۔ اسرائیلی سفیر کے متعلق یاد رہے کہ وہ خود نیو یارک سے تعلق رکھتا تھا اور چھ روزہ جنگ (1967) کے درمیان چیف آف اسٹاف تھا۔ یہودی فوجیوں کو ایک عرب بادشاہ شاہ حسین کے لئے اور امریکہ کی خاطر اپنی زندگیاں داؤ پر لگانے کے لئے کہا جا رہا تھا۔ رابن نے گولڈ میئر کو پیغام دے دیا۔ جس نے اس کی منظوری دے دی۔ مگر اسرائیل کی مدد غیر ضروری ثابت ہوئی۔ اردن کے طیاروں نے بارڈر کے گرد منڈلاتے شاہی ٹینک برباد کر دیئے۔ عرفات اور PLo کو

لبنان جلاوطن کر دیا گیا۔ حسین کا دور جاری رہا مگر وائٹ ہاؤس نے اسرائیلی رویہ کو یاد رکھا کہ کس طرح اسرائیل امریکہ کے لئے قربانی دینے پر رضامند تھا۔ اگلے تین سال کے دوران امریکہ نے اسرائیل کی امداد کئی گنا بڑھا دی اور زمین کی واپسی کے لئے اسرائیل پر دباؤ روک دیا۔

اسرائیل اور سپر پاور کے اتحاد نے عرب حکمرانوں پر شدید اثر ڈالا۔ سوویت یونین کی کنارہ کشی کے بعد صرف امریکہ اسرائیل سے مقبوضہ علاقہ چھڑوانے کے لئے کوئی سفارتی بنیاد فراہم کر سکتا تھا۔ عرب لیڈروں میں صورتحال کو سب سے زیادہ انور سادات نے سمجھا۔ ناصر جو بلیک ستمبر بحران کو سلجھاتے ہوئے دل کے دورے سے انتقال کر گیا۔ انور سادات اس کے بعد اقتدار میں آ گیا تھا۔ سانولے رنگ اور لمبے قد کے انور سادات کو ایک انتہائی فرمانبردار شخص کے طور پر دیکھا گیا۔ انور سادات نے بہت سے امریکہ مخالف بیانات دیئے۔ مگر ایک ماہر اور دوراندیش سیاستدان ہونے کی وجہ سے وہ جلد جان گیا کہ امریکہ کو اسرائیل سے دور کر کے عربوں کی حمایت میں واپس لانا کتنا ضروری ہے۔ صحرائے سینا تک پہنچنے کی کوئی سڑک ماسکو یا دمشق سے نہیں بلکہ امریکہ کے دارالحکومت سے گزرتی ہے۔

سادات نے واشنگٹن کو اپنے کھلا دل ہونے کا تاثر فوراً دے دیا۔ اس نے نکسن کو بتایا کہ مصر سوویت یونین کے زیر اثر نہیں اور اگر امریکہ ہمارے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرے گا تو ہم اس سے 10 گنا زیادہ دوستانہ رویہ دکھائیں گے۔ سادات نے نہر سویز دوبارہ کھولنے کے لئے جو کہ چھ روزہ جنگ کے بعد سے بند تھی یہ شرائط عائد کی کہ علامتی طور پر ہی کچھ مصری دستے سینا میں تعینات کئے جائیں اور وہ مصر سے سوویت مشیر نکال دے گا۔ اس نے کہا کہ عربوں کو سوویت یونین سے وابستہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لوگ مغرب سے قریب ہیں۔ سادات نے 1971ء کو فیصلے کا سال قرار دیا اور واضح کیا جنگ یا امن کے حوالے سے مصر کا رویہ امریکہ کے رویے پر منحصر ہوگا۔

نکسن سادات کے ارادوں کی جانچ کرنے کے لئے بے تاب تھا مگر داخلی، علاقائی اور عالمی واقعات نے موقع نہ دیا۔ خفیہ بات چیت کے ذریعے ویت نام جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے ساتھ نیوکلیئر ہتھیاروں میں کمی کے منصوبے پر بہت زیادہ مصروف ہونے کی وجہ سے امریکی انتظامیہ نے ایسی سیاست سے گریز کیا جو ماسکو کو اشتعال دلائے۔ مئی 1971ء میں دو سپر

پاورز نے عرب اسرائیل تنازعہ کے حل کے لئے مل کر کام کرنے کا عہد کیا۔ ایک سال بعد سادات نے 15 ہزار سوویت مشیر مصر سے نکال دیئے۔ لیکن اس کی کوشش امریکی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ کر سکیں۔ سوویت یونین سے تعلقات کی بہتری امریکہ کے لئے عرب اور اسرائیل امن قائم کروانے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی۔

1967ء کی جنگ میں شکست کے بعد فلسطینی عربوں کے لئے ہیرو بن گئے تھے۔ اس شہرت سے فائدہ اٹھانے اور عالمی برادری کی توجہ اپنے مقصد کی طرف لانے کے لئے وہ بے تاب تھے۔ فلسطینیوں نے اسرائیل کے خلاف شدید ترین حملوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ یہ حملے 1972ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گئے جب بلیک ستمبر کے نقاب پوشوں نے جو PLO سے جنم لینے والی تنظیم اور پچھلے سال کے دوران ہونے والی جنگ کے ذمہ دار تھے انہوں نے میونخ اولمپکس میں حصہ لینے والے 11 اسرائیلی کھلاڑی قتل کر دیئے۔ یہ قتل عام تشدد کی پہلی کارروائی تھا جو ٹی وی پر دکھایا گیا اور جسے بہت سے امریکیوں نے دیکھا۔ یہ شدید تشدد کی لہر کی پیشگی اطلاع بھی تھا۔ نکسن نے سانحہ میونخ پر بے دلی سے ردعمل دیا اس نے نہ PLO کے عرب اور سوویت پشت پناہوں کی مذمت کی نہ امریکی پرچم سرنگوں کیا۔ نکسن کے لئے زیادہ اہم وائٹ ہاؤس میں موجود کرپشن کے الزامات اور اپنے سٹاف پر ڈیموکریٹک نیشنل کمیٹی کے ممبر کو رشوت دینے جیسے الزامات کا مقابلہ کرنا تھا۔

جب تک سوویت یونین کے ساتھ مل کر کام کرنا امریکہ کا عزم رہا اور زیادہ تر مشرق وسطیٰ کے تشدد کی لپیٹ میں آ جانا اور صدر کا سیاسی طور پر مشکلات کا شکار ہونا جیسے عوامل رہے، سادات کو بات چیت سے کسی معاہدہ کی توقع نہ تھی۔ کسنجر نے مرحلہ وار فارمولہ دیا جس کے مطابق مصر کو اسرائیل کی حفاظت کے حوالے سے یقین دہانیاں کروانا تھیں جبکہ اسرائیل کو سینا پر مصر کی عملداری کو تسلیم کرنا تھا۔ مگر اسکی کوششیں موثر ثابت نہ ہوئیں۔ 6 اکتوبر دوپہر دو بجے کسنجر نے اپنا منصوبہ سادات دور کے وزیر خارجہ سے بیان کیا۔ اگلے دن مصر اسرائیل کے ساتھ جنگ کی حالت میں آ گیا۔ حملہ جو شام کی طرف سے ہونے والے گولان کی پہاڑیوں پر ایک حملے میں مدد کے لئے کیا گیا اس نے امریکہ کو پریشان کر دیا۔ امریکہ کی توجہ واٹر گیٹ اسکینڈل اور نکسن پر تھی۔ نکسن نے فیصلہ سازی کا زیادہ حصہ کسنجر پر چھوڑ کر خود فلوریڈا میں اپنے گھر جانا پسند کیا۔ کسنجر نے انٹیلی جنس اطلاعات پر بھروسہ کر کے مشرق وسطی میں جنگ کے امکانات کو غیر ممکن قرار دیا۔ اسرائیلی ہمیں اور

خود کو برین واش کر رہے ہیں۔ ایک امریکی افسر نے شکایت کی جسے خود سادات نے دھوکہ دیا۔

یوم کپور کی جنگ جیسا کہ عرب اسے اکتوبر وار کہتے ہیں اس جنگ نے مشرق وسطیٰ کے متعلق کسنجر کی سوچ کو دھچکا پہنچایا۔ بحران میں اس کا مقصد تین پہلو رکھتا تھا۔ جلد سے جلد خون خرابہ رکوانا، سوویت یونین کو بحران سے فائدہ اٹھانے سے روکنا اور جنگ کے بعد امریکہ میں سوچ بچار کے لئے بنیاد بنانا۔ امریکہ نے اپنا سفارتی وزن جنگ بندی کروانے کے لئے اقوام متحدہ کے پلڑے میں ڈال دیا جبکہ فوجی قوت سوویت یونین کی مداخلت روکنے کے لئے تیار کر دی۔ اسرائیل کی طرف سے عرب حملہ آوروں کو سخت جواب ملنے کی توقع تھی۔ انتظامیہ جان گئی کہ جنگ روکنے پر بہت علاقہ دینا ہوگا۔ ہم اپنی پالیسی کو اسرائیل کا یرغمال نہیں بنا سکتے۔ کسنجر نے واضح کرتے ہوئے بتایا کہ امریکہ مخالفت اگر عرب میں بڑھی تو اسرائیل کا فائدہ ہو تو ہو مگر امریکہ کو نقصان ہوگا۔

جنگ کے واقعات ایک مرتبہ پھر امریکی ایجنڈے کے مطابق نہ تھے۔ عربوں کو سوویت یونین سے گنوں اور گولیوں کی مسلسل سپلائی ہو رہی تھی۔ کسنجر سوویت یونین کو جواب دینے یا نہ دینے پر تذبذب کا شکار تھا۔ محکمہ دفاع کا دعوی تھا کہ اسرائیل کو مدد دینا ویت نام جنگ کے حوالے سے نقصان دہ ہے مگر کمیونسٹ ہتھیاروں کی فتح کے لرزا دینے والے خیال نے نکسن کو گوشہ نشینی ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ نکسن نے ہر قیمت پر اسرائیل کے تحفظ کا حکم دے دیا۔

گلیکسی اور اسٹار لفٹر طیاروں نے 300 بار تل ابیب تک کا 6000 میل کا فاصلہ طے کیا۔ آپریشن نکل گراس کے تحت 22000 ٹن میٹریل فراہم کیا گیا۔ شکست کھا رہی اسرائیلی فوج نے ایک ہفتے میں شامی فوج کو دمشق واپس دھکیل کر اور صحرائے سینا میں اسرائیل کی فوج نے مصری فوج کا محاصرہ کر کے جواب دیا۔

واشنگٹن نے جنگ کے بدلتے منظر نامے کو سراہا مگر اس کے دو غیر متوقع نتائج نکلے۔ عرب ممالک میں تیل پیدا کرنے والے ملکوں کے سربراہوں نے جن کی فیملیوں کو طبی امداد مشنری ڈاکٹر دیتے اور جن کو امریکہ کی آئل کمپنیوں نے امیر کیا۔ انہوں نے امریکہ کی اسرائیل کو واضح امداد دیکھ کر آئل سپلائی روک دی۔ امریکہ میں پیداواری لائنیں اور پاور اسٹیشن بند ہو گئے اور سارے ملک کے گیس اسٹیشنوں پر گاڑیوں کی طویل قطاریں لگ گئیں۔ عرب ممالک کی طرف سے آئل کی پیداوار روکنے سے بڑھ کر خطرہ سوویت یونین کا فیصلہ جس کے تحت زمینی اور بحری فوج ہائی الرٹ

کر دی گئی۔ جس سے نیوکلئیر جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

امریکہ کو یکا یک ایندھن کی کمی سے تباہ ہوئی معشیت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے زیادہ بھیانک روس سے عالمی جنگ کا خطرہ تھا۔ کسنجر نے بے دلی سے کہا کہ ہمیں سوویت یونین کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہمیں ناخنوں کی طرح سخت ہونا ہے۔ اسی عزم پر قائم رہتے ہوئے بحیرہ روم کے مشرقی حصے میں چھٹے امریکی بیڑے اور یورپ میں امریکی دستوں کو تیار رہنے کا حکم ملا۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ نے اسرائیل پر شدید دباؤ ڈالا کہ وہ دمشق کی طرف پیش قدمی روک دے اور مصری فوج کے خلاف نرمی لائے۔ سیز فائر کی کئی کوششیں کی گئیں۔ امریکہ اور سوویت جنگی جہاز آمنے سامنے آ گئے تھے۔ بہر حال 28 اکتوبر تک اسرائیلی فوجی مصری فوج کو پانی کے ٹینک دے رہے تھے تاکہ ان کے ساتھ مل کر کشیدگی میں کمی لا سکیں۔ اقوام متحدہ نے قرارداد 338 پاس کی جس میں مستقل اور دیرپا امن کا مطالبہ کیا گیا۔ قرارداد کی بنیاد قرارداد 242 ہی تھی اور مقاصد کے حصول کے لئے عالمی کانفرنس ہونا تھی۔ بے حد خوش کسنجر نے اسے نکسن کے سامنے شاندار فتح کی حیثیت سے پیش کیا۔

سیکرٹری شاید اپنی تعریف میں بہت آگے چلا گیا تھا۔ عالمی جنگی امور پر تنہا سوچتے ہوئے امریکہ علاقائی تنازعہ نہ روک سکا اور سفارتی کوششوں پر وقت کے ضیاع سے یہ جلد معلوم ہو گیا۔ 15 ہزار عرب اور 25 سو اسرائیلی مارے گئے۔ جنگ نے مغرب میں تقسیم کو بری طرح بے نقاب کر دیا۔ کئی ملکوں نے اسرائیل جانے والے امریکی جہازوں کے اپنی حدود سے گزرنے پر پابندی لگا دی۔ کسنجر نے بعد میں یورپ کے رویے کو گیڈروں جیسا قرار دیا۔ ان کا رویہ مکمل طور پر شرمناک تھا۔

کیا صرف حقیقت پسندی سے کام لے کر تباہی کو روکا جا سکتا ہے اور امن کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ جنیوا میں جہاں 1973ء میں عالمی امن کانفرنس ہوئی وہیں اس سوال کا مایوس کن جواب ملا۔ عرب وفود نے اسرائیل کی مقبوضہ علاقوں سے واپسی سے پہلے کوئی بھی حل قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جبکہ شام نے کاروائی میں حصہ ہی نہ لیا۔ عربوں نے معاہدے کے تحت آئیل کی قیمت 400 فیصد تک بڑھا کر ہلچل مچا دی اور جنیوا سے نکالی گئی فلسطینی تنظیم نے دو شمالی اسرائیلی شہروں میں قتل عام کیا۔ اس مشکل صورتحال میں کسنجر نے سب سے نازک سفارتی مقصد کی ذمہ داری اٹھائی۔

پچاس سال کے بعد اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے جرمنی کے مہاجر یہودیوں کو جیسا کہ سائمن وولف آسکر اسٹراس اور ہنری موگنتھو کو امریکہ اور مسلم دنیا کے درمیان رابطہ بنانا ترک کر دیا اور ان

کی جگہ مشنریز کے تعلق رکھنے والے لوگ نامزد کر دیئے۔ ایک اور جرمن نژاد اور یہودی امریکی مشرق وسطیٰ کے معاملات میں صلح کروا رہا تھا۔ رابرٹ بی اینڈرسن نے شاندار طریقے استعمال کئے اور اس نے عرب اور اسرائیل کے دارالحکومتوں میں مسلسل سفر کیا تاکہ حالت جنگ میں موجود فوجوں کو مرحلہ وار الگ کیا جاسکے۔ اینڈرسن کے برعکس جو گفتگو سے پرہیز کرتا کسنجر نے عوام میں لمبا سفر کیا۔ قاہرہ کے دورے اور سادات سے بوسہ لینے کے بعد وہ دمشق رکا اور آخر میں گولڈا میئر کو گلے لگا لیا۔ نتیجہ شام اور مصر کے محاذ پر فوجوں کی علیحدگی تھا اور امریکہ اور عربوں کے تعلقات کی بحالی بھی۔

ان کامیابیوں سے ماوراء ہوتے ہوتے کسنجر نے انتہائی اطمینان کے ساتھ عرب اسرائیل کے درمیان دیرپا سمجھوتے کے لئے کوشش جاری رکھی مگر اس کی مشکلات بڑھتی گئی۔ واٹر گیٹ اسکینڈل سے ایک موقع حاصل کرنے کے لئے اور اپنی آخری سفارتی کامیابی سے خوش نکسن جون 1974ء میں مشرق وسطیٰ روانہ ہوا۔ ایک طرف مصر، شام، اردن اور سعودی عرب میں عوام کے پر جوش ہجوم نے اس کا خیر مقدم کیا مگر اسرائیل کا رویہ برعکس تھا اس شاندار تعریف کے حاصل کرنے کے باوجود بھی اسے داخلی محاذ پر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ واپسی کے کچھ دیر بعد ہی اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد آنے والا جیرالڈ فورڈ کے پاس بہت کم تجربہ تھا اگرچہ وہ دوستانہ مزاج کا مگر وہ زیادہ پرجوش نہیں تھا۔ اس کے ریاستی امور میں عدم مہارت مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر بے نقاب ہوئی۔ چار ماہ بعد گولڈا میئر نے بھی اقتدار چھوڑ دیا۔ رابن اس کے بعد آیا ایک نسبتاً پرسکون سیاست دان ہوتے ہوئے بھی وہ علاقے چھوڑنے کے مسئلے پر جارحانہ مزاج کا شخص ثابت ہوا۔ فورڈ اور رابن کا غیر موزوں گٹھ جوڑ ہی تھا جس سے سویز تنازعہ کی طرف سے یہودی ریاست کو ملنے والی امداد کا دوبارہ جائزہ لیا۔

بہرحال کسنجر نے جو فورڈ کا سیکرٹری آف اسٹیٹ تھا مصر اور اسرائیل کے درمیان ثالثی کرتے ہوئے دوسرا معاہدہ کروادیا (ستمبر 1975) اسرائیل نے امریکہ کی یقین دہانیوں اور بات چیت کے وعدوں پر مصر کو صحرائے سینا کے حوالے سے رعائتیں دے دیں۔ یہ معاہدہ شاید کسنجر کے مزاج کے مطابق نہ تھا بلکہ اسرائیل اور مصر کی امن کی خواہش کے مطابق تھا۔

کسنجر کے سفارتکاری میں غیر جذباتی رویے کی ایک اور مثال اس وقت سامنے آئی جب

ایران اور عراق کے درمیان ایک سرحدی تنازعہ پر اس نے خفیہ طور پر کردوں کو عراقی حکومت سے بغاوت پر اکسایا۔ کردوں نے بغاوت کی مگر شاہ اور صدام حسین نے عراقی فوج کو بغاوت کچلنے کا کھلا اختیار دے کر جلد مسئلہ حل کر لیا۔ کردوں نے کسنجر سے مدد مانگی مگر اب سیکرٹری کا رویہ مدافعانہ تھا۔ کھلے اور چھپے ہوئے کام علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔

سات سالہ اقتدار کے دوران فورڈ اور نکسن نے مشرق وسطیٰ میں شدید تبدیلیاں دیکھیں اور ان کی قیادت میں امریکہ نے بھی جنگوں بغاوتوں، بائیکاٹوں کے ایک سلسلے کا سامنا کیا اور سوویت یونین کو دور رکھا۔ دونوں صدر امریکہ کا مشرق وسطیٰ میں اثر بحال کرنا اور روس کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ ایک فوجی توازن پیدا ہو سکے۔ آخری تجربے میں ان کی فتوحات شاندار تھیں۔ مصر امریکی اثر میں واپس آ گیا سوویت اثر اگرچہ عراق، شام اور لیبیا میں موجود رہا مگر اسے محدود کر دیا گیا۔ عربوں اوا اسرائیل نے 1949ء کے بعد سے پہلی بار امن معادے کئے اور جنگ کی تکرار روک دی۔ تنازعہ کے دونوں فریقوں کی نظر میں امن قابل حصول تھا لیکن اقوام متحدہ کے ذریعے نہیں بلکہ امریکہ کی کوششوں سے۔

مگر امن وہ مقصد نہ تھا جس کی طرف امریکی جا رہے تھے۔ اسرائیل نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کی مزاحمت کرتے ہوئے مقبوضہ علاقوں میں جو 1967ء میں چھینے گئے یہودی بستیاں بنانا شروع کر دی تھیں۔ حافظ الاسد نے چالیس ہزار فوجی جنگ زدہ لبنان میں بھیج دیئے تھے۔ اسرائیل خلاف غصہ آخر کو امریکہ پر بھی نکلا۔ کرنل ایلن امریکی سفیر کے طور پر سوڈان میں تھے۔ تین سال بعد مسلح فلسطینی نے سفیر فرانسس میلوئے اور معاشی ماہر رابرٹ وارنگ کو مار ڈالا۔ 8 ستمبر 1974ء کو TWA کا طیارہ جو تل ابیب جا رہا تھا اڑا دیا گیا۔ طیارے کے کارگو والے حصے میں نصب دھماکہ خیز مواد نے تمام 88 مسافر مار ڈالے۔ اسلامی بنیاد پرستی کی لہر پورے خطے میں پہنچ گئی۔ مزید یہ کہ عرب فوجوں کے اسرائیل پر قابو نہ پا سکنے اور امریکہ کے حامی ڈکٹیٹروں کی خطے میں طویل حکومتوں نے بھی جذبات کو بھڑکایا۔

کلیسا کا مہتمم، سفیرِ اعلیٰ اور شاہ

مونگ پھلی کے کاشتکار Annapolis کے تربیت یافتہ آبدوز چلانے والا اور جارجیا کے

گورنر جمی کارٹر نے امریکہ کا 39واں صدر بننے سے پہلے کئی کیریئر اختیار کئے۔ وہ ایک پکا عیسائی تھا اور روزانہ بائبل پڑھتا۔ میں اپنی زندگی میں کسی چیز سے زیادہ عیسائیت کی ترویج چاہتا ہوں۔ اس کے الفاظ تھے۔ جنوری 1977ء میں اس کے وائٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہی یہ ایک صاف و پرہیز گار جگہ بن گیا۔ وڈرو ولسن کی طرح اس نے بھی عالمی تعلقات میں عقیدے کا عمل دخل اور ایک انسانی بنیادوں پر بننے والی پالسی اختیار کرنا چاہی۔ دینا بھر کے حوالے سے وہ ایسی پالیسیاں اختیار کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ خارجہ امور میں اس کی مذہبی سوچ نے عالمی رہنماؤں کو حیران کر دیا وہ بھی جو اس جیسے تھے پاپ جان پال دوئم کہتے ہیں کہ کارٹر سے دو گھنٹے ملاقات میں مجھے لگا جیسے دو مذہبی لوگ گفتگو کر رہے ہوں۔

مذہب کے حوالے سے کارٹر کا پر جوش رویہ مشرق وسطیٰ کے معاملات میں بھی نمایاں تھا۔ ارض مقدس ہمیشہ ہی صدر کے لئے روحانی تقویت دینے والی جگہ رہی اور اسرائیلی ریاست کو سپورٹ کرنا اس نے اپنا اخلاقی فرض جانا۔ اس قسم کے خیالات بہت ہی زیادہ انجیلی فرقہ کے لوگوں میں تھے جو سب اہم پروٹسٹنٹ فرقوں میں بڑی تعداد میں تھے اور جن کا سیاسی اثر بہت زیادہ تھا۔ مذہبی جذبہ بڑھ رہا تھا اور اسے مقبولیت مل رہی تھی یہ اسلام کے سخت مخالف لوگ تھے جیسا کہ ان کا رویہ اس حوالے سے نو آبادیاتی امریکہ کے دور میں تھا۔ مگر کارٹر نے ان خیالات سے مختلف رویہ رکھا جو غزہ اور ویسٹ بینک یا مغربی کنارے کے حوالے سے اسرائیلی رویہ پر تنقید اور فلسطینیوں سے ہمدردی کا اظہار تھا۔ کسنجر اور نکسن کے برعکس جنہوں نے مسئلہ طاقت سے حل کرنا چاہا کارٹر نے مشترکہ عقیدت کو مسئلے کا حل بنانا چاہا۔ عرب، یہودی، عیسائی سب ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں۔ مقدس زمین میں بہنے والا خون خدا کو پکار رہا ہے اور شدید تکلیف میں امن کو پکار رہا ہے، کارٹر نے واضح کہا۔

کارٹر نے اداسی کا جواب دیتے ہوئے سابقہ انتظامیہ کی طرف سے مشرق وسطیٰ امن عمل پر غلبے کی پالیسی ترک کر دی۔ اس نے ایک دوسری امن کانفرنس کے لئے سوویت یونین کو مل کر کام کرنے کی دعوت دی اور اسرائیل پر مقبوضہ علاقوں کے حوالے سے اپنا عزم واضح کر دیا۔ حیران کن طور پر کارٹر نے فلسطینیوں کے حقوق پر زور دیا۔ فلسطینی ریاست قائم کرنے کی خفیہ حمایت میں اس نے PLO کے کے ساتھ بات چیت کا عندیہ دیا اگر وہ ایک بار قرارداد 242 قبول کر لے۔

ایوانجلسٹ یہ اقدام کیسے پسند کرتے جنہوں نے بڑے پیمانے پہ تقسیم کئے جانے والے صفحات میں لکھا ''وقت آ گیا ہے کہ ایوانجلسٹ عیسائی بائبل کی پیشن گوئی پر اعتماد کرتے ہوئے زمین پر اسرائیل کے الہامی حق کو تسلیم کریں''۔ مینا ہم بیگن جو 1948ء میں اراگون ملیشیا کا کمانڈر تھا اور دائیں بازو کی جماعت لیکوڈ پارٹی کا سربراہ اور نیا اسرائیلی وزیر اعظم تھا اس نے بھی کارٹر کی پوزیشن کو پسند نہ کیا۔ کسی ایوانجلسٹ سے اور اسرائیلیوں سے جڑے ہونے کے سبب کارٹر مصری صدر سادات کو متاثر نہ کر سکا۔ سادات کا امن عمل میں PLO، شام اور سوویت یونین کو شامل کرنے کا مطالبہ کارٹر نے یکسر رد کر دیا اور اسرائیل کو ہتھیاروں کی فراہمی کے حوالے سے بھی اس نے ہچکچاہٹ ظاہر تھی۔ واشنگٹن کی پالیسی میں تبدیلی کا انتظار کئے بغیر سادات نے بیگن سے براہ راست رابطہ کیا۔ دنیا کے سامنے مذاکرات کا نتیجہ 19 نومبر 1977ء کو آیا جب سادات نے سینکڑوں فلیش بلب کی روشنی میں تل ابیب کے ائیر پورٹ پر قدم رکھا۔ کسی عرب سربراہ کا یہودی ریاست کا یہ پہلا دورہ تھا۔

اس تاریخی واقعے میں امریکہ کا کوئی کردار نہ تھا اور یہ بیگن اور سادات کے درمیان ہونے والی گفتگو تھی۔ مگر مذاکرات جلد ڈیڈ لاک کا شکار ہو گئے اور دونوں فریق سمجھ گئے کہ امریکہ کی اعلی سطحی مداخلت کے بغیر اس کا حصول ممکن نہیں۔ روز ویلٹ کے بعد کارٹر پہلا صدر تھا جو مشرق وسطیٰ کے تنازعہ میں ملوث ہوا (1906ء کی کانفرنس میں روز ویلٹ خود شریک تھا) جس نے خود کو اسرائیل اور عرب ممالک کے ساتھ تنازعہ میں شامل کیا تا کہ امن کی بنیاد مل سکے۔

امن کی تلاش بے سود رہی۔ سادات کا مطالبہ تھا کہ اسرائیل مقبوضہ علاقے خالی کر کے فلسطینیوں کو حق خود ارادیت دے۔ بیگن گولان، غزہ اور ویسٹ بینک ے متعلق کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا اور صحرائے سینا میں اسرائیلی پوزیشن برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اسرائیل کے مؤقف کو رد کر کے کارٹر نے مصر کا مؤقف مان لیا۔ کارٹر کے لئے یہودی بستیاں جو مقبوضہ علاقوں میں تھیں پریشانی کا باعث تھیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مصر کا صدر امن کے لئے اپسنے مؤقف سے بھی ہٹ رہا ہے لیکن بیگن ضد پر قائم ہے۔ برزنسکی نے یاد دلایا۔ لیکن پالیسیوں کے اختلاف کے علاوہ کچھ ذاتی تلخی بھی تھی۔ بیگن کی ضد اور اسرائیلی جمہوریت کا بے ربط رویہ اس نے سادات کو پسند کیا جو خوش اخلاق اور 95% سے زیادہ ووٹوں سے منتخب ہوتا رہا تھا اور فیصہ سازی میں خود مختار تھا۔ اصولوں کے خاص

پابند نہ ہونے والے لوگوں کی مثال اس میں کچھ حصہ شخصیت پرستی کا بھی تھا۔ برزنسکی بتاتا ہے کہ کارٹر نے سادات سے کہا کہ آپ امریکہ میں مقبول ترین سیاستدان ہیں۔

کارٹر کی امن کے لئے جدوجہد صرف سوویت یونین کو ایک طرف کرنے کے لئے نہ تھی اس کی سادات کے لئے گرم جوشی کیمپ ڈیوڈ ستمبر 1978ء کو ملی۔ اس نے مصر اور اسرائیل کے لیڈروں کو صدارتی دعوت دی تا کہ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے کوشش کی جا سکے۔ پہلے مرحلہ میں امن کے لئے اسرائیل اس بات پر تیار ہو گیا کہ وہ مصر سے نارمل تعلقات کے بدلے صحرائے سینا سے دستبردار ہو جائے گا۔ جبکہ مصر ذرائع ابلاغ اسرائیل مخالف جذبات کو ختم کر دیں گے۔ امریکہ معاہدے کا ضامن تھا جس نے معاہدے کی پابندی کے لئے اپنے فوجی تعینات کر دیئے۔ امریکہ دونوں ملکوں کو اربوں کی امداد دی۔ ویسٹ بینک اور غزہ میں فلسطینی ریاست کا قیام اصل مقصد تھا۔ کارٹر، سادات اور بیگن نے ہاتھ پکڑے وائٹ ہاؤس میں مارچ 1978ء میں معاہدہ پر دستخط کئے جو امن کے عمل میں امریکی کردار کی اہمیت کا سمبل بن گیا اور جس پر بعد کے صدور نے عمل کرنا چاہا، کارٹر کے الفاظ میں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ اب بائبل کی طرح بن چکا تھا۔ لیکن صرف کارٹر ہی اس معاہدے کو صحیفہ آسمانی سمجھتا رہا۔ اسرائیل نے فلسطین کے علاقوں میں رہنے والوں کو خودمختاری دے دی مگر خطے کو نہیں۔ شام، عراق اور لیبیا کی قیادت میں زیادہ تر عرب ملکوں نے معاہدے کو غداری قرار دے کر مسترد کر دیا اور مصر کا بائیکاٹ کر دیا۔ عرفات نے بھی سادات کے خودمختاری منصوبے کو مسترد کر دیا۔ بنیاد پرست بھی معاہدہ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ جن کا اثر مشرق وسطیٰ میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ ایک ملٹری پریڈ میں اسلامی جہاد کے لوگوں نے سادات کو قتل کر ڈالا۔ یہ اکتوبر جنگ کی آٹھویں سالگرہ پر ہونے والی پریڈ تھی۔ اس کے مرتے جسم پر گولیوں کی بارش کرنے والے ''فرعون کی موت'' چلا رہے تھے۔

کارٹر عیسائی اور امریکی تصورات سے بندھا ہوا مشرق وسطیٰ آیا۔ لیکن وائٹ ہاؤس لان کے ایک شاندار لمحے کے علاوہ کسی بھی کوشش میں کامیاب نہ رہا۔ سارا خطہ عربوں کی باہمی لڑائیوں سرد جنگ کے دباؤ، عرب اسرائیل تنازع اور بڑھتی ہوئی انتہا پسندی سے گونج رہا تھا۔ 1970ء کی دہائی میں مشرق وسطیٰ کی صورتحال جس تیزی سے بدلی اس نے کئی ناخوشگوار واہموں کو پیچھے دھکیل دیا۔ ایک متھ جس کے حوالے سے مغربی لوگوں (یورپ، امریکہ) کے اس خطے میں برپا کئے گئے

رجحانات تھے مگر جو حقیقت سے پائیدار ثابت ہوئی۔

ایک ایسے خطے کے طور پر جو پُراسرار سرزمین اور نہ ختم ہونے والی جنسوں سے بھرپور ہے مغرب میں مشرق وسطیٰ کا یہ عجیب امیج تھا جس سے 1970ء کا ایک مشہور مغربی گانا جو امریکہ میں بہت مقبول ہوا منظر عام پر آیا گانا تھا نخلستان میں آدھی رات۔ تھیم وہی تھا جو 50 سال پہلے ایک مشہور کہانی کا تھا صرف کردار بدل گئے تھے۔ وہ بولی جب میں تمہارے پاس ہوں تمہیں کسی حرم کی ضرورت نہیں اور جب میں تمہیں سواری کرواؤں گی تمہیں اونٹ کی ضرورت نہیں۔ مشرق وسطیٰ کو ہلا کر رکھ دینے والی ان تبدیلیوں سے تفریحی انڈسٹری بھی لاتعلق نہ رہ سکی۔ امریکہ 1970ء میں دو صدیوں پرانے والے امریکہ کی طرح تھا نہ صرف غیر حقیقی باتوں سے متاثر بلکہ اس کے خطرات سے لاتعلق Black Sunday کے ذریعے 1977ء میں ہالی وڈ نے پہلی بار فلسطینیوں کی جنگ پسندی کے موضوع کو لیا اس میں ایک بمبار جس کا نام محمد فیصل ہے وہ ایک جہاز کو سپر بال کے موقع پر اڑا دیتا ہے کیونکہ اسے امریکہ اسرائیل اتحاد پر غصہ ہے مگر اسرائیلی ایجنٹ اسے آخری لمحوں میں ناکام بنا دیتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے انتہا پسندوں کی طرف بڑے پیمانے پر قتل کا خیال اور وہ بھی امریکی سرزمین پر اس خیال کو امریکیوں کے دل میں ڈال دیا گیا۔

مشرق وسطیٰ کا امیج جن میں سے ایک رومانوی اور دوسرا تلخ تھا امریکی دماغ میں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مگر مشرق وسطیٰ کے کلچر اور ریاست پر بنیادی تقسیم جامعات کی سطح پر بھی تھی۔ دو اہم اسکالرز اس مسئلے پر مختلف رائے رکھتے ہیں ایک حقیقی اور غیر معمولی طور پر ہمدردانہ جبکہ دوسرا روایتی اور تنقیصی رویہ رکھتا تھا۔

ایڈورڈ کے سعید ایک عرب عیسائی جو قاہرہ میں پلا بڑھا اور یروشلم میں رہا اس نے پرنسٹن اور ہاورڈ سے تعلیم لی اور کولمبیا میں انگلش پڑھائی وہ عمدہ شخصیت کا مالک، اچھی وضع اور زبردست وجاہت رکھتا اور اس نے ادبی تنقید اور فلسطینیوں کے حقوق کے کام کرنے کے سبب اہمیت حاصل کی۔ 1978ء میں اس نے ایک کتاب لکھی جس کا عنوان اورینٹل ازم تھا۔ یہ مشرق وسطیٰ کی اکیڈیمک تشریحات پر زبردست حملہ تھا۔ وہ یورپ کی تاریخ میں کوئی ایسا دور دریافت نہ کرسکا جس میں اسلام کے بارے میں معمول سے ہٹ کر سوچا سمجھا جاتا ہو اور ایسا کرنے والے پر سیاسی مفاد، تعصب، جذباتیت سے دور رہے ہوں۔ اس نے مغربی اسکالرز کو الزام دیا کہ انہوں نے اپنے

ذہن میں مشرق وسطیٰ کی خودساختہ تصویر بنارکھی ہے جوکہ ثقافتی اعتبار سے کم تر اور ریاستی اعتبار سے متضاد ہے۔ سعید یہ بھی کہتا ہے کہ اس علاقے کا تجزیہ کرتے وقت وہ اسے ایسا خطہ قرار دیتے ہیں جسے فتح کرنا مغرب کے لئے آسان ہے۔

سعید کی کتاب کو تاریخ کے طور پر دیکھنا غلطی ہے۔ ایڈورڈ سیلسں بری جو 1841ء میں امریکہ میں عربی کا پہلا پروفیسر تھا قطعاً سامراجی نہ تھا پھر بھی مشرقی تہذیبوں کا مطالعہ کرنے والے اسکالرز نے ان بنیادوں کو ذہن میں رکھ کر کام کیا جو مغرب کی تحریروں میں لمبے عرصے سے تھیں۔ اس کی مثال میلول، مارک ٹوین اور ایڈتھ وارٹن کا کام ہے۔ یہ منشور ان لوگوں کو بھی اپیل کرتا ہے جو امریکی اکیڈمیوں سے تعلق رکھنے والی ایک نسل ہے اور جو ویت نام کی ناکامی اور مغرب کے ترقی پذیر ملکوں کا استعمال کرنے کے نتیجے میں اپنی تہذیب کی اچھائی سے بھی بیزار ہوگئی ہے۔ انہوں نے سعید سے اتفاق کیا کہ مشرق وسطیٰ کے مطالعے کا موضوع اب نوآبادیاتی نظام کے اضافی پہلو سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے صحیح اسکالر وہی ہے جو اسلامی دنیا کی طرف ہمدردانہ رجحان رکھتا ہے اور خلوص دل سے عربوں کا حامی ہے۔ جو اس معیار پر پورا نہیں اترتے وہ مستشرق ہیں، جو جناب برنارڈ لوئس سے شروع ہوتے ہیں۔

برطانیہ میں پیدا ہونے والا یہودی لوئس امریکہ آیا اور مشرق قریب کے علوم میں شامل ہوا۔ پرنسٹن میں جہاں اسے مشنری ذہن کے نام پر بنائی گئی چئیر مل گئی یہ چئیر ایک غریبوں کے ہمدرد کلیو لینڈ ڈاج کے نام پر تھی۔ اس نے عثمانی سلطنت پر بڑا کام کیا اور عرب دنیا پر بھی لکھا وہ مشرق وسطیٰ کے معاملے میں بڑی اتھارٹی بن گیا۔ سعید کے برخلاف جو مشرق وسطیٰ میں پائی جانے والی اکثر خامیوں کا ذمہ دار مغرب کو سمجھتا ہے۔ لوئس اس خطے کو خود ہی بے چینی پیدا کر کے اس کا ذمہ دار امریکہ اور یورپ کو سمجھنے والا قرار دیتا ہے نہ اپنے پرانے حریف عیسائیت کے مقابلے میں اگر مسلم دنیا کمزور اور لاچار ہوگئی ہے تو اس کا ذمہ دار امریکہ نہیں۔ لوئس دعویٰ سے کہتا ہے۔ ہاں مگر اس کے مطابق امریکہ اس صورتحال میں مسلم دنیا کی مدد کرسکتا ہے خاص کر مشرق وسطیٰ کی چھوٹی چھوٹی سخت گیر حکومتوں کو امریک طرز کی ریپبلک سے بدل کر۔

سعید کے خیال میں مستشرق لوگوں کی ناپسندیدگی کا شاہکار تھے اس نے لوئس کو جان بوجھ کر سیاسی اختراعات کرنے، ان کو دلائل سے بہتر کرنے اور اس پر اکیڈمی کا ٹھپہ لگانے کا ذمہ دار

قرار دیا۔ یہ کھل کر لوئس نے اسرائیل کی حمایت کی جو سعید کے خیال میں مغربی سامراجیت کا منصوبہ ہے۔ لوئس کا مقابلہ کرنے کے لئے اورئنٹل ازم کو ایک ٹریجڈی قرار دیا گیا جو واقعی مسئلہ تھا۔ کیونکہ یہ اسے علمی حیثیت کی بجائے سیاسی اور ذاتی بنا دیتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کا ادراک کرنے مختلف طریقوں پر بحث امریکی کیمپوں سے شروع ہو کر معاشرے میں بڑے پیمانے پر پھیل گئی۔ ایک خیال تھا کہ یونیورسٹیاں فتوحات کے لئے ایک پیشگی حربہ تھیں اور ان برائیوں سے نجات پانے کے لئے مشرقی وسطیٰ کو یورپ اور اسرائیل کے مخصوص سامراجی مزاج سے دور کر لینا چاہیے اور امریکہ کو طاقت کے مظاہرے سے دور رہنا چاہیے۔ مگر دوسرے اسکول کا خیال تھا کہ امریکہ نے مشرق وسطیٰ کو خیالات اور رویوں کی صورت میں بہت کچھ دیا ہے اور طاقت کے استعمال سے مشرق وسطیٰ میں آمرانہ حکومتیں ختم کر کے اس خطے کو آزادی دلا کر امریکہ اپنی اچھائی کو مزید بڑھا سکتا ہے۔

ان الگ الگ راستوں کے درمیانی راستے کو جمی کارٹر نے اختیار کیا۔ اس نے عربوں سے ہمدردی ظاہر کی اور طاقت کا استعمال ترک کر دیا پھر بھی اس کا یہ خیال رہا کہ امریکی اصول خطے میں موجود کئی مسائل کا حل ہیں جبکہ امریکہ کی سفارتی اور مالیاتی طاقت خطے کے کئی ناقابل حل مسائل کو نیا روپ دے گی۔ مگر اس کی یہ سوچ عرب اسرائیل معاملے میں صرف وقتی طور پر کامیاب ہوئی جبکہ باقی ہر جگہ ناکام رہی اور سب سے زیادہ واضح طور پر ایران میں ناکام رہی۔

آزادی دنیا بھر میں اور جمہوریت کو سپورٹ کرنے کے اپنے وعدوں کے باوجود کارٹر نے مصر اور سعودی عرب جیسے دوست ممالک میں بڑے پیمانے پر ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں نظر انداز کر دیں۔ ایران کی خفیہ ایجنسی ''ساواک'' نے ہزاروں لوگوں کو قتل کیا یا سزائیں دیں۔ کارٹر انتظامیہ نے پھر بھی پہلی انتظامیہ کی پالیسی جاری رکھی جس کے تحت شاہ کو سیاسی طور پر مسلسل سپورٹ کیا جاتا رہا، ایرانی بادشاہ اپنے شاہانہ طرزِ زندگی میں مگن تھا اور اسے امریکہ سے جدید ہتھیار مل رہے تھے۔ 31 نومبر 1977ء کو تہران میں کارٹر نے ایران کی تعریف کرتے ہوئے اسے استحکام کا علاقہ قرار دیا۔ اس نے ایرانی بادشاہ کی سوجھ بوجھ اور بصیرت کی داد دی۔

کارٹر نے شاہ کو 1978ء کے دوران بھی مسلسل سپورٹ کیا۔ جب کہ اس کے خلاف عوامی بغاوت جڑ پکڑ رہی تھی۔ دو ہفتے بعد جلاوطن شیعہ رہنما آیت اللہ خمینی جو بغاوت کی رہنمائی ایران

سے باہر رہتے ہوئے کر رہے تھے فاتحانہ انداز میں ایران پہنچ گئے ۔شاد کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔امریکہ سے ہمارا رشتہ وہی ہے جو دبائے گئے لوگوں کا دبانے والوں اور لوٹنے والوں کا لٹنے والوں سے ہوتا ہے۔ خمینی نے اعلان کیا۔اس کے الفاظ نے اس کے لاتعداد حامیوں کو جذباتی کر دیا۔کوئی بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد ایران کی آزادی کے لئے امریکی کردار کو یاد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ گلیوں میں سادات، بیگن اور کارٹر کے لئے سزائے موت کا مطالبہ کر رہے تھے اور بڑے شیطان امریکہ کے متعلق مرگ بر امریکہ کے نعرے لگا رہے تھے۔

پچھلے رہنماؤں کی طرح کارٹر بھی مشرق وسطیٰ کے رہنماؤں کے ظاہری رویے کے متعلق شش و پنج میں تھا۔ جنہوں نے اگرچہ کبھی سوویت یونین کو پسند نہ کیا تھا، مغرب کے لئے بہت گرمجوشی دکھائی تھی۔اسے مزید پریشانی خمینی کے بنیادی انسانی حقوق کا خیال رکھنے سے انکار پر ہوئی۔اس نے لکھا کہ ''خمینی جیسے جنونی شخص کو ڈیل کرنا ممکن نہیں'' جس سے اس نے ایران سے بات چیت کے امکانات ختم کر دیئے ۔ایران جسے اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا تھا صدر کارٹر نے کینسر میں مبتلا شاہ کو امریکہ میں علاج کی اجازت دے دی۔ یہ اشارہ زیادہ امریکیوں کو اچھا لگا۔ کارٹر سابقہ بیمار اتحادی کے لئے یہی کر سکتا تھا۔لیکن ایرانی ایک ایسے شخص کے لئے امریکی مہمان نوازی سے مشتعل ہو گئے جو ان کے نزدیک نہ صرف جابر بلکہ جنگی مجرم تھا۔

4 نومبر 1979ء کو سینکڑوں طالب علم ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگاتے ہوئے اور خمینی کی تصویریں لہراتے ہوئے تہران میں واقع امریکی سفارتخانہ کی دیواریں پھاندتے ہوئے داخل ہو گئے۔ وہ عملے اور رہائش کی عمارت میں داخل ہوئے اور 66 امرکی یرغمال بنا لئے۔ جن میں ڈپلومیٹ، میرین سٹاف، انتظامی عملہ اور CIA کے آفیسر بھی تھے۔ایک ایرانی طالب علم اونچی آواز میں بولا ''ہم تمہیں خدا کے بارے میں سکھائیں گے۔ہم تمہیں سکھائیں گے کہ ہمارے ملک میں مداخلت نہ کی جائے''۔

ایرانی بحران نے کارٹر کو اسی مشکل میں ڈال دیا جس سے 200 سال پہلے تھامس جیفرسن دو چار ہوا تھا۔ وہ یا تو ایرانی انتظامیہ کو دلائل اور پیسے دے کر قیدی چھڑواتا یا لڑتا۔ جیفرسن کی طرح کارٹر نے بھی مشرق وسطیٰ کی حکومتوں کے ذریعے بیک چینل رابطے کئے۔امریکہ کے لوگ ایران سے دوستانہ برابری کی بنیاد پر اور باہمی احترام پر مبنی تعلقات چاہتے ہیں۔کارٹر نے واضح کیا ساتھ

ہی اس نے اقوام متحدہ کے کمیشن کے ذریعے اس بات کی تحقیقات کی منظوری دے دی کہ امریکہ ایران میں ہونے والے غلط رویے کے حوالے سے معلوم کرے مگر خمینی نے یہ بتاتے ہوئے اسے مسترد کر دیا کہ ایرانی انقلاب نے کیسے امریکہ کی خطے میں سیاسی، معاشی اور فوجی مضبوطی کو نقصان پہنچایا ہے۔ پریشان ہو کر کارٹر نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کیا اس نے ایران کے ساتھ تعلقات سخت کرتے ہوئے اس کے امریکہ میں موجود اثاثے منجمند کر دیئے۔ البتہ ایران کے سیاہی بائیکاٹ کا مطالبہ یورپی اور باقی دنیا کی حمایت حاصل نہ کر سکا۔

ایران کے قبضے میں امریکی قیدی بدستور تھے جہاں ان کی بری حالت تھی۔ان سے مسلسل پوچھ گچھ ہوتی اور تشدد کی دھمکی بھی دی جاتی، لگتا تھا کہ انہیں صرف طاقت کے استعمال سے رہا کروایا جا سکتا ہے۔ کارٹر نے کئی آپشن پر غور کیا۔ایرانی ریفائنریز اور کان کنی تباہ کرنے، تہران پر ایٹم بم گرانے سمیت کئی آپشن سوچنے، آخر ایک آپریشن کا فیصلہ کیا جو 1805ء میں تریپولی کے صحرا میں ہونے والے آپریشن کی طرز کا تھا جس میں ولیم ایٹن مارا گیا تھا، اب ہیلی کاپٹر کے ذریعے تہران میں کمانڈو اتارتے جاتے جو U.S کمپاؤنڈ پر قبضہ کر کے امریکی قیدی چھڑوا لیتے ۔یہ ترکیب ناکام ہو گئی۔

اس دوران امریکہ کی خطے میں پوزیشن متاثر ہوئی۔ 1979ء میں سعودی عرب میں ایک بڑی بنیاد پرست وہابی بغاوت ہوئی۔سینکڑوں لوگ مسجد الحرام پر قبضہ کی کوشش میں مارے گئے۔ عراق میں ایک خونی بغاوت کے بعد صدام حسین جیسے شخص نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور مخالفوں کا خاتمہ شروع کر دیا۔ امریکی انتظامیہ کے لئے سب سے خطرناک مسئلہ افغانستان میں سوویت مداخلت تھی۔ سوویت فوجوں کی بڑی تعداد اور سوویت ٹینکوں کی بڑے پیمانے پر موجودگی سے امریکہ کے لئے ٹرومین کا یہ بھیانک خواب کہ سوویت یونین معدنیات اور تیل کی دوسری تنصیبات پر قبضہ کر لے گا پھر سے خطرہ بن کر سامنے آ گیا۔ کہا گیا کہ خلیج فارس کو کنٹرول کرنے کی کسی بھی بیرونی قوت کی کوئی کوشش امریکہ پر براہ راست حملہ تصور کی جائے گی۔اور ایسی کوششوں کا مقابلہ ہر طرح سے کیا جائے گا۔ جس میں ملٹری طاقت کا استعمال بھی شامل ہے۔ کارٹر نے کانگریس کو جارحانہ موڈ میں بتایا۔ایک امریکی صدر نے مشرق وسطیٰ کے متعلق نئی پالیسی دی تھی لیکن اس خطے میں امریکہ کے لئے چیلنج پیدا کرنا جاری رکھا۔ جبکہ امریکی یرغمالی برے حال میں تھے۔ اس

صورتحال سے نکلنے کی واحد امید حملہ تھا۔ امریکی قیدیوں کی رہائی کے لئے چھاپہ مار کاروائی جو 24 اپریل 1980 کو شروع ہوا۔ ڈیلٹا فورس اور رینجرز کے دستوں نے تہران سے لڑنے کے لئے اپنے سی سٹالین ہیلی کاپٹروں میں فیول بھرنا شروع کر دیا۔ مگر جب وہ ایران کے صحرا میں اتر چکے تھے کہ اچانک ان کو ریت کے طوفان نے آلیا۔ دو ہیلی کاپٹر خراب ہو گئے، جبکہ تیسر ہیلی کاپٹر اچانک ایک C-130 کارگو سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ ایک آگ کے بال میں تبدیل ہو کر دونوں جہاز تباہ ہوئے۔ 7 ہیلی کاپٹر پیچھے چھوڑنے پڑے جن میں سے کچھ میں انتہائی اہم ڈاکومنٹ تھیں۔ جبکہ ساتھ ہی امریکی سپاہیوں میں سے 8 کی جلی ہوئی لاشیں بھی تھیں۔ ایرانی اتھارٹیز نے کچھ لاشیں پریس کانفرنس میں دکھائیں۔ اس سے پھر اس جنگ کی یاد تازہ ہو گئی جو طرابلس کے پاشا کے خلاف لڑی گئی۔ جس نے ایک زبردست دھماکے میں مارے جانے والے امریکی فوجیوں کی باقیات دکھائی تھیں۔ اس تشدد پر مبنی رویہ کے سبب ہی امریکی صدر جیفرسن نے دوسری حکمت عملی اختیار کی تاکہ قزاقوں کا مکمل خاتمہ کیا جا سکے اور اس کے لئے اسٹیفن ڈیکارٹر نے اسکی مدد کی۔ مگر کارٹر کے پاس کوئی اسٹیفن ڈیکارٹ نہ تھا، نہ اس کے پاس دوسری مدت کا اقتدار تھا۔

امریکہ کے ہیلی کاپٹروں کی ایران سے فرار کے ساتھ ہی سوویت ٹینکوں کی افغانستان میں آمد سے عرب اسرائیل امن کے لئے کارٹر کی کوششوں کو نقصان ہوا۔ 1980ء کے صدارتی انتخاب میں ووٹر اس کی عقیدہ کے گرد گھومنے والی سیاست سے زیادہ متاثر نہ ہوئے بلکہ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے خطرات پیدا ہوئے، کارٹر کا بطور صدر آخری کام یرغمالیوں کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بات چیت کا آغاز تھا۔ اس کا طریقہ جیفرسن کی بجائے تھامسن ایڈم جیسا تھا۔ الجزائر جس سے امریکہ کا واسطہ ماضی میں قزافی کے سلسلے میں پڑا تھا۔ الجزائر کو ہی درمیان میں لاتے ہوئے امریکی صدر نے جدید طریقے تاوان ادا کرتے ہوئے ایران کے اکاؤنٹ کھول دیئے (امریکہ میں) اور ایران کو قیدیوں کی طرف سے مستقبل میں کسی مقدمے کے حوالے سے رعایت دے دی۔ عارضی طور پر نرم پڑتے ہوئے ایرانیوں نے قیدیوں کی 444 روزہ قید ختم کر دی یہ قید کے دن فلاڈیفیا جہاد کے عملے اور کپتان بین برج کی قید سے 100 دن کم ہی تھے۔ جس کا سامنا انہوں نے طرابلس میں کیا مگر امریکیوں کے لئے اتنے ہی ہولناک تھے۔

یرغمال بنائے جانے والے امریکیوں کے تنازعہ کا نتیجہ امریکی جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ

سے تعلقات کے حوالے سے ایک اہم باب کا خاتمہ تھا۔ 30 سالوں کے دوران امریکہ نے سوویت جارحیت اور قوم کے حوالے سے خطے میں لاحق خطرات کا سامنا کیا۔ کامیاب امریکی انتظامیہ نے امریکہ کو نو آبادیاتی نظام کا مخالف چمپئن قرار دلوانا چاہا اور بعض اوقات امریکہ اور برطانیہ کے خلاف جدوجہد میں مقامی لوگوں کا ساتھ دیا۔ لیکن کئی لوگوں کے لئے سوویت یونین اور امریکہ میں کوئی فرق نہ تھا۔ جنہوں نے ایک نئی سامراجی طاقت کے طور پر یورپ کی جگہ لے لی تھی۔ امریکہ کی اسرائیل کے لئے سپورٹ نے عربوں کو مزید متحد کر دیا، خاص کر 1967ء کے بعد جب امریکہ نے اسرائیل کو ایک ذمہ داری کے بجائے ایک اثاثے کے طور پر دیکھا۔ ٹرومین سے لے کر ہر امریکی صدر کی مشرق وسطیٰ میں عرب اسرائیل تنازعہ حل کروانے کی کوشش تباہ کن نہیں تباہ کن ترین تھی۔

اگرچہ واشنگٹن کے فیصلہ ساز اپنی امن کوششوں پر 1980ء کے دوران بھی کام کرتے رہے پھر بھی پر آمادہ اسرائیل کو سپورٹ کرتے رہے۔ امریکہ پھر بھی مشرق وسطیٰ میں اپنی طاقت برقرار رکھنے اور اپنی اقدار کے دفاع کے لئے ایک توازن چاہتا تھا۔ لیکن امریکہ کو لاحق خطرے کی نوعیت بدل رہی تھی، نہ ہی ڈکٹیٹر اور نہ ہی روایتی بادشاہ خطے کے لوگوں کو معاشی اور سیاسی بدترین حالات سے نکالنے میں کامیاب رہے تھے۔۔ جبکہ دوسری طرف جہالت، ظلم اور فوجی عدم صلاحیت کے مظاہرے انتہا پسند اور پرانی سوچ کے حامل ادوار میں بڑھے تھے مگر اب بغاوت کی ایک تحریک جو مغرب کے ہاتھوں مسلمانوں کی 300 سال سے جاری تذلیل پر غصے میں تھی اٹھی۔ یہ بغاوت مشرق وسطیٰ میں تشدد پسند حکمرانوں کا نتیجہ ہے۔ یہ حالت جدیدت کی کمی یا زیادتی سے ہوئی۔ 1979ء سے مسلم بنیاد پرستی نے سوشلسٹ قوم پرستی اور روایتی بادشاہوں کو دبا دیا تھا جو کہ مشرق وسطیٰ کی سب سے اہم قوت اور امریکہ کی خطے میں بالادستی کے لئے نیا چیلنج تھا۔ سرد جنگ کا اتحاد تیزی سے ٹوٹ رہا تھا اور امریکہ اپنے نئے اور مضبوط دشمن کے سامنے بے یارومددگار تھا۔ 200 سال پہلے جب طرابلس کے سفیر عبدالرحمٰن نے جیفرسن اور ایڈمز کو بتایا تھا جو لوگ مسلمانوں کی بالادستی نہ مانیں ان سے لڑنا ضروری ہے۔ عبدالرحمٰن ان کو مذہب پر لیکچر دے رہا تھا۔ امریکہ کو پھر مذہب کے نام پر لڑنے والے مقدس جنگجوؤں سے تنہا لڑنا تھا۔

جنگ کے تیس سال

1981ء سے شروع ہونے والی دہائی وحشت ناک واقعات کے لئے یاد رکھی جائے گی۔ اسپیس شٹل چیلنجر کی تباہی سے لے کر ایڈز کے پھیلاؤ تک پھر اس کے علاوہ جو چیز سب سے کم یاد کی جاتی وہ امریکہ اور عربوں کے تعلقات میں آنے والی مسلسل پیچیدگی تھی۔ پیشگی حملے اور علاقائی تنازعات، انقلابات، عالمی سازشیں اور دہشت گردانہ حملوں نے اس عشرے کا احاطہ کئے رکھا اور واشنگٹن کو تشدد آمیز رویے پر اکسایا۔ ان دس سالوں کے دوران امریکہ میں مشرق وسطیٰ کا تاثر ایک غیر واضح خطرے کے بجائے ریاستوں کی ایسی زنجیر کا ہو گیا جہاں کی خون کی پیاسی حکومتیں خاص طور پر امریکہ کو نشانہ بنا رہی تھیں۔

کارٹر کے جانشین کے لئے اس تبدیلی سے لڑنا بہت مشکل رہا۔ مذہب پر گہرا اعتقاد اوراس کے ساتھ ہالی وڈ کی بنائی گئی متھوں پر یقین جس کی شخصیت کا حصہ تھا۔ رونالڈ ریگن جو کیلی فورنیا کا ایک سابق گورنر تھا اور جس نے 25 سے زائد فلموں اور پچاس سے زیادہ ڈراموں میں کام کیا۔ ریگن نے امریکہ کے ایران میں یرغمالیوں کو رہا کئے جانے کے دن ہی عہدہ سنبھالا۔ اس پر امریکی ناکامیوں کو چھپانے کی ذمہ داری تھی۔ نئے صدر نے سوویت یونین کو روکنے کے لئے سرد جنگ کے سخت طریقوں اور جیفرسن کے دہشت پسندی کو روکنے کے ماڈل کی طرف واپسی کا اشارہ دیا۔

بے ترتیبی کا عشرہ:

ریگن ابھی وائٹ ہاؤس آیا ہی تھا کہ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اس کی پہلی آزمائش شروع ہوئی جب معمر قذافی نے جو ایک سخت گیر سوشلسٹ تھا مذہب کی طرف جھکاؤ ظاہر کیا وہ سوویت یونین کے حامیوں میں شمار ہوتا تھا اور اب وہ اسلامی اصولوں کی بات کر رہا تھا۔ اس واقعے نے عرب سیاست کو تبدیل کر دیا۔ یہ تبدیلی مئی 1981ء میں ظاہر ہوئی جب لیبیا کے لیڈر نے ایران کی سپورٹ کا اعلان کر دیا جو کہ امریکہ کے خلاف ایران کی جدوجہد کے لئے تھی اور ساتھ ہی ایک ہجوم کو امریکی سفارتخانہ جلانے کی ہدایت کر دی۔ ریگن جس کا صاف رنگ اور آہستگی سے بولنا سیاہ رنگت اور اونچا بولنے والے قذافی سے مختلف تھا۔ اس نے واضح کہا کہ قذافی نہ صرف سخت گیر بلکہ ایک بوجھ ہے۔ بحیرہ روم میں اپنی حدود 20 کلومیٹر تک بڑھا کر قذافی نے امریکہ کو پھر

چیلنج کیا۔ اس کے مطابق ریگن نے امریکی بحریہ کی ایک ٹاسک فورس کو گلف سدرہ سے لے کر لیبیا کے ساحل تک پیش قدمی کا حکم دیا۔ سوویت یونین ساختہ SU-22 اسکوارڈن فلوٹیلا کو چیلنج کرنے کے لئے اڑا۔ لیکن بحریہ کے جہازوں نے دو کو مار گرایا۔ صدر میڈیسن انتظامیہ کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب امریکی عربوں کی مخالفت کا میدان جنگ میں مقابلہ کر رہے تھے۔ خلیج سدرہ پر لڑائی میں امریکہ نے لیبیا سے حساب چکا دیا۔ ایک ماہ بعد F-16 کی ایک فارمیشن بغداد کے خلاف حرکت میں تھی۔ مگر اس پر امریکی پانچ ستارہ نشان نہیں بلکہ اسرائیلی فضائیہ کا نشان تھا۔ اس کا مقصد بغداد سے 18 میل دور ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کرنا تھا۔ گیارہ سو میل کا سفر طے کر کے اسرائیلی پائلٹوں نے اپنے جہازوں کا بوجھ کم کرنا شروع کیا۔ نشانہ فرانسیسی ساختہ عمارت تھی جو 80 سیکنڈ میں دھوئیں کا ڈھیر بن گئی۔ تاریخ کی اس جرأت مندانہ ترین فضائی کاروائی کا نام آپریشن اوپرا رکھا گیا۔ لیکن امریکہ سے خریدے طیاروں سے آپریشن کرتے ہوئے عراقی پلانٹ کو تباہ کر کے اسرائیل نے امریکہ کو مشکل میں ڈال دیا۔

اسرائیل اور دنیا سے ریگن کے تعلقات پیچیدہ تھے وہ اب بھی تیل کو امریکہ کا مشرق وسطیٰ میں اہم ترین مفاد سمجھتا تھا اور اس کو خطرے میں ڈالنے والے کسی بھی اسرائیلی اقدام کا مخالف تھا۔ اس نے 1981ء میں سعودی عرب کو فضائی نگرانی کے لئے AWACS طیارے دیئے تاکہ آئل کی فروخت روکنے کے لئے اوپیک کی کوششوں کا مقابلہ کیا جا سکے اور جب تیل فروخت کرنے والے عرب ملکوں کی طرف سے گولان کی پہاڑیوں کو اسرائیل کے سپرد کرنے پر احتجاج ہوا تو ریگن نے اسرائیل سے دفاعی معاہدہ کر لیا۔ وزیراعظم بیگن کے خیال میں امریکہ اسرائیل کو ایک بنانا ریپبلک کے طور پر ڈیل کر رہا تھا۔ مگر ریگن یہودی ریاست کا بہت احترام کرتا تھا۔ اسرائیل نے سوویت یونین کے خلاف مکمل طور پر مغرب سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ ریگن کی پرورش زیادہ تر کرائسٹ چرچ کے ان لوگوں کے ساتھ ہوئی تھی جو عیسائیت کے تجدید چاہتے تھے یہ لوگ صیہونی نواز ایو انجلسٹ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اس نے (ریگن نے) اسرائیل کو فوجی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط کرنا اور سوویت یہودیوں کو ان کی آبائی سرزمین اسرائیل بھیجنا جاری رکھا بعد میں یہی ایتھوپیا کے یہودیوں کے لئے کیا۔

ریگن نے اسرائیل کو اضافی جیٹ طیاروں کی فراہمی روک دی۔ وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ

اپنے اتحادی کے خلاف کسی حملے میں شامل نہیں۔ اس نے امریکہ کے پر عزم سفیر جین کرک پیٹرک کو اقوام متحدہ میں اپنے عراقی ہم منصب کے ساتھ مل کر ایک مذمتی مسودہ جو کہ اسرائیلی حملے کی مذمت کرے تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ Osirak ری ایکٹر پر حملے نے آخر میں امریکہ اور اسرائیل کے تعلقات کو متاثر نہ کیا۔ بعد میں بے شک امریکی صدر عراق کو ایٹمی طاقت کے حصول سے روکنے پر اسرائیل کا شکر گزار ہو مگر اس نے عراق کے ساتھ تعلقات کا آغاز تو کر دیا۔

امریکہ ایک مرتبہ پھر عرب قوم پرست لیڈر پر اعتماد کر رہا تھا اگرچہ اس مرتبہ ایسا کمیونسٹوں کے خلاف نہیں بلکہ اسلامی بنیاد پرستوں کے خلاف کیا جا رہا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر ایک طرف عرب سیکولر عناصر کو مسلمان بنیاد پرستوں کے خلاف استعمال کرنے اور اسرائیل کو سوویت یونین کے حامیوں کے خلاف استعمال کرنے کی پالیسی کسی کام کی ثابت نہ ہوئی۔ ان دونوں کے تضادات صرف ایک سال بعد اس وقت بے نقاب ہو گئے جب Osirak ری ایکٹر پر حملے کے ایک سال بعد ہی اسرائیلی فوجی لبنان میں داخل ہو گئے۔

اسرائیلی اس حملے کے لئے عرصے سے تیار تھے۔ PLO جس نے اردن میں اپنا صدر دفتر بنایا تھا اب اپنا یہی کام لبنان میں شروع کر دیا تھا۔ جہاں سے گلیلی شہر میں اسرائیلی بستیوں پر مسلسل حملے ہو رہے تھے لیکن اسرائیل کا جھگڑالو وزیر دفاع نہ صرف یہ کہ اس خطرے کا خاتمہ چاہتا تھا بلکہ PLO کا بھی خاتمہ چاہتا تھا تا کہ مغربی کنارے اور غزہ پر دعوی کرنے وہ اور کوئی نہ ہو۔ ایریل شیرون جس نے 1950ء میں اسرائیل کے جوابی حملوں کی قیادت کی تھی اور 1973ء میں مصری فوج کا محاصرہ کیا تھا۔ شیرون نے شامیوں اور عرفات کو لبنان سے نکالنے کے لئے ایک تیز رفتار حملہ چاہا۔ جس سے بیروت حکومت بھی بحال ہو سکے۔ پلان نے ریگن کے وائٹ ہاؤس کو بھی بری طرح تقسیم کر دیا۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ الیگزینڈر ہیگ جو سوویت یونین کا شدید مخالف تھا اس نے ہر اس اقدام کی حمایت کی جو سوویت یونین کے لئے نقصان دہ ہو۔ دوسری طرف ڈیفنس سیکرٹری کاسپر وین برگر جو کہ اور زیادہ دلیل پسند تھا وہ جنگ کے امریکی مؤقف پر ہونے والے نقصان دہ خطرات سے پریشان تھا یہ بحث اس وقت خطرناک بن گئی جب فلسطینی گن مین نے 3 جون 1982ء کو اسرائیلی سفیر کو شدید زخمی کر دیا۔

اپنے ملک کا دو طرفہ خطرہ سے دفاع کرتے ہوئے 30 ہزار اسرائیلی ساحل پر اترے اور

لبنان کے پہاڑی محاز پر پانچ سو شامی ٹینک اور سو طیارے تباہ کر دیئے، ساتھ 6 ہزار فلسطین جنگجو بیروت کے شمال میں دھکیل دیئے جس کے بعد اسرائیلی فوج نے شہر کا محاصرہ کر کے اور منصوبہ کے مطابق PLO کی پوزیشنوں اور ہیڈ کوارٹر پر بمباری کی۔ شہر پر گھنا بادل چھا گیا جس کے پیچھے شعلے اور جس میں سے آگ کے گولے گزر رہے تھے۔ آپریشن گلیلی کے لئے امن جسے اصل میں اسرائیل کے شمالی بارڈر محفوظ بنانے کے لئے ایک محدود حملہ کہا جاتا ہے یہ ایک عرب دارالحکومت پر طویل قبضے میں بدل گیا۔ جس میں دسیوں ہزار لوگ مارے گئے۔

''لبنان میں اسرائیل کے سفیر پر حملہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو اس نے اسرائیل کو اس قدر جارحانہ حملے کا جواز نہیں دیا تھا۔ جو کہ بیروت پر ہوا''۔ امریکی صدر نے اسرائیلی وزیر اعظم بیگن کو جھڑک دیا۔ بمباری سے تباہ علاقے، اعضا کٹے بچے، اور مہاجروں سے بھری سڑکیں اس ساری عزت کو خاک میں ملا رہی تھیں جو امریکہ نے عرب دنیا میں حاصل کی تھی۔ پھر فلسطین اور شامی جو براہ راست ماسکو سے جڑے ہوئے تھے ان کی شکست نے سوویت مداخلت کا خطرہ خطرناک حد تک بڑھا دیا۔ ریگن لکھتا ہے کہ ہم ایک تنی ہوئی رسی پر چل رہے ہیں اس نے اسرائیل سے شیلنگ روکنے اور بیروت سے فوج واپس بلانے کا مطالبہ اصرار کے ساتھ کیا۔ ہیگ نے استعفی دے دیا اور امریکی صدر کے مطالبات نہ مانے گئے۔ اسرائیلی بمباری شدید ہو گئی، تنگ آ کر بحران کے خاتمے کے لئے ریگن نے آفر کی وہ عرفات اور اس کے ساتھیوں کی تونس منتقلی کی نگرانی خود کرے گا۔ 80 سال پہلے روز ویلٹ امریکی صدر نے فوجی بیروت بھجوائے تھے تا کہ وہاں رہنے والے امریکیوں کی حفاظت کی جا سکے۔ ریگن بیروت میں امریکی شہری PLO کی پسپائی کا معائنہ کرنے بھجوا رہا تھا۔

اٹلی اور فرانس کی فوجوں کے تعاون سے فلسطینی جنگجوؤں کا انخلا بلاشبہ کامیابی تھی۔ ریگن نے واقعہ کو مشرق وسطیٰ میں سامنے آنے والا نیا امن منصوبہ قرار دیا۔ اس نے بتایا کہ اسرائیل ویسٹ بینک اور غزہ کو چھوڑ دے گا جنہیں اردن سے جوڑ دیا جائے گا۔ صدر نے عرب اور امریکہ کے لئے ایک دوستانہ فلپ کو قاصد بنا کر فوراً بھجوایا تا کہ پروگرام کے مطابق کام شروع ہو سکے۔ فلپ کو وہ کرنا تھا جو کہ امکانات کے ماحول میں ہو سکتا تھا۔ لبنان پر منڈلا رہا بحران ٹالا جا سکتا تھا اور ٹال دیا گیا ساتھ ہی امن کے راستے کی رکاوٹ بھی ختم ہو گئی۔ ''عمدہ جاب'' کے بینر تلے امریکی

جہاز نے ساحل چھوڑ دیا۔ 14 ستمبر 1982ء کو شامی لوگوں نے لبنانی صدر قتل کر دیا۔ اسی رہنما سے اسرائیل کو معاہدے کی امید تھی۔ اس نے اسرائیل کو مسلم بیروت کے بڑے حصے پر قبضے پر اکسایا اور اس نے میرونائیٹ ملیشا کو صبرہ اور شتیلا کے فلسطینی کیمپوں میں داخل ہونے دیا۔ جہاں انہوں نے 800 عام شہریوں کا قتل عام کیا جس پر شدید عالمی ردعمل ہوا اور ایریل شیرون کو استعفیٰ دینا پڑ گیا۔ فلسطینیوں کو مزید نقصان سے بچانے کے لئے امریکی مداخلت کا مطالبہ ہوا۔ ریگن دباؤ کی تاب نہ لا سکا اور میریز کو واپس جا کر جنگ سے متاثر بیروت میں کردار ادا کرنے کو کہا۔

اس دفعہ مقصد فلسطینیوں کو بچانا نہیں تھا بلکہ مقتول صدر کے بھائی امین کی حکومت کی مدد کرنا تھا۔ میریز کو ایک مرتبہ پھر بے گناہ لوگوں کو باہر لے جانے کا کردار دیا گیا جو اپنے آپ کو جمہوریت کا محافظ کہتے مگر شامی، شیعہ اور دورروز ان کو Maronite اقلیت کے حامی اور غاصب سمجھتے تھے۔ ایران کی طرح یہ بھی شام اور لبنان کی آزادی میں میرین مرجھا دینے والی آگ کی لپیٹ میں تھے۔ جو انہیں ٹینکوں اوطیاروں سمیت واپس بھیجنا چاہتی تھی۔ انہوں نے ان بستیوں پر فائرنگ کر دی جو پہلے ہی اسرائیلی حملے کے زد میں تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکی فوج کبھی بھی مشرق وسطیٰ کی لڑائی میں اس قدر بری طرح نہیں الجھے تھے مگر ان کی فائر پاور نا کام ثابت ہوئی میریز کی مدد کے لئے امریکی فوجی بھیجے گئے اور چھٹے بحری بیڑے کو نئی جگہ بھیج دیا گیا تا کہ پہاڑیوں میں چھپے (جو بیروت سے اوپر تھیں) دشمن کو نشانہ بنایا جا سکے۔

دشمن نے بے حد سخت جواب دیا۔ 13 اپریل 1983ء کو دوپہر کے وقت ایک خودکش حملہ آور نے جس کا تعلق ایران کی حمایت یافتہ حزب اللہ سے تھا اس نے بیروت کے امریکی سفارتخانے میں دھماکہ خیز مواد سے بھرا ٹرک اڑا دیا، جس سے 17 امریکی جن میں CIA کے لوگ بھی تھے مارے گئے جن کے ساتھ چالیس لبنانی بھی مارے گئے۔ 23 دسمبر کو ایک اور حملے میں 241 امریکی مارے گئے۔ جنگ کے بعد سے یہ امریکہ پر سب سے بھیانک حملہ تھا جس کو کم حفاظت رکھنے والے میریز کے ہیڈ کوارٹر پر کیا گیا۔ بے حد خوفناک۔ امریکیوں نے یہ نظارہ اپنے ٹی وی بے سپر د جیسا کہ جہاز کا عملہ لاشوں کو کچرے سے الگ کر رہا تھا اور ساتھ ہی ریگن کا عزم سنا ''ان لوگوں کی مزاحمت کرو جو ہمیں علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں'' پہلے وہ پر عزم نظر آتا تھا۔ بحری جہاز کیریئرز کینیڈی اور انڈیپنڈنٹ سے طیارے اڑے اور شام میں ٹارگٹ پر بمباری کی۔ دو

طیارے مار گرائے گئے اور ایک پائلٹ گرفتار وا اور جنگی جہاز نیوجرسی نے پہاڑوں پر 16 انچ گن سے فائرنگ کی مگر فروری 1984ء میں ریگن کو پتہ چل گیا کہ لبنان ویت نام کی طرح کی دلدل بنتا جا رہا ہے۔ اس نے امریکی فوجی دستے واپس بلا لئے۔

اس نے اس الزام کا انکار کیا کہ امریکہ لبنان سے بھاگ آیا ہے لیکن سچ یہی تھا کہ امریکہ شام اور اس کے اتحادیوں کو محدود کرنے میں نا کام رہا۔ اس سے پہلے ایران میں بھی ایسا ہی ہوا جو بظاہر امریکہ کی مشرق وسطیٰ سے پسپائی لگ رہا تھا۔ خطے میں امریکی طاقت کا کم ہونا اس سے واضح تھا کہ لبنان نے اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ توڑ دیا جس میں امریکہ ضامن تھا اور زیادہ تکلیف دہ امریکہ کے شہریوں اور اداروں کے خلاف حملے تھے۔ 12 ستمبر 1983ء کو کویت میں امرکی سفارتخانہ زد میں آیا جس میں حزب اللہ کے ملوث ہونے کے امکانات تھے۔ پھر بیروت میں سفارتخانہ حملے کی زد میں آیا جس میں دو امریکی مارے گئے۔ اپریل 1984ء میں حزب اللہ نے بم مار کر اسپین کے شہر میں 18 امریکی قتل کر دیئے اور اسی ماہ بیروت میں سفارتخانے پر ایک اور حملے میں 22 امریکی مارے گئے۔

ہائی جیکنگ اور ائیر پورٹوں پر حملے دوبارہ ہونے لگے۔ حزب اللہ والوں نے دو امریکی اس وقت قتل کر دیئے جب انہوں نے ایک کویتی جہاز کو تہران میں اتارنے کی کوشش کی۔ 1984ء میں صرف 6 ماہ بعد انہوں نے TWA کا طیارہ اغواء کیا اور اسے بیروت لے گئے۔ جہاں امریکی نیوی کے ڈرائیور کو قتل کر کے اسکی لاش تعمیراتی میٹریل پر پھینک دی۔ ابوندال نام کے ایک فلسطینی گروپ نے 1985ء میں دستی بم اور کلاشنکوف کے حملوں میں روم اور ویانا ائیر پورٹ پر 5 امریکی مار دیئے۔ اسی مارچ میں فلسطینی جنگجو ایتھنز جانے والے ایک طیارے کو نشانہ بنانے میں کامیاب رہے جس میں 14 امریکی مارے گئے۔ لگتا تھا کہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ امریکیوں کا بے نام وسطی ایشیا کے گروہوں کے ہاتھوں مرنا معمول بن گیا ہے۔ عرب گروہوں کا خوف اور امریکی بہادری کی وضاحت اٹلی کے کروز جہاز پر قبضے سے ہوا۔ جیسا کہ مراکش کے کچھ قزاقوں نے 201 سال پہلے Brig Betsey پر قبضہ کیا۔ PLO والوں نے بھی اٹلی کے جہاز پر قبضہ کر کے 12 امریکی یرغمال بنا لئے مگر PLO کا ارادہ امریکیوں کو صرف خوفزدہ کرنا نہ تھا بلکہ وہ ان کو مثال بنا دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے نیویارک کے 69 سالہ یہودی کو جو معذور تھا جس کا نام کی وہیل چیئر کو بندرگاہ کے کنارے دھکیل کر

اس کی پشت میں گولی ماری اور اس کو سمندر میں پھینک دیا۔

ہمیں مشرق وسطیٰ میں پھر بحران کا سامنا ہے جس سے امریکی لوگوں کو خطرہ ہے۔ ریگن نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ امریکہ کی خطرات کو جواب دینے کی صلاحیت مناسب دفاع کی عدم موجودگی سے ہوئی۔ ساتھ ہی قابل بھروسہ اتحادیوں کی کمی سے بھی ہائی جیکروں کو گرفتار کرنے کی بجائے مصر نے ان کو محفوظ راستہ دے دیا تا کہ وہ تونس جاسکیں۔ امریکہ کے طیاروں نے ابوعباس نام کے فلسطینی کو لے جانے والے جہاز کو روکا اسے سسلی میں اترنے پر مجبور کیا مگر اٹلی والوں نے اسے فوراً چھوڑ دیا۔ طے ہوا مشرق وسطیٰ سے آنے والے خوف کا مقابلہ کرنے کے لئے امریکہ کو یک طرفہ اقدامات کرنا ہوں گے۔

1986ء میں امریکہ کے تنہا اقدام کرتے ہوئے لیبیا کو نشانہ بنایا جو ابوعباس کا اہم حمایتی تھا۔ قذافی کو فوجی تصادم میں الجھانے کے لئے ریگن نے نیوی کو لیبیا کے ساحل کے ساتھ دوبارہ گشت شروع کرنے کا کہا۔ دہشت سے متاثر کسی بھی قوم کو قوت سے جواب دینے کا حق ہے تا کہ اپنے خلاف نئے حملے روک سکے۔ صدر نے وضاحت دی۔ میرے خیال میں ہمیں قذافی کو دکھانا چاہیے کہ ہم اسے اس طرح نہیں جانے دیں گے۔ قذافی جال میں آ گیا۔ اس وقت جب لیبیا کی میزائل سے لیس کشتیوں نے فائر کھول دیا، نیوی کے طیاروں نے اس کو میزائلوں اور بموں سے تباہ کر دیا اور ساتھ ہی زمین پر واقع ریڈار کو بھی۔

ریگن نے ابوندال کے حوالے سے انصاف مانگا مگر قذافی ان باتوں سے دور تھا۔ دو ہفتے بعد لیبیا کے ایجنٹوں نے جرمنی کے شہر برلن کے ایک کلب میں دھماکہ کر کے دو امریکی مار ڈالے جبکہ پچاس کو زخمی کر دیا۔ ریگن نے طرابلس اور بن غازی پر 60 ٹن بارود برسا کر جواب دے دیا۔ کچھ میزائل نشانے سے ہٹ گئے اور کئی شہری جن میں قذافی کی لے پالک بیٹی بھی تھی مارے گئے۔ اس آپریشن نے امریکہ کے اتحادیوں کو اشتعال دلا دیا۔ فرانس اور اسپین نے امریکہ کے جہازوں کو راستہ دینے سے انکار کر دیا یورپ کی ہمدردی کے باوجود قذافی نے یورپ میں ہی ایک اور حملہ کیا۔ 21 دسمبر 1988ء کو Pan Am کی فلائٹ 103 کو لاکربی اسکاٹ لینڈ میں بم دھماکے سے اڑا دیا گیا جس سے 37 امریکی کالج اسٹوڈنٹ اور کل 259 مسافر مارے گئے۔ ان میں 11 دیہاتی بھی تھے جو زمین پر تھے۔

امریکہ نے پھر اپنی طاقت کا مظاہر بغیر یورپی مدد کے شمالی افریقہ کے خلاف کرنے کا فیصلہ کیا جیسا کہ انیسویں صدی کے شروع میں یوسف کے خلاف ہوا تھا۔ جو اس وقت طرابلس کا حاکم تھا۔ قذافی پر دنیا میں کسی وقت بھی حملہ کیا جا سکتا تھا اور انتقام اس سے زیادہ کیا ہوسکتا تھا جو امریکیوں سے لبنان میں لیا گیا۔

Kilburn کا اغواء اور قتل اسے یرغمال بنانے اور قتل کے سلسلے کی علامت تھا جس نے لبنان میں 80 کے عشرے میں امریکیوں کی زندگی مشکل کر دی جو متحارب قوتوں کی لڑائی کا شکار تھے۔ امریکی شہری ہزاروں مسلح اور ماسک پہنے ملیشیا کے لوگوں کا جو بیروت میں گھومتے تھے آسان شکار بن گئے۔ یونیورسٹی آف بیروت کی بنیاد رکھنے والے Daniel B Liss کا پڑپوتا اور یونیورسٹی کا صدر جسے حزب اللہ نے 1981ء میں یرغمال بنا کر سال بھر پاس رکھا اسے بغیر نقصان کے چھوڑ دیا گیا۔ مگر اس کا جانشین اتنا خوش قسمت ثابت نہ ہوا۔ Kerr جو مشنری گھرانے کا فرد اور عرب داخلی امور کا ماہر تھا وہ آفس سے باہر آتے ہوئے حزب اللہ کے دو جنگجوؤں کی طرف سے قتل کر دیا گیا۔ پھر حزب اللہ نے اگلے سال CIA کے بیروت میں بیورو چیف William Buckley کو تشدد کر کے قتل کیا اور 1988ء میں William Higgin کو جو امریکی امن فوج کے ساتھ موجود تھے اغواء اور قتل ہوئے۔

لبنانی گروہوں نے 9 دیگر امریکی 91-1981ء کے عرصے میں اغواء کئے جن میں سے ایک ایسوسی ایٹڈ پریس کا نمائندہ تھا جو سات سال تحویل میں رہا۔ امریکی تنصیبات پر بمباری سے اور امریکی شہریوں کے قتل سے بھی زیادہ یرغمال بنائے جانے والوں کے مسئلے پر امریکی لیڈر پریشان تھے۔

مگر لبنان کی حالت کے پیش نظر ریگن کے لئے یہ ممکن نہ تھا صرف ایک متبادل تھا کہ حکومت تو لبنان میں تھی نہیں چنانچہ ان لوگوں کی سرپرستی کرنے والوں سے بات کی جائے جن میں ایران سب سے اہم تھا اور اقتصادی ارفوجی ذرائع استعمال میں لائے جائیں۔ ریگن نے اپنی دوسری ٹرم کا زیادہ ایران کی طرف سے پیدا کردہ مسائل کو سلجھانے میں گزارا وہ بے یقینی کا شکار تھا کہ آیا ملاؤں سے معاملہ کیا جائے یا ان کو کم ناراض کیا جائے۔ تب 1985ء کی گرمیوں میں اسرائیل نے اسے ایک راستہ فراہم کر دیا۔ اس نے دعوی کیا کہ ایران کی حکومت میں موجود معتدل لوگ یرغمالیوں کو رہا کروا لیں گے اگر ان کو اینٹی ٹینک یا ٹینک شکن میزائل دیئے جائیں۔ جس کی ان کو عراق کے ساتھ جنگ میں شدید ضرورت تھی۔ انتظامات کرتے ہوئے ریگن نے یہ خفیہ طور پر تیار

کیا کہ امریکہ اسرائیل کو دے گا جو وہ تہران کو دے دے گا ''ہم ایران کے لوگوں کو کوئی اسلحہ نہ پہنچائیں گے'' صدر نے افسوس کیا میرے خیال میں یہ کوئی آپریشن نہیں جیسا کہ یرغمالیوں کے بدلے اسلحہ رات کے وقت بے نشان ڈبوں پر جو صاف جھنڈوں سے لیس جہازوں اسرائیل نے میزائل پہنچانے شروع کر دیئے۔ اگست تک 600 میزائل ایران پہنچ گئے۔ اگرچہ ان میزائلوں نے تل ابیب اور تہران میں کچھ تعلقات قائم کر دیئے مگر واشنگٹن میں منصوبہ سازوں کو تقسیم کر دیا جب CIA اور نیشنل سیکورٹی ایجنسی نے آپریشن کی حمایت کی۔ مگر George Shultz نے جو سابقہ سیکرٹری خزانہ تھا نے اس مسئلے پر بغاوت کی۔ اسی نے سیکرٹری آف اسٹیٹ کے طور پر ہیگ کی جگہ لی تھی۔ اگرچہ صدر نے پھر بھی ہتھیاروں کے تبادلہ پر نومبر 1986ء کے بعد بھی پابندی جاری رکھی جب پہلی بار میڈیا میں آپریشن کا لفظ آیا ریگن نے پہلے تو انکار کیا کہ اس نے دہشت گردی کی سرپرستی کرنے والی حکومت کو میزائیل بیچے ہیں مگر ایک ہفتے کے بعد ہی یہ کہہ کر اپنا مؤقف بدل لیا کہ امریکہ نے ایک اچھے مقصد کے لئے ایران کو کچھ دفاعی ہتھیار دیئے ہیں۔ ہماری حکومت دہشت پسندوں کی بات نہ ماننے کے عزم پر قائم ہے ہم نے یرغمالیوں کے بدلے ہتھیار دیئے نہ دیں گے۔

لیکن اسے ریگن کی ساکھ امریکیوں کی نظر میں شدید متاثر ہوئی اور تہران میں بھی اسے کچھ نہ ملا۔ ایران نے حزب اللہ کو روکنے سے انکار کر دیا نہ صرف لبنان بلکہ خلیج فارس میں بھی غیر مسلح کویتی تیل کے جہازوں پر میزائل کشتیوں سے حملے جاری رکھے۔ ریگن نے بربری وار کا اہم سبق بھلا دیا تھا۔ مشرق وسطیٰ کی ان ریاستوں کو جو قزاقوں سے تعاون کرتی ہیں ہتھیار دینا قذافی کو بڑھاوا دے گا۔ 1987ء اور 1988ء کے دوران امریکہ کے جنگی جہازوں نے بڑے پیمانے پر ایران کے جنگی جہازوں کو ڈبویا اور ساتھ ہی خطرے کا شکار کویت کی کشتیوں کی حفاظت کرنا شروع کر دی، مگر اس دوران امریکہ جہازوں نے ایک ایرانی طیارہ مار گرایا جس میں تمام 290 لوگ مارے گئے۔ اگرچہ امریکی فوجی گلف میں ایران سے لڑ رہے تھے مگر ایران کی حکومت کو ہتھیاروں کی فراہمی نے ایک نیا اسکینڈل شروع کر دیا۔ اجتماعی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میزائل کی فروخت سے ملنے والی رقم سے نگاراگوا کے اینٹی کمیونسٹ گوریلے Contra گروپ کو مسلح کیا جا رہا تھا اس وقت جب کہ امریکہ ایران کو ٹینک شکن میزائل فروخت کر رہا تھا۔ یہ ایران کے واضح دشمن عراق کو ہیلی کاپٹر، سوئرز، اسٹیلائیٹ اور انٹیلی جنس معلومات بھی فراہم کر رہا تھا۔

اگرچہ عراق بھی لیبیا سے کم ابوندال کا سرپرست نہ تھا مگر ریگن نے عراق کو دہشت گردی کی سرپرستی کرنے والی ریاستوں کی فہرست سے ہٹا دیا۔ دو مرتبہ اس نے صدارتی سفیر رمزفیلڈ کو صدام حسین سے ملنے بھیجا اس شہادت کو اس نے نظر انداز کر دیا کہ عراقی حکومت نے کیمیائی گیس کے استعمال سے اپنے ہزاروں مخالف قتل کیئے ہیں۔ ''کسی کو عراق کی دہشت گردی میں ملوث ہونے کی بات پر شبہ نہیں'' ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ کی ایک دستاویز بھی تصدیق کر رہی تھی۔ اگرچہ کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال پر رمزفیلڈ نے صدام حسین کی مذمت کی مگر واضع الفاظ میں مذمت کے باوجود اسے یقین دلایا کہ امریکہ آیت اللہ خمینی سے اس کی لڑائی میں اس کے پیچھے کھڑا رہے گا اور عراق کی پسند کی رفتار سے سے تعلقات کو دوطرفہ طور پر بہتر بنانے کی بات کی۔ امریکہ اور عراق کے تعلقات مسلسل مضبوط ہوئے اس کے باوجود کہ عراق کے میراج طیارے نے خلیج فارس میں اسٹارک نام کے امریکی جہاز پر میزائل برسائے۔

امریکی انتظامیہ کی ایران کو محدود کرنے کی مہم جو کہ خلیج فارس میں چل رہی تھی اس کے ساتھ ایک اور مہم بھی چل رہی تھی جو عرب جنگجو گروہوں کو اسلحہ عسکری ایڈوائزری اور مالی امداد دینے کی تھی تا کہ وہ افغانستان میں سوویت یونین سے لڑ سکیں۔ انتظامیہ مزاحمت کو رومانوی انداز میں دکھا رہی تھی اور اس ذلت کو جو امریکہ کو ان مجاہدین کے ہاتھوں ہوئی تھی کو بالکل تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا۔ امریکہ یہ ماننے پر بھی آمادہ نہ تھا کہ سعودی عرب میں امریکہ کے خلاف نفرت سامنے کی بات تھی اور امریکہ نے تو ایک بڑے پیمانے پر تقسیم کی جانے والی کیسٹ میں یہ دعوی بھی کیا کہ تمام مسلمانوں کی دشمن ایک قوم ہے (روس) جو کہ گلہ سڑا گوشت کھاتی ہے۔ صرف چند امریکیوں کو پتہ تھا کہ ان کا ملک کس قسم کے امریکہ مخالف پروپیگنڈہ کے لئے راہ ہموار کر رہا ہے۔ مسلمان جنگجو گروپوں کی مدد کر کے اور عرب تیل خرید کر جن لوگوں کو سپورٹ کیا جا رہا تھا ان میں ایک سعودی تاجر کا بیٹا بن لادن بھی تھا۔

یہی ریگن انتظامیہ جو سوویت یونین کے حوالے سے ایک سیدھی سادھی پالیسی پر قائم تھی یہی انتظامیہ مشرق وسطیٰ میں دائروں کی سیاست کے لئے بدنام ہو رہی تھی۔ امریکہ نے عرب حریت پسند افغانستان بھجوائے اور سعودی تھیوکریسی (وہابیت) کو بڑھایا۔ اس کی وجہ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے ذہنوں میں موجود تھیں۔ دونوں سے لاحق خطرات سے بے خبر امریکہ ان

دونوں کی سرپرستی کررہا تھا۔ تضادات میں گھوم رہے جو کہ زیادہ تر سیکورٹی اور عقیدہ کے حوالے سے تھے امریکہ نے پہلے لبنان پر اسرائیل کے حملے کی مدد کی اور پھر اس کا مخالف ہو گیا اور یہودی ریاست کو سپلائی میں تاخیر شروع کر دی۔ اسرائیل کے ساتھ اسلحہ کے بدلے یرغمالی رہا کروانے کا منصوبہ بنایا پھر 1985ء میں جوناتھن پولارڈ کو جو نیوی انٹیلی جنس کا تجزیہ کار تھا اس کو اسرائیل کے لئے جاسوسی کرنے پر سزا دی، پہلے امریکہ نے لبنان سے PLO کے انخلا میں مدد کی تاکہ بعد میں اس کا بائیکاٹ کر سکے بعد میں عرفات کے ساتھ پھر سفارتی بات چیت میں مصروف ہو گیا۔

فلسطینی رہنما کے ساتھ یہ معاملہ امریکی پالیسی میں واضح تبدیلی تھا۔ اگرچہ نکسن سے لے کر ہر انتظامیہ نے خفیہ طور پر PLO سے بات چیت کی تھی جس کا مقصد امریکہ کو فلسطینیوں کی پُرتشدد مہم سے بچانا تھا مگر امریکہ نے اس گروپ کو اس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جب تک یہ گروپ دہشت ختم کر کے اسرائیل کا وجود نہیں مان لیتا۔ ریگن مضبوطی سے اس پالیسی پر قائم تھا ''کوئی PLO نہیں''، جیسا کہ Shultz نے AIPAC کے مجمع کے سامنے الفاظ دہرائے۔ مگر دسمبر 1987ء میں پھوٹ پڑی تھی جس میں فلسطین کے نوجوانوں نے پتھر پکڑ کر اسرائیل کے ٹینکوں کا مقابلہ کیا۔ امریکہ اور اسرائیل یہ دونوں کے خلاف تھا مگر امریکہ نے عرفات کو بھی ہلا دیا۔ نوجوان فلسطینی یقیناً بوڑھے لوگوں سے ہدایات نہیں لے رہے تھے۔ عرفات نے جیسا کہ معلوم ہے وہ تونس میں تھا اگلے دسمبر میں تشدد ترک کرنے اور قرارداد 242 پر عمل کا اعلان کر دیا۔ یہی امریکہ کی قبولیت کے پیشگی شرط تھی۔ ریگن کے پاس PLO کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا اور ساتھ میں عرفات سے رابطے بھی کھولنا پڑے۔ امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور فلسطینی حکومتی عہدیداروں کے درمیان کئی امور پر بات ہوئی جن میں ایک فلسطینی ریاست کا قیام بھی زیرغور آیا۔ لیکن ریگن کے ریکارڈ سے لگتا نہیں تھا کہ مشرق وسطیٰ میں امن کے لئے اس کی کوشش کامیاب ہو گی جو اسرائیل کے ساحل پر ابوعباس کے حملے سے متاثر ہوئی۔ عرفات نے دھماکے کی مذمت سے انکار کیا اور واشنگٹن نے بات چیت روک دی۔

امریکہ کی مشرق وسطیٰ میں امن کے لئے مسلسل بات چیت کو برقرار رکھنے کی صلاحیتیں متنازعہ تھیں۔ اگرچہ ریگن کو سرد جنگ میں واضح فتح کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ ریگن مشکلات پر قابو پانے میں ناکام رہا جو عرب اسرائیل تنازعہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ ایران عراق جنگ اور سیکولر

حکومتوں کا اسلامی حکومتوں سے تصادم بھی اس کا حصہ بن گیا۔ خطے میں Pax Americana قائم کرنے کا منصوبہ شاید ہی کبھی اس سے زیادہ مشکل رہا ہو۔

صحرا میں ڈھالیں

جارج بش سینیئر جب امریکہ کے صدر بنے تو مشرق وسطیٰ میں ایک اور جنگ کا امکان حقیقت سے دور تھا۔ ایک سابقہ جنگی ہیرو، بیس کے کپتان اور CIA کے ڈائریکٹر کے طور پر بش نے زبردست صلاحیتیں دکھائی تھیں جن سے امریکہ کے خطے میں لاحق بے یقینی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ جس سے عرب دنیا کے کئی ڈکٹیٹر بھی سوویت سرپرستی سے محروم ہو گئے تھے۔ فلسطینی انتفاضہ میں بھی وہ شدت نہ تھی اور PLO بھی غیر متعلق بن کر رہ گئی تھی۔ اگرچہ امن ابھی بھی قابل حصول نہ تھا۔ مشرق وسطیٰ اس سطح پر تھا جہاں امریکی امن کے لئے راستہ ہموار کرتے ہوئے اس کے کچھ دیرینہ تنازعات کو سلجھا سکتے تھے۔

مگر مشرقِ وسطیٰ میں امن کا یہ وقفہ عارضی ثابت ہوا۔ صدام کو جنگ سے لاحق ایک ٹریلین کے قرضے کو ادا کرنے کے لئے فوری کیش درکار تھا جو اسے ہمسایہ ریاست میں مل سکتا تھا یعنی کویت میں۔ وہ نقد رقم کی شدید تلاش میں تھا اس نے تیل سے مالا مال عرب ریاست کے حکمرانوں پر الزام لگایا کہ کویت کو مصنوعی طریقے سے عراق سے الگ کیا گیا تھا اور یہ کام برطانوی سامراج کا تھا۔ صدام نے کویت پر دعویٰ کر دیا۔ اپنے بنیادی رجحانات میں اس کا جھکاؤ عرب دنیا کی طرف تھا مگر سیکولر صدام نے خود کو صلاح الدین ایوبی دکھانا شروع کر دیا اور جنگ شروع کر دی۔ 1990ء میں جولائی کے ماہ میں ہزاروں عراقی ٹینک اور فوجی دستے کویت میں پہنچ گئے۔ دنیا عراق کے متعلق فوری طور پر کویت اور شاید سارا جزیرہ عرب کی تسخیر کر لینے کے متعلق سوچ رہی تھی اور یہ بش انتظامیہ کا مشرق وسطیٰ کا پہلا چیلنج تھا جس کا اسے سامنا تھا۔

صدر کو ایک بحران درپیش تھا۔ کویت امریکہ کو تیل دیتا تھا مگر امریکہ کی جنگ میں عراق کا کردار بھی کم اہمیت کا حامل نہ تھا۔ امریکہ اور عراق کے اچھے تعلقات خطے میں استحکام لاتے۔ واشنگٹن کویت عراق تنازعہ میں یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ کس کی حمایت کرے چنانچہ وہ اب تک غیر جانبدار تھا۔ اپریل گلسپی عراق میں امریکی نمائندہ اور مشرق وسطیٰ میں پہلی خاتون سفیر نے صدام کو

یقین دلایا ''ہم عربوں کے عربوں سے تنازعات پر کوئی رائے نہیں رکھتے ہم صرف امید کرتے ہیں
کہ یہ مسائل جلد حل ہوں گے''۔

امریکہ نے ماضی میں مشرق وسطیٰ کے تنازعات سے باہر رہنے کی کوشش کی تھی مگر یہ تنازعہ تو
غیر متوقع تھا جب 2 اگست کو صدام نے حملہ کر کے کویت پر قبضہ کر لیا بش کی تنازعہ کے پُرامن حل کی
امیدیں ختم ہو گئیں۔ جبکہ عراق کا تناسب خلیج فارس میں کہیں بڑھ گیا۔ غیر جانبداری کا آپشن اب
نہ تھا۔ اقوام متحدہ کا اجلاس بلا کر بش نے کویت کو تمام غیر ملکیوں سے آزاد کروانے کا مطالبہ کیا اور
نیوی کا ایک امدادی جہاز مشرق وسطیٰ بھیجنے کا حکم دیا۔ آپریشن ڈیزٹ شیلڈ ''ہم اپنے کسی ساتھی کو اتنا
سخت گیر ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے نہ دیں گے'' بش نے واضح کر دیا تھا۔

کویت میں مداخلت کے لئے (ایک فوجی مداخلت) عالمی اتفاق رائے جمع کیا۔ اپنی پہلی
ہچکچاہٹ کے برعکس جو یورپ نے امریکہ کی دہشت پسندی کے خلاف جنگ میں دکھائی تھی اس
مرتبہ مشرق وسطیٰ کے تیل کے دفاع کے لئے یورپ بھی آمادہ تھا۔ سب سے حیران کن بات یہ کہ
عرب حکمران بھی جو عراق سے لاحق خطروں سے خوفزدہ تھے عراق کے خلاف اتحاد میں شامل ہونا
چاہتے تھے جو کہ صدام حسین کے خلاف بنتا تھا۔ ان کی واحد شرط جنگ کے بعد اربوں امریکی ڈالر
کی امداد اور اسرائیل کو اتحاد سے نکالنا تھا۔ اس عالمی طاقت کو مضبوط دیکھ کر بش نے اقوام متحدہ کی
قراردادوں کی حمایت کروائی جو طاقت کے استعمال کا اختیار کویت سے عراق کو نکالنے کے لئے
دے رہی تھی اور تمام ضروری ذرائع استعمال کئے جا سکتے تھے جو مقصد کے لئے ضروری تھے۔

آپریشن ٹارچ سے دس گنا بڑا فوجی اجتماع تیار کیا گیا۔ یاد رہے کہ آپریشن ٹارچ اس سے
48 سال پہلے ہوا تھا۔ 5 لاکھ سے زیادہ امریکی فوجی ٹینکوں کے اجتماع کے ساتھ اور طیاروں گنوں
اور سپورٹ کرنے والی گاڑیوں کے ساتھ کویت کے گرد کھڑے تھے۔ انہیں 34 رکنی اتحاد کی حمایت
حاصل تھی۔ مشرق وسطیٰ میں یہ سب سے بڑا جنگی ساز و سامان تھا جسے ابھی بھی بش نے استعمال نہ
کیا تھا اور اس نے صدام کو واپسی کا آخری موقع دے دیا۔ انتہائی اہمیت کی حامل ملاقاتوں
میں جیمز بیکر نے اپنے عراقی ہم منصب کو بتایا اور ساتھ ہی طارق عزیز کو بھی کہ کویت خالی کرنا پڑے
گا۔ مگر یہ کوشش بے نتیجہ رہیں۔ صدام نے فوج واپس بلانے سے انکار کرتے ہوئے مقدس جنگ کا
دائرہ اسرائیل تک بڑھانے کا اعلان کر دیا اور 19 ویں صوبے کو برقرار رکھنے کے لئے جنگوں کی ماں

شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ امریکہ نے 15 جنوری 1991ء تک مہلت دے دی کہ صدام بات
مان لے یا اتحادیوں کے غضب کا مقابلہ کرے۔

اپنی مشرق وسطیٰ کی پہلی آزمائش میں بش شاندار انداز میں کامیاب ہوا لیکن اصل رکاوٹ
ابھی باقی تھی۔ ایک عالمی اتحاد بنانے سے زیادہ مشکل اور عرب کے صحراؤں میں ایک مکمل فوج
رکھنے سے بھی مشکل اور یہ تھا کہ صدر کو اپنے ہم وطن امریکیوں کو جنگ کی ضرورت کے لئے آمادہ
کرنا تھا۔ اکثر اس کے لئے ابھی آمادہ نہ تھے کہ ان کے خیال میں جنگ میں امریکی جوان کویت کی
آزادی کے لئے نہیں محفوظ تیل کے لئے لڑیں گے۔ بش نے اسی لئے اپنی تقریر میں تیل کا ذکر ہی
نہ کیا اور اس کے بجائے اس خطرے کا ذکر کیا جو عراق سے ہر جگہ آزاد لوگوں کو تھا۔ ہر گزرتے دن
کے ساتھ صدام نیوکلیئر اسلحہ کے اپنے عزم کو پورا کرنے کے لئے قدم اٹھا رہا ہے۔ صدر نے تنبیہ
کی اور وہ کوئی اسلحہ رکھنے کے لئے نہیں بناتا اس کا استعمال کرتا ہے۔ برطانیہ نے ایک بار کرنل ناصر کو
جو مصر کا صدر تھا ہٹلر سے ملا دیا تھا مگر امریکی صدر بش کے نزدیک تو صدام کی بربریت کی کوئی حد نہ
تھی۔ کانگریس مسئلے پر تقسیم رہی کہ وہ صدر کو کویت کو عراق سے چھڑانے کی اجازت دے کہ نہ دے
جبکہ سینٹ نے صرف 5 ووٹوں کی اکثریت سے فیصلہ دے دیا۔ امریکہ جنگ کے لئے چلا گیا۔

Operation Desert Storm بغداد اور دیگر مراکز پر فضائی حملے سے 17 جنوری کی شام کو
شروع ہوا، راڈار، اطلاعاتی ذرائع سب کچھ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ گائیڈڈ میزائل اور کلسٹر
بموں نے سب کچھ راکھ کر دیا۔ عراق بھی اس یلغار کے لئے تیار تھے۔ پوری دنیا کے ناظرین نے
اس دن عراقی اینٹی کرافٹ گنوں کی باڑھ بھی دیکھی جس نے رات کو کام کرنے والے کیمروں میں
فضا کو نیلا کر دیا ہوا تھا لیکن یہ یلغار امریکی جہازوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی امریکیوں کو الجھانے کے
بجائے عراقی جنگی طیارے تہران کی جانب پرواز کر گئے۔

عرب اسرائیل کے مذاکرات کاروں کی عام اصولوں سے بڑھ کر کسی ٹھوس امن کے
بندوبست میں نااہلی دیکھ کر کارٹر کلنٹن فریقین میں بیچ بچاؤ کرانے پر مجبور ہو گیا۔ صدارتی بھاری
ذمہ داریوں کے باوجود دونوں فریقوں میں عبوری معاہدے کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ وائٹ
ہاؤس میں اکثر جنگی لباس میں ملبوس یاسر عرفات مہمان ہوتا تھا کہ کلنٹن کے نقاد اس کے ابتدائی
سکول کے دن یاد کرنے لگے کہ تیسری دنیا کے گوریلا رہنماؤں کی 60 کی دہائی کی داستان خیالی یاد

آنے لگی۔ بہت دور کے تعلقات کلنٹن، اردن کے شاہ حسین اس کی امریکی بیوی پرنسٹن کی تعلیم یافتہ ملکہ نور کے درمیان قائم ہوگئے۔ کلنٹن کی گہری محبت اگرچہ یہودی صدر رابن کے لئے تھی جو ایک خاموش اور نڈر بزرگ سیاست دان تھا جسے وہ اپنے باپ کی طرح سمجھتا تھا۔ کلنٹن نے یاد کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس طرح دوست بنے جس اعلی طریقے سے لوگ دوست بنا کرتے ہیں جب انھیں یقین ہو کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ بہت عظیم کام ہے۔ میں ہر معاملے میں اس کی عزت کی اور اس کی بہت احتیاط کی۔ اردن کے صحرا میں اکتوبر 1994ء میں کلنٹن کی ذیر صدارت اردن کے شاہ اور اسرائیلی وزیرِ اعظم نے اردن۔ اسرائیل امن کے معاہدے پر دستخط کئے۔ اس تقریب کے موقع پر رنگا رنگ غبارے فضا میں چھوڑے گئے جو ایک نئ امن کی کوشش کی علامت تھے کلنٹن نے شام کے ساتھ اسرائیلی مصالحت کے لئے اسرائیلی مقبوضہ گولان ہائٹس کے تبادلے کے امکان کھوجنے کی کوشش کی۔

گولان غزہ اور مغربی کنارے کی قربان کرنے کے پس منظر نے ان اسرائیلیوں کو غضب ناک کر دیا جو جوان علاقوں کا مقدس سمجھ کر احترام کرتے تھے اور ان کو قوم کے دفاع کا مضبوط حصہ سمجھتے تھے۔ عرفات دہشت گرد گروہوں کو قابو کرنے میں ناکام رہا جس کی شہادت یروشلم میں اگست 1995ء میں بس پر بم کا حملہ ہے۔ جس نے حزبِ اختلاف کو بھڑکا دیا۔ 4 نومبر کو ایک جلسے میں شرکت کے بعد ایک یہودی سپاہی نے گولی ماردی کچھ دیر بعد وہ مر گیا۔ مایوس کلنٹن وائٹ ہاؤس میں اخبار نویسوں کے سامنے آیا اور عبرانی میں جملے ادا کرنے والا پہلا صدر بن گیا ''Shalom and Chaver'' سلامتی ہو خدا حافظ میرے دوست۔

حقائق اور نظریات کا تصادم

اوہ! میں ایک ایسی سرزمین سے آیا ہوں، بہت دور کی سرزمین سے
جہاں اونٹوں کے غول پھرتے ہیں
جہاں وہ تمہارے کان کاٹ دیں گے
اگر وہ تمہارا چہرہ پسند نہیں کرتے
یہ بربریت ہے لیکن دیکھو یہ گھر بھی تو ہے۔

اس غیر متعلقہ نظم کے ساتھ والٹ ڈزنی نے اپنی دلچسپ کامیڈی "الہ دین" کی ابتدا کی ہے۔ یہ بھی "الف لیلہ" سے ماخوذ ہے۔ مشرق وسطی کے کلچر کے سخت رویوں پر روشنی ڈالنا کبھی نہ صرف امریکہ میں قابل قبول تھا بلکہ اسے قابل تعریف سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مشرق سے متعلق علوم کی اشاعت کے بعد اور سیاسی درستگی کے عمل میں ایسے شبہات عیر مناسب قرار دیے گئے۔ امریکہ میں موجود عرب گروپوں نے اسے اپنے کلچر کو نشانہ بنانے کی کوشش قرار دیتے ہوئے اس پر شدید احتجاج کیا۔ اس بار ڈزنی جھک گیا۔ گانا لکھنے والوں نے متنازعہ جملے نکال دیے۔ جو تھے کہ وہ تمہارے کان کاٹ دیں گے اگر وہ تمہارا چہرہ پسند نہیں کرتے۔ ان کی جگہ یہ جملے ڈال دیے۔ جو ہموار اور وسیع ہے اور جہاں بہت گرمی ہے۔ اگرچہ فلم سازی کی صنعت نے امریکہ میں موجود عرب، ترک اور ایرانی کلچر کے لوگوں کی توہین کرتے ہوئے ان کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں ڈالی گئی منفی باتوں کو پھیلانا جاری رکھا۔

مشرق وسطی کے متعلق قائم کیے گئے غلط تاثرات کے سبب مووی تھیٹر میں اختلاف وسیع ہوا۔ ساتھ ہی لائبریریوں اور لیکچر ہال میں یہی ہوا۔ مشرق وسطیٰ کے مطالعے کا شعبہ امریکہ میں نوے کی دہائی میں قائم ہوا۔ یہ شعبہ اب سو سے زیادہ یونیورسٹوں میں ہے۔ جو اس سے متعلقہ مضامین پر کورس کروا رہی ہیں۔ مشرق وسطیٰ سٹڈی ایسوسی ایشن جو 1966 میں قائم ہوئی۔ اس کا دعوی تھا کہ اس کے چھبیس سو سے زیادہ ممبر ہیں۔ ملٹی کلچرازم اور پوسٹ کالونی ازم کی بات کرتے ہوئے ان میں سے زیادہ اسکالرز نے امریکہ کی مشرق وسطی میں سیاست کے خلاف آواز اٹھائی۔ خاص طور پر انہوں نے اسرائیل کو اور عرب کے ان حکمرانوں کو جو اپنی ریاستوں پر مکمل کنٹرول رکھتے تھے سپورٹ کرنے پر امریکہ پر تنقید کی۔ انہوں نے PLO اور خطے میں موجود جمہوری اپوزیشن قوتوں کو سپورٹ کرنے پر زور دیا۔ بلکہ بعض صورتوں میں تہران اور شام میں موجو امریکہ مخالف لیڈروں کو بہادر قرار دیا۔ ایسے خیالات صرف مشرق وسطیٰ ڈیپارٹمنٹ ہی میں نہ تھے بلکہ ہیومینٹزم اور سائنس کی شاخوں میں ان میں بہت اضافہ ہوا۔ نوم چومسکی جو ایک MIT کے ماہر لسانیات اور دنیا بھر میں جانے جانے والے لبرل سوشلسٹ ہیں اور فلاڈلفیا میں یہودی والدین کے گھر 1922 میں پیدا ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکہ نے ظالم اور طاقتور حکومتوں کو سپورٹ کیا ہے۔ امریکہ کا موقف بہت واضح طور پر خطے کو طاقت سے کنٹرول کرنے کا ہے۔ اس سے باہر آنا چاہیں۔

برنارڈ لوئس کے خیالات کم سنے جاتے۔اس نے اسرائیل اور امریکہ کے تعلقات مضبوط کرنے پر زور دیا۔اس نے امریکہ مشرقی وسطیٰ میں نہ صرف جمہوری تبدیلی کی امید سمجھا بلکہ بہت بنیادی حثیت دی۔سیموئیل پی ہنٹنگٹن ان چند اسکالرز میں سے ایک تھا۔جس نے مشرق وسطی کے متعلق لوئس کی رجائیت پسندانہ تعریف کی حمایت کی۔اپنے 1993 کے کام Clash of civilizations میں خاموش مزاج اور الگ تھلگ رہنے والا ہینگٹن ایک ایسی دنیا کا تصور دیتا ہے جو کہ سرمایہ دارانہ اور کمیونزم نظام کی بنیاد پر تقسیم نہیں ہے۔لیکن جہاں مغرب کے زیادہ تر عیسائی مما لک اور مسلمان ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں۔مغرب کے لئے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں۔بلکہ Huntington کے خیال میں مغرب کو اصل چیلنج اسلامی تہذیب سے درپیش ہے۔اسلام ایک مختلف تہذیب ہے جس کے ماننے والے اپنے کلچر کو مغرب سے بلند سمجھتے ہیں اور مغرب کے مقابلے میں اپنی طاقت میں کمی سے کے متعلق پریشان ہیں۔لوئس کی طرح ہنٹنگٹن امریکہ کو اس اتحاد کو روکنے کے لئے اہم کردار ادا کرنے کا نہیں کہتا لیکن کہتا ہے کہ اس کے خیال میں اِمریکہ اس لڑائی سے سب سے زیادہ متاثر ہوگا۔

ہنٹنگٹن کا یہ مقالہ اس وقت درست ثابت ہوا۔جب دھماکہ خیز مواد سے بھری ایک وین ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے زیر زمین پارکنگ سنٹر میں داخل ہوئی۔ایک کویتی رمزی یوسف وین چلا رہا تھا۔لیکن بم ایک عراقی عبدالرحمٰن یاسین نے بنایا تھا جو مصر کے اندھے رہنما عمر عبدالرحمٰن کی ہدایات پر کام کر رہے تھے۔جو بروکلین میں واقع اپنی مسجد سے ایک انتہا پسند گروپ کی قیادت کر رہا تھا۔اس گروپ کے اسامہ بن لادن کی القاعدہ سے بھی تعلقات تھے۔نیویارک میں واقع امریکہ کی سب سے اونچی بلڈنگ کو گرا کر جو امریکی مہارت کی علامت تھی دراصل عبدالرحمٰن مغرب کے خلاف مقدس جنگ شروع کرنا چاہتا تھا۔رمزی نے تیرہ سو دس پونڈ وزنی بم کا فیوز اڑا دیا۔اور وہاں سے پیدل بھاگ گیا۔دوپہر کے وقت ہونے والے دھماکے نے جس میں کنکریٹ کی چار فرشوں کو ملانے والے نوے فٹ جگہ کو تباہ کر دیا گیا۔چھ لوگ مارے گئے جبکہ ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔چھ سازشیوں کو گرفتار کر کے دوسو چالیس سال کی مجموعی سزا سنا دی گئی۔

Twin Tower پر حملہ امریکہ پر پہلا بڑا دہشت گردانہ حملہ تھا۔لیکن اس سے امریکہ کو مشرق وسطیٰ سے ایک نیا خطرہ درپیش ہو گیا۔مرکزی حکومت نے اپنی تمام فوجی اور انٹیلی جنس قوت کو

متحرک کرنے سے اجتناب کیا۔ایک ماہ قبل بننے والی بل کلنٹن انتظامیہ دہشت گردی کا ایک جرم کی حیثیت سے مقابلہ کرنے کے لئے پرعزم تھی۔نہ کہ اسے قومی سلامتی کے لئے خطرہ قرار دے کر اس کا مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔صدر کا مسلم جنگجوؤں کا مقابلہ میدان میں نہ کرنے کا فیصلہ 1993 میں اس وقت درست ثابت ہوا جب بلیک ہاک گرنے سے اٹھارہ امریکی فوجی مارے گئے۔جب وہ ایک صومالی وار لارڈ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔آٹھ ماہ قبل سفید فام نسل پرستوں کے ہاتھوں اوکلاہامہ سٹی میں مارے جانے والے ایک سو اڑسٹھ لوگوں نے کلنٹن انتظامیہ کے عزم کو مضبوط کیا کہ دہشت گردی کا مقابلہ پولیس افسر کریں گے نہ کہ فوجی۔کلنٹن نے لکھا کہ مجھے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کام سے خوشی ہوئی ہے۔لیکن اپنی سوسائٹی کے دہشت کے سامنے خوفزدہ ہونے کا دکھ ہے۔

رہوڈ کے اسکالر، لا پروفیسر اور ارکنساس کے گورنر کے طور پر کام کرنے والے کلنٹن کو خارجہ امور کا بہت کم تجربہ تھا۔اور مشرق وسطی کے معاملات کی بھی زیادہ جانکاری نہیں تھی۔کلنٹن جانتا تھا کہ 1992 میں بش کی شکست عراق میں مصروف ہونے اور عرب اسرائیل تنازعہ پر غور و فکر کا اور داخلی امور پر توجہ نہ دینے کا نتیجہ تھا۔اور امریکی جو کہ ترقی کا ایک بظاہر نہ ختم ہونے والے عرصے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔انہوں نے صدر کی اندونی معاملات میں توجہ کی پالیسی کا خیر مقدم کیا۔وہ کلنٹن کے اس خیال سے متفق تھے کہ دہشت گردی کو صرف جہالت اور غربت کے خاتمے سے ختم کیا جا سکتا ہے جو کہ اس کی پرورش کرتے ہیں۔اور دہشت گردی کی حمایت کرنے والی ریاستوں کو الگ کر دینا چاہیے۔القاعدہ اور دوسرے انتہا پسند گروپوں سے لاحق خطرات کا میدان جنگ میں مقابلہ کر کے ان کو کم کرنے کی بجائے امریکہ کے لوگ صدی کا آخری اور خوش کن عشرہ بھرپور انداز سے گذارنا چاہتے تھے۔

مشرق وسطی میں کلنٹن کی پالیسی اہم فوجی اور سفارتی فیصلوں سے اجتناب کی تھی جبکہ خلیج فارس میں حالات کو جوں کا توں رکھنا تھی۔اگرچہ دوطرفہ گھیراؤ کی پالیسی کے تحت امریکہ نے ایک طرف عراق اور ایران پر پابندیاں لگا دیں اور ساتھ ہی صدام حسین پر دباؤ بڑھانا جاری رکھا۔نو فلائی زون جس کے تحت عراقی طیاروں کو کرد اور شیعہ علاقوں پر اڑنے کے اجازت نہ تھی بنانے کے علاوہ کلنٹن نے دو مرتبہ عراق پر میزائیل حملے کرنے کا حکم دیا۔پہلی بار 1993 میں صدام کی طرف

سے سابق صدر بش کو قتل کرنے کی کوشش پر اور دوسری مرتبہ اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹروں سے تعاون نہ کرنے پر۔ کلنٹن اسلحہ انسپکٹروں کا بڑا حامی تھا جو عراق میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار بے نقاب کر رہے تھے۔ اس کے خیال میں عراق کی حکومت دراصل دہشت گردی، منشیات کی اسمگلنگ کرنے والوں اور عالمی مجرموں کا ایک گروہ تھا۔ اور اگر ان کو نیوکلئر، کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحہ تیار کرنے دیا گیا تو یہ بہت خطرناک ہو جائے گا۔

کلنٹن نے امریکی مفادات کو مشرق وسطیٰ میں محفوظ بنانے کے امن کی بحالی کو ذریعہ بنانا چاہا۔ سوویت خطرہ اب نہیں رہا تھا اور نہ ہی قوم پرست موجود تھے۔ بم دھماکوں میں امریکہ میں کئی جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ لیکن مسلم بنیاد پرستوں سے لاحق خطرات کا مقابلہ انتہائی احتیاط سے کیا گیا۔ کلنٹن نے اسرائیل اور عربوں کے درمیان ثالثی کروانے کو خاص ضروری نہ سمجھا۔ وہ ایک بپتسٹ تھا اور پاسٹر نے اسے بچپن میں ہی بتا دیا تھا کہ اگر اس نے اسرائیل کی حمایت نہ کی تو خدا اسے معاف نہیں کرے گا۔ چنانچہ کلنٹن یہودی ریاست سے دوستانہ تعلقات چاہتا تھا۔ اور لاحاصل امن عمل پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ صورتحال جاری رہتی اگر اسرائیلی وزیراعظم رابن اسے 9 ستمبر 1993 کو فون کر کے نہ بتاتا کہ اسرائیل اور PLO کئی دہائیوں سے جاری خون خرابے کے بعد ایک خفیہ معاہدے پر پہنچ گئے ہیں۔

اگرچہ امریکہ کو فلسطینی تنظیم کے ساتھ مذاکرات کے ساتھ تعلقات بھی پھر سے شروع کرنا تھے لیکن اسرائیلی وزیراعظم رابن نے ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں عرفات کی تنظیم سے واضح طور بات چیت شروع کر دی۔ اب جبکہ سمجھوتہ تیار ہو چکا تھا۔ رابن اور عرفات اس پر صدر کے دستخط بھی چاہتے تھے۔ اس بات سے ناخوش کہ دونوں فریقوں نے اس سے مشورہ نہ کیا لیکن کلنٹن اس بات سے خوش تھا کہ اسے معاہدے کی سرپرستی کرنا ہے۔ عوام کے سامنے دستخطوں کے لئے جو صرف چار دن بعد وہائٹ ہاؤس میں ہونا تھے فوری اور شدید تیاریاں شروع تھیں۔ صدر کی ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ دونوں رہنماؤں کی ملاقات میں شرکت یقینی بنائے اور عرفات اسرائیل کے وزیراعظم کو بوسہ دینے کی کوشش نہ کرے۔ کلنٹن نے تقریب سے پہلے کی رات بغیر سوئے گذاری۔ وہ ساری رات یشوع کی کتاب پڑھتا رہا۔ جو یہودی معرکہ آرائیوں کی داستان تھی۔ اگلی صبح کلنٹن نے بہت شوخ ٹائی باندھی جس پر دو قرنے (ناد) بنے ہوئے تھے جو یشوع کی

یاد دلاتے تھے جنھیں بجا کر اس نے اریحا شہر کی دیوار گرائی تھی۔ اب یہی ناد قائم ہونے والے امن کی خبر دے گا۔ اور اریحا شہر فلسطین کو مل جائے گا۔ اگلے دن ہزاروں عربوں، اسرائیلیوں اور امریکی خیرخواہوں کی موجودگی میں تمتماتے کلنٹن نے کارٹر کی یاد تازہ کرتے ہوئے تین طرح سلام کیا Shalom,Salam,Peace اور دستخط کرنے والوں سے کہا امن قائم کرنے والوں کے طور پر آگے بڑھو۔

سادات اور بیگن کی طرح عرفات اور رابن کو بھی نوبل امن پرائز مل جاتا لیکن جن اصولوں کے اعلان پر انھوں نے دستخط کئے وہ کسی بھی قسم کے معاہدے سے دور کی بات تھی یہ اسرائیل اور P.L.O کو کسی قسم کی باہمی پہچان دینے، دہشت گردی کم کرنے، یا فلسطینیوں کو دھیرے دھیرے حقوق دینے سے قاصر تھا۔ اس میں اوسلو معاہدے کا بھی ذکر نہیں تھا کہ کب اسرائیلی غزہ اور مغربی کنارہ خالی کریں گے اور یہ علاقے کیسے عرب حکمرانی میں آئیں گے۔

یروشلم پر دونوں فریقوں کا دعوی تھا کہ یہ ان کا دارالحکومت ہے ہزاروں پناہ گزین اور ان کی نسلیں جو پوری دنیا میں پھیل چکی تھیں ان کے بارے میں فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا۔ اسرائیلیوں نے اس ابہام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی علاقوں میں اپنی آبادکاری میں وسعت پیدا کرنا شروع کر دی۔ جب کہ عرفات اور فلسطینی اتھارٹیز اوسلو معاہدے کی رو سے دہشت گردی ختم کرنے اور فلسطینیوں کو امن کی تعلیم دینے کی بے ترتیب کاوشیں کرتے رہے۔

شیمون پیریز جو سابقہ وزیر خارجہ اور اوسلو معاہدہ کا بنیاد گزار تھا۔ رابن کی جگہ صدر بنا، اور امن کا عمل بحال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مسلسل بمباری نے اسکی کوششوں کو سبوتاژ کر دیا۔ اور 1996ء میں یہ کوششیں امن کے انتخاب ہارنے کا سبب بن گئیں۔ ایم آئی ٹی کا تعلیم یافتہ رہنما نیتن یاہو جیت گیا۔ اسرئیل میں دائیں بازو کی حکومت اور بد دیانت اور پھوٹ کا شکار فلسطینی اتھارٹیز کے ملاپ کی وجہ سے کلنٹن کو بہت زیادہ توانائیاں صرف کرنا پڑیں۔ ان توانائیوں کی وجہ سے 1998ء میں ایک اور عبوری معاہدہ ہوا جس کے مذاکرات میری لینڈ وائی پلانٹیشن میں ہوئے۔ جس میں اسرائیل نے مزید علاقہ لے لیا۔ اور امن کے لیئے مزید ضمانتیں لے لیں۔ اس وقت فلسطین اسرائیل امن کے حصول کی کوششیں اس ضرورت سے ایک طرف رکھ دی گئیں کہ امریکہ کو اپنا دفاع مقصود تھا۔

دو سال بعد سات اگست 1998ء میں تونس اور کینیا مین امریکی سفارت خانے میں دھماکے کیئے گئے۔ جس میں دوسو چوالیس لوگ مارے گئے اور چار ہزار زخمی ہوئے۔ امریکی پرچم میں لپٹے ہوئے لاشے جب امریکیوں کو موصول ہونے لگے تو پُرمسرت بن لادن نے ایک نئی تنظیم یہودیوں اور صلیبیوں کے خلاف انٹرنیشنل اسلامک فرنٹ فار جہاد کا اعلان کیا۔ اور امریکہ کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کر دیا' کسی بھی ملک میں اس نے حکم دیتے ہوئے کہا کہ جو مسلمان امریکیوں اوران کے جہادیوں کو قتل کرے گا اسے نوازہ جائے گا۔ چاہے وہ عام شہری ہو یا فوجی ہو۔

امریکی انٹیلی جنس ایجنسیاں اس بات کی قائل تھیں کہ القاعدہ بہت جلد امریکہ پر بڑا حملہ کر سکتی ہے۔ پھر بھی کلنٹن کا اس پر ردعمل بہت کم تھا۔ فورڈ انتظامیہ کی سیاسی قتل پر پابندی میں جکڑے ہوئے صدر نے بن لادن کو قتل کرنے کی بجائے زندہ گرفتار کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اور مصر اور افغانستان میں اپنے ایجنٹوں کو اس سے باہر نکالنے کے لئے حوصلہ دیا تھا۔ اس دوران میں امریکی فوجیں کسووو میں، سربوں سے البانیہ کے باشندوں کو بچانے کے لئے بلغراد پر بمباری میں مصروف تھیں۔ کلنٹن کو یقین تھا کہ عوام مشرقِ وسطی میں بڑے حملے کی حمایت نہیں کر سکتے ہیں۔ کانگریس کی طرف سے کلنٹن پر وائٹ ہاؤس میں وقت گزار کر دیر کرنے کی کوشش کا الزام لگایا گیا۔ سیاسی اور آئنی پابندیوں میں جکڑے صدر نے افغانستان میں القاعدہ کے تربیتی مرکز اور سوڈان میں فارموسیوٹیکل فیکٹری پر کروز میزائل سے حملہ کرنے کا حکم دیا تا کہ سفارت خانے پر بمباری کا جواب دیا جا سکے۔ کلنٹن نے زور دیتے ہوئے کہا کہ امریکی جنگ کا مقصد اسلام کو نہیں بلکہ بدمعاشوں اور قاتلوں کو نشانہ بنانا ہے۔ اور اس کے لیے طویل جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ پھر بھی کلنٹن کے ناقدین نے اس ردعمل کو کلنٹن کی اپنے مواخذے سے توجہ ہٹانے کی کوشش قرار دیا اور دہشت گردوں کی طرف سے اسے کمزوری کی علامت سمجھا گیا۔ بن لادن اس حملے سے صاف بچ نکلا اگرچہ میزائلوں نے سوڈانی کیمپ کو تباہ کر دیا اور وہاں سے کسی قسم کے زہریلے نشانات نہ مل سکے۔

آٹھ برسوں کے صدارتی اختتام پر کلنٹن خوف زدہ لیکن مشرق وسطیٰ کے ماہر کے طور پر سامنے آیا۔ جب بھی ممکن ہوا، کلنٹن نے اسلامی انتہا پسندوں کے خلاف فوجی قوت استعمال کرنے سے گریز کیا۔ لیکن پھر بات عیاں ہوگئی کہ اسلامی انتہا پسند اپنی جنگ امریکہ تک لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اپنی اعلیٰ اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اسرائیل اور فلسطین کا امن چاہتے تھے۔ اگرچہ

بار بار ہزیمت ان کے حصے میں آئی۔ امریکی ریاستوں اور جابر عرب حکومتوں کا اتحاد خاص طور پر خلیج فارس میں، پہلے سے زیادہ مضبوط تھا۔ اگرچہ مشرق وسطیٰ میں امیر وغریب کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ کلنٹن کا اصل میں امریکی اور مشرق وسطیٰ کے لوگوں کو جوڑنے کا مقصد تمام تنازعات کا حل ڈھونڈنا تھا لیکن 1999ء کے آخر تک یہ مقصد سرد معاشی اعداد وشمار اور قابل حل تضادات کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ مشرق وسطیٰ میں کلنٹن کا تجربہ مایوسی اور دکھ کا تھا اور عقیدے اور قوت کی ناکامی تھی۔

اوسلو معاہدے کو بچانے کی آخری کوشش کے طور پر کلنٹن نے نئے اسرائیلی وزیراعظم ایہود باراک، جو بائیں بازو کا سابقہ کمانڈو تھا، کی امن معاہدے پر عرفات سے مذاکرات کی درخواست مان لی۔ یہ مذاکرات جولائی 2000ء میں کیمپ ڈیوڈ میں ہوئے۔ اپنی مدت کے خاتمے سے چھ ماہ پہلے کلنٹن نے دونوں کے درمیان حائل فاصلے کو کم کرنے کے لیے دو ہفتے تک کوشش کی۔ امریکی اور اسرائیلی شمولیت کاروں کے مطابق فلسطینیوں کو 90 فیصد آزاد ریاست دینے کی پیشکش کی گئی، جو بعد میں بڑھتے ہوئے 95 فیصد تک آ گئی۔ اس 95 فیصد میں مغربی کنارا، غزہ پورا، اور یروشلم کا آدھا مشرقی حصہ شامل تھے۔ اسرائیلیوں کو 1967ء کی سرحد سے منسلک بلاکس کو مضبوط کرنا تھا۔ اور فلسطینی پناہ گزینوں کو مراعات ملنا تھیں لیکن عرفات نے کہا کہ باراک اور کلنٹن نے مغربی کنارے میں چاروں طرف سے گھرے ہوئے غیر ضروری علاقوں کی پیشکش کی ہے اور حرم شریف سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ یہودی حرم شریف کو ماؤنٹ ٹیمپل کہتے تھے جس میں مغربی دیوار بھی شامل تھی۔

کلنٹن کی تجاویز پناہ گزینوں کو وطن مہیا کرنے میں ناکام ہوگئیں۔ عرفات کیمپ ڈیوڈ سے رخصت ہوتے ہوئے کلنٹن کو سلام کرنے کی خاطر گھڑی بھر رکا اور اس کی عظمت کو سراہا۔ کلنٹن نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "میں ہرگز عظیم نہیں، ایک ناکام شخص ہوں اور یہ تمہاری وجہ سے ہوا۔"

آنے والے ستمبر میں، ایریل شیرون، جو اسرائیل حزب اختلاف کا سربراہ تھا، نے ماؤنٹ ٹیمپل کا دورہ کیا تو فلسطینیوں نے حرم شریف میں مسجد اقصیٰ کو گرانے کا الزام لگاتے ہوئے، دوسری بار انتفاضہ کیا۔ پہلی بار جو بغاوت ہوئی تھی وہ غیر متشدد تھی۔ اس بغاوت میں خودکش بمبار بھی شامل تھے جنہوں نے لوگوں کی جانیں لے لی تھیں۔ اسرائیلیوں نے جوابی کارروائی کے طور پر فلسطینی اتھارٹیز کی عمارتوں پر بمباری کی اور مغربی کناروں کے شہر خالی کروا لیے اور کئی عسکری رہنماؤں کو

قتل کر دیا۔ یہ قتل و غارت اسرائیل-فلسطین امن کے لیے اس خیال کو تقویت دینے کا باعث بن گئی کہ اب پورا خطہ اس خونریزی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ کلنٹن نے اپنی صدارت کے آخری ہفتوں میں جنگ روکنے اور دوبارہ مذاکرات کے لیے سر توڑ کوششیں کیں۔ سیکریٹری آف سٹیٹ میڈلین البرائیٹ اپنے اونچی ایڑی کے جوتے کھنکھناتی، پیرس میں امریکی سفارت خانے میں، عرفات کے پیچھے دوڑی۔ وہاں مذاکرات ہونا تھے۔ اس نے چیخ کر محافظوں سے کہا ''دروازے بند کر دو''

جلد ہی تمام امریکی صدارتی انتخابات میں مصروف ہو گئے اور ان معاملات پر توجہ نہ دے سکے۔ جو تھوڑی بہت توجہ مشرق وسطیٰ پر تھی، القاعدہ کے خودکش حملہ آور کی وجہ سے ختم ہو گئی، جس نے 12 اکتوبر کو ''کول'' (Cole) نامی امریکی جہاز سے کشتی ٹکرا دی، جو یمنی بندرگاہ پر لنگر انداز تھا۔ 17 ملاح مارے گئے اور 34 لوگ زخمی ہوئے۔ جارج ٹینٹ نے افسوس کے ساتھ کہا کہ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ میں اس کوشش میں کسی آدمی کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے کچھ ہم وطن مایوس ہوئے کہ حکومت نے دہشت گردی کی جنگ کے اعلان سے پرہیز کیا ہے۔ ''کول'' میں تقریباً 60 فٹ گہرا سوراخ بن گیا جو امریکی حکومت کے اس خلا کی علامت تھا جو مشرق وسطیٰ کے حوالے سے جنگی لائحہ عمل میں تھا۔ ولسن، کینیڈی اور کارٹر کی تقلید میں کلنٹن نے جنگ کے بجائے اپنے مثالی خیالات کو ترجیح دی۔ لیکن ان کی تمام پالیسیاں، امن کے حصول اور دہشت گردی روکنے میں ناکام ہو گئیں۔ امریکہ نے ''کول'' پر حملے کا کبھی جواب نہ دیا۔ یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ افغانستان میں اب حکومت خالص مذہبی طالبان کی تھی اور وہاں القاعدہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

آتش گیریت

امریکہ میں اکیسویں صدی کے ظہور نے جہاں اس کی مستقبل کی امنگوں کو ابھارا وہاں کئی مباحث کو بھی جنم دیا۔ جن میں آزاد تجارتی سرمایہ بمقابلہ فلاحی ریاست، توانائی کی طلب بمقابلہ ماحول کو محفوظ رکھنے کی امنگ، اور حکومت اور کلیسا کے درمیان تعلق کے مباحث شامل تھے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکی مداخلت، اسرائیل کے ساتھ ملکی اتحاد، بڑی تجارت اور عرب تیل کے بندھن پر سب سے زیادہ اختلافات کھل کر سامنے آئے۔ ان کے مقابلے میں انتہا پسندوں کی طرف سے

مسلط کردہ خطرات اور امریکہ کے اپنے دفاع کے حوالے سے بہت کم بحث تھی۔ امریکی اس وقت گھر پر دہشت گردوں کے حملوں کے بجائے Y2K بک کے کمپیوٹرز پر اثرات کے حوالے سے احتجاج کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ جس طرح ماضی میں 1789ء میں مشرق وسطیٰ کے قزاقوں کے نئے بننے والے ملک کے ساحلوں پر حملوں کے خوف سے امریکیوں کو قانون سازی کرنے اور امریکہ کو متحد کر دیا۔ لیکن 2000ء میں امریکہ پر ایک بڑا دہشت گردانہ حملے کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی کیونکہ امریکی اس وقت بنیادی مسائل پر جھگڑ رہے تھے۔

امریکہ کے خلاف دہشت گردی پہلے سے موجود تھی اگرچہ اس کا منصوبہ اسامہ بن لادن کے ذہن میں تھا۔ وہ پہلے ہی ایک نئے حملے کی اجازت دے چکا تھا، جس میں اس کے مخفی گروہوں کو متحرک کیا جاتا، جو امریکہ کے ہوائی جہاز اغوا کرتے اور انہیں بڑی تجارتی اور سرکاری عمارتوں سے ٹکرا دیتے۔ جس کی زیادہ تر امداد سعودی عرب اور خلیج فارس سے ہوتی تھی۔ کم از کم 19 دہشت گرد امریکہ کے شہروں میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور وہاں اپنی نئی شناخت قائم کی، اور بعض لوگ تو ہوائی تربیت کے لیے داخلہ لینے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

القاعدہ کے عسکریت پسندوں کی طرف سے سی آئی اے کو مختلف قسم کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ جارج ڈبلیو بش نے دہشت گردی کا مقابلہ کرتے ہوئے دفتر سنبھالا، لیکن اس نے امریکی دفاع کے لیے فقط چند اقدامات کیے۔

وائٹ ہاؤس، یمن کو، کول جہاز کے حملہ آوروں کو گرفتار کرنے کے لیے، قائل کرنے میں زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوا اور سعودی حکمرانوں پر دباؤ ڈالتا رہا کہ وہ امدادی پیسے کی ترسیل کو بند کریں۔ مراکش سے تعلق رکھنے والا فرانسیسی شہری Zacarias Moussaui کو اگست 2001ء میں منی سوٹا پائلٹ سکول سے گرفتار کیا گیا اور اس سے 747 نامی فلائٹ کے اوقات برآمد ہوئے۔ تب بھی انتظامیہ نے بہت کاہلی کا مظاہرہ کیا۔ بش نے امریکی سفارتخانوں کو ہوشیار کیا اور افغانستان میں بن لادن پر میزائل برسانے کے منصوبے کی منظوری دی۔ لیکن ملکی دفاع کو مزید بہتر کرنے سے انکار کر دیا۔ سب سے بڑی ناکامی ہمارے تصور کی تھی۔ ہمیں اس بات پر یقین نہیں ہے کہ رہنما، خطرے کی سطح کو سمجھتے تھے۔

امریکی لوگوں کو خود خطرے پر قابو پانا چاہیے تھا۔ دہشت گردانہ حملے، جو Cole کے ساتھ ختم

ہوئے، جہازوں کا اغوا، اور 1970ء کے اوّلین میں قتل عام، امریکیوں کے لیے حقیقت بن چکے تھے۔ اس حقیقت کا عکس فلموں میں بھی آنے لگا۔ 1998ء کی The Siege نامی فلم جس میں اسلامی بمبار نیویارک کو پامال کر دیتے ہیں۔ Three Kings نامی فلم میں ایک بچہ عراقی جنسی کج روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیوس اور ہنٹنگٹن کے قائم کردہ مشرق وسطیٰ ے بارے میں عکس بہت مؤثر اور سرایت کرنے والے تھے۔ اپنی فوج پر اعتماد تھا لیکن امریکی یہ سمجھنے میں دشواری محسوس کر رہے تھے کہ کس طرح سعودی عرب، مصر اور لبنان سے غیر تربیت یافتہ لوگوں کا دھڑا ان کے ملک میں داخل ہو سکتا تھا اور ان کے نمایاں ممتاز شہر اور دارالحکومت پر حملہ کر سکتا تھا۔ کچھ لوگ ایڈورڈ سعید اور چومسکی کے نظریات سے متاثر، اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ عربی اور ایرانی، امریکیوں کے خوف سے بہت دور ہیں، دیگر کئی لوگ خود کو ابھی تک اساطیر سے بہلاتے تھے۔ لاکھوں امریکی 2000ء میں بننے والی فلم The Arabian Nights کی سنسنی میں مبتلا تھے، جس مُں شہرزاد، علی بابا، سندباد جہازی کے کردار بھی تھے۔ اس فلم کے کئی ناظرین اس بات پر حیران تھے کہ اتنی پُراسرار زمین کے باسی، قالین کے بجائے جہاز اڑانے والے، امریکہ پر کیوں حملہ کریں گے، جس نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

وہ 11 ستمبر 2011ء کی صبح تھی اور 8:46 بجے تھے۔ اس لمحے لاس اینجلس جانے والا طیارہ، جس پر القاعدہ کے دہشت گردوں کا قبضہ تھا، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے شمالی ٹاور سے ٹکرا گیا۔ اس میں 99 لوگ سوار تھے اور اس میں دس ہزار گیلن تیل تھا۔ عمارت کے دونوں طرف سے سرخ شعلے اٹھنے کا نظارہ، منوں گرد و غبار، ذی روح اور غیر ذی روح نیچے گلیوں میں جمع تھے۔ اس سے امریکی یادداشت کا خاتمہ ممکن تھا۔ یونائیٹڈ ایئر لائنز کا اغوا شدہ طیارہ 175، جو سترہ منٹ بعد جنوبی ٹاور سے ٹکرا گیا، نے بھی اسی طرح کا نظارہ دکھایا۔

اس حادثے سے چند لمحے پیشتر ایک مسافر نے اپنی بیوی کو پیغام بھیجا ''جس قدر ممکن ہو اچھی زندگی گزارنا۔ مجھے تم سے شدید محبت ہے۔ ہم دوبارہ ملیں گے۔'' آدھے گھنٹے سے کم وقت میں ایک سویلین ایئر لائنز کا تیسرا طیارہ واشنگٹن میں پینٹا گان کی عمارت سے ٹکرا گیا۔ ایک چوتھا طیارہ، جسے غالباً وائٹ ہاؤس سے ٹکرانا تھا، مسافروں کی مداخلت کی وجہ سے پنسلوانیا کے کھیتوں میں جا گرا۔ 10:30 تک Twin Towers تباہ ہو چکے تھے۔ موت کی طرح سفید دھوئیں اور گرد و

غبار نے Manhattan کے جنوبی حصے کو چھپا دیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے دو سو سال پہلے U.SS. Essex نامی جہاز مشرق وسطیٰ کی طرف جنگ کے لیے روانہ ہوا تھا۔

تقریباً 3000 امریکی مارے گئے۔ قوم کی تاریخ کا سب سے بڑا قتل عام تھا۔ پہلا ردعمل حیرت زدگی کا تھا۔ اغوا کاروں اور ان کے عزائم کے بارے میں ابہام پھیل گیا۔ کیا دہشت گرد دھڑے ابھی موجود ہیں اور ان کا اگلا ہدف کیا ہوگا۔ ''The Siege'' بحری جہاز کی طرح سکیورٹی فورسز نے تمام فلائٹس زمین پر اتار لیں۔ ہزاروں عرب اور امریکی مسلمان نکال دیے گئے۔ قومی اثاثے کی سخت نگرانی شروع ہو گئی۔

اگر ابتدائی دور کے امریکی لوگ ہوتے تو حملے کے ردعمل میں تمام مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے اور اسلام کے خلاف جنگ کا اعلان کرتے۔ ہنٹنگٹن کی پیش گوئی کے مطابق تہذیبوں کے تصادم کی اس سے بہتر تصویر کشی نہیں ہو سکتی تھی جس طرح جہازوں کے ٹکرانے سے ہوئی۔ لیکن امریکی اس وقت پُرامن مسلمانوں کے ساتھ ساتھ 9/11 حملوں کے قاتلوں سے بھی نفرت کرتے تھے۔ ٹام کلیسنی ناول نگار جو طیارے ٹکرانے کے حوالے سے ایک سائنسی ناول لکھ چکا تھا، نے اس صبح سی این این کو بتایا ''اگر یہ اسلامی انتہا پسند ہیں تو انہوں نے اپنے مذہب کو ذلیل کر دیا ہے۔ اسلام کسی کو خودکشی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس قسم کے کام سے تم سیدھے دوزخ میں جاتے ہو۔'' حقیقت یہ ہے ٹام کلینسی دہشت گردی کے ایک ماہر سے مشورہ کر چکا تھا، اس درجے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ امریکہ کی مشرق وسطیٰ کے بارے میں جو فہم تھی، اس میں حقیقت اور داستان خیالی اب مدھم ہونے لگی تھی۔ وائٹ ہاؤس نے اس بات پر زور دیا کہ قوم کے دشمن اسلامی مذہبی جنونی ہیں نہ کہ مسلمان یا اسلامی عقیدہ ہے۔

امریکہ ناقابل تردید طور پر حالت جنگ میں تھا۔ فوری سوالات جو ابھرے وہ یہ تھے، امریکی کس کو، کیسے، کہاں جواب دے۔ ان سوالات کو صدر نکھار سکتا تھا، ایک ایسا شخص جو مشرق وسطیٰ سے جڑا ہوا تھا۔ امریکی، اپنی خاندانی اقدار، اپنے بنیادی سماجی، معاشی پالیسیز کے دفاع کے لیے اور صدر رفاحی اور ماحولیاتی مسائل اور اپنی سادہ رحم دلی کے لیے تیزی اور اناڑی پن کی وجہ سے معتوب کیا گیا۔ تاہم 9/11 کے حیران کن انجام پر امریکیوں نے جارج ڈبلیو بش کو گھیر لیا اور قیادت کے لیے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی بھی دوسرے مابعد جنگ کے صدر سے کہیں زیادہ،

صدر بش نے مشرق وسطیٰ کے ساتھ تعلقات کا ازسرِ نو تعین کیا۔

ٹیڈی روز ویلٹ کے پانچویں کزن فرینکلن کی طرح، بش بھی تیل کی قدر و قیمت سے واقف تھا اور خاص طور پر سعودی عرب میں تیل دینے والوں کو الگ کرنے میں ہچکچاتا تھا۔ یہاں اس نے امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے درمیان تجارت پر کسی خدشے کا اظہار کیا اور اپنے باپ کے امریکی کارپوریشنز کے ساتھ تعلقات جو وہاں کاروبار کر رہی ہیں، قائم رکھے۔ بڑے جارج ایچ ڈبلیو بش نے طرز حکومت کو محدود کر دیا تھا لیکن جونیئر بش سیاسی طور پر زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والے کلیساؤں کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا۔ اس بات نے اسے روحانی وارث کر دیا۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ پروفیسر جارج بش کا وارث تھا جس نے 1840ء میں یہودی ریاست کی وکالت کی تھی، جو کالونیل اخلاقی مفکر تھا جس نے اسلامی عسکریت پسندی کے خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ غیر ارادی طور پر اسلامی دہشت پسندی کے خلاف بش نے اپنی کوشش کو، برائی کرنے والوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کو صلیبی جنگ کہا۔ اس مذہبی جوش کے ساتھ صدر نے نو بنیاد پرستوں کے سیکولر شوق کی تائید کی تھی۔ ان میں سے کئی سابقہ آزاد پسند، اسرائیل کے بائیں بازو کی سیاست ترک کرنے اور اسرائیلی جرائم پر اس کی نرمی سے ناراض تھے اور جو مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے ذریعے تبدیلی کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ بش کے دماغ میں مقدس اور شہری مقاصد نے اسے ولسن کی روایت پر مضبوطی سے قائم رکھا۔ لیکن اس غیر عقیدے نے ولسن کو مشرق وسطیٰ میں جنگ و جدل سے منحرف کیا تھا لیکن بش کو جنگ کے حق میں فیصلہ کرنے کا حوصلہ دیا۔

امریکی جنگ کی جگہ کا انتخاب کیمپ ڈیوڈ 15 ستمبر کو کیا گیا۔ ڈپٹی سیکرٹری آف ڈیفنس پال شلٹز، جو نمایاں نو بنیاد پرست تھا، نے عراق کے خلاف جوابی حملے کے لیے دھڑے بندی کی۔ اسے یقین تھا کہ القاعدہ کے عراق سے رابطے ہیں۔ لیکن کولن پاؤل، جو اب سیکریٹری آف سٹیٹ تھا، اس نے نائب صدر ڈک چینی اور نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر کنڈولیزا رائس کا ساتھ دیا اور افغانستان کو جنگی میدان بنانے کی سفارش کی، جہاں طالبان نے بن لادن کو چھپا رکھا تھا۔ بش نے کولن پاؤل سے اتفاق کیا اور دس سال پہلے، جو اس کے باپ نے عالمی اتحاد قائم کیا تھا، اس کی نقل کرنے چل پڑا۔ افغانستان کو جنگ اور دہشت سے نجات دینا عالمی کام ہوگا بجائے اس کے کہ یہ امریکی کلیسائی مہم بنے۔

افغانستان میں طالبان کے زیر تسلط علاقوں پر ہوائی حملے 9/11 ایک ماہ کے بعد ہوئے۔ امریکی جیٹ طیاروں نے طالبان مخالف قوتوں شمالی اتحاد کو زمینی مدد دی، جب انہوں نے کابل، جلال آباد اور قندھار جیسے بڑے شہروں کا رخ کیا۔ نومبر کے اختتام تک امریکی فوجی افغانستان میں جنگ کر رہے تھے اور طالبان کے ٹھکانوں کو تباہ کر کے ان کی مزاحمت ختم کر رہے تھے۔ اور پاکستانی سرحد کے ساتھ منسلک پہاڑوں میں بن لادن کو ڈھونڈ رہے تھے۔ بش نے اٹھارہ قوموں بشمول برطانیہ اور فرانس کو قائل کر لیا کہ وہ اس مہم میں اپنے فوجی دستے بھیجیں تا کہ مابعد جنگ افغانستان کی ازسرِ نو تعمیر کر سکیں۔ اگرچہ اسامہ بن لادن ہاتھ آتے آتے بچ گیا لیکن طالبان گوریلے ناقابل رسائی مورچوں سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ اب جنگ کے فوجی مراحل مکمل تھے۔ امریکہ دوبارہ سے اپنے عقائد پر توجہ دے سکتا تھا۔ امریکیون نے افغانی قانون سازی میں معاونت کی اور تاریخ میں پہلی بار انتخابات میں خاتون پارلیمنٹ کی ممبر بنی۔

افغانستان کی آزادی کو 9/11 کے حملے کے انتقام کی ضرورت کے مطابق کیا جا سکتا تھا لیکن بش اس بات کا قائل تھا کہ امریکہ طویل المیعاد دہشت گردی میں الجھ گیا تھا اور اسے بمشکل کامیابی ملی ہے۔ لیکن اس اقدام کو برقرار رکھنا ہے، کسی کو حد میں اور باز رکھنے والی پرانی پالیسیاں جو پہلے مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین کے خلاف اور بعد میں ایران اور عراق کے خلاف استعمال کی گئیں، اب کسی بھی طرح امریکہ کے اندر دہشت گرد دھڑوں اور انسانی تباہی کے ہتھیار تیار کرنے والوں سے مقابلہ کرنے کے لیے صائب نہیں رہی تھیں۔ ٹرومین، آئزن ہاور اور کارٹر کی تقلید کرتے ہوئے بش نے بھی ایک نیا اصول وضع کیا۔ اب امریکہ انتظار نہیں کرے گا بلکہ کسی بھی تنظیم یا ملک کی طرف سے دہشت گردی میں ملوث ہونے یا فروغ دینے کی صورت میں پورا ردعمل ظاہر کرے گا۔ حقِ شفع کا طریقہ کار جس کی جانسن اور نکسن نے مخالفت کی تھی، جب اسرائیل نے اسے اپنایا تھا، اب امریکہ کی پالیسی بن گیا تھا۔ امریکہ اب اپنی توانائیاں مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے لیے وقف کرے گا، کیونکہ یہ اصولی معاملہ اور نفرت اور اجڈ پن کو ختم کرنے کا بہترین ذریعہ تھا جس سے دہشت گردی جنم لیتی تھی۔ بش نے یہ بات ویسٹ پوائنٹ میں 2002ء میں گریجوایشن کرنے والے طلبا سے کہا: ''ہم دوسروں کے لیے بھی وہی کرنا چاہیے ہیں جو تشدد سے تحفظ، آزادی کا ثمر اور بہتر زندگی کی امید اپنے لیے چاہتے ہیں۔'' ایک دفعہ پھر امریکی، مشرق وسطیٰ کو اپنے تصور کے

مطابق تشکیل دینے کی خواہش کر رہے تھے، اس بار ابتدا عراق سے ہوئی۔

صدام اور بن لادن کے درمیان تعلق کا ثبوت بہت کم تھا لیکن بش نے اپنے اصول کو عراق میں آزمانے کا عزم کیا۔ اس کے پاس وجوہ کی کمی نہیں تھی۔ صدام نے 1993ء میں بش کے باپ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور ابھی تک نو فلائی زونز کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ بش کے لیے سب سے زیادہ ناگوار بات عراق کا انسانی تباہی کے ہتھیار تیار کرنا اور اقوام متحدہ کے انسپکٹرز سے ان کا چھپانا تھا۔ امریکہ جیسی طاقت سے یہ دھوکہ دہی تھی جس طرح القاعدہ نے کیا تھا۔ اب عراق بھی ان برائیوں میں شامل تھا جن میں ایران اور شمالی کوریا شامل تھے۔ بش صدام کو خطرہ قرار دیتے ہوئے نئی جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ 2002ء کے دوران میں امریکی فوجوں نے عراقی راڈارز اور حفاظتی تنصیبات پر حملے کرنا شروع کر دیے اور خلیج میں اپنی قوت بڑھا لی۔ تیل کے کویتی ڈپوؤں اور ایمونیشن کے ساتھ، دیگر فوجی ایئر کنڈیشن کمروں کے ساتھ، بہت سے خیمے بھی صحراؤں میں ابھر آئے اور سفارشی منصوبے کے تحت صدام کے مخالف جلاوطن لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان میں اہم ترین شخص، ایم آئی ٹی، احمد چیلابی بھی تھا جو شیعہ تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ جلاوطنی میں مغرب کے حق میں جمہوری حکومت قائم کر لے۔ بش امریکہ میں لوگوں کو جنگ کے از حد ضروری ہونے کے لیے قائل کر رہا تھا۔ آخر میں وائٹ ہاؤس نے عراق میں موجود انسانی تباہی کے ہتھیاروں کی موجودگی کی سی آئی اے کی معلومات اور خبریں عیاں کر دیں۔ اور زور دیا کہ صدام عراق میں نیوکلیئر پروگرام جاری رکھے ہوئے تھا۔ کچھ امریکیوں نے ان دعوؤں کو ایک شوشے کے طور پر لیا۔ لیکن عوام جلد ہی 9/11 کے بعد، صدر کی پشت پناہی کرنے لگے۔ عوام کو قائل کرنے میں ذرا وقت نہیں لگا اور نہ ہی کانگریس کو اکثریت پر غلبہ پا کر، سینٹ نے اکتوبر میں عراق کے خلاف وسیع فوجی قوت کے استعمال کی منظوری دے دی۔ پڑوسیوں کو دھمکانے والا، اپنے لوگوں پر ظلم کرنے والا، دنیا کے منشا کے مطابق عراق کے دن گنے جا چکے ہیں، بش نے اعلان کیا۔ عراق یا تو یو این او کی تمام قراردادوں پر عمل کرے گا اور انسانی تباہی کے تمام ہتھیاروں سے جان چھڑائے گا اور دہشت گردوں کی حمایت ختم کرے گا یا اسے اس بات پر مجبور کیا جائے گا۔

اس بار معاملہ پہلی خلیجی جنگ جیسا نہیں تھا، جس کی کئی امریکیوں نے مخالفت کی تھی، اور کانگریس نے اسے بہت محدود اختیار دیے تھے۔ عراق کے خلاف دوسری جنگ میں بہت زیادہ

اندرونی حمایت کی ضرورت تھی۔ جب عالمی طبقے نے صدام کو شکست دینے کے لیے 1991 میں امریکہ کا ساتھ دیا اس وقت کئی ممالک نے بش کے ساتھ شامل ہونے سے احتراز کیا۔ اگرچہ کویت اور سعودی عرب نے حملے کے لیے اپنے صحرا استعمال کرنے کی اجازت دی لیکن کسی عرب ریاست نے حملہ کرنے کے لیے اور صدام کو گرانے کے لیے فوجی دستے نہ دیے۔ بش کے اتحاد کے لیے ایک اور دھچکا روسی اور کئی دیگر یورپی ریاستوں کی مخالفت تھی۔ ان میں نمایاں جرمنی اور فرانس تھے۔ اگرچہ 1991ء میں کویت کو آزادی دلانے میں ان کے امریکہ کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ اور افغانستان پر حملے کے دس سال بعد تجویز کردہ عراقی حملے پر ان کے اپنے تحفظات تھے۔ انہوں نے امریکی کوششوں کو عالمی اختیار کی حامل فوجی دستے کی مدد سے رد کر دیا۔ اس میں عراق کے ساتھ تجارتی معاملہ بندی پر پابندی لگانے کی وجہ بھی شامل تھی اور بش کی یک رخی معاشی اور ماحولیاتی پالیسیوں پر ناراضی کا اظہار تھا۔ جونہی ٹون ٹاور کا معاملہ ذرا دب گیا تو جرمنی اور فرانس کی حکومتوں نے مشرق وسطیٰ میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کی چالوں سے دوری اختیار کی اور خطے کو آزاد اور غیر جنگی بنانا شروع کر دیا۔

امریکہ اور یورپ کے درمیان مشرق وسطیٰ کے مسائل پر تقسیم کو مزید تقویت بش کی اسرائیل اور ایریل شیرون کی حمایت کی وجہ سے ملی، جسے 2001ء میں وزارت عظمیٰ ملی۔ شیرون نے بش کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرتے ہوئے مغربی کنارے پر بڑا حملہ کرنے سے پہلے انتظار کیا۔ بعد میں اسرائیلی فورسز نے حملہ کر کے سینکڑوں حماس اسلامک جہاد، اور الاقصیٰ مارٹیر بریگیڈ کے سینکڑوں کارکن قتل کر دیے اور کئی سو کو گرفتار کر لیا۔ عرفات رملہ میں آدھے تباہ شدہ ہیڈ کوارٹر تک محدود ہو گیا، جہاں وہ اپنی موت کے دو سال تک رہا۔ بش نے ان اعمال کو اسرائیل کا اپنے دفاع کے لیے حق سمجھا۔ اور یو این سیکیورٹی کونسل کو مداخلت سے روک دیا۔ اس کی اسرائیلی حمایت نے امریکی عوام کو بہت خوش کیا، جنہوں نے یہودی ریاست کی حمایت جاری رکھی، فلسطینی اتھارٹی کی بحالی کے لیے۔ مسلم آبادیوں میں ان کے خلاف بڑھتی نفرت سے یورپی یونین کے اراکین نے امریکہ اسرائیل محاذ سے فاصلہ پیدا کر لیا۔ بش نے اس غصے کو کم کرنے کے لیے پہلے امریکی صدر کا اعزاز حاصل کیا جس نے عوامی طور پر فلسطینی ریاست کے قیام کی تصدیق کی۔ اور یورپی یونین کے ساتھ مل کر اس جنگ و جدل اور تضاد کے خاتمے اور کل کے لیے کام کرنے کی پیشکش کی۔ لیکن

یورپ والوں کی تسلی نہ ہوئی۔ بروسلز انٹ رپ اور پیرس کی گلیوں میں احتجاج کنندگان کا ہجوم تھا جن کے ہاتھوں میں پوسٹر تھے جن پر شیرون اور بش کے خلاف غم و غصے کا اظہار تھا اور ان کا تقابل ہٹلر سے کیا گیا تھا۔

سکیورٹی کونسل سے رجوع کر کے فروری 2003ء میں اپنے عراق پر حملے کے لیے امریکہ صرف برطانیہ کا ووٹ حاصل کر سکا۔ اس قرارداد کے لیے عالمی حمایت حاصل کرنے کے لیے بش نے عراق کے کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے خطرات پر زور دیا کہ ''صدام حسین کے قبضے میں ان ہتھیاروں کا چند ماہ رہنا یا سال تک رہنا، کوئی صائب کام نہیں ہے۔'' یہ بات سیکرٹری آف سٹیٹ نے میڈیا کے سامنے کہی۔ سیکرٹری نے فوٹو، اور سیٹلائٹ تصاویر اور ریکارڈنگز پیش کیں، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ صدام کے کے پاس انسانی تباہی کے ہتھیار موجود ہیں۔ پاؤل نے زور دیتے ہوئے کہا کہ صدام القاعدہ سے بھی تجاوز کر چکا ہے اور نیوکلیئر بم حاصل کرنے کی سازش کر چکا ہے۔

کونسل نے اس پر کوئی یقین نہ کیا۔ سوال یہ نہیں تھا کہ صدام کے پاس انسانی تباہی کے ہتھیار موجود ہیں یا نہیں، بلکہ بیان کردہ خطرے کو عالمی جائزے اور جواز کے ساتھ بیان کیا گیا کہ نہیں، حتیٰ کہ ہانز بلکس، چیف یو این انسپکٹر کو یقین تھا کہ صدام کے پاس ایسے ہتھیار موجود ہیں۔ کونسل کے اراکین کی اکثریت ہانز سے متفق تھی کہ موجودہ جنگ ضروری نہیں ہے۔ سخت تذبذب کا شکار، بش نے، یو این سے دستبردار ہو کر 18 مارچ کو صدام کو ایک حکم جاری کیا جس میں صدام کو اڑتالیس گھنٹوں میں ملک چھوڑنے کا حکم دیا یا حملے کا سامنا کرنے کی دھمکی دی گئی۔ دو دن کے بعد کئی لاکھ دستے، جن میں 90 فیصد امریکی تھے، عراق میں اتر گئے۔ پڑوسی ملک ترکی کی جانب سے شمالی عراق میں داخلے پر پابندی تھی، اس لیے دستے کویت کی جانب سے داخل ہوئے، جو شمال مشرقی حصہ تھا۔ ایٹن کے ریکارڈ کو قائم رکھتے ہوئے جدید دور کے فوجیوں نے وحشت ناک صحرا میں 500 میل تک سفر کیا۔ یہ ناقابل عبور اور بہت خطرناک علاقہ تھا، جہاں دشمن کو مصروف رکھنا تھا۔ ایک الگ خصوصی فوجیوں کے دستے، جس کا نام بربری جنگوں کے اعزاز میں ٹاسک فورس طرابلس رکھا گیا، اس نے صدام کے آبائی گاؤں تکریت پر قبضہ کر لیا۔ جنگی جہازوں نے 1991ء والی کروز میزائلوں کی بغداد پر بارش کر دی۔ یہ حملے ان جنگی محاذوں سے کیے گئے جن کا خفیہ نام Shock and awe تھا۔ دنیا بھر کے ٹیلی ویژن کی سکرینوں پر ایک بار پھر صدام کے اینٹی

ایئر کرافٹ گولوں کی سبز آگ چمکنے لگی۔ امریکی اور برطانوی جنگی دستوں نے عراق کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ دیگر سودمند پلوں پر بھی قبضہ کر لیا تاکہ زمینی دستوں کو آگے بڑھنے میں آسانی ہو۔

فتح آسانی سے نہیں ہوئی، جس طرح پہلی خلیجی جنگ میں بغیر مزاحمت کے ہوئی تھی۔ خوفناک صحرائی طوفانوں نے فوجوں کی کھال ادھیڑ دی۔ اور صدام کے نشانہ بازوں نے بھی انھیں خاصا ہراساں کیا، جب انھوں نے کوفہ نجف اور نصیریا کی طرف پیش قدمی۔ گولیاں اور بم ان فوجیوں کا راستہ نہ روک سکے۔ عراق کے وزیرِ اطلاعات نے اس بات پر اصرار جاری رکھا کہ امریکی سانپ صحرا میں رینگ رہے ہیں، یہ بدمعاش شہر میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن امریکی فوجی تو دارالحکومت کی طرف رواں دواں تھے۔ 9 اپریل کو عراقی شہری میرین کارپورل ایڈورڈ چن کے گرد جمع تھے۔ جب اس نے صدام کے مجسمے کے گرد دھاتی تار لپیٹا۔ انیسویں صدی کے آخر میں امریکیوں نے قدیم مصری مجسمے کی سنٹرل پارک میں تنصیب کر کے خوشی منائی تھی اور اب اکیسویں صدی کی ابتدا میں اپنی قوت کا مظاہرہ اسی طرح کو عیاں کیا۔ تار کو M88 ٹینک سے باندھ کر صدام کے مجسمے کو گرا دیا جبکہ کہ عراقی اس کے گرد ناچ رہے تھے اور گا رہے تھے۔ فاتح فوجوں نے الف لیلوی شہر میں گشت کیا اور لوگوں کو آزادی دینے کا اعلان کیا۔ امریکہ ناصر سادات اور عرفات سے مایوسیوں کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں سیکولر قیادت کے کئے دعوے کرتا ہوا وہاں چڑھ دوڑا۔

جنگ ابھی بمشکل شروع ہوئی تھی جونہی بغداد پر قبضہ ہوا لٹیروں نے عمارتوں کا رخ کیا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ پانی، بجلی اور صحت کا نظام تباہ ہو گیا صدام پکڑا گیا اور اس کے دونوں بیٹے مارے گئے۔ ہزاروں سابقہ عراقی دستوں کو معطل کر دیا گیا۔ امریکیوں کی فوج نے پولیس کا انتظام سنبھال لیا۔ ادھر روزانہ کئی امریکی فوجی مرنے بھی لگے، ان پر راستوں میں دھماکہ خیز مواد سے حملے ہونے لگے۔ کئی لوگ، جو عراق کی دوبارہ تعمیر میں شامل تھے، مارے گئے۔ کئی لوگوں کو اغوا کیا گیا۔ ان کے سر دھڑ سے جدا کرنے کی فلمیں آنے لگیں، جن میں اسلامی تشدد پسند، ان کے سر دھڑ سے جدا کرتے نظر آتے تھے۔ انتظامیہ اور عراقی حزب اختلاف کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ احمد چیلابی نے سید علی حسین سیستانی سے اتحاد کیا، جو عراق کا شیعہ رہنما تھا۔ اور تماشہ یہ ہے کہ زیادہ تلاش کے باوجود بھی عراق میں کسی قسم کے انسانی تباہی کے ہتھیاروں کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہ ملا۔

باغیوں کی طرف سے ملنے والی موت کی دھمکیوں کے باوجود عراقی عوام، قانون سازی کرنے اور آزاد انتخابات کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر لیبیا میں معمر قذافی نے امریکی صدر کی نیوکلیئر ہتھیاروں کی تلاش کی چھوڑ کر اور امریکہ کے ساتھ نئے تعلقات پیدا کرنے کی جستجو کی۔ عراقی مثال قائم ہونے کے بعد مشرق وسطیٰ میں سعودی عرب اور مصر میں بھی جمہوریت کی لہر سرایت کر گئی، جہاں مخالف گروپ بھی سر اٹھانے لگے۔ اور لبنان نے بھی براہ راست مصری تسلط سے آزادی حاصل کر لی۔ بش نے ان کامیابیوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''ہم یقین کرتے ہیں کہ آزادی آگے بڑھ سکتی ہے اور عظیم مشرق وسطیٰ میں زندگیوں کو تبدیل کر سکتی ہے۔ جب کبھی اس معاملہ میں لوگوں کو اختیار ملتا ہے تو وہ خوف کی زندگی کے بجائے آزادی کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔''

مصری اور سعودی حکومتوں نے بہت جلد ان جمہوری تحریکوں کچلنا شروع کیا اور لبنان شام کے زیر سایہ رہا۔ اسلامی شدت پسند جیسے حماس نے 2006ء کے انتخابات میں فلسطین میں کامیابی حاصل کی۔ اسے پورے خطے میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیبیا نے اپنا نیوکلیئر پروگرام ترک کیا، ایران نے اس پروگرام کا آغاز کیا جو اپنے دفاع کے لیے بہت اچھا تھا لیکن خطے کے لیے بہت خطرہ تھا۔ عراقی بھی ایک قومی آئین اور قیادت میں متحد ہو چکے تھے لیکن یہ پورا ملک جلد شیعہ سنی اور کردوں کے درمیان فرقہ ورانہ فسادات میں لہولہان ہو گیا۔ اسے جمہوریت پسند بنانے کے بجائے، امریکہ، ایک اور برے کام، ریاست بنانے میں مصروف ہو گیا۔ امریکی، جو ایک ظالم کو تخت سے ہٹانے کے لیے آئے تھے، وہ اس قوم کو متحد رکھنے میں مصروف ہو گئے۔ گورے سپاہی، مساجد اور بازاروں سے بم ہٹانے میں مصروف ہو گئے۔

جنگ عظیم دوم میں وار ڈیپارٹمنٹ نے جو کتابچہ جاری کیا تھا اس میں عراق میں تعینات جرنیلوں کو ہدایت کی گئی تھی ''تم عراقیوں کی زندگی بدلنے کے لیے جنگ نہیں لڑ رہے ہو، ہم یہ جنگ جیو اور جینے دو کے اصول کے لیے لڑ رہے ہیں۔'' اس کتابچے میں ''کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا'' کی ہدایات بھی شامل تھیں۔ شراب نہ پیو، سور نہ کھاؤ، کسی عراقی کو نہ مارو، کسی مسلمان عورت کی طرف پیش قدمی نہ کرو نہ ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ساٹھ سال بعد، عراق میں امریکی مرد و خواتین کی زندگی کا مقصد مکمل طور پر بدل چکا تھا لیکن حیران کن طور پر ہدایات وہی تھیں۔ عراقی کلچر سمارٹ کارڈ، جو امریکی فوجیوں کو جاری کیا گیا، اس پر یہ ہدایات تھیں: مصافحہ دائیں ہاتھ سے

کرو، کسی مسلمان کو شراب اور سور کی پیشکش نہ کرو، مذہبی مباحث میں نہ الجھو۔ دوسری جنگ عظیم کے کتابچے کے تناظر میں، اس کارڈ پر تفصیل سے ملک کے سخت گیر حصوں، زندگی بچانے کے اشارے اور ان سے جدا رہنے کی ہدایات لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ معلومات، عراقی، تیل کے کنوؤں والے علاقوں میں اور امریکی زندگیاں بچانے کے لیے ناکافی ہیں۔ برائن ٹرنر، جو شاعر تھا اور عراق میں انفنٹری افسر تھا، اس نے زیادہ تفصیل سے عملی ہدایات لکھی ہیں:

''اگر تم جمعرات کی سہ پہر کو بندوق چلنے کی آواز سنو، تو وہ کسی شادی کی تقریب کے لیے یا تمہارے لیے ہو سکتی ہے۔ انشاء اللہ کا مطلب ہے کہ اگر اللہ نے چاہا۔ سڑک کے کنارے بم نہ ہو۔ پلوں کے نیچے بم ہو سکتے ہیں۔ یا کیچڑ، اینٹوں کے ڈھیر میں، یا کاروں میں ہو سکتے ہیں۔ واسکٹ پہنے لوگ بارودی ہو سکتے ہیں۔ وہ چلتے ہوئے، اپنے ہتھیار لہراتے ہیں، اور انشاء اللہ کہتے ہیں۔ کچھ لوگ 80 ڈالر کماتے ہیں۔ کہ وہ تم پر حملے کر کے 500 لوگ مار دیتے ہیں۔ چھوٹے بچے تمہارے ساتھ کھیلیں گے، بزرگ تم سے باتیں کریں گے، عورتیں تمہیں چائے پیش کریں گی۔ ان میں سے کوئی ایک، کل تمہاری لاش پر ناچتا ہوگا۔''

امریکی دستوں نے عراق میں اتحاد برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ جنگ پر اجماع جلدی مکمل ہو گیا۔ امریکی فوجیوں میں بڑھتے زخمیوں کی تعداد کا الزام لگا کر، اس لڑائی کی مخالفت کو تقویت دی۔ امریکی دستوں کے ہاتھوں عراقی عوام کی قتل و غارت کے ثبوت نے بھی مخالفت بڑھا دی۔ اسی طرح کا کام ابوغریب جیل میں بند قیدیوں کے ساتھ سلوک نے بھی کیا۔ صدر کے ناقدین نے صدر پر، صدام کے انسانی تباہی کے ہتھیاروں کے غلط الزام اور انسانی آزادیوں کی خلاف ورزی کرنے کا الزام لگایا کہ اس نے یہ کام ملکی دفاع کے نعرے کے تحت کیا۔

ان طوفانوں کے باوجود، امریکہ سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں اپنی شمولیت کے پرانے نمونوں کی پیروی کرے۔ پالیسی میکرز، اپنے شہری مقاصد پر بطور آزادی پسند کے دباؤ رکھیں گے، اور امریکی امن کی کوشش کریں گے۔ امریکی چرچ اور ایونجلسٹ، خطے کو روحانی طور پر محفوظ رکھیں گے۔ اور فلم کے پروڈیوسرز، اس پراسرار اور آسیبی مشرق کے لیے، تماشائی کم نہ پائیں گے۔ مشرق وسطیٰ کے ساتھ امریکی ٹکراؤ کے دو صدیوں پرانے خیالات اور موضوعات ان تعلقات میں فرق رکھنا جاری رکھیں گے اور کئی صدیوں تک قائم رہیں گے۔

گہرا اور بھرپور تشکر

امریکہ کی آزادی کے وقت جان لیڈیار کی قائم کردہ روایت پر عمل کرتے ہوئے نیتھینل فک نے کالج چھوڑ دیا اور مشرق وسطیٰ کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ وہ لمبا، چوڑے نشانوں والا، گورا اور لیڈیارڈ سے جسمانی مشابہت رکھتا تھا۔ اسی کی طرح اصل میں مردانہ خود اعتمادی اور اس کی مطمئن کن تیزی تھی مگر لیڈیارڈ کے مقابلے میں فِک ڈارٹ ماؤتھ سے بھاگا نہیں تھا بلکہ عزت سے گریجوایٹ کیا تھا، نہ وہ لیڈیارڈ کی طرح تنگ بوٹوں میں کنکٹی کٹ دریا کو روانہ ہوا تھا بلکہ وہ ایک بس میں روانہ ہوا تھا۔ اس نے میرینز کو جوائن کیا نہ کہ رائل میرنز میں شمولیت اختیار کی جیسا کہ لیڈیارڈ نے کیا۔ ہاں 225 سال کے بعد امریکی دستے مصر میں اترے اور فِک عراق روانہ ہوگیا۔

''میں مکمل طور پر بے مقصد، الگ تھلگ محسوس کر رہا تھا'' فِک نے خطے کے متعلق اپنے ابتدائی تاثر میں کہا جسے اس نے شیشوں کا ایک ہال قرار دیا۔ بطور اسپیشل آپریشن پلاٹون کے کمانڈر کے وہ 25 زبردست مشین گنوں سے لدی گاڑی چلا رہا تھا۔ کیپٹن فِک نے 20 مارچ 2003ء کو کویت کی سرحد عبور کی وہ پہلی میرین ڈویژن سے آگے تھا تا کہ عراقی دفاع کا توڑ کر سکے۔ تم کیسے سمجھو گے کہ تم کہاں ہو جب تم گلیوں کے نشانات بھی نہیں پڑھ سکتے۔ 26 سال کے بالٹی مورین نے یوں دیکھا جیسے کہ گاؤں کے پرانے بوڑھے لوگ بھاری قدموں پر چلے اور تھوک رہے تھے اسے ایک مقامی ترجمہ کرنے والے نے بتایا کہ لوگ امریکہ کی شکرگزار ہیں جس نے انہیں صدام حسین سے آزادی دلائی۔

2003ء میں بہت سے عراقی امریکہ کے شکرگزار تھے اور امریکی پیش قدمی کو سراہتے تھے۔

مجھے لگتا ہے یہ ایسا ہی تھا جیسے 1944ء میں فرانس میں ہوا تھا۔ فِک کے ایک ساتھی سپاہی نے بتایا۔ ایک چرواہے نے جو مہمان نواز لگتا تھا میرینز کو ایک بکرے کی پیشکش کی مگر ناصریہ میں ایسا نہیں تھا، جہاں امریکیوں کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی معاملہ بغداد کے باہر کے قصبوں کا تھا جن پر انہوں نے آگ برسائی بعد میں فِک اور اس کے ساتھی راکٹ حملوں اور کھاد سے بنائے گئے بموں کے حملوں کا ہدف بن گئے۔ یہ عراقی بغاوت کا عروج تھا۔ حاجی جیسے قابل احترام نام کو امریکی منفی انداز میں لیتے تھے اور ہر عراقی کو اس نام سے پکارتے تھے اس بات کو فِک نے افسوس کے ساتھ یاد کیا۔ وہ تنازعہ میں فوج کے کردار پر بہت فکرمند تھا ساتھ ہی جنگ کی ساکھ پر امریکہ میں اٹھائے گئے سوال اور تقسیم پر وہ بہت کنفیوز تھا۔ فِک اور اس کے ایک لاکھ 30 ہزار ساتھیوں نے زندہ بچ رہنے پر توجہ رکھی اور جہاں ممکن ہوا عراقیوں کی زندگی بہتر بنائی۔ خود کو مشرق وسطیٰ میں لاحق خطرات سے بچاتے ہوئے اور مقامی لوگوں کی ہر ممکن مدد کرتے ہوئے امریکی فوجی خطے میں امریکی مداخلت جو ابتدا میں رکھی گئی کے اثرات دیکھ رہے تھے۔

امریکہ نے آزادی حاصل ہی کی تھی جب بربری قزاقوں نے اس کی تجارت کو نشانہ بنا کر اس کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا۔ اپنی بقاء کے لئے نو آموز قوم کو ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت آنا پڑا اور ایک خطرات سے بچاؤ کرنے والی نیول فورس بنائی اور اپنے ساحلوں سے ہزاروں میل دور ایک خطرناک مہم اپنے ساحلوں سے ہزاروں میل دور شروع کی۔ امریکہ کے جنگی جہازوں نے بربری جنگوں کے بعد مشرق وسطیٰ کے پانیوں میں گشت کرنا جاری رکھا جس نے تاجروں کو نیو انگلینڈ کی رم، افیم کے بدلے تیار اشیاء، قالین اور انجیروں کی خرید و فروخت کے قابل بنایا۔ مشنریز اور بائبل بھی پہنچ گئے۔ اگرچہ ان کا اصل مقصد مقامی آبادی کو عیسائی بنانا تھا اور فلسطین میں یہودیوں کو دوبارہ آباد کرنا تھا مگر ان ایوانجلسٹ نے آخر میں مغرب کی طرز پر تعلیم فراہم کرنے والے اسکول بنائے۔ مشنریز نے آخر میں خطے کی چند ابتدائی یونیورسٹیاں بنائیں اور امریکی طرز کی جمہوریت اور قوم پرستی کا تصور متعارف کروایا۔

اس کے علاوہ قومی سلامتی، اقتصادی اور روحانی انعامات کے حوالے سے بھی امریکیوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر مہم جوئی کے طور پر کیا۔ اس ریاست کے ابتدائی دنوں سے ہی ریاست میں واقع کالونیز (سابقہ) کے باشندوں نے اس مشہور سرزمین کو دریافت کرنے کی کوشش کی یا اس

سے متعلق جاننا چاہا جو اس کی سرزمین کے متعلق افواہوں پر مشتمل جوانی کی کہانیاں اور اس کے پیچیدہ خطرات سے متاثر تھے (امریکہ میں مشرق وسطیٰ کے حوالے سے ایسی ہی کہانیاں مشہور تھیں)۔ مہم جوؤں اور بہادروں کی شروع میں ایک مختصر تعداد بعد میں بہت زیادہ ہوگئی جس میں جگہ کو دیکھنے والوں سے لے کر (عیسائیت سے متعلق) مقدس تبرکات کے حاصل کرنے کے خواہشمند سب شامل تھے۔ دوسرے لوگ جن پر مذہب کا اثر تھا مگر کچھ زیادہ نہیں انہوں نے مقدس زمین میں کالونیز بنانا شروع کر دیں۔ اردن کا بحری سفر کیا اور قدیم آثار کے حوالے سے آرکیالوجی کی فیلڈ کا جائزہ لیا۔ واپس آ کر امریکیوں نے سفر نامے اور نظمیں لکھیں جس میں اپنے تجربات بتائے۔ انہوں نے ایک چمڑے کی کیپ پہنے والا سلسلہ، ایک ماحولیاتی بچاؤ کی تحریک اور اونٹ سوار دستے تخلیق کئے۔ پہلی امریکی نے نیل پہنچ کر دریا کے لیول پر تحقیق کی سو سال کے اندر اندر امریکی اس علاقے کے ہر حصے میں گئے اور سفارتی وفود کے ساتھ پھیل گئے۔ لیکن جیسے ہی امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے درمیان تعلقات مضبوط ہونا شروع ہوئے۔ پرانے دشمن متحد ہونا شروع ہوئے اور شمالی اور جنوبی مصر نے اکٹھا ہو کر اپنی فوج کو جدید تقاضوں کے مطابق مضبوط کرنا چاہا تاکہ وہ حب الوطنی کی تحریک کا ہراول دستہ بنے۔ جنگ کے سبب مصر کی کپاس کی صنعت میں آنے والے اتار چڑھاؤ میں مصری معشیت میں بنیادی تبدیلیوں کا سبب بنے جنہوں نے مصر پر برطانیہ کے قبضے کی راہ ہموار کی اور خطے میں یورپ کی فتوحات کی تیز کر دیا۔ جنگ کے نتیجے میں ہونے والی صنعتی ترقی نے امریکہ کو بھی مشرق وسطیٰ کی اہم طاقت بنا دیا۔ امریکہ کے شہری جنگ کے دوران اپنی معصومیت سے محروم ضرور ہوئے مگر اس نے ان کے اندر اہرام مصر کو ناپنے یا پھر مردہ سمندر بحر مردار کے پانیوں میں چلنے کی شدید خواہش کو کم نہ کیا۔ اگرچہ ان کی سرزمین آزادی سے لطف اندوز ہو رہی تھی مگر اٹلانٹک اور سویز نہر کے درمیان کا علاقہ غیر ملکی حکومت کے عتاب میں آ گیا تھا۔ مجسمہ آزادی کو مصر کے مقروض لوگ تو بنا سکتے تھے اس لئے یہ نیویارک میں بنا جسے آزادی کی یادگار سمجھا گیا مگر جہاں تک مشرق وسطیٰ کا تعلق ہے وہ ابھی آزادی کی خواہش ہی کر سکتے تھے۔

جنگ کا شکار امریکیوں نے مشرق وسطیٰ میں بہت سے بحران دیکھے تھے چاہے وہ یونان کی عثمانی سلطنت کے خلاف آزادی کی درست جدوجہد کو سپورٹ کرنے سے آئے اور چاہے وہ مخالفوں کے ساتھ حقیقی معاشی مفادات کی کوشش ہو اور یہ غیر یقینی پن سامراجی دور میں صرف تیز

ہوا۔ کیا امریکہ کو نو آبادیاتی نظام کے پنجے میں جکڑے لوگوں کا ساتھ دینا چاہیے جس کا وہ کبھی خود بھی شکار تھا یا پھر اسے نئی تہذیب کے دعویداروں سے تعلقات قائم کرنے چاہیے جو اسلام کے خلاف تھے جبکہ خود امریکی اسلام کے متعلق زیادہ نہ جانتے تھے۔ زیادہ امریکی تو علاقے کو کانونی بنانے والوں کو پسند کرتے تھے اور ان صدور کی حمایت کرتے جو اپنی ڈپلومیسی جنگی کشتیوں سے چلاتے تھے۔ ایک اہم اقلیت نے اگرچہ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے امریکہ کے جنگجو پسند مزاج پر تنقید کی اور خطے کی آزادی کے لئے کام کیا مگر دوسرے صرف مخصوص علاقوں کے لوگوں کی خودمختاری چاہتے تھے جیسے فلسطین میں یہودیوں کی اور شام میں عراق کی خودمختاری۔ مگر مجموعی طور پر امریکی ایسے معاملات کو اپنے چرچوں یا اخباروں تک محدود رکھ کر مطمئن تھے وہ جن چیزوں سے متاثر ہوتے ان میں ایرانی نوجوان عورتیں اور مصر کی حقیقی نمائش شامل تھیں۔ لیکن ان خوش کن خوابوں کی حقیقت جلد ہی ختم ہوگئی جب مشرق وسطیٰ کے پریشان کن حقائق سے ان کا سامنا ہوا۔ کئی سو ہزار امریکیوں کی لاشیں راستے کے ساتھ لگی تھیں جس سے امریکی مسائل کی شدت کا پتہ چلتا تھا۔

جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو امریکہ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اسے ترکی کی مخالفت کرنی ہے یا غیر جانبدار رہنا ہے کیونکہ اس جنگ پر مشرق وسطیٰ کا مستقبل منحصر تھا۔ اب اخلاقیات اور مفادات کا معاملہ تھا ہی نہیں اب تو سوال یہ تھا کہ اخلاقی طور پر زیادہ درست کون ہے۔ ایک نسل کشی کرنے والی ریاست کی شکست اور ان اداروں کا تحفظ جو امریکی فراخ دلی نے ہزار سال میں تخلیق کئے تھے۔ امریکی مشنریز کی طرف سے اس صدی کے دوران انہیں ملنے والے اثر و رسوخ نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ ان دنوں امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں فوج ہرگز نہ بھیجی جو فرانس اور برطانیہ کی واضح مدد ہوتی۔ امریکہ کے رہنما مشرق وسطیٰ کے لوگوں کے لئے حق خود ارادیت کے حصول کی کوشش میں کوئی ضمانت حاصل نہ کر سکے کہ مشرق وسطیٰ کے لوگوں کو یہ حق ملے گا۔ اس کی بجائے ایک مینڈیٹ سسٹم بنا تھا جس میں یورپی حکومت ہی برقرار رہتی۔ اگرچہ بہت سے امریکیوں کا خواب تھا کہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست بنے اس خواب کو حقیقت کا روپ دھارنا شروع کر دیا اور اس کی بنیادیں رکھ دی گئیں مگر دوسرے دوسرے امریکیوں کی اب بھی خواہش تھی (اور جن کی تعداد بھی کافی تھی) کہ عربوں کے حقوق ان کو ملنے چاہیئں۔

جنگ عظیم اول کے قتل عام اور جنگ کے بعد کے غلط رویے کے سبب امریکہ دنیا اور خاص

کر مشرق وسطیٰ کے معاملات میں مداخلت سے متنفر ہو گیا۔ بہت سے امریکیوں کے لئے تو خطہ صرف اور صرف ہالی وڈ کی پیش کردہ تصویریں اور گانوں کی حد تک دلچسپی کا مرکز رہ گیا۔ جس متھ کا مرکز مشرق وسطیٰ کے خطے کے حوالے سے پہلے کتابیں تھیں اب گانے اور فلمیں تھی۔ اگرچہ امریکی معاشرے کا بڑا حصہ علاقے سے اب بھی کسی نہ کسی طرح تعلق ضرور رکھتا تھا۔ کچھ لوگوں نے زور دینا شروع کیا کہ امریکہ کو فلسطین میں صیہونیوں کو مضبوط کرنا اور امریکی حکومت کو اس کی موجودہ غیر جانبداری کی پوزیشن سے ہٹانا چاہتے اور علاقے کے تنازعات میں کردار ادا کرنا چاہیے۔ پادریوں، مہم جوؤں اور بزنس مینوں کے ایک گروہ نے جو چھوٹا مگر بااثر تھا ایک سعودی قبیلے کے ساتھ تاریخی رشتہ دریافت کیا اور زیرزمین اثاثے پر قابض ہو گے ء۔

1939ء تک تیل امریکہ کی معشیت کی بنیادی ضرورت تھا پھر بھی امریکہ خطے میں سفارتکاری سے بھی پرہیز کر رہا تھا وہ فوجی مداخلت کیا کرتا یہ پالیسی جنگ عظیم کے شروع ہونے اور پرل ہاربر پر حملے کے بعد بھی جاری رہی۔ اسی کے سبب جرمنوں نے بحر روم کے علاقے کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور محوری قوتوں نے امریکہ کو تنازعہ میں دھکیلنے کے لئے نہر سویز کی طرف پیش قدمی کی۔ طرابلس کے ساحل پر اتر کر امریکہ نے دشمن کو شکست دے دی اور امریکی فوجی سارے محاذ پر پھیل گئے حتیٰ کہ ایران تک چلے گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد تنہائی میں چلے جانے کے برعکس امریکہ دوسری جنگ عظیم سے ایک بہت بڑی طاقت کی حیثیت سے سامنے آیا۔ مشرق وسطیٰ کی ایک بہت بڑی طاقت جو اس کی ترقی کا وکیل اور آزادی کا محافظ تھا۔ طاقت کے ساتھ ذمہ داریاں بھی آتی ہیں۔ امریکہ یورپ کے یہودیوں کو نازی ازم سے بچانے میں ناکام رہا۔ امریکہ پر ان لاکھوں ہالوکاسٹ سے بچ جانے والوں کا دباؤ تھا کہ انہیں فلسطین میں آباد کیا جائے مگر ان مطالبات کو پورا کرنا امریکہ کو فلسطین کے برطانوی حکمرانوں کے ساتھ تنازعہ میں لے گیا۔ جو ملک فلسطین میں مزید مہاجر لانے یا یہاں ایک یہودی ریاست بنانے کے خلاف تھے۔ اگرچہ امریکہ کو سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے خطرے سے بچاؤ کے لئے برطانیہ کی مدد کی ضرورت تھی تاکہ مشرق وسطیٰ کا دفاع ہو سکے۔ امریکہ کے لوگ بھی صیہونیت سے عرصے سے چلا آ رہا لگاؤ رکھتے تھے۔ امریکہ نے یہودیوں کا واضح طور پر ساتھ دیا اور مئی 1948ء میں اسے تسلیم کرنے والا پہلا ملک بن گیا۔ ایسا کر کے امریکہ نے خطے سے برطانیہ کی واپسی کو تیز کر دیا اور عربوں کا غصہ بھی اس

کو دیکھنا پڑا جو اسے اس کے سامراج مخالف مؤقف کی وجہ سے اچھا سمجھتے تھے ان کو سوویت یونین سے خوف کم اور صہونیت سے نفرت زیادہ تھی۔ سرد جنگ کی آمد، عرب اسرائیل تنازعہ پھیلاؤ اور امریکہ کے عرب ممالک کے تیل پر انحصار نے کئی اہم سوالات کو جنم دیا، کیا امریکہ اسرائیل کے لئے اپنی حمایت برقرار رکھے گا یا یہ برطانیہ اور فرانس سے اتحاد کرے گا اور عربوں سے اپنی دوستی بھی برقرار رکھے گا، یہ کیسے مشرق وسطیٰ کو متاثر کرے گا اور اسے سوویت قبضے سے بچائے گا۔

ان مسائل سے بچتے ہوئے امریکہ نے خطے کو حقیقت پسندانہ انداز میں چلایا۔ ایک صدارتی ڈاکٹران جو اپنی نوعیت کے ایسے اعلانات میں پہلا تھا یہ مشرق وسطیٰ کے سیکرٹی سے تعلق رکھتا تھا جس میں یونان اور ترکی کی فوجی امداد میں واضح اضافہ کیا گیا اور اقوام متحدہ میں امریکہ کے فیصلہ کن اقدام نے سوویت یونین کو شمالی افریقہ سے دور کر دیا اور شامی اتحادی بھی اس کے ہاتھ سے گئے۔ اگرچہ امریکہ کمیونزم کے خلاف اپنے یورپی اتحادیوں کے ساتھ تھا مگر سامراج کے خلاف مقامی قوموں کی جدوجہد کا ساتھ بھی دے رہا تھا امریکہ بنیادی یا جزوی طور پر لیبیا، شام اور ایران کی آزادی کی وجہ بنا۔

سرد جنگ کی مخالف نوعیت کی ضرورتوں اور نوآبادیاتی نظام مخالف رویہ کے درمیان جلد ہی کوئی سمجھوتہ ممکن نہ رہا۔ امریکہ نے 1953ء میں ایک مقبول ایرانی لیڈر کو ہٹانے میں ساتھ دیا لیکن تین سال بعد یہ سوویت یونین کے ساتھ مل کر اسرائیل، فرانس اور برطانیہ کو روک رہا تھا۔ فرانس اور برطانیہ ایک ایسے حکمران کو ہٹانا چاہتے تھے جسے خفیہ طور پر امریکہ ہٹانا چاہتا تھا پہلے امریکہ نے اسرائیل کو آمادہ کیا کہ وہ اپنا ایٹمی پروگرام ترک کرے پھر اسرائیل کو بعد میں مدد دی تاکہ وہ سوویت یونین کے خلاف دفاع کر سکے اسی وجہ سے امریکہ تیل کے حوالے سے ایک عرب معاہدے اور فلسطینی حملوں کا نشانہ بنا۔ عرب اسرائیل کو روایتی طریقوں سے ختم نہ کر سکنے پر مایوس تھے اور اسی نے انہیں دہشت کی طرف کیا۔ مخالفوں کا خاتمہ کرنے کے لئے امریکہ نے اپنی ثالثی پیش کی ساتھ ہی اسرائیل پر دباؤ ڈالا کہ وہ امن کے بدلے دہشت گردی میں ملوث لوگ رہا کر دے۔ مشرق وسطیٰ میں اپنی آمد کے 30 سال بعد امریکی اپنی کامیابیاں فخر کے ساتھ بتا سکتے ہیں۔ مگر ان کے حصے ناکامیاں بھی آئیں جو کافی تکلیف دہ تھیں انہوں نے اسرائیل کے ساتھ مضبوط اتحاد بنایا۔ قاہرہ اور یروشلم کے درمیان بات چیت سے امن معاہدہ کروا دیا۔ انہوں نے سوویت اثر عرب میں کم کر

دیا اور انسانی حقوق کے چمپئن کہلائے۔ پھر بھی خطے کے بہت سے لوگوں کی نظر میں امریکہ مشرق وسطیٰ کے بے پناہ اختیارات کے حامل حکمرانوں کا مددگار تھا۔ غزہ اور ویسٹ بینک میں اسرائیلی بستیوں کا ذمہ دار تھا اور خلیج فارس میں تیل کی مدد سے ہونے والی فضول خرچی کا ذمہ دار تھا۔ امریکہ کا مشرق وسطیٰ میں رویہ کئی ایسے لوگ سامنے لایا جن کو نوبل انعام ملا ساتھ ہی اس نے ان لوگوں میں اضافہ کیا جو دہشت گردی میں ملوث تھے۔ دراصل مشرق اور مغرب کے درمیان تصادم جو خطے میں رونما ہوا اس تصادم کے درمیان امریکہ کا اصول بن گیا کہ ''تعریف یا حوصلہ افزائی نہیں بلکہ حملہ''۔

1979ء میں تہران میں امریکی سفارتخانہ پر قبضے سے لے کر امریکہ مکمل طور پر مشرق وسطیٰ میں نشانے پر رکھ لیا گیا۔ ان کے طیارے ہائی جیک ہوئے ان کے جہازوں پر بم مارے گئے، انہیں ائیر پورٹوں پر گولیاں ماری گئیں۔ یورپ کے کلبوں میں اڑایا گیا اور بیروت میں انہیں ملبے کے نیچے دفن کیا گیا۔ امریکہ نے اپنی فوجوں کو لیبیا سے لبنان تک پھیلا کر بھرپور جواب دیا مگر اس کا سوائے اس کے کہ دہشت گردی کرنے والے مزید جرأت مند ہوئے بہت کم اثر ہوا۔ امریکہ کو سرد جنگ کی بجائے مقدس جنگ کے لفظ پر بہت غصہ آیا۔ مگر خود اس نے عراقی ڈکٹیٹر صدام کو ایران کی مذہبی حکومت کے خلاف استعمال کیا اور ساتھ ہی تہران کے خلاف ہتھیار بھی دیتا رہا۔

امریکہ نے امریکہ کے مخالف اسلام پسندوں کو سوویت یونین کے خلاف افغانستان میں اسلحہ دیا اور سعودی عرب سے اتحاد کیا جو سخت بنیاد پرست ریاست تھی۔ امریکہ نے پہلے اسرائیل کے لبنان پر حملے کو قبول کیا پھر اس کی مخالفت کی پہلے اسرائیل کی طرف سے عراقی ری ایکٹر پر حملے کی مذمت کی پھر اسی اقدام کی تعریف کی۔ اسرائیل کے ساتھ مل کر اسلحہ کے بدلے یرغمالی کی اسکیم بنائی۔ اسرائیل کے لئے جاسوسی پر امریکہ نے ایک امریکی کو عمر قید دی۔ جب امریکہ کی حکومت یہ بدلتی سیاست چلا رہی لوگوں کا مشرق وسطیٰ کے متعلق یہ تھا کہ یہ مشرق میں خوابوں کی جنت ہے یا یہ تھا کہ یہ تو اغواء کاروں اور ٹھگوں کا محفوظ ٹھکانہ ہے یہ تھی امریکی عوام کی سوچ، اسکالر اس سوال پر لڑ رہے تھے کہ آیا مشرق وسطیٰ امریکہ کو اخلاقی طور پر دھمکائے گا یا امریکہ مشرق وسطیٰ کے مسائل کی جڑ ہے۔

ان سوالوں کے جواب پہلے ہی موجود ہیں اگرچہ تفصیل طلب ہیں۔ امریکہ نے عراق کے ایک سخت گیر حکمران سے جنگ لڑی اور کویت کو آزاد کروایا۔ فتح کے باوجود امریکہ نے مشرق وسطیٰ سے متعلق ایک نیو ورلڈ آرڈر دے دیا جو وہاں امن اور سکیورٹی کو مضبوط کرے۔ حقیقت میں خطے کو

اس سے کچھ نہیں ملا۔ گو امریکہ کے پالیسی سازوں نے اسرائیل اور فلسطینیوں میں معاہدے کروائے اور ساتھ اسلام پسندوں کو جبر پُر تشدد طریقے اپنائے بغیر روکنا چاہا مگر امن معاہدے خون ریزی کی نذر ہو گئے۔ تشدد سے زندگیاں ضائع ہوتی رہیں۔ خطرے کا سامنا کرنے میں احتیط، اپی فوج پر حد سے زیادہ اعتماد اور ابھی تک مشرق وسطیٰ کے بارے میں متھوں سے دھوکے کھاتے ہوئے امریکہ جہادیوں کی یلغار کے لئے تیار نہ تھا۔ ٹوین ٹاور کا گرنا اگرچہ متھ کے خاتمے کا سبب ہوا جو کہ صرف دھوکہ تھیں اور ساتھ ہی امریکی مزاحمت کا بھی۔

امریکہ نے پہلے کابل پھر بغداد، فلوجہ اور تکریت پر قبضہ کیا مگر امریکہ کی فتح کی حرارت نے طالبان اور سیکولر لوگوں کو ایک نیا موڑ دیا جو عراق کی شدید مزاحمت کی صورت میں سامنے آیا۔ امریکہ نے صدیوں پر محیط کوشش کی کہ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت جو امریکی طرز کی ہو آ سکے لیکن یہ صرف تباہی لائی پہلے شیعہ اور سنی امریکی فوج پر حملہ آور ہوتے تھے تا کہ انہیں اپنے ملک سے نکال سکیں بعد میں شیعہ اور سنی ایک دوسرے کو نشانہ بنانے کے لئے جو فائرنگ کرتے تھے امریکی فوجی اس زد میں آنے لگے۔ عالمی طور پر امریکہ مغربی یورپ کی ریاستوں سے بھی الگ ہو گیا جنہوں نے عراق کے خلاف اتحاد میں نام نہیں لکھوایا، جیسا کہ دوسو سال پہلے بربری جنگوں کے لئے بنائے گئے اتحاد میںؒ انہوں نے کیا تھا۔ امریکی قوم کے طور پر بھی تقسیم ہو گئے ہیں وہ جنگ کے درست ہونے پر اتفاق نہیں رکھتے۔ رویہ جنگ کی قربانیوں اور ہلاکتوں کی تعداد پر وہ کراہ اٹھے ہیں مشرق وسطیٰ جس نے 18 ویں صدی کے شروع میں امریکہ کو متحد کیا آج امریکہ کو الگ کر رہا ہے۔

فِک کہتا ہے کہ سخت غلطی ہوئی ہے ہم لوٹ مار نہ روک سکے۔ بارڈر نہ بند کر سکے ہم نے عراقی فوج منتشر کر دی۔ اس نے حال ہی میں One Bullet Away کے نام سے ایک بڑے پیمانے پر مقبول کتاب شائع کی ہے جو اس کے فوجی تجربے کی یادگار ہے اور بزنس اور ایڈوانس ڈگری کے لئے ہاورڈ بھی پڑھ رہا ہے۔ ہم اندھے ہیں، ہم مضبوط مگر چالاک نہیں۔ اس نے عراق کے متعلق خیالات مجھ سے کہے۔ اسی طرح سے مشرق وسطیٰ اور وہاں امریکی کردار پر کیمبرج کیمپس میں بات ہوئی۔

فِک نے بتایا کہ میں چار مشرقی وسطیٰ کے ممالک گیا ہوں اور پاسپورٹ استعمال نہیں کیا مگر اس نے یہ کہا نیم دلی سے۔ اگرچہ اس نے عرصہ پہلے بزنس مینوں کے سمر کوٹ جیسے کوٹ سے اپنی

کمزوری کو بدل دیا مگر وہ دوبارہ ایک فوجی بن گیا۔اس نے ان گن فائیٹ کا ذکر کیا جو اس کی یونٹ نے کی تھیں وہ جنگ کے نتیجے پر پریشان تھا اور اپنے کئی کمانڈوز کی ہلاکٹ پر اداس بھی تھا پھر بھی اس نے عراق میں اپنی خدمت پر فخر کیا ''میں جنگ پر یقین رکھتا تھا اور ہوں'' اس کا اصرار تھا وہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں اچھی امیدیں رکھتا ہے''امریکہ علاقے کی مدد وہاں جمہوریت پھیلا کر کر سکتا ہے'' اس نے وضاحت کی۔مگر اس کا فیصلہ شہریوں کے فیصلے پر ہی منحصر ہے۔''مرضی ان کی ہے وہ جدیدیت کے ساتھ جائیں یا سب شمالی افریقہ کے ساتھ''

وہ بولا اور لمحہ بھر کے لئے مجھے لگا میں جان لے یارڈ کو سن رہا ہوں۔پلینی فسک، چارلز پموری، کلیرا بیٹرن اور لاتعداد امریکیوں کی آواز کی گونج اس کی آواز میں تھی جنہوں نے مشرق وسطیٰ میں کام کیا تھا۔مجھے یاد آیا امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے تعلقات کی تاریخ کوئی غیر ضروری نرمی اور بے غرضی تو ہے نہیں، امریکہ کی آئل کمپنیوں نے کئی بلین بیرل تیل نکالا ہے جس سے مقامی آبادی کا بھی فائدہ ہوا وہ بھی امیر ہوئے ہیں۔انتظامیہ نے مسلسل پُرتشدد حکومتوں کا ساتھ دیا جنہوں نے امریکی مفاد آگے بڑھایا اور پھر امریکہ نے مقبول عوامی لیڈر ہٹائے بھی ہیں۔تمام تر بری باتوں کے باوجود امریکہ کا مشرق وسطیٰ کے ساتھ تعلقات کا ریکارڈ بہت اچھی باتیں اور ارادے رکھتا ہے۔امریکہ تعلیم اور صحت کی سہولتیں خطے کو فراہم کرنے کے خلاف نہ تھا جبکہ اس نے ہنگامی امداد، عمارتوں کے ڈھانچے میں توسیع کی۔ریاستوں کی آزادی میں مدد دی اور اسکیورٹی اور امن کی کوشش کی۔

امریکہ مشرق وسطیٰ میں مداخلت صرف عراق پر جنگ مسلط کرنے یا مشرق وسطیٰ کے عرب اسرائیل تنازعہ میں ثالثی تک محدود نہیں ہے۔مستقل قریب میں امریکہ کو ایک ایران اور القاعدہ کے بکھرے گروہوں کا سامنا ہوگا، وہ یعنی امریکی اسلام کی ایک نئی تشریح چاہتے ہیں اور تیل کے متبادل طریقوں میں سرمایہ لگانا چاہتے ہیں۔سب سے بڑھ کر امریکہ کو اپنے خیالات کی بہادرانہ جانچ پڑتال کرنا اور مشرق وسطیٰ سے اپنا تعلقات کا دوبارہ جائزہ لینا ہے اسی کے ذریعے پوری دنیا کے ساتھ تعلقات کا۔

فِک پہلے ہی اس سفر پر ہے اور وہ جان لے یارڈ کی طرح نہیں ہے جو مشرق وسطیٰ کے اپنے سفر کو ''Passage to Glory'' میں رومانوی بناتا ہے۔فِک علاقے میں اپنے تجربے کو

امریکہ کے بہتر فہم کے لئے ایک جگہ قرار دیتا ہے۔اس کی خامیوں اور خوبیوں پر بات کرتا ہے''میں اس ملک کے لئے بے حد اور جذباتی طور پر شکر گزار ہوں جہاں میں بڑا ہوا'' وہ بتاتا ہے۔مگر مشرق وسطیٰ کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لئے کہ وہ بھی احترام کا یہ احساس ہمارے ساتھ شئیر کریں اس کے لئے مضبوط ارادہ اور محتاط انداز میں امریکی طاقت کے مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی مضبوط اور برداشت رکھنے والے انداز میں امریکی عقیدے پر عمل کی ضرورت ہے۔

اپنی طاقت پر ذمہ داری کا احساس رکھ کر اور اپنے اصولوں کو اٹھا کر ہی ہم اپنا پُرامن اور باثمر تعلقات جس کا خواب ہم مشرق وسطیٰ کے ساتھ دیکھتے ہیں اپنے اس خواب کو حقیقت بنا سکتے ہیں۔

نوٹس

A note on the notes: Because of the immense number of quotations and sources in need of citation, I have inserted endnotes at thematic breaks and transitions in the text.

Prologue: A Passage to Glory

1. Jared Sparks, The Life of John Ledyard, the American Traveller (Cambridge: Hillard and Brown, 1828), pp. 1-70. Helen Augur, Passage to Glory: John Ledyard's America (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1946), pp. 142, 157-58, 173. Henry Beston, The Book of Gallant Vagabonds (New York: George H. Doran, 1925), p. 23. Laurie Lawlor, Magnificent Voyage: An American Adventurer on Captain James Cook's Final Expedition (New York: Holiday House, 2002), p. 203 ("the greatest traveler"). See also Clanance Ashton Wood, "Southhold's John Ledyard" and "John Ledyard the Traveler," longislandgenealogy.com/Ledyard/one.htm.

2. John Ledyard, A Journal of Captain Cook's Last Voyage to the Pacific Ocean (Hartford: Nathaniel Patten, 1783), pp. 33 ("dancing through life"), 72, 85, 157. Kenneth Munford, John Ledyard: An American Marco Polo (Portland: Binfords and Mort, 1939), p. 300. Beston, Book of Gallant Vagabonds, p. 43. James Zug, American Traveler (New York: Basic, 2005), p. 152. Lawlor, Magnificent Voyage, pp. 5, 59, 143, 197-98. S. G. Mantel, Explorer with a Dream, John Ledyard (New York: Julian Messner, 1969), pp. 121-23. Thomas Jefferson, Autobiography (New York: Capricorn, 1959), p.

80. Lawlor, Magnificent Voyage, p. 199 ("my brother"). See also Stephen D. Watrous, ed., John Ledyard's Journey through Russia and Siberia, 1787-1788: The Journal and Selected Letters (Madison: Univ. of Wisconsin Press, 1966), and the website Mutual Perceptions- Travel Accounts, memory.loc.gov/intldl/mtfhtml/mfpercep/perceptledyard.html.

3. Henry Beaufoy, "Some Accounts of Mr. Ledyard's Method of Traveling," Ladies' Magazine, July 1792 ("manliness of his person"). Zug, American Traveler, p. 216 ("An American face"). Larzer Ziff, Return Passages: Great American Travel Writing, 1780-1910 (New Haven: Yale Univ. Press, 2000), p. 36. Sparks, Life of John Ledyard, pp. 290, 293 ("My path will be"), p. 303. Augur, Passage to Glory, p. 268 ("Behold, I afford a new character"). Zug, American Traveler, pp. 173 ("I…do not think"), 220.

1. A Mortal and Mortifying Threat

1. Evan Thomas, John Paul Jones: Sailor, Hero, Father of the American Navy (New York: Simon & Schuster, 2003), pp. 30-34. James A. Field Jr., America and the Mediterranean World, 1776-1882 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1969), pp. 30-31. A. L. Tibawi, American Interests in Syria, 1800-1901 (Oxford: Clarendon Press, 1966), pp. 1-2. Michael L. S. Kitzen, Tripoli and the United States at War: A History of America's Relations with the Barbary States, 1785-1805 (Jefferson: McFarland, 1962), p. 10. Thomas A. Bryson, American Diplomatic Relations with the Middle East, 1784-1975 (Metuchen, N.J.: Scarecrow, 1977), pp. 1-2. David H. Finnie, Pioneers East: The Early American Experience in the Middle East (Cambridge: Harvard Univ. Press, 1967), pp. 244-45 ("Go where you will"). A. Uner Turgay,

"Ottoman-American Trade during the Nineteenth Century," Journal of Ottoman Studies 3, no. 1 (1982): 193-94.

2. Richard B. Parker, Uncle Sam in Barbary: A Diplomatic History (Gainesville: Univ. Press of Florida, 2004), pp. 5-6, 17-20. Robert Davis, Christian Slaves, Muslim Masters (New York: Palgrave Macmillan, 2003), pp. 4-5, 23, 36, 41-42, 74. Sir Godfrey Fisher, Barbary Legend: War, Trade and Policy in North Africa, 1415-1830 (Oxford: Oxford Univ. Press, 1957), pp. 290-91. Max Boot, The Savage Wars of Peace: Small Wars and the Rise of American Power (New York: Basic, 2002), pp. 6-8. Maria Martin, History of the Captivity and Sufferings of Maria Martin (Philadelphia: Jacob Meyer, 1811), p. 37. Questions have been raised about the veracity of Martin's account, though her descriptions of the ordeals of captivity in North Africa accord with those of many other former prisoners. See James R. Lewis, "Savages of the Seas: Barbary Captivity Tales and Images of Muslims in the Early Republic," Journal of American Culture 13, no. 2 (Summer 1990): 68.

3. Joseph Wheelan, Jefferson's War: America's First War on Terror, 1801-1805 (New York: Carroll & Graf, 2003), p. 36. Parker, Uncle Sam in Barbary, pp. 33-34 ("We had already lost five"). Charles A. Goodwin, Narrative of Joshua Gee of Boston, Mass., While He Was Captive in Algeria of the Barbary Pirates, 1680-1687 (Hartford: Wadsworth Atheneum, 1943), pp. 1-29. Simon Smith, "Piracy in Early British America," History Today 46 (May 1996).

4. Letters of Delegates to Congress, 1774-1789, ed. Paul Smith

(Washington, D.C.: Library of Congress, 1995): Pierse Long to John Langdon, Aug. 6, 1786, p. 433. Alexander DeConde, A History of American Foreign Policy (New York: Scribner, 1971), pp. 21, 41 ("The Americans cannot protect"). The Revolutionary War Diplomatic Correspondences of the United States. ed. Francis Wharton (Washington, D.C.: GPO, 1889): Salva to Franklin, April 1, 1783, p. 357. Bradford Perkins, The Cambridge History of American Foreign Relations, vol. 1, The Creation of a Republican Empire, 1776-1865 (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1993), pp. 33 ("No nation can be trusted"), 46, 69. Robert J. Allison, The Crescent Obscured: The United States and the Muslim World, 1776- 1815 (New York: Oxford Univ. Press, 1995), p. 3.

5. E. Dupuy, Américains et Barbaresques (Paris: R. Roger et F. Chernoviz, 1910), p. 8 ("to use its best offices"). The Writings of Benjamin Franklin, vol. 10, ed. Albert Smyth (New York: Haskell House, 1970): Franklin to Robert Livingston, July 7, 1783, p. 71 ("If there were no Algiers"). See also The Papers of George Mason, 1725-1792, ed. Robert Rutland (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 1970): George Mason to Hunter, Allison and Company, Aug. 8, 1783, pp. 788-89. Louis B. Wright and Julia H. Macleod, The First Americans in North Africa: William Eaton's Struggle for a Vigorous Policy against the Barbary Pirates, 1799-1805 (New York: Greenwood, 1945), p. 15. Seton Dearden, A Nest of Corsairs (London: Butler and Tanner, 1976), p. 151. Parker, Uncle Sam in Barbary, pp. 218-19 ("there is no advantage").

6. Paul Baepler, ed., White Slaves, African Masters: An Anthology of

American Barbary Captivity Narratives (Chicago: Univ. of Chicago Press, 1999), pp. 77-80. Stephen Clissold, The Barbary Slaves (London: Paul Elek, 1977), p. 3 ("They made signs"). A. B. C. Whipple, To the Shores of Tripoli: The Birth of the U.S. Navy and Marines (New York: Morrow, 1991), p. 26. H. G. Barnby, The Prisoners of Algiers: An Account of the Forgotten American-Algerian War, 1785-1797 (New York: Oxford Univ. Press, 1966), pp. 2-3. Gardner W. Allen, Our Navy and the Barbary Corsairs (Boston: Houghton Mifflin, 1905), pp. 8-9 ("sabers grasped"). Donald Barr Chidsey, The Wars in Barbary: Arab Piracy and the Birth of the United States Navy (New York: Crown, 1971), p. 7.

7. The Letters of Richard Henry Lee, ed. James Ballagh (New York: Macmillan, 1914), vol. 2: Lee to Thomas Shippen, Oct. 14, 1785, p. 392 ("Curse and doubly curse"); Lee to Samuel Adams, Oct. 17, 1785, p. 396. John Jay Papers: 1968, 13031, Jay to William Bingham, Feb. 12, 1785; Jay to Bowen, May 24, 1786. Naval Documents Related to the United States Wars with the Barbary Powers, ed. Dudley Knox, 6 vols. (Washington, D.C.: GPO, 1939), vol. 1: O'Brien, Coffin, and Stevens to Thomas Jefferson, June 8, 1786, p. 2. David McCullough, John Adams (New York: Simon & Schuster, 2001), p. 352. Barnby , Prisoners of Algiers, pp. 3-9, 25-26. Allison, Crescent Obscured, pp. xiv-xv. Allen, Our Navy, pp. 13, 25, 21-22 ("perfectly dark"). Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 25-26, 69. A Journal of the Captivity and Sufferings of John Foss (Newburyport: Angier March, 1798), pp. 17 ("Now I have got you"), 20, 24, 33. DeConde, History of American Foreign Policy, p. 41 ("It will not be"). Lawrence A. Peskin, "The

Lessons of Independence: How the Algerian Crisis Shaped Early American Identity," Diplomatic History 28, no. 3 (June 2004): 299-300 ("The Algerians are cruising"). Walter A. McDougall, Promised Land, Crusader State: The American Encounter with the World since 1776 (New York: Mariner Books, 1997), p. 37.

8. The Writings of Thomas Jefferson, ed. Paul Ford (New York: Putnam, 1970): Jefferson to James Monroe, Nov. 11, 1783, pp. 10-11 ("We ought to begin"). Allen, Our Navy, p. 37 ("It will procure us"). See also Thomas Jefferson Papers: Gerard W. Gawalt, "America and the Barbary Pirates: An International Battle Against an Unconventional Foe," on memory.loc.gov/ammem/mtjhtml/mtjprece.html ("temper of my countrymen"). DeConde, History of American Foreign Policy, p. 83 ("sink us under them" and "erect and independent attitude"). Joseph J. Ellis, American Sphinx. The Character of Thomas Jefferson (New York: Vintage, 1998), p. 26 ("combined great depth"), and Founding Brothers: The Revolutionary Generation (New York: Vintage, 2002), pp. 233-42. William M. Fowler, Jack Tars and Commodores: The American Navy, 1783-1815 (Boston: Houghton Mifflin, 1984), p. 5. I am aware of the controversy surrounding Jefferson's relationship with Sally Hemmings; geneticists have determined that Thomas Jefferson was almost certainly the father of Hemming's son, Eston.

9. The Emerging Nation: A Documentary History of the Foreign Relations of the United States under the Articles of Confederation, 1780-1789, vol. 2, ed. Mary Giunta (Washington, D.C.: National Historical Publications and Records Commission, 1996): Thomas Jefferson to James Monroe, Feb. 6,

1785, p. 543. The Papers of George Washington, ed. W. W. Abbit (Charlottesville: Univ. Press of Virginia, 1995): Lafayette to Washington, Jan. 13, 1787, p. 514. Lafayette in the Age of the American Revolution, vol. 5, ed. Stanley Idzerda and Robert Crout (Ithaca: Cornell Univ. Press, 1983): Lafayette to Adams, Jefferson, and Franklin, April 8, 1785, p. 315.

10.Writings of Thomas Jefferson, ed. Ford: Jefferson to James Monroe, Nov. 11, 1783, pp. 10-11 ("The states must see"). The Writings of Thomas Jefferson, ed. Andrew A. Lipscomb (Washington, D.C.: Thomas Jefferson Memorial Association, 1905): Jefferson to John Page, Aug. 20, 1785, p. 91 ("Honour as well as"). John Jay Papers: Jay to Jefferson, Adams, and Franklin, March 11, 1785 ("the Influence of…Courts"). Whipple, To the Shores of Tripoli, p. 23.

11. Writings of Thomas Jefferson, ed. Lipscomb: Jefferson to William Carmichael, Nov. 4, 1785, p. 194 ("His manners and appearance"). Barnby , Prisoners of Algiers, p. 75 ("I hope never to see"). Parker, Uncle Sam in Barbary, pp. 37-38, 217-19. Ray Irwin, The Diplomatic Relations of the United States with the Barbary Powers, 1776-1816 (New York: Russell & Russell, 1970), pp. 49-50.

12. Emerging Nation, vol. 1: John Adams to John Jay, Feb. 17, 1786, p. 96. The John Jay Papers: 4605, Jay to Congress, Aug. 2, 1787. Walter Livingston Wright, "American Relations with Turkey to 1831" (Ph.D. diss., Princeton Univ., 1928), pp. 1-2 ("pestilence and war"). Allison, Crescent Obscured, pp. 8, 14-16. McCullough, John Adams, pp. 352-53. Allen, Our Navy, pp. 36- 37.

13. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 4-5 ("the Dignity of Congress"). The Adams-Jefferson Letters: The Complete Correspondence between Thomas Jefferson and Abigail and John Adams, ed. Lester J. Cappon (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 1959): Adams to Jefferson, July 13, 1786, p. 139. Emerging Nation, vol. 1: Letter from John Adams to John Jay, June 27, 1786, p. 207; vol. 2: John Adams to John Jay, Dec. 15, 1784, p. 513 ("unfeeling tyrants"). McCullough, John Adams, p. 366 ("We ought not to fight").

14. Emerging Nation, vol. 3: Jefferson and Adams to John Jay, March 28, 1786, pp. 135-36 ("It was…written") . Adams-Jefferson Letters: Adams to Jefferson, June 6, 1786, p. 133. Writings of Thomas Jefferson, ed. Ford: Thomas Jefferson to James Monroe, Aug. 11, 1786, pp. 264-65 ("an angel sent on this business"). Writings of Benjamin Franklin: Franklin to William Carmichael, March 22, 1785, pp. 301-2. McCullough, John Adams, p. 354. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 7-10. Allen, Our Navy, pp. 30-31. Allison, Crescent Obscured, p. 12 ("a universal and horrible War").

15. Revolutionary War Diplomatic Correspondences of the United States: Franklin to Congress, May 26, 1779, pp. 192-93. Diary and Autobiography of John Adams, vol. 3, Diary 1782- 1804 (Cambridge: Harvard Univ. Press, Belknap Press, 1961), entries for March 19 and March 20, 1785, pp. 174-75. John Jay Papers: 3891, Jay to Congress, March 22, 1786. Emerging Nation, vol. 1: John Adams to John Jay, Feb. 16, 1786 ("Innocence and the Olive Branch"), p. 95. Jerome B. Weiner, "Foundations of U.S. Relations with Morocco and the Barbary States," Hespris-Tamuda [Morocco] 20-21

(1982-83), pp. 165-82. Field, America and the Mediterranean World, pp. 32-33, 40. Allen, Our Navy, pp. 27-30. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 8-9. The text of the treaty is reproduced in J. C. Hurewitz, ed., The Middle East and North Africa in World Politics: A Documentary Record, vol. 1, European Expansion, 1535-1914, 2d ed. (New Haven: Yale Univ. Press, 1975), pp. 103-5.

16. The Writings of Thomas Jefferson: Jefferson to Humphreys, Aug. 14, 1786, p. 400 ("public treasury"). The Writings of George Washington from the Original Manuscript Sources, 1745-1799, vol. 38, ed. John Fitzpatrick (Washington, D.C.: GPO, 1938): Washington to Lafayette, March 25, 1787, p. 185 ("the highest disgrace"); Washington to Lafayette, Aug. 15, 1786, p. 521 ("Would to Heaven"). Whipple, To the Shores of Tripoli, p. 21. Boot, Savage Wars of Peace, p. 10. U.S. Naval History: The Reestablishment of the Navy, 1787-1801, on http://www.history.navy.mil/biblio/bibli04/bibli04a.htm. The Documentary History of the Ratification of the Constitution, ed. John Kaminksi and Gaspare Saladino (Madison: State Historical Society of Wisconsin, 2001): Russell to Adams, p. 47 ("Without a national system"). Parker, Uncle Sam in Barbary, p. 44 ("Our sufferings"). Field, America and the Mediterranean World, p. 33 ("See what dark prospect").

17. Documentary History of the Ratification of the Constitution: Speech by James Madison before the Virginia Constitutional Convention, June 12, 1788, p. 1206. Writings of George Washington: Washington to Lafayette, Aug. 15, 1787, p. 260. Letters of Delegates to Congress: Virginia Delegates

to Edmund Randolph, Nov. 3, 1787, p. 539. James Madison, Notes of Debates in the Federal Convention of 1787 (Athens: Ohio Univ. Press, 1966), p. 549. Perkins, Cambridge History of American Foreign Relations, p. 69. See also Julia H. Macleod, "Jefferson and the Navy: A Defense," Huntington Library Quarterly 8 (Feb. 1945): 154.

18. Documentary History of the Ratification of the Constitution, pp. 47, 160, 567 ("preposterous"), 1126 ("May not the Algerines"), 1417 ("our sailors…in Algiers"). The Debate on the Constitution, ed. Bernard Bailyn (Washington, D.C.: Library of America, 1993): Hugh Williamson's Speech, Nov. 8, 1787, p. 233. The Republic of Letters: The Correspondence between Thomas Jefferson and James Madison, 1776-1826, ed. James Morton Smith (New York: Norton, 1995): Jefferson to Madison, May 8, 1784, p. 314; Madison to Jefferson, Oct. 8, 1788, p. 555; Jefferson to Madison, Jan. 12, 1789, p. 583.

19. Alexander Hamilton, John Jay, and James Madison, The Federalist Papers (Cutchogue, N.Y.: Buccaneer Books, 1992), pp. 49-50 ("federal navy…of respectable"), 207-8 ("maritime strength" and "the rapacious demands"). John Jay Papers: 4572, Jay to Congress, May 29, 1786; 10876, Jay to Lafayette, Oct. 28, 1786; 4605, Jay to Congress, Aug. 2, 1787. Thomas A. Bailey, A Diplomatic History of the American People (Englewood Cliffs, N.J.: Prentice-Hall, 1980), p. 65 ("The more we are ill-treated"). See also George Pellew, American Statesmen: John Jay (Cambridge, Mass.: Riverside Press, 1890), p. 239.

20. Mary Chrysostom Diebels, Peter Markoe (1752-1792): A Philadelphia Writer (Washington, D.C.: Catholic Univ. of America Press, 1944), pp. 1-3,

16, 50-61. Peter Markoe, The Algerine Spy in Pennsylvania; or, Letters Written by a Native of Algiers on the Affairs of the United States in America, from the Close of the Year 1783 to the Meeting of the Convention (Philadelphia: Prichard and Hall, 1787), pp. 25-30, 78-79, 104-5 ("totally ruined" and "plundered without"), 113-14. Bailey, Diplomatic History of the American People, p. 65. See also Lotfi Ben Rejeb, "Observing the Birth of a Nation: The Oriental Spy/Observer Genre and Nation Making in Early American Literature," in Abbas Amanat and Magnus T. Bernhardsson, eds., The United States and the Middle East: Cultural Encounters (New Haven: Yale Center for International and Area Studies, 2002), pp. 253-89.

21. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: Jefferson to the Senate and the House of Representatives, Dec. 30, 1790, p. 22; Edward Church to Thomas Jefferson, Oct. 12, 1793, p. 45. Writings of Thomas Jefferson, ed. Lipscomb: Jefferson to the Board of Treasury, May 16, 1788, p. 11 ("sea-dogs"); Jefferson to John Jay, Aug. 11, 1788, p. 121 ("that pettifogging nest"). Ellis, American Sphinx, p. 162 ("Algerine"). Allison, Crescent Obscured, pp. 9-10 ("suspended between indignation").

22. Writings of Thomas Jefferson, ed. Lipscomb: Jefferson to John Paul Jones, June 1, 1792, p. 355; Jefferson to Thomas Barclay, June 11, 1792, p. 367. Charles Stuart Kennedy, The American Consul: A History of the United States Consular Service, 1776-1914 (New York: Greenwood, 1990), p. 29 ("as a great People"). Writings of Thomas Jefferson, ed. Paul Ford: Jefferson to James Monroe, Nov. 11, 1783, pp. 10-11 ("John Paul Jones").

23. Writings of Thomas Jefferson, ed. Lipscomb: Jefferson to Thomas

Barclay, June 11, 1792, p. 367. John Jay Papers: 5052, Temple to Jay, June 7, 1786. The Papers of Alexander Hamilton, ed. Harold Syrett, 27 vols. (New York: Columbia Univ. Press, 1961-87): Hamilton to William Seton, April 22, 1794, vol. 16, p. 312. The Life and Correspondence of Rufus King, ed. Charles King (New York: Putnam, 1894): John Alsop to Rufus King, Dec. 15, 1793, p. 505. Irwin, Diplomatic Relations of the United States, p. 80.

24. Writings of George Washington, vol. 33: Washington to Jonathan Trumbull, Aug. 20, 1793, p. 125; President's Sixth Annual Address to Congress, Dec. 13, 1793, p. 166 ("If we desire").

25. Annals of the Congress of the United States: Third Congress (Washington, D.C.: Gales and Seaton, 1849), pp. 433, 434 ("Bribery alone," "a Secretary of [the] Navy," and "we are no match"), 436 ("Our commerce is"), 439 ("at war with"), 447-48 ("pusillanimous measures"). Craig L. Symonds, Navalists and Antinavalists: The Naval Policy Debate in the United States, 1785-1827 (Newark: Univ. of Delaware Press, 1980), pp. 27-37. See also The Papers of Josiah Bartlett, ed. Frank Mevers (Hanover: Univ. Press of New England, 1979): Paine Wingate to Josiah Bartlett, Feb. 24, 1794, p. 403.

26. Papers of Alexander Hamilton: John Quincy Adams to Hamilton, Dec. 5, 1795, vol. 17, pp. 420-21; Edmund Randolph to Hamilton, William Bradford, and Henry Knox, vol. 16, pp. 498-99. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: Samuel Calder to David Pearce, Dec. 4, 1793, p. 57; George Washington to Congress, Feb. 8, 1795, p. 93; Joel Barlow to Jefferson, March 18, 1796, pp. 140-41. Allison, Crescent Obscured, pp. 31,

141 ("stigma on the American"). Frances Diane Robotti and James Vescovi, The USS Essex and the Birth of the American Navy (Holbrook, Mass.: Adams Media Corp., 1999), p. 12. Field, America and the Mediterranean World, p. 7. Allen, Our Navy, p. 51 ("If I were to make peace").

27. Among the gifts given Tunis by the United States were "1 Fusee, 6 feet long, mounted with gold set with diamonds; 4 set with gold mounting, ordinary length; 1 pr. of pistols mounted with gold, set with diamonds; 1 poniard, enameled, set with diamonds; 1diamond ring; 1 gold repeating watch, with diamonds, chain the same, 6 pieces of brocade of gold; 30 pieces superfine cloth of different colors; 6 pieces Satin, different colors." See Irwin, Diplomatic Relations of the United States, pp. 100-1. Republic of Letters: Madison to Jefferson, Feb. 21, 1796, pp. 921-22; Jefferson to Madison, April 17, 1796, pp. 931-32. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: Barlow to Jefferson, March 18, 1796, pp. 140-41; O'Brien to Jefferson, Jan. 12, 1797, pp. 192-93 ("25 chests of tea"); Barlow to Jefferson, Aug. 18, 1797, p. 208 ("To what height"); Barlow to Jefferson, Aug. 24, 1797, p. 209 ("You are a liar"). Kennedy, American Consul, pp. 30-32. Allen, Our Navy, pp. 23-24, 53-54 ("Our people have conducted"), 56-57. Barnby, Prisoner of Algiers, pp. 304, 318. Foss, Journal of the Captivity, p. 123 ("No nation of Christendom"). Milton Cantor, "Joel Barlow's Mission to Algiers," Historian 25 (1963). See also Library of Congress States," United the with Country Studies, "Algeria, Relations memory.loc.gov/cgi-bin/query/r?frd/cstdy:@field(DOCID+dz0025).

28. Royall Tyler, The Algerine Captive; or, The Life and Adventures of

Doctor Updike Underhill, Six Years a Prisoner among the Algerines (Hartford: Peter B. Gleason, 1816), pp. 196, 239. Anonymous, The American in Algiers; or, The Patriot of Seventy-six in Captivity (New York: J. Buel, 1797), p. 16 ("Does Columbia"). Susanna Rowson, Slaves in Algiers; or, The Struggle for Freedom (Philadelphia: Wrigley and Berriman, 1794), p. 48 ("What, give it up").

29. James Leander Cathcart, Tripoli (LaPorte, Ind.: Herald Print, 1901): Cathcart to Pickering, Aug. 16, 1799, p. 67. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: Barlow to Jefferson, Aug. 24, 1797, p. 209. Kennedy, American Consul, pp. 2-3.

2. The Hostile and Ethereal Orient

1. Abbas, Hamdani, "Columbus and the Recovery of Jerusalem," Journal of the American Oriental Society 99, no. 1 (1979) pp. 43 ("As…enemies), 44 ("all the gain"). Robert Irwin, For Lust of Knowing: The Orientalists and their Enemies (London: Penguin, 2007), pp. 60-62, 87-88, 100. George Sandys, Description of the Ottoman Empire (Amsterdam: Theatrum Orbis Terrarum, 1973), p. 36. Philip L. Barbour, The Three Worlds of Captain John Smith (Boston: Houghton Mifflin, 1964), pp. 45-49. Timothy Worthington Marr, "Imagining Ishmael: Studies of Islamic Orientalism from the Puritans to Melville" (Ph.D. diss., Yale Univ., 1997), pp. 1-2, 30-33, 70 ("an emissary of Satan"), 87-89. Douglas Little, American Orientalism: The United States and the Middle East since 1945 (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 2002), pp. 12-13, 73-74. Allison, Crescent Obscured, pp. xiv-xviii, 45-46, 61-64. Josiah Strong, "Anglo-Saxon Predominance (1891),"

http://xroads.virginia.edu/~DRBR/strong.html ("The Eastern nations sink"). Translating the Untranslatable: A Survey of English Translations of the Quran, http://www.quranicstudies.com/article32.html. A. J. Arberry, The Koran Interpreted (New York: Macmillan, 1955), pp. 7 ("so viewing thine enemies"), 8 ("contradictions, blasphemies"), 10 ("attack the Koran"). Humphrey Prideaux, The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mahomet (Fairhaven, Vt.: James Lyon, 1798), p. 108.

2. Henry Hugh Brackenridge and Philip Freneau, Father Bombo's Pilgrimage to Mecca, 1770, ed. Michael Davitt Bell (Princeton: Princeton Univ. Library, 1975), pp. 7 ("to change thy religion"), 92 ("I prostrated myself"). Ros Ballaster, Fabulous Orients: Fictions of the East in England, 1662- 1785 (Oxford: Oxford Univ. Press, 2005), pp. 8, 33, 54-56, 72, 77. Alain Grosrichard, The Sultan's Court: European Fantasies of the East (London: Verso, 1998), p. 79. Mohammed Sharafuddin, Islam and Romantic Orientalism: Literary Encounters with the Orient (London: I. B. Tauris, 1994), pp. xxv-xxvi, 64, 107. Ben Rejeb, "Observing the Birth of a Nation," pp. 256-57. Claude Étienne Savary, Letters on Egypt, Containing a Parallel between the Manners of Its Ancient and Modern Inhabitants (London: G. G. J. and J. Robinson, 1787). Irwin, For Lust of Knowing, p. 109 ("the present terror"). Constantin-François Volney, Voyage en Syrie et en Egypte, pendant les années 1783, 1784, et 1785 (Paris: Desenne et Volland, 1787).

3. Daniel Beaumont, Slave of Desire: Sex, Love, and Death in 1,001 Nights (Madison, N.J.: Fairleigh Dickinson Univ. Press, 2002), p. 42. Husain Haddawy, trans., The Arabian Nights (New York: Norton, 1990), pp. xv-xvii.

Novelists Magazine 18 (Containing The Arabian Nights Entertainment) (London: Harrison, 1785). Adele L. Younis, "The Arabs Who Followed Columbus,"Arab World 12, no. 3 (March 1966). Excerpt from The Arabian Night Entertainment: Consisting of One Thousand and One Stories, the First American Edition, Freely Transcribed from the Original Translation by Galland (Baltimore: H. & P. Rice and J. Rice, 1794). Susan Nance, "Crossing Over: A Cultural History of American Engagement with the Muslim World, 1830-1940" (Ph.D. diss., Univ. of California, Berkeley, 2003), p. 25. See also the Arabian Nights Resource Center, http://www.crock11.freeserve.co.uk/arabian.htm.

4. Alexis de Tocqueville, Democracy in America, ed. J. P. Mayer, trans. George Lawrence (New York: Harper & Row, 1969), p. 536. Edward McNall Burns, The American Idea of Mission: Concepts of National Purpose and Destiny (New Brunswick: Rutgers Univ. Press, 1957), p. 125. Daniel Boorstin, The Americans: The National Experience (New York: Random House, 1965), pp. 219, 264. William H. Goetzmann, New Lands, New Men: America and the Second Great Age of Discovery (New York: Viking, 1986), pp. 1, 5, 14. Frederick Jackson Turner, The Frontier in American History (1920; reprint, New York: Henry Holt, 1947), pp. 2, 30, 37, 38.

5. Sparks, Life of John Ledyard, p. 305 ("Alexandria at large"). P. J. Vatikiotis, The History of Egypt: From Muhammad Ali to Sadat (Baltimore: Johns Hopkins Univ. Press, 1980), pp. 30-38. Samir Khalaf, Persistence and Change in 19th Century Lebanon (Beirut: American Univ. of Beirut, 1979), pp. 16-31. Bernard Lewis, The Emergence of Modern Turkey (London:

Oxford Univ. Press, 1968), pp. 21-39, and The Crisis of Islam: Holy War and Unholy Terror (New York: Modern Library, 2003), pp. 64-65.

6. Augur, Passage to Glory, pp. 265, 276 ("The Mahometans [are] a superstitious"), 277-80. Zug, American Traveler, p. 222 ("infinitely below"). Sparks, Life of John Ledyard, pp. 306, 307 ("This was about" and "nothing merits more"), 309, 310 ("very, very humiliating"), 314-15. Finnie, Pioneers East, pp. 139-40 ("dust, hot"). See also Robert D. Kaplan, The Arabists: The Romance of an American Elite (New York: Free Press, 1993), pp. 16-17.

7. Finnie, Pioneers East, p. 140 ("a bilious complaint"). Wood, "John Ledyard the Traveler," ("full and perfect health"). Significant disagreement surrounds the date of Ledyard's death. Augur places it on March 4, 1789, and Dr. Wood on Jan. 17. Sparks, the official biographer, speculates that the time was late Nov. 1788 On the basis of Ledyard's last letter to Jefferson, I have remained with Sparks's date, albeit without certainty.

8. "An Egyptian Anecdote," Ladies' Magazine, April 1793 ("although generally tender"); "An Account of Egypt and Alexandria," Feb. 1793 ("absorbed in surprise"). Augur, Passage to Glory, p. 282 ("That Man"). J. Fred Rippy, Joel R. Poinsett: Versatile American (Durham: Duke Univ. Press, 1935), pp. 27-29. Finnie, Pioneers East, p. 14 ("long red pantaloons"). George Barrell, Letters from Asia: Written by a Gentleman of Boston, to His Friend in That Place (New York: A. T. Goodrich, 1819), p. 35 ("having perused"). Bruce G. Tigger, "Egyptology, Ancient Egypt, and the American Imagination," in Nancy Thomas, ed., The American Discovery of Ancient Egypt (New York: Abrams, 1995), pp. 21-22. Thomas Jefferson, The

Writings of Thomas Jefferson, vol. 7 (Washington, D.C.: Thomas Jefferson Memorial Association of the United States, 1903), p. 78. Ziff, Return Passages, p. 53 ("Ledyard was a great favourite").

3. A Crucible of American Identity

1. Thomas Harris, The Life and Services of Commodore William Bainbridge, United States Navy (Philadelphia: Carey Lea and Blanchard, 1837), pp. 37, 45 ("You pay me tribute"). Robotti and Vescovi, USS Essex, pp. 70-72. Finnie, Pioneers East, pp. 48-50. Whipple, To the Shores of Tripoli, p. 56. Allen, Our Navy, pp. 75, 80-81. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 31 ("To save the peace), 32-33 ("mortifying degradations"), 35-36. Richard Zacks, The Pirate Coast: Thomas Jefferson, the First Marines, and the Secret Mission of 1805 (New York: Hyperion, 2005), pp. 13-15, 24.

2. Lord Kinross, The Ottoman Centuries: The Rise and Fall of the Turkish Empire (New York: Morrow Quill, 1977), pp. 429-36. Stanford Shaw, History of the Ottoman Empire and Modern Turkey, vol. 1, Empire of the Gazis: The Rise and Decline of the Ottoman Empire, 1280-1808 (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1976), pp. 260-74. Henry A. S. Dearborn, The Life of William Bainbridge, Esq., of the United States Navy (Princeton: Princeton Univ. Press, 1931), p. 20. Barnby, Prisoner of Algiers, pp. 37, 84. Henry S. Osborn, Palestine, Past and Present (Philadelphia: James Challen and Son, 1859), p. 505. Field, America and the Mediterranean World, pp. 114-15. Lewis, Crisis of Islam, p. 66 ("heavenly bodies"). Turgay, "Ottoman-American Trade," p. 205.

3. Glenn Tucker, Dawn like Thunder: The Barbary Wars and the Birth of the

U.S. Navy (New York: Bobbs-Merrill, 1963), pp. 15-18. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 31-32 ("Had we 10 or 12"), 34 ("Did the United States know"), 37-41, 42 ("Capitaines Vilon"). Allen, Our Navy, pp. 85-86. Field, America and the Mediterranean World, pp. 115-16. Bainbridge letter to Stodder, in Robotti and Vescovi, USS Essex, p. 76. Harris, Life and Services of Commodore William Bainbridge, p. 60.

4. Republic of Letters: Jefferson to Madison, Aug. 28, 1801, pp. 1193-94 ("enemy to all these" and "send the powder"). Thomas Jefferson Papers: Jefferson to Wilson Cary Nicholas, June 11, 1801 ("There is no end"). The Writings of Albert Gallatin, ed. Henry Adams, vol. 1 (New York: Antiquarian Press, 1960): Gallatin to Jefferson, Dec. 1802, pp. 104-5. Kenneth J. Hagan, This People's Navy: The Making of American Sea Power (New York: Free Press, 1991), p. 55 ("deeply affected"). Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: Cathcart to Dale, Sept. 17, 1801, Cathcart to Madison, April 18, 1802, p. 127 ("to buy peace").

5. Field, America and the Mediterranean World, p. 49 ("sinking, burning"). Herbert E. Klingelhofer, "Abolish the Navy!" Manuscripts 33, no. 4 (Fall 1981): 279-83. Macleod, "Jefferson and the Navy," p. 170. Allen, Our Navy, pp. 89-90 ("a delay on your part"), 94, 112-13. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 31-36. Dumas Malone, Jefferson the President: First Term, 1801-1805 (Boston: Little, Brown, 1970), p. 98.

6. The Enterprise was commanded by Lt. Andrew Sterrett. See Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: National Intelligencer, Nov. 18, 1801, p. 539. Allen, Our Navy, pp. 89-91 92-93, 97-101. Robotti

and Vescovi, USS Essex, pp. 78-79, 91-93. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: Dale to Cathcart, Aug. 25, 1801, p. 560 ("amuse"). Whipple, To the Shores of Tripoli, p. 79. Field, America and the Mediterranean World, p. 49. Boot, Savage Wars of Peace, pp. 13-14.

7. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: Dale to the Acting Secretary of the Navy, July 30, 1801, p. 535 ("the whole tribe"). Circular Letters of Congressmen to Their Constituents, 1789-1829, ed. Noble Cunningham (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 1978), vol. 1: Letter from John Stratton, April 22, 1802, p. 281. Whipple, To the Shores of Tripoli, p. 96 ("Shall we buy"). For a fuller discussion of the constitutional aspects of Jefferson's policy toward North Africa, see Robert F. Turner, "The War on Terrorism and the Modern Relevance of the Congressional Power to 'Declare War,'" Harvard Journal of Law & Public Policy 25 (2002). See also Gordon Silverstein, Imbalance of Powers: Constitutional Interpretation and the Making of American Foreign Policy (Oxford: Oxford Univ. Press, 1997), and David N. Mayer, "By the Chains of the Constitution: Separation of Powers Theory and Jefferson's Conception of the Presidency," Perspectives on Political Science 26 (1997).

8. Republic of Letters: Madison to Jefferson, March 17, 1802, p. 1265; Jefferson to Madison, March 22, 1802, p. 1267; Madison to Jefferson, July 22, 1802, p. 1231. Allen, Our Navy, pp. 89-93, 109-10, 130-31. Thomas Jefferson Papers: Jefferson to Albert Gallatin, March 28, 1803. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 2: Murray to Captain Richard Morris, Aug. 20, 1802, p. 242; Excerpt from the Journal of Henry

Wadsworth, Feb. 26, 1803, p. 437 ("Twas good sport"); vol. 3: Captain Murray to Congressman Joseph Nicholson, Nov. 5, 1803, p. 201. Cathcart, Tripoli, p. 111 ("venal wretch"). Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 88, 90, 99. Boot, Savage Wars of Peace, pp. 14-15 ("best exertions").

9. The Republic of Letters: Madison to Jefferson, July 22, 1802, p. 1231; Jefferson to Madison, Aug. 17, 1802, p. 1264; Jefferson to Madison, March 19, 1803, p. 1266. Life and Correspondence of Rufus King: King to Madison, July 19, 1802, p. 149 ("Our security"). Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 65 ("rest the safety"), 113. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 3: Preble to the Secretary of the Navy, Sept. 22, 1803, p. 70 ("The Moors"); Preble to Cathcart, March 18, 1804, p. 501. Robotti and Vescovi, USS Essex, pp. 112-13 ("his savage highness").

10. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 3: Bainbridge to James Simpson, Aug. 29, 1803 ("I sincerely hope"); John Ridgeley to Susan Decatur, Nov. 10, 1826, p. 425. Robotti and Vescovi, USS Essex, p. 100. Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 114, 121. Allen, Our Navy, pp. 147-48 ("It is with deep regret"), 152-53, 164-65. Zacks, Pirate Coast, p. 48 ("Gift of Allah"). Harris, Life and Services of Commodore William Bainbridge, pp. 81, 92. Mohamed El Mansour, "The Anachronism of Maritime Jihad: The U.S.-Moroccan Conflict of 1802-1803," in Jerome Bookin-Weiner and Mohamed El Mansour, eds., The Atlantic Connection: 200 Years of Moroccan- American Relations, 1786-1986 (Rabat: Edino Press, 1990).

11. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 3: Preble to the Secretary of the Navy, Dec. 10, 1803, pp. 256-57 ("Would to God").

James Tertius De Kay, A Rage for Glory: The Life of Commodore Stephen Decatur (New York: Free Press, 2004), pp. 38 ("We are now about"), 56. Allen, Our Navy, pp. 157, 160-73 ("The flames…ascending"). Robotti and Vescovi, USS Essex, p. 102. Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 121, 123, 136. Field, America and the Mediterranean World, p. 60.

12. MML: William Eaton, Interesting Detail of the Operations of the American Fleet in the Mediterranean, Communicated in a Letter from W. E. Esq. to His Friend in the County of Hampshire (Springfield, Mass.: Bliss & Brewer, 1804), p. 7 ("bayonet, spear"). De Kay, Rage for Glory, p. 67 ("Some of the Turks"). Allen, Our Navy, pp. 181-85, 192-94, 214, 217. Niles' Weekly Register, March 7, 1812, p. 12 ("done more for the cause"). Robotti and Vescovi, USS Essex, pp. 78-79, 91-93. Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 142, 156. Harris, Life and Services of Commodore William Bainbridge, p. 116. Field, America and the Mediterranean World, p. 60 ("The most bold") . Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 3: Preble to the Secretary of the Navy, Feb. 19, 1804, p. 439 ("spend [his] life"); John Hall to William Burrows, Dec. 7, 1803, p. 254 ("eight oz. of bread); vol. 4: Preble to the Secretary of the Navy, Sept. 18, 1804, p. 301 ("I cannot but regret"). Jonathan Cowdery, American Captives in Tripoli (Boston: Belcher & Armstrong, 1806), pp. 13, 17 ("Such attempts served").

13. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 4: Diary of Surgeon Jonathan Cowdery, entry for Aug. 10, 1804, pp. 64-65. Thomas A. Bryson, Tars, Turks, and Tankers: The Role of the United States Navy in the Middle East, 1800-1979 (London: Scarecrow, 1980), p. 14. Allen, Our

Navy, pp. 176-77, 203-9, 217-18. Boot, Savage Wars of Peace, p. 22 ("like so many planets"). Robotti and Vescovi, USS Essex, p. 123. Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 149, 172, 221 ("You have done well").

14. Writings of Albert Gallatin: Gallatin to Jefferson, Aug. 16, 1802, pp. 88-89; Gallatin to Jefferson Jan. 18, 1803, 116. Republic of Letters: Jefferson to Madison, April 27, 1804, pp. 1324-25 ("the most serious one," "begging alms," and "beat…[the Algerians'] town"). Thomas Jefferson Papers, Princeton Univ.: Jefferson to Robert Smith, April 27, 1804. Allen, Our Navy, p. 197. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 1: Cathcart to Dale, Sept. 17, 1801, p. 572; Cathcart to Madison, April 18, 1802, p. 127. Nathan Schachner, Thomas Jefferson: A Biography (New York: Thomas Yoseloff, 1951), pp. 685-86.

15. William Eaton Papers (WEP) (San Marino, Calif.: Huntington Library). Negociations of the United States with the Kingdom of Tunis: William Eaton [no recipient], Feb. 21, 1799, p. 37 ("No man will"); roll 1: Eaton to Pynchon, Oct. 12, 1799 ("a man not overly"). Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 177-78 ("a great bulldog"). Kitzen, Tripoli and the United States at War, pp. 25-26. Wright and Macleod, First Americans in North Africa, p. 19.

16. WEP, Negociations of the United States with the Kingdom of Tunis: Remarks &c made at Algiers: Feb. 13, 1799, p. 28 ("Universal God"); William Eaton to "Honorable Secretary of the United States," April, 1799, 117 ("land of rapine," "Genius of my country!" and "There is but one"); Eaton to General Smith, Aug. 19, 1802 ("Are we then"); Continued Communications from Tunis in Barbary: Eaton to Cathcart, Aug. 8, 1802, p.

237 ("[The] Government may as well"). Zacks, Pirate Coast, p. 31 ("a fiddle bow"). Wright and Macleod, First Americans in North Africa, pp. 20-21, 49-50. Field, America and the Mediterranean World, pp. 41-42. Allen, Our Navy, pp. 68-69. Allison, Crescent Obscured, pp. 168, 177.

17. WEP, Negociations of the United States with the Kingdom of Tunis: Eaton to William Smith, Nov. 13, 1800 ("a cowardly Jew"); Eaton to General Smith, Aug. 19, 1802; Madison to Eaton, Aug. 22, 1802 ("zeal…and calculations"); William Eaton Journal, Sept. 4, 1804, p. 59 ("A whipt Spaniel!"). Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 54, 94-95, 183. Eaton to William Smith, May 24, 1801 ("buy[ing] oil of rose").

18. Eaton, Interesting Detail of the Operations, p. 29 ("sun-brown children"). See also R. C. Anderson, Naval Wars in the Levant, 1559-1853 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1952), p. 405. WEP, Continued Communications from Tunis in Barbary: Eaton to the Department of State, Sept. 5, 1801; Eaton to Samuel Lyman, Oct. 12, 1801; Eaton to Mr. James Uphorn, Aug. 11, 1802; Eaton to Hamet Dec. 14, 1804 ("God ordained"). Republic of Letters: Jefferson to Madison, Aug. 28, 1801, p. 1193. Robotti and Vescovi, USS Essex, p. 88. Allen, Our Navy, pp. 57-66, 110-12, 187, 217.

19. Zacks, Pirate Coast, pp. 184 "(Cash…is the only"), 188. WEP, William Eaton Journal, March 20, 1805, p. 20 ("o'er burning sands"); William Eaton Journal, March 30, 1805, p. 25 ("They have no sense"); Negociations of the United States with the Kingdom of Tunis: Eaton to the Governor of Derne, April 26, 1805 ("Let no difference"). Allen, Our Navy, pp. 229-32, 235-39, 243-44. Finnie, Pioneers East, p. 258. Field, America and the Mediterranean

World, pp. 53-54.

20. Republic of Letters: Madison to Jefferson, July 25, 1806, p. 1427; Madison to Jefferson, July 28, 1806, p. 1429; Madison to Jefferson, Sept. 4, 1806, p. 1438; Jefferson to Madison, Sept. 16, 1806, p. 1439. Robotti and Vescovi, USS Essex, p. 116. Field, America and the Mediterranean World, p. 55 ("Georgia, a Greek"). Whipple, To the Shores of Tripoli, p. 253 ("so unusually honorable").

21. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 2: Madison to Lear, July 14, 1805, p. 485. WEP, Negociations of the United States with the Kingdom of Tunis: Eaton to the Secretary of State, May 7, 1800; Eaton to Mr. Appleton, Feb. 18, 1800 ("covered with blood"); William Eaton to Com. Rodgers, on board the U.S. frigate Constellation, off Derne: June 13, 1805 ("uttering shrieks"). Zacks, Pirate Coast, p. 175. Whipple, To the Shores of Tripoli, pp. 235-37, 239, 244, 253. Harris, Life and Services of Commodore William Bainbridge, p. 123.

22. WEP, Hamet Bashaw Caramali to Eaton, June 29, 1805; Eaton to the President of the United States, Feb. 12, 1808 ("Honor recoils"). Republic of Letters: Jefferson to Madison, Aug. 2, 1806, pp. 1431-32. Allen, Our Navy, pp. 252-53, 256 ("You have acquired").

23. Whipple, To the Shores of Tripoli, p. 221. Thomas Jefferson Papers: Jefferson's Report to Congress, Dec. 3, 1805.

24. Republic of Letters: Jefferson to Madison, Sept. 1, 1807, p. 1494 ("to secure peace"). Perkins , Cambridge History of American Foreign Relations, pp. 145-46. Robotti and Vescovi, USS Essex, pp. 145-46. Hurewitz, Middle

East and North Africa, p. 202. Field, America and the Mediterranean World, p. 57. Allen, Our Navy, pp. 277 ("Should our differences"), 279 ("My policy"). An Affecting Narrative of the Captivity and Suffering of Thomas Nicholson Who Has Been Six Years a Prisoner among the Algerines (Boston: N. Coverly, 1818), pp. 5-6, 11.

25. Jonathan D. Sarna, Jacksonian Jew: The Two Worlds of Mordecai Noah (New York: Holmes & Meier, 1981), pp. 13-27, 28 ("It might be well"), 29-33. Isaac Goldberg, Major Noah: American-Jewish Frontier (Philadelphia: Jewish Publication Society of America, 1936), pp. 76-80, 117-26. See also Mordecai Manuel Noah, Correspondence and Documents Relative to the Attempt to Negotiate for the Release of the American Captives at Algiers Including Remarks on Our Relations with that Regency (Washington, D.C.: n.p., 1816). "Judaic Treasures of the Library of Congress: Mordecai Manuel Noah," http://www.us-israel.org/jsource/loc/noah.html. For David Franks, see Frederick C. Leiner, The End of Barbary Terror: American's 1815 War against the Pirates of North Africa (Oxford: Oxford Univ. Press, 2006), p. 30.

26. Allen, Our Navy, pp. 283-84, 286-87, 289 ("swept from the seas" and "dictated from the mouths"). Field, America and the Mediterranean World, p. 58 ("liberal and enlightened"). Boot, Savage Wars of Peace, pp. 27-28 ("powder as tribute"). Leiner, End of Barbary Terror, pp. 46-47, 68-69 ("serious disasters"). William Shaler, Sketches of Algiers (Boston: Cummings, Hillard, 1826), pp. 38 ("worthless a power"), 101 ("Islamism"), 126-27, 167-68. For the Madison-dey correspondence see Hurewitz, Middle East and North Africa, pp. 206-7. On the personality and foreign policy views

of James Madison, see J. C. A. Stagg, Mr. Madison's War: Politics, Diplomacy, and Warfare in the Early American Republic, 1783-1830 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1983), p. 506. Drew R. McCloy, The Last of the Fathers: James Madison and the Republican Legacy (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1989), pp. 18, 22, 26. Robert A. Rutland, The Presidency of James Madison (Lawrence: Univ. Press of Kansas, 1990), pp. 2, 18-20, 25-26.

27. Niles' Weekly Register, April 15, 1815 ("The name of an American"); Oct. 15, 1815 ("energy which liberty"). Marshall Smelser, The Democratic Republic (New York: Harper & Row, 1968), p. 60. Boot, Savage Wars of Peace, p. 28. Allison, Crescent Obscured, pp. 33, 201-6. Allen, Our Navy, p. 295 ("It was not to be"). Irving Brant, James Madison, vol. 6 (New York: Bobbs- Merrill, 1961), p. 398. Dennis Caplan, "John Adams, Thomas Jefferson, and the Barbary Pirates: An Illustration of Relevant Costs for Decision Making," Issues in Accounting Education 18, no. 3 (2003). James Ellison, The American Captive; or, The Siege of Tripoli: A Drama in Five Acts (Boston: Joshua Belcher, 1812). Joseph Hanson, The Musselmen Humbled; or, A Heroic Poem in Celebration of the Bravery Displayed by the American Tars, in the Contest with Tripoli (New York: Southwick and Hardcastle, 1806).

28. Jefferson to Adams, May 27, 1813, in Adams-Jefferson Letters, p. 325. See also Adams- Jefferson Letters: John Adams to Thomas Jefferson, June 11, 1813, pp. 328-29. WEP, Eaton to General Bradley, Jan. 15, 1810 ("I am closely besieged"). William Harlan Hale, "'General' Eaton and His

Improbable Legion," American Heritage 11, no. 2 (Feb. 1960): 106. Whipple, To the Shores of Tripoli, p. 280. Allison, Crescent Obscured, pp. 205-6. Field, America and the Mediterranean World, p. 336. Allen, Our Navy, pp. 265-66.

29. Naval Documents Related to the United States Wars, vol. 3: Statement by Mordecai Noah, Nov. 8, 1826, p. 232. John Martin Baker, A View of the Commerce of the Mediterranean (Washington, D.C.: Davis and Force, 1819), p. 67. Tibawi, American Interests in Syria, p. 2. Finnie, Pioneers East, pp. 32-33 ("What a reproof"), 119, 258. Smelser, Democratic Republic, p. 313.

4. Iluminating and Emancipating the World

1. Levi Parsons, The Dereliction and Restoration of the Jews: A Sermon, Preached in Park- Street Church Boston, Sabbath, Oct. 31, 1819, Just before the Departure of the Palestine Mission (Boston: Samuel T. Armstrong, 1819). Levi Parson, The Memoir of Rev. Levi Parsons, comp. Daniel Oliver Morton (New York: Arno Press, 1977), p. 219 ("The spirit of the missions"). Alvan Bond, Memoir of the Rev. Pliny Fisk (New York: Arno Press, 1977), pp. 63, 96-97 ("And now, behold"). Marty E. Martin, Pilgrims in Their Own Land: 500 Years of Religion in America (Boston: Little, Brown, 1984), pp. 146-47. Clifton Jackson Phillips, Protestant America and the Pagan World: The First Half Century of the American Board of Commissioners for Foreign Missions, 1810-1860 (Cambridge: Harvard Univ. Press, 1969), p. 135. Finnie, Pioneers East, pp. 150-51. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 13-16. Kaplan, Arabists, p. 21. Instructions to Fisk and

Pliny, in Field, America and the Mediterranean World, p. 93.

2. Barbara W. Tuchman, Bible and Sword: England and Palestine from the Bronze Age to Balfour (New York: Ballantine, 1956), pp. 80 ("the genius and history"), 81, 124-25. Edward Robinson, Biblical Researches in Palestine, Mount Sinai and Arabia Petraea, vol. 1 (Boston: Crocker and Brewster, 1841), p. 46. Yona Malachy, American Fundamentalism and Israel: The Relation of Fundamentalist Churches to Zionism and the State of Israel (Jerusalem: Graph Press, 1978). Everett Emerson, Puritanism in America, 1620-1750 (Boston: Twayne, 1977), pp. 71-72, 90-92. Cecelia Tichi, "The Puritan Historians and Their New Jerusalem," Early American Literature 6 (1971). John Davis, The Landscape of Belief: Encountering the Holy Land in Nineteenth-Century American Art and Culture (Princeton: Princeton Univ. Press, 1996), p. 14 ("Jerusalem was"). Shalom Goldman, ed., Hebrew and the Bible in America: The First Two Centuries. (Hanover: Brandeis Univ. Press and Dartmouth College, 1993), pp. xv-xxii, 105, and God's Sacred Tongue: Hebrew and the American Imagination (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 2004), p. 29 ("[In] New England").

3. Burns, The American Idea of Mission, pp. 5, 11, 18, 31, 261. Obenzinger, American Palestine, pp. 12, 28-29. Willard Sterne Randall, Alexander Hamilton: A Life (New York: Perennial, 2003), p. 18. Ron Chernow, Alexander Hamilton (New York: Penguin, 2004), p. 18 ("entirely out of the ordinary"). Davis, The Landscape of Belief, p. 15 ("instead of the twelve"). Conrad Cherry, ed., God's New Israel: Religious Interpretations of American Destiny (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 1998), pp. 40 ("City on

the Hill"), 62-71, 82-85. Jon Meacham, American Gospel: God, the Founding Fathers, and the Making of a Nation (New York: Random House, 2006), pp. 79-84.

4. Tibawi, American Interests in Syria, p. 10. Bond, Memoir of the Rev. Pliny Fisk, p. 111 ("The Christian…ought"). Tocqueville, Democracy in America, pp. 418-19. Phillips, Protestant America, p. 8 ("We have now entered"), 12 ("the tabernacle of God"). Perkins, Cambridge History of American Foreign Relations, p. 4 ("an object so valuable "). Cherry, God's New Israel, p. 65 ("a great…design"). See also Brooke Allen, "Our Godless Constitution," Nation, Feb. 3, 2005.

5. Kenneth Latourette, Missions and the American Mind (Indianapolis: National Foundation Press, 1949), pp. 28 ("Though you and I"), 31-34. Phillips, Protestant America, p. 20. Walter Russell Mead, Special Providence: American Foreign Policy and How It Changed the World (New York: Routledge, 2002), pp. 151-52. Kaplan, Arabists, p. 19 ("Only the extension"). Rao H. Lindsay, Nineteenth Century American Schools in the Levant: A Study of Purposes (Ann Arbor: Univ. of Michigan School of Education, 1965), pp. 61-63, 67. Finnie, Pioneers East, pp. 50 ("the groans" and "Zion will now"), 114-15.

6. Israel Finestein, "Early and Middle 19th-Century British Opinion on the Restoration of the Jews: Contrasts with America," in Moshe Davis, ed., With Eyes toward Zion, vol. 2: Themes and Sources in the Archives of the United States, Great Britain, Turkey and Israel (New York: Praeger, 1986), pp. 74-77, 79-80. Obenzinger, American Palestine, pp. 34, 37. Martin, Pilgrims

in Their Own Land, pp. 181-82. Tuchman, Bible and Sword, p. 121 ("transport Izraell's sons"). Lester I. Vogel, To See a Promised Land: Americans and the Holy Land in the Nineteenth Century (University Park: Pennsylvania State Univ. Press, 1993), pp. 125-26. Cherry, God's New Israel, p. 91 ("the return of the twelve"). Marr, "Imagining Ishmael," pp. 32-33, 35 ("When that empire falls"), 37-40, 61.

7. Niles' Weekly Register Nov. 9, 1816, p. 168. Naomi Shepherd, The Zealous Intruders: The Western Rediscovery of Palestine (London: Collins, 1987), p. 39. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 5-8. Field, America and the Mediterranean World, 281. Elias Boudinot, A Star in the West; or, A Humble Attempt to Discover the Long Lost Ten Tribes of Israel, Preparatory to Their Return to Their Beloved City, Jerusalem (Trenton, N.J: Fenton, Hutchinson, and Dunham, 1816), p. 43. Michael Schuldiner and Daniel J. Kleinfeld, The Selected Writings of Mordecai Noah (London: Greenwood, 1999), p. 127 ("a hundred thousand").

8. Twenty cities in the United States are named for Smyrna, which is twice mentioned in the New Testament (see Revelations 1:10-11 and 2:8). Papers of the American Board of Commissioners for Foreign Missions (PABCFM), 5/515/0039, Mission to the Jews, vol. 3: Journal of Eli Smith, Jan. 23, 1827 ("There seems to be"). Tibawi, American Interests in Syria, pp. 13-14 ("Do nothing rashly"), 17, 23. Parsons, Memoir, pp. 222 ("With the spirit"), 240 ("The permission to"). Finnie, Pioneers East, p. 151 ("wear a turban").

9. PABCFM, 5/515/0039, Mission to the Jews, vol. 3: Journal of Eli Smith,

Dec. 12, 1826 (estimation of Jerusalem's Jewish population). Rev. Harvey Newcomb, Cyclopedia of Missions (New York: Scribner, 1854), p. 734. Parsons, Memoir, pp. 263, 363 ("no place in the world"), 385 ("The door is already"), 390 ("the present commotions"). Moshe Davis and Yehoshua Ben-Arieh, With Eyes toward Zion, vol. 5, Jerusalem in the Mind of the Western World, 1800-1848 (New York: Praeger, 1997), pp. 95-96, 144. Finnie, Pioneers East, pp. 24, 151-52. Joseph L. Grabill, Protestant Diplomacy and the Near East: Missionary Influence on American Policy, 1810-1927 (Minneapolis: Univ. of Minnesota Press, 1969), p. 7 ("Thy spirit, Parsons").

10. Tibawi, American Interests in Syria, p. 22 ("Suffer not your minds"). The Missionary Herald: Reports from Ottoman Syria, 1819-1870, vol. 1, ed. Kamal Salibi and Yusuf Khoury (Amman: Royal Institute for Inter-Faith Studies, 1995): Journal of Jonas King, May 10, 1825, p. 405 ("the Arabs poured down"). Isaac Bird, Bible Work in Bible Lands (Philadelphia: Presbyterian Board of Publication, 1872), p. 15. Finnie, Pioneers East, pp. 154-55 ("He gave us").

11. PABCFM, 5/515/0039, Mission to the Jews, vol. 3: Journal of Eli Smith, March 1, 1827 ("She was brought"); May 13, 1824; April 18, 1825 ("It is by no means"), Gridley to Anderson, Nov. 16, 1826 ("Scarcely ten"). Newcomb, Cyclopedia of Missions, p. 735 ("Druses, Maronites"). Burns, American Idea of Mission, p. 261. Shepherd, Zealous Intruders, p. 40. Field, America and the Mediterranean World, pp. 94-95, 103, 129 ("missionaries loaded with books"). Julius Richter, History of Protestant Missions in the Near East (New

York: AMS Press, 1970), p. 187. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 28-29, 42. Grabill, Protestant Diplomacy, p. 8.

12. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 25-26, 32-35, 37-39. Field, America and the Mediterranean World, pp. 98-99, 103. Finnie, Pioneers East, pp. 152, 171, 191-92.

13. George H. Scherer, Mediterranean Missions, 1808-1870 (Beirut: Bible Lands Union for Christian Education, n.d.), p. 7. Adnan Abu-Ghazaleh, American Missions in Syria: A Study in Missionary Contributions to Arab Nationalism in 19th Century Syria (Brattleboro, Vt.: Amana Books, 1990), pp. 20-21. Kaplan, Arabists, p. 21 ("Christian workers"). Tibawi, American Interests in Syria, pp. 18 ("day of small things"), 35-37, 38 ("a wide and effectual"), 42.

5. Confluence and Conflict

1. Pierre Crabites, Americans in the Egyptian Army (London: Routledge, 1938), p. 25 ("pale, delicate-looking"). Finnie, Pioneers East, pp. 144-45, 146-47 ("to the prosperity"). Wright, "American Relations with Turkey," pp. 95-96. George Bethune English, A Narrative of the Expedition to Dongola and Sennaar under the Command of His Excellence Ismael Pasha Undertaken by Order of His Highness Mehemmed Ali Pasha Viceroy of Egypt (Boston: Wells and Lilly, 1823), p. 114 ("the land of the free"). George Bethune English, The Grounds of Christianity Examined by Comparing the New Testament with the Old (Boston: A.M., 1813), p. 113. George Bethune English, A Letter to the Reverend Mr. Cary Containing Remarks upon His Review of the Grounds of Christianity Examined by Comparing the New

Testament with the Old by the Author of That Work (Boston: Printed for the Author, 1813), pp. 76 ("worship of angels"), 118 ("infernal wickedness"). George Bethune English, Letter Respectfully Addressed to the Reverend Mr. Channing Relative to His Two Sermons on Infidelity (Boston: Printed for the Author, 1813), pp. 9, 30.

2. English, Narrative of the Expedition to Dongola and Sennaar, pp. 18-20, 32 ("We are lost!"), 49, 59 ("luckless fornicators"), 61-62 ("monuments of his"). See also Finnie, Pioneers East, p. 147. Wright, "American Relations with Turkey," p. 96 ("Obstinate hostility to the truth"). Adams- Jefferson Letters: Adams to Jefferson, March 10, 1823, p. 591.

3. Adams-Jefferson Letters: Adams to Jefferson, June 6, 1785, p. 133. Republic of Letters: Jefferson to Madison, April 15, 1804, p. 1309. Kennedy, American Consul, pp. 94-95. Barrell, Letters from Asia, pp. 13-14. Field, America and the Mediterranean World, p. 118 ("bribery and brass"). Josiah Brewer, A Residence at Constantinople in the Year 1827, with Notes to the Present Time (New Haven: Durrie and Peck, 1830), p. 71. Bryson, American Diplomatic Relations, pp. 17-18. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 58-63. Finnie, Pioneers East, pp. 26-29, 30 ("Imaginary Protection"). Ades Nimet Kurat, "Archival Documents concerning Relations between Turkey and the United States of America," Journal of Historical Research [Turkish] 5 (1964): 290 ("There is no benefit").

4. John Lewis Gaddis, Surprise, Security, and the American Experience (Cambridge: Harvard Univ. Press, 2004), p. 15. Mary W. M. Hargreaves, The Presidency of John Quincy Adams (Lawrence: Univ. Press of Kansas,

1985), pp. 29-30, 38. Field, America and the Mediterranean World, pp. 119-20 ("preserve him"). Finnie, Pioneers East, pp. 51-52. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 28, 78-81, 89. Kurat, "Archival Documents," pp. 292 ("Though once only"), 308-9 ("Their cannon foundries").

5. Bryson, American Diplomatic Relations, p. 10 ("fellow-citizens of Penn"). Myrtle Cline, American Attitude toward the Greek War of Independence, 1821-1828 (Atlanta: Higgins-McArthur, 1930), pp. 29 ("Sacred to the cause"), 63 ("My old imagination"), 98 ("Humanity, policy"). Edward Mead Earle, "Early American Policy Concerning Ottoman Minorities," Political Science Quarterly 42 (March 1927): 45 ("purge Greece"), 46 ("how spontaneously"), 47, 55-56. Field, America and the Mediterranean World, p. 121 ("see the language"). Little, American Orientalism, p. 12 ("Wherever the arms"). Thomas Robbins, Diaries, 1796-1854 (Boston: Thomas Todd, 1886): vol. 2, entry for April 11, 1829, p. 90. Samuel Gridely Howe, An Historical Sketch of the Greek Revolution (New York: n.p., 1828), pp. 36-38.

6. Samuel Woodruff, Journal of a Tour to Malta, Greece, Asia Minor, Carthage, Algiers, Port Mahon, and Spain (Hartford: Cooke, 1831), p. 11. Bryson, American Diplomatic Relations, pp. 11- 12 ("cherish[ed] sentiments"), 13-15. John Quincy Adams, The American Annual Register, 1827- 1829 (New York: Blunt, 1830), pp. 269 ("fanatic and fraudulent," "Ismael," and "doctrine [of] violence"), 274 ("the subjugation of others"), 299 ("the natural hatred"), 303. Samuel Flagg Bemis, John Quincy Adams and the Foundations of American Foreign Policy (New York: Knopf, 1956), p.

388. See also American Philhellenes and the War for Independence, http://www.ahepafamily.org/d5/Grk%20Inde-mar02.htm.

7. Hargreaves, Presidency of John Quincy Adams, 86. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 96-97 ("You will inform me" and "American Mussulman"), 109-10 ("much engaged" and "his good offices").

8. Bemis, John Quincy Adams, p. 468. Hargreaves, Presidency of John Quincy Adams, pp. 85- 86, 121. Finnie, Pioneers East, pp. 53-56. Wright, "American Relations with Turkey," pp. 109-10, 148 ("misconduct"). John Quincy Adams, Chronology, Documents and Bibliographical Aids (New York: Oceana Publications, 1970), p. 84 ("suffering Greeks"). Kurat, "Archival Documents," p. 293 ("See how these Franks").

9. For general histories of the reign and policies of Muhammad Ali, see Henry H. Dodwell, The Founder of Modern Egypt: A Study of Muhammad 'Ali (1931; reprint, New York: AMS Press, 1977), and Afaf Lutfi al-Sayyid Marsot, Egypt in the Reign of Muhammad Ali (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1984). See also Shimon Shamir, "Egyptian Rule (1832-1840) and the Beginning of the Modern Period in the History of Palestine," in Gabriel Baer and Amnon Cohen, eds., Egypt and Palestine: A Millennium of Association (868-1948) (New York: St. Martin's, 1984), pp. 214-31.

10. The Senate approved the treaty, but objected to the provision of warships. Jackson chose to ignore the Senate's objections, and proceeded with arms sales to Turkey. Robert V. Remini, Andrew Jackson and the Course of American Freedom, 1822-1832, vol. 2 (New York: Harper & Row, 1981), p. 289 ("to leave no proper" and "the most friendly"). Kurat, "Archival

Documents," pp. 293-94. John M. Belohlavek, Let the Eagle Soar!: The Foreign Policy of Andrew Jackson (Lincoln: Univ. of Nebraska Press, 1985), pp. 130-38. Donald B. Cole, The Presidency of Andrew Jackson (Lawrence: Univ. Press of Kansas, 1993), p. 128. Field, America and the Mediterranean World, pp. 145-46 ("Americans will be"). Lester D. Langley, "Jacksonian America and the Ottoman Empire," The Muslim World (Hartford: Duncan Black Macdonald Center, Hartford Seminary Foundation, 1978), pp. 46-49. Tungay, "Ottoman-American Trade," pp. 208-11. Text of the U.S.-Ottoman Treaty can be found in Hurewitz, Middle East and North Africa, pp. 246-47.

11. In appreciation of the sultan's purchases of his pistols. Samuel Colt presented him with a gold-plated revolver emblazoned with the images of George Washington and the Great Seal. The firearm, today valued at $5 million, is on display at New York's Metropolitan Museum of Art. Wright, "American Relations with Turkey," p. 138. Diplomatic Instructions of the Department of State, 1801-1906. Turkey. April 2, 1823-July 9, 1859. Microfilm 77, roll 162: John Forsyth to David Porter, May 16, 1837 ("improvement in seamanship"). Finnie, Pioneers East, pp. 16, 163-65, 175. Field, America and the Mediterranean World, pp. 168-69 ("balls without gunpowder"), 189 ("chairs and tables"), 191, 229. Sarah Rogers Haight, Letters from the Old World by a Lady of New York (New York: Harper, 1840), p. 193. Nathaniel Parker Willis, Summer Cruise in the Mediterranean on an American Frigate (New York: Scribner, 1853), p. 277. Brewer, Residence at Constantinople, p. 72. See also Thomas A. Bryson, An American Consular Officer in the Middle East in the Jacksonian Era: A Biography of William

Brown Hodgson, 1801-1871 (Atlanta: Resurgens, 1979), p. 42.

12. Edmund Roberts, Embassy to the Eastern Courts of Cochin-China, Siam, and Muscat, in the U.S. Sloop-of-War Peacock, during the Years 1832-3-4 (New York: Harper, 1837) (courtesy of the New Hampshire Historical Society and the Tuck Library), pp. 343-45 ("the scene of"), 361 ("A strict lover"), 362-64. New England Merchants in Africa: A History through Documents, 1802- 1865, ed. Norman Bennett and George Brooks (Boston: Boston Univ. Press, 1965): Edmund Roberts to Louis Mclane, May 14, 1834, pp. 156-57. Michael A. Palmer, Guardians of the Gulf: A History of America's Expanding Role in the Persian Gulf, 1833-1992 (New York: Free Press, 1992), pp. 3-4. Among the coins presented to Sultan Sa'id was an extremely rare 1804 silver dollar now known as the Watters-Childs specimen, which last sold for $4.4 million. See http://www.geocities.com/CollegePark/Union/8191/mcsh/Omanncss.html and http://www.coinfacts.com/silver_dollars/1804_dollars/1804_Draped_Bust_Silver_Dollar.htm.

13. Finnie, Pioneers East, pp. 258 ("salutary effect"), 261 ("savage and uncivilized"). Missionary Herald, vol. 2: Letter from Eli Smith, Sept. 17, 1834, p. 431 ("multitude of Arab Christians"). John Israel and Henry Lundt, Journal of a Cruize in the U.S. Ship Delaware 74 in the Mediterranean in the Years 1833 & 34 (1835; reprint, New York: Arno Press, 1977). George Jones, Excursions to Cairo, Jerusalem, Damascus, and Balbec from the United States Ship Delaware , during Her Recent Cruise: With an Attempt to Discriminate between Truth and Error in Regard to the Sacred Places of the Holy City (New York: Van Nostrand and Dwight, 1836). See also "An

Audience with Sultan Abdul Mejud," by An American, Knickerbocker 19 (June 1842).

14. Frank E. Manuel, The Realities of American-Palestine Relations (1949; Westport, Conn.: Greenwood, 1975), pp. 9-10. Kennedy, American Consul, pp. 86-89, 97-98. Tibawi, American Interests in Syria, p. 88. Finnie, Pioneers East, pp. 250-53 ("Our whole consular"). Luella J. Hall, The United States and Morocco, 1776-1956 (Metuchen, N.J.: Scarecrow, 1971), pp. 90-91. Ruth Kark, "Annual Reports of the United States Consuls in the Holy Land as a Source for the Study of 19th Century Eretz Israel," in Davis, With Eyes toward Zion, vol. 2, pp. 131-32.

15. USNA, Dispatches from U.S. Ministers to Turkey, 1818-1906 (Microfilm M46): David Porter to Nicholas Navoni, Sept. 23, 1831. W. M. Churchill to the Secretary of State, Aug. 10, 1833. The Papers of Daniel Webster, ser. 3, Diplomatic Papers, vol. 1 (Hanover: Univ. Press of New England, 1983), pp. 23-24. David Long, Nothing Too Daring: A Biography of Commodore David Porter, 1780-1843 (Annapolis: U.S. Naval Institute, 1970), pp. 17-21. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 3, 90. Archibald Douglas Turnbull, Commodore David Porter, 1780-1843 (New York: Century, 1929), pp. 250-51. Field, America and the Mediterranean World, pp. 151, 168 ("There is no part"), 174. Finnie, Pioneers East, pp. 83-85 ("the head and neck"), 88 ("Salaams are"), 91, 94.

16. Field, America and the Mediterranean World, pp. 165-67, 170, 174. Finnie, Pioneers East, pp. 68, 71-73, 94-95 ("Had I the talent"), 259. Kennedy, American Consul, pp. 92-95. Tibawi, American Interests in Syria,

p. 3. Cary Corwin Conn, "John Porter Brown, Father of Turkish- American Relations: An Ohioan at the Sublime Porte, 1832-1872" (Ph.D. diss., Ohio State Univ., 1973), pp. 48-49.

17. The pardon came too late, however, for two of the Syrians Jews, who were tortured to death. See Jonathan Frankel, The Damascus Affair: "Ritual Murder," Politics, and the Jews in 1840 (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1997). Sarna, Jacksonian Jew, pp. 123-25. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 3, 90. Malachy, American Fundamentalism and Israel, pp. 23-25. Diplomatic Instructions of the Department of State, 1801-1906. Turkey. April 2, 1823-July 9, 1859. Microfilm 77, roll 162: John Forsyth to David Porter, Aug. 17, 1840 ("atrocious cruelties").

18. Papers of Daniel Webster, pp. 273-74 ("Avoid doing anything"), 277-78 ("Frank residents of Beyrout"), 280. Stephen Vincent Benet, The Devil and Daniel Webster and Other Writings (New York: Penguin, 2000). Irving H. Bartlett, Daniel Webster (New York: Norton, 1978), pp. 24, 44, 73, 85. Robert Seeger, And Tyler Too: A Biography of John and Julia Gardiner Tyler (New York: McGraw-Hill, 1963), pp. 104, 109. Field, America and the Mediterranean World, pp. 287-89, 350- 51 ("A reading nation"). Finnie, Pioneers East, pp. 94-95, 126-27 ("at their own risk"). Franklin Steiner, The Religious Beliefs of Our Presidents: From Washington to F.D.R. (New York: Prometheus, 1995), pp. 95-97.

6. Manifest Middle Eastern Destiny

1. Brewer, Residence at Constantinople, pp. 25, 65, 361, 370. Finnie, Pioneers East, 36-37 ("Our Pilgrim mothers").

2. Newcomb, Cyclopedia of Missions, p. 737. Finnie, Pioneers East, pp. 50-51, 57, 171-72 ("I have not heard" and "roar of cannon"), 172-87. Missionary Herald, vol. 2: Journal of Mr. Thomson, April 16, 1834, p. 373 ("The Jordan"); Journal of Mr. Thomson [written in Nablus], April 23, 1834, p. 378 ("the wreck"); Whiting to Dodge, Nov. 17, 1834, p. 441. Davis, Landscape of Belief, p. 45. Newcomb, Cyclopedia of Missions, p. 737 ("not a single soul"). Yehoshua Ben-Arieh, Painting the Holy Land in the 19th Century (Jerusalem: Yad Izhak Ben-Zvi, 1997), p. 210. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 100-1. Bird, Bible Work in Bible Lands, p. 87 ("a land of devils"). See also Shamir, "Egyptian Rule," pp. 214-31.

3. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 40-43 ("The Turks…exhibit"). Board report in Newcomb, Cyclopedia of Missions, p. 737. Finnie, Pioneers East, pp. 35-38, 39 ("gloomy, austere"), 42 ("The thought of their"), 124, 193-94. Brewer, Residence at Constantinople, pp. 383- 84.

4. Horatio Southgate, Narrative of a Tour through Armenia, Kurdistan, Persia, and Mesopotamia (London: Appleton, 1840), pp. 300-1 ("the first Americans"). Kaplan, Arabists, pp. 22-23 ("every species"), 24-25. Tibawi, American Interests in Syria, p. 79. Finnie, Pioneers East, pp. 208-9 ("I felt a stronger desire"), 216-17 ("The sick, the lame"), 196-97, 205-7, 214-15 ("his eye bright").

5. Finnie, Pioneers East, 118-19, 205-9 ("Enfeebled health"), 238-39 ("Let us have"). Louisa Hawes, Memoir of Mrs. M. E. Van Lennep, by Her Mother (Hartford: Belknap and Hamersley, 1849), p. 325 ("I sometimes fear"). Tibawi, American Interests in Syria, p. 73 ("The hour is near"). Hawes,

Memoir of Mrs. M. E. Van Lemep, p. 325. Missionary Herald, vol. 2: Letter from Eli Smith, June 21, 1827, p. 247; Memoir of William Goodell, 1825, p. 431 ("a man's hat"). The Reminiscences of Daniel Bliss (New York: Revell, 1920), p. 106 ("You Americans think").

6. Robert T. Handy, The Holy Land in American Protestant Life, 1800-1948 (New York: Arno Press, 1981), 85-86 ("Whereas, but"). Tibawi, American Interests in Syria, pp. 56, 82-83, 121-22, 170-76. Finnie, Pioneers East, pp. 109 ("liberty, property"), 200-1 ("Not only do"). Stephen Penrose, That They May Have Life: The Story of the American University of Beirut, 1866-1941 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1941), p. 6.

7. Missionary Herald, vol. 2: Letter from Mr. Marsh, Feb. 25, 1851, p. 299. Field, America and the Mediterranean World, pp. 210 ("ought to know"), 250, 351 ("I do love"). Finnie, Pioneers East, p. 129 ("full extent" and "I am persuaded"). Phillips, Protestant America, p. 259. William Goodell, Forty Years in the Turkish Empire (New York: Robert Carter, 1883), p. 174 ("We have come") For insights into missionary views of Islam and Muhammad, see Thomas Laurie, The Ely Volume; or, The Contributions of Our Foreign Missions to Science and Human Well-Being (Boston: American Board of Commissioners for Foreign Missions, 1881), pp. 320-22, and the anonymous Life of Mohammad (Bombay: American Mission Press, 1851). The semidiplomatic role of European missionaries is discussed in Derek Hopwood, The Russian Presence in Syria and Palestine, 1843- 1914: Church and Politics in the Near East (Oxford: Clarendon Press, 1969), p. 59.

8. Cyrus Hamlin, My Life and Times (Boston: Pilgrim Press, 1893), pp. 30,

62. Cyrus Hamlin, Among the Turks (New York: Robert Carter, 1878), pp. 57 ("a decided impression"), 62 ("rather leaky"). Finnie, Pioneers East, pp. 99-108, 109 ("indomitably self-willed"). Field, America and the Mediterranean World, p. 297 ("querulous" and "despotic"), 347-48.

9. Vogel, To See a Promised Land, pp. 118-19. Latourette, Missions and the American Mind, p.33. Grabill, Protestant Diplomacy, p. 4. Lindsay, Nineteenth Century American Schools, p. 66. Phillips, Protestant America, p. 316. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 97-98. Mead, Special Providence, pp. 143, 146-48, 150-51. Lewis, Crisis of Islam, p. 67 ("This country is"). PABCFM: Eddy to the American Board, Sept. 7, 1867 ("There are no rail"). Benjamin Foster, "Yale and the Study of Near Eastern Languages in America, 1770-1930," in Amanat and Bernhardsson, eds., United States and the Middle East, pp. 18 ("The countries of the West"), 19. Bruce Kuklick, Puritans in Babylon: The Ancient Near East and American Intellectual Life, 1880-1930 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1996), pp. 5, 20-22. John Thornton Kirkland, "Letter on the Holy Land," Christian Examiner and General Review 23, no. 2 (1842): 261. Elizabeth Cabot Kirkland, Letters (Cambridge: Massachusetts Historical Society, 1905), p. 503 ("These worthy people").

10. Robinson, Biblical Researches in Palestine, vol. 1, pp. 23-25, 75, 133 ("strangeness and overpowering" and "Although not given"). William Thomson, The Land and the Book; or, Biblical Illustrations Drawn from the Manners and Customs, the Scenes and Scenery, of the Holy Land, vol. 1 (New York: Harper, 1886), p. 6. Manuel, Realities, pp. 6-12. Ruth Kark,

American Consuls in the Holy Land, 1832-1914 (Jerusalem: Magnes Press, Hebrew Univ., 1994), pp. 84, 95, 127 ("There is no other"). Obenzinger, American Palestine, p. xvii. Vivian D. Lipman, "American-Holy Land Material in British Archives, 1820-1930," in Davis, With Eyes toward Zion, vol. 2, p. 28.

11. Robinson, Biblical Researches in Palestine, vol. 1, pp. 23-25, 75, 132, 162 ("stagnation and moral darkness"), 176, 262-63, 266-68, 350, 374 ("vast mass of tradition"). Edward Robinson, Later Biblical Researches in Palestine and Adjacent Regions: A journal of travels in the year 1852 (London: John Murray, 1856), p. 73. Shepherd, Zealous Intruders, pp. 80-83. Handy, Holy Land, pp. 2-19. Neal Asher Silberman, Digging for God and Country: Archeology and the Secret Struggle for the Holy Land, 1799-1917 (New York: Knopf, 1982), pp. 40-47. Davis, Landscape of Belief, p. 36 ("American science").

12. William F. Lynch , Narrative of the United States' Expedition to the River Jordan and the Dead Sea (Philadelphia: Blanchard and Lea, 1853) , pp. v ("teeming with sacred"), 18 ("hallowed by"), 76, 79 ("protection against"), 115 ("gun-shot wounds"), 119, 152 ("It must have been"), 230 ("wanderers in an unknown"), 259-60, 261, 284 ("The curse of God"), 293 ("in honour of), 287 ("the tents among"), 321 ("The thought of death"), 407. Edward P. Montague, Narrative of the Late Expedition to the Dead Sea (Philadelphia: Carey and Hart, 1849), pp. 116, 121-22 ("We Yankee boys"), 149, 218-19 ("float with perfect ease").

13. Lynch, Narrative of the United States' Expedition, pp. 360 ("Fifty

well-armed"), 415 ("destined to be"). American Geographical and Statistical Society, Report and Memorial on Syrian Exploration (New York: New York Univ., 1857), p. 7. Andrew C. A. Jampoler, Sailors in the Holy Land: The 1848 American Expedition to the Dead Sea and the Search for Sodom and Gomorrah (Annapolis: Naval Institute Press, 2005), pp. 60, 142. See also Robert Edward Rook, "Blueprints and Prophets: Americans and Water Resource Planning for the Jordan River Valley, 1860-1970" (Ph.D. diss., Kansas State Univ., 1996), pp. 22-23.

14. Robbins, Diaries, 1796-1854, vol. 2, p. 573. Haight, Letters from the Old World, p. 110. George Bush, The Life of Mohammed: Founder of the Religion of Islam, and of the Empire of the Saracens (New York: Harper & Brothers, 1837), pp. 49 ("pseudo-prophet"), 160-61 ("man of superior"); The Valley of Vision (New York: Saxton and Miles, 1844), pp. 17 ("elevating"), 39 ("carnal inducements"), 41 ("It will blaze"), 56 ("link of communication"). Shalom Goldman, "Professor George Bush: American Hebraist and Proto-Zionist," American Jewish Archives 43, no. 1 (1991): 58-69. "Bush on Ezekiel's Vision," Princeton Review 16, no. 3 (1844): 384. Elaine B. Prince, "The Patrilineal Descent of Vice-President Bush," NEXUS: The Bimonthly Newsletter of the New England Genealogical Society 3 (1986): 124-25.

15. Truman G. Madsen, "The Holy Land and the Mormon Restoration," in Davis, With Eyes toward Zion, vol. 2, pp. 28-29. Obenzinger, American Palestine, pp. xvii, 116, 121, 126-27, 160 ("very weak minded"). Warder Cresson, The Key of David (Philadelphia: Self-published, 1852), p. 15 ("There is no salvation"). Frank Fox, "Quaker, Shaker, Rabbi: Warder

Cresson: The Story of a Philadelphia Mystic," Pennsylvania Magazine of History and Biography 95 (1971): 147 ("I left the wife"), 157-63. Vogel, To See a Promised Land, p. 170 ("capacity & probity"). Sarna, Jacksonian Jew, pp. 153-55. Selected Writings of Mordecai Noah, pp. 125-26. William Makepeace Thackeray, From Cornhill to Grand Cairo (London: George Routledge, 1888), pp. 225-26, 242 ("has no knowledge").

16. Catherine A. Brekus, "Harriet Livermore, the Pilgrim Stranger: Female Preaching and Biblical Feminism in Early Nineteenth-Century America," Journal of the Early Republic 65 (Sept. 1996): 389-404. Elizabeth F. Hoxie, "Harriet Livermore: Vixen and Devotee," New England Quarterly 18 (March 1945): 41 ("Sick of the world"), 43 ("She is the most"). Diplomatic Instructions of the Department of State, 1801-1906. Turkey. April 2, 1823-July 9, 1859. Microfilm 77, roll 162: Louis Lane to David Porter, April 28, 1834 ("high character"). Finnie, Pioneers East, pp. 182-83 ("meet my lot"). Portraits of Lady Hester Stanhope can be found in Charles Lewis Meryon and Hester Lucy Stanhope, The Travels of Lady Hester Stanhope (London: H. Colburn, 1846). Michael Bruce, The Nun of Lebanon (London: Collins, 1951). "The Memoirs of Lady Stanhope," Living Age 6, no. 69 (Sept. 6, 1845).

17. John T. Brown, ed., Churches of Christ (Louisville: John P. Morton, 1904), pp. 440-41 ("criminally modest" and "they could all"). James Turner Barclay, The City of the Great King; or, Jerusalem As It Was, As It Is, and As It Is to Be (Philadelphia: James Challen, 1857), pp. 608-10. Handy, Holy Land, p. 84 ("God hath not"). Vogel, To See a Promised Land, p. 107.

18. Clorinda Minor, Meshullam!; or, Tidings from Jerusalem: From the Journal of a Believer Recently Returned from the Holy Land (Philadelphia: Self-published, 1851), pp. 52 ("His time to favor"), 91, 114 ("Many Christians profess"). Catherine A. Brekus, Strangers and Pilgrims: Female Preaching in America, 1740-1845 (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 1998), p. 53 ("The conviction of my soul"). Henry L. Feingold, Zion in America: The Jewish Experience from Colonial Times to the Present (New York: Twayne, 1974), p. 199. Barbara Krieger, Divine Expectations: An American Woman in 19th Century Palestine (Athens: Ohio Univ. Press, 1999), pp. 38-39, 50, 113-16. Lipman, "American-Holy Land Material," pp. 29-32.

19. Field, America and the Mediterranean World, p. 280 ("the Modern Tabitha"). Tabitha-in Greek, Dorcas-was a righteous woman of Jaffa who, according to the New Testament (Acts 9:36- 43), was resurrected after death by the apostle Peter. Yaron Perry, "John Steinbeck's Roots in Nineteenth-Century Palestine," Steinbeck Studies 15, no. 1 (Spring 2002): 51-52 ("our Hebrew friends"), 55. Abraham Karp, "The Zionism of Warder Cresson," in Isadore Meyer, ed., Early Zionism in America (Philadelphia: American Jewish Historical Society, 1958), pp. 9-14. Warder Cresson Biography, http://www.us-israel.org/jsource/biography/Cresson.html. Vogel, To See a Promised Land, p. 132. Field, America and the Mediterranean World, p. 281.

20. PABCFM, 5/546/16.8.1, Syrian Mission, vol. 7: Eddy to the American Board, Sept. 7, 1867 ("Europe is striving"). Tocqueville, Democracy in America, vol. 1, pp. 269 ("all-pervading"), 318 ("unquiet passions"); vol. 2, p.

622 ("strange unrest" and "in the midst").

7. Under American Eyes

1. Stanley T. Williams, ed., Journal of Washington Irving, 1828 and Miscellaneous Notes on Moorish Legend and History (New York: American Book Co., 1937), pp. 21-34. William H. Hedges, The Old and New World Romanticism of Washington Irving (New York: Greenwood, 1986), pp. 20, 89-120. Philip Almond, "Western Images of Islam, 1700-1900," Australian Journal of Politics and History 49, no. 3 (2003). Fuad Shaban, Islam and Arabs in Early American Thought: Roots of Orientalism in America (Durham, N.C.: Acorn Press, 1991), p. 32. Malini Johar Schueller, U.S. Orientalisms: Race, Nation, and Gender in Literature, 1790-1890 (Ann Arbor: Univ. of Michigan Press, 1998), pp. 68-70. Ahmed Mohamed Metwalli, "The Lure of the Levant: The American Literary Experience in Egypt and the Holy Land, 1800-1865," (Ph.D. diss., State Univ. of New York at Albany, 1971), p. 64 ("living in the Arabian"). Washington Irving and James Paulding, Salmagundi (Chicago: Belford, Clarke, 1807), pp. 34 ("positively assured"), 86 ("superlative ventosity"), 131 ("slangwhangging"). George S. Hellman, Washington Irving, Esquire: Ambassador at Large from the New World to the Old (New York: Knopf, 1925), pp. 155 ("A mighty potentate"), 207 ("a kind of Oriental"). Washington Irving, The Conquest of Granada (New York: Putnam, 1850), p. xx ("romantic adventures"). Washington Irving, Alhambra (Boston: Ginn, 1902), p. 90 ("naked realities").

2. Barrell, Letters from Asia, p. 10. Wright, "American Relations with Turkey," p. 155. Finnie, Pioneers East, pp. 4, 12-13, 160-65. Field, America and the

Mediterranean World, p. 298. Joseph J. Malone, "America and the Arabian Peninsula: The First Two Hundred Years," Middle East Journal 30, no. 3 (Summer 1976): 407. Isaac M. Fein, The Making of an American Jewish Community: The History of Baltimore Jewry from 1773 to 1920 (Philadelphia: Jewish Publication Society, 1971), pp. 24-25. Tigger, "Egyptology, Ancient Egypt," pp. 21-22.

3. Papers of William H. Seward: "Governor Seward's Journey from Egypt to Palestine," New York Daily Tribune, Dec. 24, 1859, p. 5 ("There are no berths"). Metwalli, "Lure of the Levant," p. 100. Prices to travel to the Middle East are listed in Warder Cresson, King Solomon's Two Women and the Living and Dead Child or Messiah (Philadelphia: Self-published, 1852), pp. 343-44. John Lloyd Stephens, Incidents of Travel in Egypt, Arabia Petraea, and the Holy Land (New York: Harper, 1855), pp. 4, 17-18. James Ewing Cooley, The American in Egypt, with Rambles through Arabia Petra and the Holy Land during the Years 1839-1840 (New York: Appleton, 1842), pp. 16, 329. Wages in 1840 listed on "Senate Salaries since 1789," www.senate.gov/artandhistory/history/ common/briefing/senate_salaries.htm and "Documenting the American South," http://docsouth.unc.edu/nc/helper/helper.html.

4. David F. Dorr, A Colored Man round the World by a Quadroo n (N.p: Printed for the author, 1858), pp. 38 ("head-choppers"), 186. Cooley, American in Egypt, pp. 15 ("narrow, gloomy streets"), 16 ("Arabs, Armenians"), 262 ("ignorance and superstition"), 313 ("lunatics, idiots"). Stephens, Incidents of Travel, pp. 18 ("splendor and opulence" and "the

dashing Turk"), 103 ("bigoted Musselmans"), 104, 120 ("false religion" and "haughty and deluded"). Haight, Letters from the Old World, pp. 30 ("I only saw"), 269 ("Mohammedanism").

5. Cooley, American in Egypt, pp. 259 ("civilized nations"). Stephens, Incidents of Travel, pp. 174-75 ("When I heard"), 345 ("life hangs"). Haight, Letters from the Old World, pp. 45 ("penetrate the darkness"), 269 ("political crusade"), 270 ("kick the beam"). Walter Colton, Visit to Constantinople and Athens, vol. 2 (New York: Leavitt, Lord, 1836), pp. 105, 176-77 ("The same effort"), 181 ("Islamism"). Finnie, Pioneers East, pp. 155 ("There is a feeling"), 161. Valentine Mott, Travels in Europe and the East (New York: Harper, 1842), p. 269 ("His royal highness"). William H. Bartlett, The Nile Boat; or, Glimpses of the Land of Egypt. (London: Arthur Hall, Virtue, 1850), pp. 46 ("city of Saladin"), 135 ("Egypt, fallen"). Kirkland, Letters, pp. 480-81 ("a rich Jew"), 490 ("a man lying").

6. Stephens, Incidents of Travel, pp. 146 ("yellow slippers"), 84-85 ("that precious fragment"), 216. Mott, Travels in Europe and the East, p. 327. Dorr, Colored Man round the World, pp. 123 ("I would have given"), 177 ("jingling and a screwing"). Willis, Summer Cruise, pp. 254 ("the camel- driver's wife"), 268 ("a graceful creature"), 285. On nineteenth-century Western sexual fantasies of the Middle East, see Edward Said, Orientalism (New York: Vintage, 1979), pp. 119, 181-90.

7. Bayard Taylor, The Lands of the Saracen; or, Pictures of Palestine, Asia Minor, Sicily, and Spain (New York: Putnam, 1855), pp. 55 ("We kept our arms"), 56 ("heard the trumpets"). Finnie, Pioneers East, 181-83 ("plain man

of steady habits"), 187. Field, America and the Mediterranean World, pp. 195-96. Stephens, Incidents of Travel, pp. 163 ("Can it be"), 188 ("witness of that great"), 318 ("I never saw"). Haight, Letters from the Old World, vol. 2, pp. 10 ("her friends have"), 130 ("How deplorable"). Cooley, American in Egypt, pp. 45 ("Surely the serpent"), 60 ("He that dippeth"). Dorr, Colored Man round the World, p. 187 ("not worth"). Mott, Travels in Europe and the East, p. 330 ("Nothing denotes"). Kirkland, Letters, p. 491 ("I wore my").

8. Davis, Landscape of Belief, pp. 33, 42. The review of Cooley's book can be found in United States Democratic Review 11, no. 50 (Aug. 1842): 219 ("a novelty quite unique"). Samuel Austin Allibone, A Critical Dictionary of English Literature, and British and American Authors (Philadelphia: Lippincott, 1871), pp. 415 ("replete with information"), 754 ("precious volumes"). Cleveland Plain Dealer archive, Sept. 20, 1858, p. 3 ("graphic and racy"). "A Kentuckian in the East," Harper's New Monthly Magazine, 6, no. 36, May 1853, p. 741. The Works of the Late Edgar Allan Poe, vol. 4 (New York: Arthur Gordon Pym, 1856), pp. 371-89. Washington Irving, Mahomet and His Successors (Chicago: Belford, Clarke, 1973), p. 200. J. Ross Browne, Yusef; or, The Journey of the Frangi: A Crusade in the West (New York: Harper, 1853), p. 177 ("Yes, sir").

9. John Freeman, Herman Melville (New York: Macmillan, 1926), pp. 32-34, 63-65. Robert L. Gale, A Herman Melville Encyclopedia (Westport, Conn.: Greenwood, 1995), pp. 106-7, 127, 143,

400. Herman Melville, Redburn (New York: Literary Classics of the United States, 1983), p. 10. Herman Melville, Moby Dick (New York: Hendrick's

House, 1952), p. 30. Obenzinger, American Palestine, p. 63. Herman Melville, Journals, ed. Howard C. Horsford and Lynn Horth (Chicago: Northwestern Univ. Press, 1989), pp. 56 ("Imagine an immense"), 58, 61 ("horrible grimy"), 62-63 ("Out of every"), 65 ("these millions"), 72-73 ("like a huge stick"), 75-76 ("Vapors below summits"). Herman Melville, White-Jacket; or, The World in a Man-of-War (Oxford: Oxford Univ. Press, 1990), p. 153. Metwalli, "Lure of the Levant," p. 353. Dorothee Metlitsky Finkelstein, Melville's Orienda (New Haven and London: Yale Univ. Press, 1961), pp. 3, 165-67, 189, 192.

10. Warder Cresson, Jerusalem: The Center and Joy of the Universe (Philadelphia: Self- published, 1844), p. 23 ("God hath chosen"). Frank Fox, "Quaker, Shaker, Rabbi," pp. 174, 182. Obenzinger, American Palestine, pp. 127, 133 ("sawdust of Christianity"), 134-35. Warder Cresson biography on http://www.us-israel.org/jsource/biography/Cresson.html ("settling forever"). Melville, White-Jacket, p. 153 ("peculiar chosen people"). Melville, Journal, pp. 83 ("It is against the will" and "Whitish mildew"), 85 ("An American turned Jew"), 87 ("confused and half-ruinous"), 90 ("No country" and "the color"), 91 ("Is the desolation" and "In the emptiness"), 94 ("preposterous Jew mania").

11. Melville, Journal, pp. 81 ("exponent of her aspirations"), 92 ("broken-down machinist"), 93 ("H.M.: Have you settled"). Herman Melville, Clarel: A Poem and Pilgrimage to the Holy Land (Chicago: Northwestern Univ. Press, 1991), p. 413 ("in the name of Christ"). Finkelstein, Melville's Orienda, pp. 60-61, 90. Obenzinger, American Palestine, pp. 68-89. Walter Herbert, "The Force of Prejudice: Melville's Attack on Missions in Typee,"

Border States 1 (1973). Perry, "John Steinbeck's Roots," pp. 52-55, 60-61 USNA, RG 59, Dispatches from the U.S. Consuls. Alexandria, Egypt, vol. 2: Gorham to Brown, Jan. 17, 1858: Testimony of Mary Steinbeck, Jan. 18, 1858 ("Oh! Father" and "We sat half"); Testimony of Caroline Dickson, Jan. 18, 1858. Vogel, To See a Promised Land, p. 133. Robert DeMott, "Steinbeck's Other Family: New Light on East of Eden?" Steinbeck Newsletter 7, no. 1 (Winter 1994).

12. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls. Jerusalem, Palestine: De Leon to Bell, Jan. 27, 1858 ("prompt, stern"); De Leon to Cass, Feb. 22, 1858 ("unprotected heads"); De Leon to Cass, March 6, 1858 ("We regard the murder"); Gorham to Brown, Oct. 12, 1859; De Leon to Cass, July 28, 1860 ("It is the nature"). Edwin De Leon, Thirty Years of My Life on Three Continents (London: Ward and Downey, 1890), pp. 259 ("Are our countries"), 262 ("the Arab character"), 263 ("The audacity"). Feingold, Zion in America, p. 89. USNA, RG 84, Records of Foreign Service Posts. Cairo, Egypt: The State Department to Edwin de Leon, April 16, 1858. Papers of William H. Seward, Reel 58: Trabulsi to Seward, Sept. [n.d.], 1859.

13. Harold W. Felton, Uriah Phillips Levy (New York: Dodd, Mead, 1978), p. 34. Samuel Sobel, Intrepid Soldier (Philadelphia: Cresset, 1980), pp. 17, 15 ("I would rather serve"), 21. Sanford V. Sternlicht, Uriah Phillips Levy: The Blue Star Commodore (Norfolk: Norfolk Jewish Community Council, 1961), p. 41. Donovan Fitzpatrick and Saul Saphire, Navy Maverick: Uriah Phillips Levy (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1963). Marc Leeson, Saving Monticello: The Levy Family's Epic Quest to Rescue the House That Jefferson Built

(New York: Free Press, 2001). Field, America and the Mediterranean World, pp. 292-93. Palmer, Guardians of the Gulf, pp. 6-8.

14. Douglas H. Strong, Dreamers and Defenders: American Conservationists (Lincoln: Univ. of Nebraska Press, 1988), pp. 29-30. Life and Letters of George Perkins Marsh (New York: Scribner, 1888), p. 7. Jane Curtis, Will Curtis, and Frank Lieberman, The World of George Perkins Marsh (Woodstock: Countryman Press, 1982), pp. 65, 90, 102. David Lowenthal, George Perkins Marsh: Versatile Vermonter (New York: Columbia Univ. Press, 1958), pp. 120 ("wretched place"), 121-22, 126, 134-36, 178 ("the Comanches" and "strike with a salutary"). Rook, "Blueprints and Prophets," pp. 34-35, 39-40. Melville, Journals, pp. 69-70. Ninth Annual Report of the Smithsonian Institution (Washington, D.C.: Beverley Tucker, 1855), pp. 100 ("Ship of the desert"), 120.

15. Younis, "Arabs Who Followed Columbus," p. 14. Felicity Allen, Jefferson Davis: Unconquerable Heart (Columbia: Univ. of Missouri Press, 1999), p. 210. Odie B. Faulk, The U.S. Camel Corps (New York: Oxford Univ. Press, 1976), pp. 30, 49, 102 ("What are these"), 185-86 ("Napoleon, when"). The Papers of Jefferson Davis, ed. Lynda Crist and Mary Dix, vol. 6 (Baton Rouge: Louisiana State Univ. Press, 1989), pp. 26-27, 87 ("These tests fully realize"), 385, 387. Ben Macintyre, The Man Who Would Be King: The First American in Afghanistan (New York: Farrar, Straus and Giroux, 2004), pp. 269-72. See also U.S. Camel Corps Remembered in Quartzite Arizona, http://www.outwestnewspaper.com/camels.html.

16. Khalaf, Persistence and Change, pp. 89-93. PABCFM: W. W. Eddy to

Board, June 5, 1860. Henry Jessup, Fifty-three Years in Syria, vol. 1 (New York: Revell, 1910), pp. 175 ("terror-stricken, hungry"), 187-88 ("the blood at length"). Reminiscences of Daniel Bliss, pp. 142, 146, 152. Melvin Urofsky, The Levy Family and Monticello (Monticello: Thomas Jefferson Foundation, 2001), p. 83. Perry, "John Steinbeck's Roots," p. 70. Malini Johar Schueller, ed., David F. Dorr: A Colored Man round the World (Ann Arbor: Univ. of Michigan Press, 1999), p. xi.

8. Fission

1. Writings of Benjamin Franklin, vol. 10: Historicus to the Editor of the Federal Gazette, March 23, 1790, pp. 87-91. Ellis, Founding Brothers, pp. 81-119.

2. Lotfi Ben Rejeb, "America's Captive Freemen in North Africa: The Comparative Method in Abolitionist Persuasion" Slavery and Abolition 9 (1988): 60-61 ("If many thousands"). Arthur Zilversmit, The First Emancipation: The Abolition of Slavery in the North (Chicago: Univ. of Chicago Press, 1967), p. 171 ("doubtless shudder"). Marr, "Imagining Ishmael," p. 142 ("The American slaves") and ("the injustice and cruelty"). The Family Letters of Thomas Jefferson, ed. Edwin Bettis and James Bear Jr. (Columbia: Univ. of Missouri Press, 1966): Martha Jefferson to Thomas Jefferson, May 5, 1787, p. 39. Documentary History of the Ratification of the Constitution: Anonymous letter, Feb. 6, 1789, p. 872 ("six of one"). Tyler, Algerine Captive, pp. 98 ("like so many head"), 111 ("fly to"). Anonymous, American in Algiers, p. 24.

3. James Stevens, An Historical and Geographical Account of Algiers

(Philadelphia: Hogan and McElroy, 1797), p. 235 ("the execrable practice"). WEP, Negociations of the United States with the Kingdom of Tunis, roll 2: "Remarks &c Made at Algiers," Feb. 24, 1799, p. 38 ("Barbary is hell"). James Riley, Sufferings in Africa: Captain Riley's Narrative (New York: Potter, 1965), pp. 445 ("the cursed tree") 446-47 ("shiver in pieces"). Allison, Crescent Obscured, pp. 221-25. Gerald McMurty, "Influences of Riley's Narrative upon Abraham Lincoln," Indiana Magazine of History 30, no. 2 (June 1934): 136-38. Marr, "Imagining Ishmael," pp. 151-53. Charles Sumner, White Slavery in the Barbary States (Boston: J. P. Jewett, 1853), pp. 11, 12-13.

4. Missionary Herald: Journal of Pliny Fisk, Mary 8, 1823, p. 156. Shaban, Islam and Arabs in Early American Thought. Albert J. Raboteau, "Black Americans," in Davis, With Eyes toward Zion, vol. 2, pp. 312-14. Stephen Olin, Travels in Egypt, Arabia Petra and the Holy Land (New York: Harper, 1844), p. 318 ("great national calamities"). Handy, Holy Land, p. xiii ("A keen observer").

5. Ziff, Return Passages, p. 50. Mott, Travels in Europe and the East, pp. 390-91. Willis, Summer Cruise, pp. 282-83. Stephens, Incidents of Travel, p. 62. Cooley, American in Egypt, p. 349. Dorr, Colored Man round the World, p. 141.

6. FRUS, 1861: Brown to Aali Pacha, June 26, 1861, pp. 391-92 ("continue to cultivate"); Brown to Seward, July 17, 1861, p. 391 ("friendly sympathies"); Thayer to Seward, June 29, 1861; 1862: Message of the President to the Two Houses of Congress, Dec. 5, 1862, p. 5. Seward to Morris, April 1,

1862, p. 783 ("accustomed as they are"); 1863, vol. 2: Thayer to Seward, Nov. 5, 1862, p. 1101. Phillip Shaw Paludan, The Presidency of Abraham Lincoln (Lawrence: Univ. Press of Kansas, 1994), pp. 89-91, 218-19. Benjamin P. Thomas, Abraham Lincoln: A Biography (New York: Random House, 1968), pp. 281-83, 360. Wright, United States Policy toward Egypt, On the replacement of James Williams, see Senate Executive pp. 60-61. Journal, March 18, 1861, p. 310.

7. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls. Tangier, Morocco, vol. 8: De Long to Seward; Feb. 15, 1862 ("so called Southern Confederacy"); De Long to Seward; Feb. 20, 1862 ("American Citizens"); De Long to Commander of the Sloop of War "Tuscarosa," Feb. 20, 1862 ("I want the presence"); De Long to Bargash, Feb. 26, 1862; De Long to Seward, Feb. 27, 1862 ("at least three thousand"); De Long to the French, Italian, Swedish, Spanish, and Portuguese Consuls in Tangier, March 1, 1862 ("If temporary civil war"); De Long to Seward, March 6, 1862 ("I have heard"); De Long to Seward, March 20, 1862 ("Moorish authorities"). FRUS, 1862: Bargash to De Long, Feb. 25, 1862, pp. 863-64. Official Records of the Union and Confederate Navies in the War of the Rebellion, ser. 1, vol. 1 (Washington, D.C.: GPO, 1894), pp. 310-20, 358-60, 392, 668, 676-79. Raphael Simmes, Memoirs of a Service Afloat (Baltimore: Baltimore Publishing Co., 1887), pp. 334-35, 336 ("political ignorance"), 337-40. Jay Monaghan, Diplomat in Carpet Slippers: Abraham Lincoln Deals with Foreign Affairs (Indianapolis: Bobbs-Merrill, 1945), pp. 215-17. On the Tangier lighthouse convention, see Peter Larsen, Theodore Roosevelt and

the Moroccan Crisis, 1904-1906 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1984), p. iv.

8. FRUS, 1861: Thayer to Seward, July 20, 1861, p. 424; 1863, vol. 2: Thayer to Seward, Nov. 5, 1862, p. 1101; 1864, vol. 4: Thayer to Seward, Jan. 23, 1864, p. 405; Hale to Seward, Oct. 22, 1864, p. 408 ("generous contribution"); 1864, vol. 1: Message of the President to the Two Houses of Congress, Washington, Dec. 6, 1864, p. 4.

9. Studies in the National Military Victories of Egypt [Arabic]. Cairo: Ministry of Information, 1984, pp. 153-63. FRUS, 1865, vol. 3: Hale to Seward, Aug. 26, 1865, p. 329 ("What the Pacha"). Wright, United States Policy toward Egypt, pp. 63-65. Bryson, American Diplomatic Relations, pp. 25-26. Field, America and the Mediterranean World, p. 385. Arnold Blumberg, "William Seward and Egyptian Intervention in Mexico," Smithsonian Journal of History 1 (Winter 1966-67): 31-34, 44-45. Howard Kerner, "Turko-American Diplomatic Relations, 1860-1880" (Ph.D. diss., Georgetown Univ., 1948), pp. 62-65.

10. Allen C. Guelzo, Abraham Lincoln: Redeemer President (Grand Rapids, Mich.: Eerdmans, 1999), p. 434 ("How I should like"). USNA, RG 84, Records of Foreign Service Posts. Cairo, Egypt, vol. 78: Seward to Hale, Dec. 4, 1866; Seward to Hale, Jan. 23, 1867 ("considerate and friendly"). Osborn Oldroyd, The Assassination of Abraham Lincoln (1901; reprint, Union, N.J.: Lawbook Exchange, 2001), pp. 65, 232-35, 239, 266. Edward Steers, Blood on the Moon: The Assassination of Abraham Lincoln (Lexington: Univ. Press of Kentucky, 2001), pp. 231-32.

9. Rebs and Yanks on the Nile

1. Zachary Karabell, Parting the Desert: The Creation of the Suez Canal (New York: Knopf, 2003), p. 184 ("Practically every"). David Christy, King Cotton (Cincinnati: Moore, Wilstach, Keys, 1855), pp. 68-79. Field, America and the Mediterranean World, pp. 193-94 ("a Southern plantation"), 248-49. The goats given to Davis became the progenitors of prize Angora herds in Texas and Oregon; see Texas Department of Agriculture, http://www.agr.state.tx.us/education/ teach/mkt_fibernet.htm, and The First Farmers of Oregon, http://www.gesswhoto.com/centennial- farmers.html.

2. E. R. J. Owen, Cotton and the Egyptian Economy, 1820-1914 (London: Oxford Univ. Press, 1969), pp. 89, 105. Edward M. Earle, "Egyptian Cotton and the American Civil War," Political Science Quarterly 41, no. 4 (Dec. 1926): 520-36. USNA, RG 84, Records of Foreign Service Posts. Cairo, Egypt, vol. 78: William Seward to William Thayer, Dec. 16, 1862 ("The…increase of cotton"). FRUS, 1861: Thayer to Seward, July 20, 1861, p. 423; 1863, vol. 2: Seward to Morris, Dec. 13, 1862, pp. 1090-91. Vatikiotis, History of Egypt, pp. 73-77, 125-28. Karabell, Parting the Desert, pp. 183-84. Wright, United States Policy toward Egypt, pp. 66-70.

3. Charles Dudley Warner, Mummies and Moslems (Toronto: Belford Brothers, 1876), p. 380. Wright, United States Policy toward Egypt, pp. 86-87 ("shorten by 2,000 leagues"), 219. USNA, RG 84, Records of Foreign Service Posts. Cairo, Egypt: W. L. Marcy to Edwin de Leon, June 17, 1854 ("cheerfully received"). FRUS, 1861: Thayer to Seward, July 20, 1861, p. 424; 1862, vol. 2: Thayer to Seward, Nov. 5, 1862, p. 1101; 1864, vol. 4:

Thayer to Seward, Jan. 23, 1864, p. 405; 1864, vol. 1: Message of the President to the Two Houses of Congress, Washington, Dec. 6, 1864, p. 4 ("Our relations with Egypt"); 1865, vol. 3: Hale to Seward, Dec. 22, 1864, p. 315.

4. Pierre Crabitès, Americans in the Egyptian Army (London: Routledge, 1938), pp. 14, 39. Charles Chaillé-Long, My Life in Four Continents, vol. 1 (London: Hutchinson, 1912), pp. 17, 38, 231. William B. Hesseltine and Hazel C. Wolf, The Blue and the Gray on the Nile (Chicago: Univ. of Chicago Press, 1961), pp. 4 ("a soldier of misfortune"), 5-11, 18-19, 29-41, 43-44. Field, America and the Mediterranean World, pp. 395-96.

5. John Marlowe, Spoiling the Egyptians (New York: St. Martin's, 1975), pp. 104-17. Wright, United States Policy toward Egypt, p. 70.

6. James Morris Morgan, Recollections of a Rebel Reefer (Boston: Houghton Mifflin, 1917), pp. 268-69 ("That was about"), 270 ("An exact reproduction"). Chaillé-Long, My Life, pp. 20-22, 30-33. Crabitès, Americans in the Egyptian Army, pp. 41-42, 44. Hesseltine and Wolf, Blue and the Gray, pp. 65-66 ("discretion, devotion"), 72-73, 93-94 ("The East with its"), 98-100, 150-51.

7. William Wessels, Born to Be a Soldier: The Military Career of William Wing Loring (Fort Worth: Texas Christian Univ. Press, 1971), p. 78-79. Hesseltine and Wolf, Blue and the Gray, pp. 19-20, 51 ("The limits"), 66-72, 87 ("the express right" and "The army here"). Field, America and the Mediterranean World, pp. 392-93, 397. Wright, United States Policy toward Egypt, p. 81. Chaillé-Long, My Life, p. 35. Morgan, Recollections of a Rebel Reefer, pp. 271 ("I looked so much"), 287. See also Olive Risley Seward,

ed., William H. Seward's Travels around the World (New York: Appleton, 1873), pp. 545-46, 620. Ralph Kirshner, The Class of 1861: Custer, Ames, and Their Classmates after West Point (Carbondale: Southern Illinois Univ. Press, 1999), pp. 6, 167. Personal Memoirs of U.S. Grant, vol. 1 (New York: C. L. Webster, 1885), p. 181.

8. Morgan, Recollections of a Rebel Reefer, pp. 277-81, 291 ("Christian prejudices"). William Loring, A Confederate Soldier in Egypt (New York: Dodd, Mead, 1884), p. 69 ("the same barbarous"), 135 ("born of the sword"). Hesseltine and Wolf, Blue and the Gray, pp. 60 ("they are better"), 61-62, 64-65 ("Christian intolerance"), 89 ("The army, both officers"), 106, 116-17, 125-26. William Dye, Moslem Egypt and Christian Abyssinia (New York: Negro Universities Press, 1969), pp. 38-39, 45-46 ("imaginative soul"), 102.

9. Frederick J. Cox, "The American Naval Mission in Egypt," Journal of Modern History 26, no. 2 (June 1954). Hesseltine and Wolf, Blue and the Gray, pp. 123-27, 130-34, 144-46, 147 ("In the philanthropist"), 220. Crabitès, Americans in the Egyptian Army, pp. 74 ("Although I am prostrate"), 77, 81.

10. Charles Chaillé-Long, The Three Prophets: Chinese Gordon, Mohammed-Ahmed (El Maahdi), Arabi Pasha (New York: Appleton, 1884), pp. 25-27, and My Life, pp. 68, 91 ("Prostrate upon their faces,"), 94 ("number of warriors"), 97 ("The entire Nile"), 102-6, 158, 195 ("This young officer"). H. E. Wortham, Chinese Gordon (Boston: Little, Brown, 1933), p. 181. Godfrey Elton, Gordon of Khartoum (New York: Knopf, 1955), pp. 127,

135 ("on what he has done"). Crabitès, Americans in the Egyptian Army, pp. 110-11 ("Give it to them"), 134-35, 151-62, 167-68 ("American pirate"), 167 ("My hair hung"), 185. See also David Icenogle, "The Expeditions of Chaille-Long," http://www.saudiaramcoworld.com/issue/197806/the.expeditions.of.chaille-long.htm, and "Americans in the Egyptian Army," http://www.home.earthlink.net/~atomic_rom/officers.htm.

11. William Loring, "The Egyptian Campaign in Abyssinia-From the Notes of a Staff Officer," in Littell's Living Age 34, no. 1729 (Aug. 4, 1877). Loring, Confederate Soldier in Egypt, p. 63 ("I need not repeat"). Hesseltine and Wolf, Blue and the Gray, pp. 176-82.

12. Loring, Confederate Soldier in Egypt, pp. 416 ("morally and physically"), 417 ("a splendid place"), 401 ("in any other army"), 419 ("The Egyptians not only"), 414 ("alive with the moving"), 420-21 ("hideous…howls"), 435 ("No sooner had he"). Chaillé-Long, My Life, p. 195. Hesseltine and Wolf, Blue and the Gray, pp. 184-86, 194-95 ("Loring has blockhouse"), 205, 211-13, 224-25. Morgan, Recollections of a Rebel Reefer, pp. 309-10. Dye, Moslem Egypt, pp. 167 ("as shriveled with lechery"), 139-40 ("They escaped"), 219-22, 235, 270-71, 369 ("surgeons and sheiks"), 371 ("one unsightly mass"), 483, 487-88.

13. FRUS, 1878: Farman to Evarts, July 3, 1878, pp. 922-23; Farman to Evarts, July 15, 1878, pp. 923-24. On the Ottomans' purchase of Civil War surplus, see FRUS, 1877: Mr. Maynard to Mr. Evarts Constantinople, May 25, 1877, p. 572. James Raab, W. W. Loring (Manhattan, Kan.: Sunflower

Bornstein, "A Forgotten Alliance: Africans, Americans, Zionists and Irish," Times Literary Supplement, March 4, 2005, p. 13.

2. FRUS, 1862: Morris to Seward, Oct. 25, 1861, p. 787; Morris to Seward, Oct. 16, 1862, p. 791; 1864, vol. 4: Morris to Seward, May 21, 1863, p. 368. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 151 ("The providential history"), 170-76. Hanna F. Wissa, Assiout: The Saga of an Egyptian Family (Lewes, Sussex: Book Guild, 1994), pp. 93, 97, 105. Jessup, Fifty-three Years in Syria, p. 512 ("could place a Tammany"). Ellen Clare Miller, Eastern Sketches (New York: Arno Press, 1977), pp. 132-33. Missionary Herald, vol. 3: Letter from Mr. Perkins, Dec. 26, 1862, p. 341 ("This great struggle"). Harry N. Howard, "President Lincoln's Minister Resident to the Sublime Porte," Balkan Studies 5 (1964): 205-6.

3. John A. DeNovo, American Interests and Policies in the Middle East, 1900-1939 (Minneapolis: Univ. of Minnesota Press, 1963), p. 15. Grabill, Protestant Diplomacy, p. 34 ("Mohammedans, Muscovites"). Tibawi, American Interests in Syria, pp. 220-21 ("enjoy[ed] a liberty"), 272. Wright, United States Policy toward Egypt, pp. 146-47 ("We had the Gospel"), 219. The murderers of the two missionaries, the Reverends Merriam and Coffing, were later apprehended and executed. As a sign of gratitude, Secretary of State Seward presented the Ottoman grand vizier with a brace of silver pistols. See FRUS, 1863, vol. 2: Morris to Seward, April 30, 1863, p. 1094; 1864, vol. 4: Morris to Seward, Dec. 4, 1863, p. 373; Seward to Morris, Jan. 11, 1864, p. 366; Morris to Seward, April 14, 1864, pp. 381-82.

4. Jessup, Fifty-three Years in Syria, p. 597 ("semi-secular" and "letting in

Univ. Press, 1997), pp. 833, 890. Field, America and the Mediterranean World, pp. 312, 422 ("a crime against humanity"). Loring, Confederate Soldier in Egypt, p. 448 ("During the ten years"). Hesseltine and Wolf, Blue and the Gray, pp. 213-14, 223, 229-30 ("The whole confounded"), 243-24 ("Egypt has been kind"), 251. Bryson, American Diplomatic Relations, p. 27. Wessels, Born to Be a Soldier, p. 94. Wright, United States Policy toward Egypt, p. 83 ("No intelligent foreigner"). Dye, Moslem Egypt, p. 1 ("They were men").

10. The Trumpet That Never Calls Retreat

1. Edward Wilmot Blyden, Christianity, Islam and the Negro Race (Edinburgh: Edinburgh Univ. Press, 1967), pp. 6, 10 ("self-reliant, productive"), 13, 19-21, 186, 254. Edward Wilmot Blyden, The Elements of Permanent Influence: A Discourse Delivered at the 15th Street Presbyterian Church (Washington, D.C.: R. I. Pendleton, 1890) ("the spirit" and "Not the author"). Obenzinger, American Palestine, pp. 230-31 ("with an awe"). Yvonne Chireau and Nathaniel Deutsch, Black Zion: African American Religious Encounters with Judaism (New York: Oxford Univ. Press, 2000), p. 15 ("I would earnestly"). Edith Holden, Blyden of Liberia (New York: Vantage Press, 1966), pp. 141-44. Hollis Lynch, "A Black Nineteenth Century Response to Jews and Zionism: The Case of Edward Wilmot Blyden, 1832-1912," in Joseph Washington, ed., Jews in Black Perspective (Rutherford, N.J.: Fairleigh Dickinson Univ. Press, 1984), pp. 43-45. See also "Edward Wilmot Blyden and Africanism in America," http://www.columbia.edu/~hcb8/EWB_Museum/EWB1.html, and George

the light"). Taylor, Lands of the Saracen, p. 78. Tibawi, American Interests in Syria, p. 145 ("From the same battlefields"). Finnie, Pioneers East, p. 134 ("more converts"). Henry M. Field, From Egypt to Japan, 19th ed. (New York: Scribner, 1905), p. 60 ("Christian Missions").

5. John Freely, A History of Robert College (Istanbul: Y.K.Y, 2000), pp. 11-12. "The History of Robert College," http://www.robcol.k12.tr/admin/headmaster/history.htm. Field, America and the Mediterranean World, pp. 355-56. Hamlin, My Life and Times, p. 286 ("The work has proved"), 446-49, 470-73. Marcia Stevens and Malcolm Stevens, Against the Devil's Current: The Life and Times of Cyrus Hamlin (Lanham, Md.: Univ. Press of America, 1988), pp. 246, 258 ("No one was about"), 269, 297-98, 330-31. Khalaf, Persistence and Change, p. 100.

6. Carleton Coon, ed., Daniel Bliss and the Founding of the American University of Beirut (Washington, D.C.: Middle East Institute, 1989), pp. 35 ("Their faces"), 62-63, 67-68, 75 ("a home for jackals"), 79. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 161-62 ("necessary choice"). Jessup, Fifty-three Years in Syria, p. 595 ("the promised land"). Penrose, That They May Have Life, p. 23. Field, America and the Mediterranean World, p. 357 ("a man white").

7. Philip Hitti, Lebanon in History from the Earliest Times to the Present (London: Macmillan, 1962), pp. 450, 454, 462-67. Albert Hourani, Arabic Thought in the Liberal Age, 1798-1939 (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1962), pp. 243, 246-49. Holden, Blyden of Liberia, pp. 143- 44 ("to the day"). Elie Kedourie, "The American University of Beirut," Middle Eastern Studies 3 (1966): 75. Bernard Lewis, The Arabs in History (London:

Hutchinson's Univ. Library, 1950), pp. 173-74. Abu Ghazaleh, American Missions in Syria, pp. 31, 41-42, 59, 67-68. George Antonius, The Arab Awakening (London: Hamish Hamilton, 1938), pp. 42-43. Missionary Herald: "Recent Intelligence" (Mr. Wolcott), Feb. 1841, p. 255. Daniel Bliss, Letters from a New Campus: Written to His Wife Abby and Their Four Children during Their Visit to Amherst, Massachusetts, 1873-1874 (Beirut: American Univ. of Beirut, 1994), pp. 159 ("Oh that all"), 280-81.

8. USNA, RG 84, Records of Foreign Service Posts. Cairo, Egypt: William Seward to Charles Hale, Nov. 16, 1867. Glyndon Van Deusen, William Henry Seward (New York: Oxford Univ. Press, 1967), pp. 212-13. FRUS, 1864, vol. 4: Seward to McMath, Dec. 9, 1863, p. 410 ("exert all proper").

9. A Maine Family's History, http://www.calaisalumni.org/Maine/tales9.htm ("lips shut tight"). Reed M. Holmes, The Forerunners (Independence, Mo.: Herald, 1981), pp. 189 ("The great Restitution"). John Swift, Going to Jericho (New York: A. Roman, 1868), p. 201 ("Johnson's patent"). Vogel, To See a Promised Land, pp. 135. Obenzinger, American Palestine, pp. 181 ("The reign of Christ"), 182-83. Shlomo Eidelberg, "The Adams Colony in Jaffa (1866-1868)," Midstream 3 (Autumn 1957): 52-53. Peter Amann, "Prophet in Zion: The Saga of George J. Adams," New England Quarterly 37 (Dec. 1964): 481-86.

10. In his response to the Reverend Monk, Lincoln also mentioned that his chiropodist and close confidant, Isachar Zacharie, was a Jew who had "put me upon my feet" so often that he would gladly aid the doctor's countrymen to "get a leg up" in moving to Palestine. Peter Grose, Israel in the Mind of

America (New York: Knopf, 1983), pp. 25-26 ("There can be no"). See also Naphtali J. Rubinger, Abraham Lincoln and the Jews (New York: Jonathon David, 1962), p. 42, Bertram Korn, American Jewry and the Civil War (New York: Jewish Publication Society of America, 1951), p. 202, and Steiner, Religious Beliefs, pp. 110-45. Vogel, To See a Promised Land, p. 203. Little, American Orientalism, p. 13 ("We know far more"). Henry White Warren, Sights and Insights; or, Knowledge by Travel (New York: Nelson and Phillips, 1874), p. 246 ("This is the first country"). John Russell Young, Around the World with General Grant: A Narrative of the Visit of General U. S. Grant, Ex- President of the United States, to Various Countries in Europe, Asia and Africa, in 1877, 1878, 1879 (New York: American News Co., 1879), p. 335 ("Somehow you always").

11. Vogel, To See a Promised Land, p. 83 ("shall yet be brought home"), 220 ("So much has"). Princeton Review 38, no. 4 (1866): 670-74. Warren, Sights and Insights, pp. 283-84 ("the greatest temptation"). Philip Schaff, Through the Bible Lands (New York: American Tract Society, 1878), pp. 233, 237, 249 ("squalid and forbidding"). David S. Landes, "Passionate Pilgrims and Others: Visitors to the Holy Land in the 19th Century," in Davis, With Eyes toward Zion, vol. 2, pp. 10-11. Henry A. Riley, The Restoration at the Second Coming of Christ: A Summary of Millenarian Doctrines (Philadelphia: Lippincott, 1868), pp. 41-42 ("be gathered from"). Sarah Barclay Johnson, Hadji in Syria (New York: Arno Press, 1977), pp. 16 ("rightful owner"), 119 ("the Hebrew race"). William C. Prime, Tent Life in the Holy Land (New York: Harper, 1857), pp. 2 ("cast in holy radiance"), 99-100

("imported by Jaffa"). Henry W. Bellows, Restatement of Christian Doctrines in 25 Sermons (Boston: American Unitarian Association, 1869). Holmes, Forerunners, p. 19 ("The sons of Ephraim").

12. Amann, "Prophet in Zion," p. 486 ("he would rather"). Eidelberg, "Adams Colony in Jaffa," pp. 55-60. Obenzinger, American Palestine, p. 183 ("The exhalations"). Field, America and the Mediterranean World, pp. 281, 325 ("churches, hotels"). Holmes, Forerunners, pp. 119-21, 187 ("Put your faith"). Vogel, To See a Promised Land, pp. 138 ("adventurer, a charlatan"), 139 ("our warmest friends"), 140-41, 144 ("a monster in human"), 145-46, 147 ("We the colony"). Henry W. Bellows, The Old World in Its New Face (New York: Harper, 1869), pp. 262-62 ("religious fanatic"). Charles Elliot, Remarkable Characters and Places in the Holy Land (Hartford: J. B. Burr, 1867), p. 586 ("unprotected as they would be"). Swift, Going to Jericho, pp. 197-98 ("modern Mayflower"), 199-200 ("American eagle"), 201. On the death of Walter Cresson, see USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls. Jerusalem, Palestine: Page to Cass, Nov. 8, 1860.

13. National Library of Israel, Jerusalem, Manuscript Archive, Miscellaneous File 519: Petition of Colonists to Governor Chamberlain, Aug. 31, 1867. USNA, RG 84, Records of Foreign Service Posts. Cairo, Egypt, vol. 4: William Seward to Charles Hale, Oct. 7, 1867; RG 59, Dispatches from U.S. Consuls. Beirut, Lebanon, vol. 5: Letter for Jaffa Colonists to Beauboucher, March 20, 1867 ("How can we confide"); Records of Foreign Service Posts: Jerusalem, Palestine. March 8, 1857- Dec. 21, 1869, vol. 24: Johnson to Beauboucher, Dec. 3, 1867. Lipman, "American-Holy Land Material," pp.

32-33 ("The failure of the"). Vogel, To See a Promised Land, pp. 140 ("pale faced"), 147 ("recede and become"), 149. Obenzinger, American Palestine, pp. 184-85 ("American citizens"). Field, America and the Mediterranean World, p. 326 ("An Appeal!"). Eidelberg, "Adams Colony in Jaffa," p. 61. Holmes, Forerunners, p. 226.

11. American Onslaught

1. USNA, RG 59, Dispatches from the U.S. Consuls. Alexandria, Egypt, vol. 2: De Leon to Appleton, July 5, 1859. Vogel, To See a Promised Land, pp. 56, 59 ("The number of American"). Charles Dudley Warner, Mummies and Moslems (Toronto: Belford, 1876), p. 382 ("the perfumes of Arabia"). Jeffrey Alan Melton, Mark Twain, Travel Books, and Tourism: The Tide of a Great Popular Movement (Tuscaloosa: Univ. of Alabama Press, 2002), pp. 17, 18 ("nomadic era"). Kark, "Annual Reports," p. 164 ("unfavorable for the foreigner"). The Memoirs of Rose Eytinge (New York: Frederick A. Stoker, 1905), p. 151 ("most irksome"). Schaff, Through the Bible Lands, p. 26. Goldman, God's Sacred Tongue, pp. 160-61 ("The few Englishmen"). Field, From Egypt to Japan, pp. 7-8 ("Ah, you Americans").

2. Warner, Mummies and Moslems, pp. 357 ("Antiquity" Smith), 411 ("the conclusive verdict"). Vogel, To See a Promised Land, pp. 88 ("with few ideas" and "These cousins"), 91-92 ("miserable fellaheen"), 177. Crabitès, Americans in the Egyptian Army, p. 65 ("They usually come" and "They often think"). Morgan, Recollections of a Rebel Reefer, p. 267. Young, Around the World, pp. 301-2 ("Powell Tucker,"). Journals of Ralph Waldo Emerson, ed. Edward Emerson, vol. 10 (Boston: Houghton Mifflin, 1914), pp. 406, 407-8

("The people...are"), 409 ("The lateen sail"). Frederick Douglass, Autobiographies (New York: Library of America, 1994), pp. 1006 ("combat American prejudice"), 1007 ("half brothers").

3. Papers of William H. Seward , reel 58: Seward to Johnson, Sept. 28, 1859; "Governor Seward's Journey from Egypt to Palestine," New York Daily Tribune, Dec. 24, 1859, p. 5. Thornton Kirkland Lothrop, William Henry Seward (Boston: Houghton Mifflin, 1896), pp. 396-97. George E. Baker, ed., The Life of William H. Seward with Selections from His Works (New York: J. S. Redfield, 1855), p. 224 ("To the oppressed masses"). Frederic Bancroft, The Life of William H. Seward, vol. 2 (New York: Harpers, 1899), pp. 521-23. Walter LaFeber, The Cambridge History of American Foreign Relations, vol. 2, The American Search for Opportunity, 1865-1913 (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1993), p. 10. William H. Seward's Travels around the World, pp. 525-32, 616 ("double thralldom"), 634-35 ("former chief minister"), 654-55 ("a remarkable rabbi"). USNA, RG 84, Records of Foreign Service Posts. Cairo, Egypt, vol. 78: Seward to Hale, Jan. 5, 1867. Olive Risley Seward, Around the World Stories (Boston: D. Lothrop, 1889), pp. 265-80, 281 ("It used to be"), 282 ("It is not enough), 283-86.

4. George B. McClellan, "A Winter on the Nile," Scribner's Monthly 13, no. 3 (Jan. 1877): 368-83; 13, no. 4 (March 1877): 670-77; "The Bombardment of Alexandria," North American Review 142, no. 355 (June 1886): 593 ("so long as we"), 594 ("little but life").

5. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Cairo, Egypt, vol. 2: Beardsley to Fish, Jan. 22, 1872. William T. Sherman Family Papers,

CSHR9/59: Sherman to Thomas Sherman, March 29, 1872 ("Their Faith in Mohamet" and "the most repulsive"). Michael Fellman, Citizen Sherman: A Life of William Tecumseh Sherman (New York: Random House, 1995), p. 307 ("a hard-looking" and "undertake to move"). Morgan, Recollections of a Rebel Reefer, p. 266. Chaillé-Long, My Life, p. 231. Memoirs of Rose Eytinge, p. 201. J. C. Audenreid, "General Sherman in Europe and the East," Harper's New Monthly Magazine 47, no. 280 (Sept. 1873): 232, 234-35, 236, 240, 486-95.

6. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Cairo, Egypt, vol. 5: Farman to Evarts, Feb. 12, 1878. The Papers of Julia Dent Grant, ed. John Simon (New York: Putnam, 1975), pp. 220 ("One might easily think"), 221 ("We had only to clap"), 222-23, 224 ("One could not but"). Vogel, To See a Promised Land, pp. 54-55 ("the most remarkable journey"). Young, Around the World, pp. 257 ("Welcome General Grant"), 299. Elbert Farman, Along the Nile with General Grant (New York: Grafton Press, 1904), pp. 26, 32-33, 92, 99. William McFeely, Grant (New York: Norton, 1981), pp. 466-67. Geoffrey Perret, Ulysses S. Grant (New York: Random House, 1997), p. 454 ("It looks as if" and "I have seen"). Dye, Moslem Egypt, p. 491. Wessels, Born to Be a Soldier, pp. 80- 81 ("Why there's Loring"). Hesseltine and Wolf, Blue and the Gray, pp. 232-33 ("I wouldn't sit down").

7. Papers of Julia Dent Grant, p. 233 ("a gorgeous gleaming" and "a poor place"). Vogel, To See a Promised Land, p. 149. Young, Around the World, pp. 234-35, 329, 351. McFeely, Grant, p. 467. Perret, Ulysses S. Grant, p. 454. Steiner, Religious Beliefs, pp. 71-76. See also William N. Still,

American Sea Power in the Old World: The United States Navy in European and Near Eastern Waters, 1865-1917 (Westport, Conn.: Greenwood, 1980), p. 76.

8. References to "Cairo," "Turk," "Arab," and "Arabian Nights" in Twain's writing, can be located on Mark Twain and His Times, http://etext.lib.virginia.edu/railton/about/srchmtf.html. Mark Twain website, http://www.boondocksnet.com/twaintexts/letters/letter670607.html: Letter to Jane Clemens and Family, June 7, 1867 ("tired of staying"). "Mark Twain's Correspondence with the San Francisco Alta California," http://www.twainquotes.com/altaindex.html: April 9, 1867 ("Isn't it a most attractive"). Dayton Duncan and Geoffrey C. Ward, Mark Twain: An Illustrated Biography (New York: Knopf, 2001), pp. 10, 48 ("the necessary stock "), 54 ("permanently miserable"), 60-61. Mark Twain, The Innocents Abroad; or, The New Pilgrims' Progress: Being Some Account of the Steamship Quaker City's Pleasure Excursion to Europe and the Holy Land (Pleasantville, N.Y.: Reader's Digest Association, 1990), pp. 11 ("picnic on a gigantic," "scamper about the decks," and "green spectacles"), 17 ("The Synagogue"), 418 ("a funeral without"). Albert Bigelow Paine, Mark Twain: A Biography: The Personal and Literary Life of Samuel Langhorne Clemens (New York: Harper, 1912), pp. 324-31.

9. Twain, Innocents Abroad, pp. 51 ("Tangier is a foreign"), 52 ("The emperor of Morocco"), 53 ("Christian dogs"), 54 ("thinks he has five" and "They slice around"), 56, 419 ("strange horde"), 424 ("Travel is fatal").

10. Twain, Innocents Abroad, pp. 80-81 ("a short, stout"), 228 ("in all the

outrageous"), 229 ("the three-legged woman"), 233, 239 ("nothing of romance"), 262 ("The picture lacks"), 290-91 ("an island of pearls"), 284, 289-90 ("wretched nest"), 303 ("couldn't smile"), 351 ("To glance at").

11. Twain, Innocents Abroad, pp. 302 ("The gods of my"), 306, 311, 317 ("If all the poetry"), 319-20, 324, 332 ("frescoed…with disks"), 342, 358, 361, 385, 391. Paine, Mark Twain, pp. 333- 36, 337 ("Is it any wonder"), 338, 394 ("hopeless, dreary"). Justin Kaplan, Mr. Clemens and Mr. Twain (New York: Simon & Schuster, 1966), p. 52.

12. USNA, RG 84, Records of Foreign Service Posts. Cairo, Egypt, vol. 78: William Seward to Charles Hale, Oct. 30, 1867. Twain, Innocents Abroad, pp. 397-98 ("shamefully humbugged"), 401 ("Palestine is no more"), 406 ("American vandals"). Mark Twain website, http://www.boondocksnet.com/twaintexts/letters/letter670607.html: Twain to the San Francisco Alta California, Jan. 8, 1868 ("Moorish haiks"). Paine, Mark Twain, p. 341 ("gospel of sincerity"). Kaplan, Mr. Clemens and Mr. Twain, p. 233. Obenzinger, American Palestine, pp. x ("right along with"), 188, 256.

13. "A Short History of the Shrine," http://www.shrinershq.org/shrine/short history.html. Eric Davis, "Representations of the Middle East at American World Fairs, 1876-1904," in Amanat and Bernhardsson, eds., United States and the Middle East, pp. 352-53, 354 ("the oldest people"), 355- 58, 359 ("from Tangiers").

12. Resurgence

1. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Damascus: Johnson to Seward, April 3, 1867 ("that Americans sympathize"); Governor General of Syria to Johnson, Oct. 3, 1868; Johnson to Seward, Oct. 10, 1868; Johnson to Seward, July 22, 1868; Johnson [L.] to Johnson [A], Oct. 31, 1868; Johnson to Seward, Nov. 12, 1868; Dillon to Johnson, Dec. 19, 1868; Johnson to Seward, Dec. 31, 1868. New York Times, Dec. 7, 1880.

2. FRUS, 1880: Evarts to Fairchild, March 12, 1880, pp. 893-94. USNA, Dispatches from U.S. Consuls, Tangiers: Cohen to Mathews, May 5, 1880 ("It is to America"); Dispatches from U.S. Consuls, Jerusalem: Meizel, Alexander and Lipkin to deHass, May 3, 1877. Bryson, American Diplomatic Relations, pp. 29, 47. Brainerd Dyer, The Public Career of William M. Evarts (Berkeley: Univ. of California Press, 1933), pp. 217-18. Cyrus Adler, Jews in the Diplomatic Correspondence of the United States (Baltimore: Friedenwald, 1906), pp. 39-45. Ron Bartur, "American Consular Assistance to the Jewish Community of the Land of Israel at the End of the Ottoman Period to the Outbreak of World War I, 1856-1914 [Hebrew]" (Hebrew Univ., 1984), p. 364 ("The stars and stripes").

3. David Harris, Britain and the Bulgarian Horrors of 1876 (Chicago: Univ. of Chicago Press, 1939), p. 410 ("In Paniguischte"). New York Times, Sept. 9, 1876 ("the remains of babes"). Field, America and the Mediterranean World, pp. 365-72. Bryson, American Diplomatic Relations, pp. 29-30. Sir Edwin Pears, Forty Years in Constantinople, 1873-1915 (New York: Appleton, 1916), pp. 16-18.

4. Palmer, Guardians of the Gulf, p. 311 ("There is no place"). Field, America and the Mediterranean World, p. 312 ("now gets its"). Jonathan Grant, "The Sword of the Sultan: Ottoman Arms Imports, 1854-1914," Journal of Military History 66 (Jan. 2002), pp. 9-36. John Dunn, "Egypt's Nineteenth-Century Armaments Industry," Journal of Military History 61 (April 1997), pp. 231-54. Jeffrey D. Wert, General James Longstreet (New York: Simon and Schuster, 1993), p. 419. Marty H. Krout, ed., Lew Wallace: An Autobiography (New York: Harper, 1906), pp. 962-63. See also "Meet Lew Wallace: American Minister to Turkey, 1881-1885," on http://www.ben-hur.com/meet_ambassador.html.

5. FRUS, 1877: Mr. Maynard to Mr. Evarts, Nov. 26, 1877, p. 141; 1878, Mr. Heap to Mr. Hunter, Jan. 25, 1878, pp. 929-31; 1879: Farman to Evarts, May 22, 1879, p. 1003 ("long remain"); Message of the President, Dec. 1, 1879, p. xiv ("a generous mark"); 1880, Farman to Evarts, May 5, 1880, pp. 1108-12. Elbert Eli Farman, "Negotiating for the Obelisk," Century Illustrated Monthly Magazine 24 (Oct. 1882): 882-83 ("The population," "another souvenir," and "It is not for"). Elbert Farman, Egypt and Its Betrayal (New York: Grafton Press, 1908), pp. 148-49, 166. Seaton Schroeder, Fifty Years of Naval Service (New York: Appleton, 1922), pp. 133-36, 140-43. Labib Habachi, The Obelisks of Egypt (Cairo: American Univ. in Cairo Press, 1984), pp. 176-78, 181-82. Bob Brier, "Saga of Cleopatra's Needles," Archaeology 55, no. 6 (Nov.-Dec. 2002): 48-51. Martina D'Alton, The New York Obelisk (New York: Metropolitan Museum of Art, 1993), pp. 2, 11 ("point the finger" and "It would be absurd"), 16-21, 63. James Field, "Near

East Notes and Far East Queries," in John Fairbank, ed., The Missionary Enterprise in China and America (Cambridge: Harvard Univ. Press, 1974).

13. Empires at Dawn

1. Conn, "John Porter Brown," pp. 10-11. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Algiers, Algeria: Lee to French Consul, Feb. 20, 1830 ("the Frenchman"); Lee to Van Buren, July 15, 1830; Porter to Van Buren, Sept. 22, 1830. Haight, Letters from the Old World, pp. 260, 262. FRUS, 1882: Wallace to Frelinghuysen, Feb. 1, 1882, p. 501. Akira Iriye, From Nationalism to Internationalism: U.S. Foreign Policy to 1914 (London: Routledge and Kegan Paul, 1977), p. 65 ("we cannot follow"). Potts, "National Boasting," New York Times, Nov. 26, 1852. E. J. Hobsbawm, The Age of Empire, 1875-1914 (New York: Pantheon, 1987), p. 59.

2. USNA, RG 59; Dispatches from U.S. Consuls, Tunis: Fish to Hunter, April 22, 1881 ("It looks as though"); Fish to Hunter, May 5, 1881 ("In plain Anglo-Saxon"). David M. Pletcher, The Awkward Years: American Foreign Relations under Garfield and Arthur (Columbia: Univ. of Missouri Press, 1962), pp. 224-25 ("Civilization gains"). General Lewal, "The French Army," Harper's New Monthly Magazine 82, no. 491 (April 1891): 657.

3. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Cairo, Egypt: Beardsley to Page, April 24, 1874; Beardsley to Fish, Dec. 11, 1875. Wright, United States Policy toward Egypt, pp. 92, 108-9 ("What folly"), 120, 123. Adam Badeau, "The Bombardment of Alexandria," North American Review 142, no. 355 (June 1886): 592. "American Trade Opportunities in Egypt Destroyed," Los Angeles Times, July 26, 1882, p. 2 ("shameful act"). "A

Mohammedan Revival," New York Times, Sept. 22, 1881, p. 4 ("fanatic…Arabs "); "The Conquest of Egypt," Sept. 15, 1882, p. 4 ("everlasting shame"); "The Bondage of Egypt," Feb. 6, 1882, p. 4 ("taxation without representation").

4. Chaillé-Long, My Life, pp. 245-48, 251, 259 ("In the sea"), 271 ("Men, women"), 302-3 ("We dominate"), 307 ("the Americans…who"). Still, American Sea Power, pp. 83-84, 85 ("I corralled"), 86-87. Frederick J. Cox, "Arabi and Stone: Egypt's Military Rebellion, 1882," Cahiers d'Histoire Egyptienne 8 (April 1956): 173-74. Messages and Papers of the Presidents, 1789- 1897, vol. 8, ed. James D. Richardson (New York: Bureau of National Literature, 1917): Second Annual Address of Chester Arthur to Congress, Dec. 4, 1882, p. 126. FRUS, 1882: Sackville West to Frederick T. Frelinghuysen, Sept. 17, 1882, p. 325 ("sailors and marines").

5. Farman, Egypt and Its Betrayal, pp. 286 ("evil genius"), 289 ("Shylock"), 290 ("aggressive European Powers"), 302 ("He was the idol"), 303 ("instigated by"). Egyptian State Information Service, "Orabi Pasha," http://216.239.41.104/search?q=cache:O8sDNNWobzsJ:www.sis.gov.eg/calendar/html/c1310397.htm+orabi&hl=en&start=2. For a reference to the Arabic roots of the name "'Urabi," see Hans Wehr, A Dictionary of Modern Written Arabic (Beirut: Librairie du Liban, 1980), p. 601.

6. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Cairo: Wolf to Blaine, Sept. 12, 1881 ("act cautiously"); Wolf to Blaine, Sept. 15, 1881 ("Here on this"); Wolf to Blaine, Oct. 29, 1881 ("the natives and owners"); Wolf to Blaine , Nov. 11, 1881 ("in no way"); Urabi to Wolf (n.d.) ("management and wisdom"); Wolf to Frelinghuysen, March 21, 1882 ("There is scarcely").

Esther L. Panitz, Simon Wolf: Private Conscience and Public Image (Rutherford: Fairleigh Dickinson Univ. Press, 1987), pp. 71-78. Selected Addresses and Papers of Simon Wolf (New York: Bloch, 1926), pp. 15-16. Simon Wolf, The Presidents I Have Known from 1860-1918 (Washington, D.C.: Byron S. Adams, 1918), pp. 124-30.

7. Cox, "Arabi and Stone," pp. 155-58. Charles P. Stone, "Stone Pacha and the Secret Dispatch," Journal of the Military Service Institution of the United Fanny Stone, "The Diary of an States 8, no. 29 (March 1887): 95. American Girl in Cairo during the War of 1882," Century Illustrated Monthly Magazine 28, no. 2 (June 1883): 29 ("quietly eating"), 43 ("death to the Christians"), 38 ("There never lived"), 34 ("be brave"), 45 ("For once"). Crabitès, Americans in the Egyptian Army, p. 263. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Cairo: Gomanos to Frelinghuysen, July 23, 1882.

8. Chaillé-Long, My Life, pp. 139 ("Egypt for the Egyptians"), 201 ("a very bad soldier"). Farman, Egypt and Its Betrayal, p. 333 ("Tel el-Kebir"). USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Cairo: Wolf to Blaine, Oct. 29, 1881 ("The cup is full"). Later in life, Wolf seems to have altered his opinion of the British administration in Egypt, crediting it with bringing it into "new light." See Wolf, Presidents I Have Known, p. 134.

9. Cox, "Arabi and Stone," p. 158 ("Egypt had become"). Bernard A. Weisberger, Statue of Liberty: The First Hundred Years (Boston: Houghton Mifflin, 1985), pp. 22-23 ("Granite beings"), 24 - 25, 33. Willadene Price, Bartholdi and the Statue of Liberty (Chicago: Rand McNally, 1959), pp.

27-29, 42-45, 63-65, 119-20. Marvin Trachtenberg, The Statue of Liberty (New York: Penguin, 1986), pp. 46, 53-54, 57. Grabill, Protestant Diplomacy, p. 56 ("When will you turn").

10. On the use of the Middle East model by American imperialists in the Far East, see Field, "Near East Notes," pp. 24 ("The Muslim societies"), 25-27. Field also makes the remarkable observation (p. 41) that "all the countries in which women have recently exercised significant political power-Israel, India, Ceylon, and China-were nineteenth-century targets of American missionary endeavor." Mark Twain, "An Anti-Imperialist," New York Herald, Oct. 15, 1900.

14. Imperial Piety

1. Eve Merriam, The Voice of Liberty: The Story of Emma Lazarus (New York: Farrar, Straus and Cudahy, 1959), pp. 140-41. Mark A. Raider, The Emergence of American Zionism (New York: New York Univ. Press, 1998), pp. 12 ("We consider ourselves"), 70-71 ("Wake, Israel"). Bette Roth Young, "Emma Lazarus and Her Jewish Problem," American Jewish History 84 (Dec. 1996): 299 ("opens up such"), 309 ("a home for" and "artisans, warriors"). Martin Feinstein, American Zionism, 1884-1904 (New York: Herzl Press, 1965), pp. 18, 58-59. Emma Lazarus, "Epistle to the Hebrews," American Hebrew 13 (Feb. 2, 1883): 137; "The Jewish Problem," Century Illustrated Monthly Magazine 36, no. 6 (Feb. 1883). Daniel Marom, "Who Is the 'Mother of Exiles'?: Jewish Aspects of Emma Lazarus's The New Colossus," Prooftexts 20, no. 3 (2000): 250 ("renew their youth"). Abram S. Isaacs, "Will the Jews Return to Palestine," Century 26, no. 1 (May 1883).

See also Ranen Omer- Sherman, "Emma Lazarus, Jewish American Poetics, and the Challenge of Modernity," Journal of American Women Writers 19 (2003). Gregory Eiselein, "Emotion and the Jewish Historical Poems of Emma Lazarus," Mosaic 37 (2004). Arthur Zeiger, "Emma Lazarus and Pre-Herzlian Zionism," in Shulamit Reinharz and Mark A. Raider, eds., American Jewish Women and the Zionist Enterprise (Waltham, Mass.: Brandeis Univ. Press, 2004), pp. 13-17.

2. T. De Witt Talmage, Talmage on Palestine (New York: W. D. Rowland, 1890), pp. 7, 10 ("that curse of nations"), 24 ("All the fingers" and "They would be foolish"). John Rusk, The Authentic Life of T. DeWitt Talmage (New York: L. G. Stahl, 1902), pp. 79-82, 104, 125-26. Handy, Holy Land, pp. 125-28. See also T. De Witt Talmage, New Tabernacle Sermons (New York: George Munro, 1886).

3. William E. Blackstone, Jesus Is Coming (Chicago: Revell, 1908), pp. 240-41. Paul Charles Merkley, The Politics of Christian Zionism, 1891-1948 (London: Frank Cass, 1998), pp. 60-63, 69-71. Obenzinger, American Palestine, pp. 268-69. Vogel, To See a Promised Land, pp. 228-29. The full text of the Blackstone Memorial can be found in Joseph Celleni, ed., Christian Protagonists for Jewish Restoration (New York: Arno Press, 1977), pp. 13-14.

4. In his first State of the Union Address, in 1885, Grover Cleveland assailed the Porte for its attempts to impose "religious tests as a condition of residence [in Palestine]," but otherwise refrained from endorsing the Jewish state idea. See Messages and Papers of the Presidents: 1789-1897, vol. 8

(Washington, D.C.: GPO, 1898), p. 335. FRUS, 1882: Wallace to Said Pasha, June 3, 1882, p. 508; Ascher and Weinberg to Wallace, June 13, 1882, pp. 517-18; 1885: Bayard to Cox, Oct. 15, 1885, p. 871; 1888: Straus to Said Pasha, May 17, 1888, p. 1589 ("inquisitorial"); Rives to Gilman, Oct. 12, 1888, p. 1618; 1898: Straus to Hay, Nov. 22, 1898, p. 1092. Merle Curti, American Philanthropy Abroad (New Brunswick: Rutgers Univ. Press, 1963), p. 108. Jacob M. Landau and Kemal Mim Oke, "Ottoman Perspectives on American Interests in the Holy Land," in Davis, With Eyes toward Zion, vol. 2, pp. 269-72. Cyrus Adler, Jacob H. Schiff: His Life and Letters, vol. 2 (London: William Heinemann, 1929), pp. 162-63. Naomi Wiener Cohen, A Dual Heritage: The Public Career of Oscar S. Straus (Philadelphia: Jewish Publication Society of America, 1969), pp. 88-89, 171, 283. Regina S. Sharif, Non-Jewish Zionism: Its Roots in Western History (London: Zed Press, 1983), pp. 92-93.

5. Bertha Spafford Vester, Our Jerusalem: An American Family in the Holy City (1950; reprint, New York: Arno Press, 1977), pp. 56-57, 63 ("American-made"), 98 ("He taught me"), 134, 158. Vogel, To See a Promised Land, pp. 114 ("post-Protestant period"), 152-53 ("When sorrows"), 155 ("hoping to be").

6. Supporters of the American Colony were also instrumental in securing the recall of Merrill's successor, Edwin S. Wallace. Wallace accused Mrs. Spafford of holding "such power over her victims as to make them swear to be true what they know to be false," and of "doing much harm to injure the good name of America in this part of the world." See USNA, RG 59,

Dispatches from U.S. Consuls. Jerusalem: Wallace to Cridler, Dec. 7, 1897; Merrill to Wharton; Oct. 3, 1891 ("one of the wildest"); Merrill to Quincy, Aug. 17, 1893; Merrill to Cridler, Jan. 30, 1899; Merrill to Cridler, July 8, 1901 ("They hate the United"). Shalom Goldman, "The Holy Land Appropriated: The Careers of Selah Merrill, Nineteenth Century Christian Hebraist, Palestine Explorer, and U.S. Consul in Jerusalem," American Jewish History 85, no. 2 (June 1997): 152-67. Ruth Kark, "Annual Reports," pp. 173-74. Alexander Fume Ford, "Our American Colony at Jerusalem," Appleton's Magazine 8 (1906): 643-55.

7. Carl Dolmetsch, "Our Famous Guest"-Mark Twain in Vienna (Athens: Univ. of Georgia Press, 1992), pp. 45, 128-31, 25, 270. Cynthia Ozick, "Mark Twain and the Jews," Commentary 99, no. 5 (May 1995): 56-62. Theodore Herzl, "Mark Twain and the British Ladies: A Feuilleton," Commentary 28, no. 3 (Sept. 1959): 243-44 ("a short, spare"). Twain, Innocents Abroad, p. 324. Amos Elon, Herzl (New York: Holt, Rinehart and Winston, 1975), pp. 66, 245. Obenzinger, American Palestine, pp. 266 ("The difference between the brain"), 267-68 ("If that concentration"). "Concerning the Jews" first appeared in Harper's New Monthly Mazagine in Sept. 1899; see also Charles Neider, ed., The Complete Essays of Mark Twain (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1963), pp. 235-50, and Dan Vogel, Mark Twain's Jews (Jersey City, N.J.: KTAV Publishing House, 2006), pp. 61-88.

8. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Cairo: Wolf to Frelinghuysen, March 25, 1882. Field, America and the Mediterranean World, p. 350. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 249-50, 275. DeNovo,

American Interests, pp. 9, 13-14, 18, 31. Kaplan, Arabists, pp. 39-40. Grabill, Protestant Diplomacy, p. 21. Wright, United States Policy toward Egypt, p. 229 ("Americans occupy Egypt").

9. American diplomatic records are rife with correspondence describing assaults on, and even the murder of, missionaries. See, e.g., FRUS, 1901: Negotiations for the Settlement of Indemnity Claims of United States Citizens, Hay to Straus, Jan. 11, 1900, p. 906. Laurie, Ely Volume, pp. 84, 457. Cagri Erhan, "Ottoman Official Attitudes towards American Missionaries" in Amanat and Bernhardsson, eds., United States and the Middle East, pp. 317-19. Vogel, To See a Promised Land, pp. 116-17. Tibawi, American Interests in Syria, pp. 237, 269 ("In the war"), 275, 280. DeNovo, American Interests, pp. 12, 35 ("No man ever came"), 42. Wright, United States Policy toward Egypt, p. 331. Field, America and the Mediterranean World, p. 437. Grabill, Protestant Diplomacy, pp. 30-31 ("modern missionaries").

10. J. Christy Wilson, Apostle to Islam: A Biography of Samuel M. Zwemer (Grand Rapids, Mich.: Baker Book House, 1952), pp. 40-44, 72-73. Henry Harris Jessup, The Setting of the Crescent and the Rising of the Cross; or, Kamil Abdul Messiah, a Syrian Convert from Islam to Christianity (Philadelphia: Westminster Press, 1898), pp. 51-53, 65, 72, 127, 137-39, 143. Alfred DeWitt Mason and Frederick J. Barny, History of the Arabian Mission (New York: Board of Foreign Missions Reformed Church in America, 1926), pp. 76-77, 86 ("very heart of Islam"), 90-91. Samuel Zwemer and James Cantine, The Golden Milestone: Reminiscences of Pioneer Days Fifty

Years Ago in Arabia (New York: Revell, 1938), pp. 18-19, 30, 43, 92, 135. A. E. Zwemer and S. M. Zwemer, Zigzag Journeys in the Camel Country: Arabia in Picture and Story (New York: Revell, 1911), pp. 27, 31 ("Pioneer journeys"), 50, 92, 103 ("A country [without]"). Paul W. Harrison, Doctor in Arabia (London: Robert Hale, 1943), p. 264. Stuart Knee, "Anglo-American Relations in Palestine, 1919-1925: An Experiment in Realpolitik," Journal of American Studies of Turkey 5 (1997): 5 ("American religious-philanthropic").

11. Josiah Strong, Our Country: Its Possible Future and Its Present Crisis (New York: American Home Mission Society, 1885), pp. 218-19. USNA, RG 59, Diplomatic Instructions of the Department of State, Persia: Bayard to Pratt, Aug. 23, 1887; Bayard to Pratt, July 7, 1886. FRUS, 1881: Foster to Blaine, May 21, 1881, pp. 1016-17; Vol. XLII, 1883: Benjamin to Felinghuysen, June 13, 1883, pp. 703-6 ("the most brilliant"); 1886, Pratt to Bayard, Nov. 29, 1886, p. 913 ("iron, coal, copper"); 1887: Pratt to Bayard, May 4, 1887, pp. 916-17. Bryson, American Diplomatic Relations, pp. 39-40. Abraham Yeselson, United States-Persia Diplomatic Relations, 1883-1921 (New Brunswick: Rutgers Univ. Press, 1956), pp. 23-25. Palmer, Guardians of the Gulf, pp. 6-9. DeNovo, American Interests, pp. 296-97. Michael Zirinsky, "American Presbyterian Missionaries at Urmia during the Great War," Journal of Assyrian Academic Studies 12, no. 1 (April 1998): 8-11.

12. Field, "Near East Notes," pp. 51, 54. Still, American Sea Power, pp. 79 ("The wayward Turks"), 103-4 ("Even the head").

13. USNA, RG 59, Dispatches from the U.S. Consuls, Erzerum: Chilton to Use, Oct. 9, 1895. New York Times, Dec. 28, 1894 ("if not by"). Peter

Balakian, The Burning Tigris: The Armenian Genocide and America's Response (New York: HarperCollins, 2003), pp. 11 ("Armenian Holocaust"), 23, 64, 73, 93. Arman Kirakossian, ed., The Armenian Massacres, 1894-1896: U.S. Media Testimony (Detroit: Wayne State Univ. Press, 2004), pp. 37 ("blot upon civilization"), 47 ("Not all the perfume"). Grabill, Protestant Diplomacy, p. 43 ("the demon of damnable"). Clyde E. Buckingham, Clara Barton: A Broad Humanity (Alexandria, Va.: Mount Vernon Publishing, 1977), p. 262 ("the warships").

14. Angell later served as president of the University of Michigan, where an impressive hall still bears his name. FRUS, 1900: Griscom to Hay, Dec. 12, 1900, p. 515. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Constantinople: Judson Smith to Olney, Nov. 19, 1895; Olney to Terrill; Jan. 16, 1896. Frederick Davis Greene, Armenian Massacres; or, The Sword of Mohammed (Philadelphia: National Publishers Co., 1896), p. xvii ("The policy of the United"). Grabill, Protestant Diplomacy, pp. 41-44, 45 ("rattle the Sultan's"). Kirakossian, Armenian Massacres, p. 71 ("Yankees of the Orient"). Erhan, "Ottoman Official Attitudes," p. 332. Still, American Sea Power, pp. 99-100, 105- 6, 107. George Washburn, Fifty Years in Constantinople (Boston: Houghton Mifflin, 1909), pp. 246-49. Washburn relates how one American sailor, an African American whom the Turks mistook for a Muslim, succeeded in saving large numbers of Armenians.

15. Buckingham, Clara Barton, pp. 260-62. David H. Burton, Clara Barton: In the Service of Humanity (Westport, Conn.: Greenwood, 1995), pp. 128-30. Curti, American Philanthropy Abroad, pp. 124, 127 ("I shall never counsel").

Balakian, Burning Tigris, pp. 10, 62-65, 69-70. Kirakossian, Armenian Massacres, pp. 42-43. "Profiles in Caring: Clara Barton," http://www.nahc.org/NAHC/Val/Columns/SC10-1.html ("perhaps the most perfect"). McDougall, Promised Land, pp. 104-5.

15. Imperial Myths

1. Clarence Clough Buel, "Preliminary Glimpses of the Fair," Century Illustrated Monthly Magazine 45, no. 4 (Feb. 1893): 615. Davis, "Representations of the Middle East, 1876-1904," pp. 344-48, 370. Erik Larson, The Devil in the White City: Murder, Magic, and Madness at the Fair That Changed America (New York: Vintage, 2003), pp. 247-48, 250-51, 265-67.

2. The Autobiography of Sol Bloom (New York: Putnam, 1948), pp. 106 ("I came to realize"), 107-8 (I knew that"), 119 ("To have made"). Donna Carlton, Looking for Little Egypt (Bloomington, Ind.: IDD Books, 1994), p. 27. A superb description of the Middle Eastern exhibitions at the Paris fair can be found in Timothy Mitchell's Colonising Egypt (Berkeley: Univ. of California Press, 1988), p. 1.

3. "The World's Columbian Exposition: Idea, Experience, Aftermath," http://xroads.virginia.edu/~MA96/WCE/title.html ("the strange music"). Mark Stevens, Six Months at the World's Fair (Detroit: Detroit Free Press, 1895), pp. 101, 103 ("Cairo was strikingly"). Larkin, Devil in the White City, p. 236. Gustav Kobbe, "Sights at the Fair," Century Illustrated Monthly Magazine 46, no. 6 (Sept. 1893): 653 ("The Midway Plaisance"). Carlton, Looking for Little Egypt, pp. 27, 35, 39 ("Such a jaunt"). Norman Bolotin and Christine Laing,

The World's Columbian Exposition (Urbana: Univ. of Illinois Press, 2002), p. 139. Robert Muccigrosso, Celebrating the New World: Chicago's Columbian Exposition of 1893 (Chicago: Ivan R. Dee, 1993), p. 164. David Burg, Chicago's White City of 1893 (Lexington: Univ. Press of Kentucky, 1976), pp. 105, 221.

4. The cost of riding camels was twice that of riding donkeys-twenty-five cents. A quarter also gained admission to the Moorish Palace, the Persian Tent, the Turkish Pavilion, and the Bedouin encampment. See Bolotin and Laing, World's Columbian Exposition, p. 107. Stevens, Six Months, p. 102 ("This high art dancing"). Burg, Chicago's White City, pp. 221 ("splendid specimens"), 222 ("It is the coarse" and "Every motion"), 223 ("Now she revolves"). Carlton, Looking for Little Egypt, p. 23. Muccigrosso, Celebrating the New World, pp. 165, 166 ("genuine native muscle" and "a peaceful night's rest"), 167 ("simply horrid"). Larkin, Devil in the White City, pp. 311-12 ("whether the apprehensions").

5. Daniel Burnham, ed., Final Official Report of the Director of Works of the World's Columbian Exposition (New York: Garland, 1989), p. 40. "None Can Compare with It," New York Times, June 19, 1893, p. 5 ("The denizens"). Mrs. Mark Stevens, A Lecture on What You Missed in Not Visiting the World's Fair (Flint: n.p., 1895), p. 6 ("New Jerusalem"). Buel, "Preliminary Glimpses," p. 626 ("Haroun al-Raschid"). Muccigrosso, Celebrating the New World, pp. 167-68 ("We were all knocked"). Autobiography of Sol Bloom, pp. 122-23, 135 ("The crowds poured in" and "a masterpiece of rhythm"), 136. Burg, Chicago's White City, p. 223.

6. Blackstone's proposal for an international arbitrating organization, circulated at the 1893 fair, can be found in the William Blackstone Papers, collection 540, box 7, folder 1. Turner, Frontier in American History, p. 37.

16. A Region Renamed and Reordered

1. A. T. Mahan, Retrospect and Prospect (Boston: Little, Brown, 1902), pp. 233, 237, 243. A. T. Mahan, The Problem of Asia (Boston: Little, Brown, 1900), pp. 80-81, 83 ("the neck of land"). Numerous studies exist on the Mahan's naval theories in general and on his concept of the Middle East in particular. See, e.g., Roderic H. Davison, "Where Is the Middle East?" in Richard H. Nolte, ed., The Modern Middle East (New York: Atherton Press, 1963), pp. 15-17. Marwan R. Buheiry, "Alfred T. Mahan: Reflections on Sea Power and on the Middle East as a Strategic Concept," in Lawrence I. Conrad, ed., The Formation and Perception of the Modern Arab World (Princeton: Darwin Press, 1990), pp. 157-62. W. D. Pulson, The Life and Work of Captain Alfred Thayer Mahan (New Haven: Yale Univ. Press, 1939), pp. 41-42.

2. Fareed Zakaria, From Wealth to Power: The Unusual Origins of America's World Role (Princeton: Princeton Univ. Press, 1996), pp. 46, 127. Walter Zimmerman, First Great Triumph: How Five Americans Made Their Country a World Power (New York: Farrar, Straus and Giroux, 2002), pp. 24-25, 30-31, 34-37. Walter LaFeber, The New Empire: An Interpretation of American Expansion, 1860-1898 (Ithaca: Cornell Univ. Press, 1998), pp. 99, 105. Ernest May, Imperial Democracy: The Emergence of America as a Great Power (Chicago: Imprint Publications, 1961), p. 6.

3. Camel cigarettes first appeared in 1913, with a logo inspired by "Old Joe," a camel in the Barnum and Bailey Circus. Other "Middle Eastern" brands soon appeared, with names like Aga, Kismet, and Osman. See Nance, "Crossing Over," pp. 98-102. DeNovo, American Interests, pp. 16- 22, 39-40. Wright, United States Policy toward Egypt, pp. 206-7. Turgay, "Ottoman-American Trade," p. 234 ("The newspapers"). Field, America and the Mediterranean World, pp. 327, 338. The Complete Plays of Bernard Shaw (London: Constable Press, 1931), pp. 320 ("As the search"), 323 ("The world").

4. Theodore Roosevelt's Diaries of Boyhood and Youth (New York: Scribner, 1928), pp. 227 ("I felt a great deal"), ("what we should call"), 276 ("How I gazed"), 278-79 ("the Arabs always talk"), 290, 304 ("a glimpse of"), 314-319. Theodore Roosevelt, An Autobiography (New York: Da Capo Press, 1985), pp. 20, 398-99, 548 ("so utterly incompetent"), 550, 561 ("dreadful scourge"). Nathan Miller, Theodore Roosevelt: A Life (New York: Quill Books, 1992), p. 54. Edmund Morris, The Rise of Theodore Roosevelt (New York: Modern Library, 2001), pp. 37, 40-41. Grabill, Protestant Diplomacy, p. 45 ("Spain and Turkey"). Steiner, Religious Beliefs, pp. 152-56. John Milton Cooper, The Warrior and the Priest: Woodrow Wilson and Theodore Roosevelt (Cambridge: Harvard Univ. Press, 1983), pp. 71-72 ("barbarous and semi-barbarous").

5. FRUS, 1901, vol. 4: Leishman to Hay, Sept. 5, 1901, p. 997; Lazzaro to Dickinson, Sept. 5, 1901, p. 998 ("dressed like Turks"); Stone to Peet, Sept. 20, 1901, p. 1006; Eddy to Hay, Dec. 13 1901; Leishman to Hay, March 1,

1902. Teresa Carpenter, The Miss Stone Affair: America's First Modern Hostage Crisis (New York: Simon & Schuster, 2003), pp. 30-31 ("Women have no earthly"), 32-35, 56-57, 94-96, 140-42.

6. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls, Constantinople: Leishman to Hay, Sept. 10, 1903. "Unspeakable Turk to Be Called Upon to Settle for the Murder of American Vice-Consul," Los Angeles Times, Aug. 28, 1903. "Turkish Minister to Confer with Hay," New York Times, Aug. 30, 1903 ("We have allowed"). Still, American Sea Power, p. 159. Erhan, "Ottoman Official Attitudes," p. 332.

7. USNA, RG 59, Dispatches from U.S. Consuls. Tangier: Gummere to Hay, May 19, 1904 ("most prominent American"); Gummere to Hay, May 20, 1904; Gummere to Hay, June 15, 1904. FRUS, 1904: Hay to Gummere, June 9, 1904, pp. 498-99 ("Anything which may be regarded"). Edmund Morris, Theodore Rex (New York: HarperCollins, 2003), pp. 323, 324 ("all we hold sacred"), 329 ("PRESIDENT WISHES"), 325-26, 327 ("I had much rather"), 335 ("WE WANT PEDICARIS"), 337-38 ("that flag"). Baepler, White Slaves, pp. 291-97, 301 ("one of the most"). Peter Larsen, "Theodore Roosevelt and the Moroccan Crisis, 1904-1906" (Ph.D. diss., Princeton Univ., 1984), pp. 1, 21-22 ("surrender to the demands"), 40-41, 64, 66.

8. FRUS, 1906: International Diplomatic Conference at Algeciras: White to the Secretary of State, Jan. 30, 1906, pp. 1471-72. The Letters of Theodore Roosevelt, ed. Elting Morison (Cambridge: Harvard Univ. Press, 1954): Roosevelt to Whitelaw Reid, June 27, 1906, pp. 318-19; Roosevelt to Joseph Cannon, Sept. 12, 1904, pp. 923-24 ("Do they object"). Selections

from the Correspondence of Theodore Roosevelt and Henry Cabot Lodge, 1884-1918 (New York: Scribner, 1925): Roosevelt to Lodge, July 11, 1905, p. 166. USNA, RG 59, Special Missions: Root to White, March 2, 1906 ("side with either"). Frederick W. Marks, Velvet on Iron: The Diplomacy of Theodore Roosevelt (Lincoln: Univ. of Nebraska Press, 1979), p. 69. Howard K. Beale, Theodore Roosevelt and the Rise of America to World Power (Baltimore: Johns Hopkins Univ. Press, 1986), pp. 356-62, 366, 370-74, 377-78, 381-88. Raymond A. Esthus, Theodore Roosevelt and the International Rivalries (Claremont: Regina Books, 1970), pp. 70-79, 83-89, 104-9, 111 ("It would be enormously").

9. Franklin Matthews, Back to Hampton Roads (New York: B. W. Huebsch, 1909), pp. 282-83, 287-89, 290 ("We gave Cairo"). Roman J. Miller, Around the World with the Battleships (Chicago: A. C. McClurg, 1909), pp. 301-6, 308 ("About us swarmed"), 309, 315, 324-25. James A. Reckner, Teddy Roosevelt's Great White Fleet (Annapolis: Naval Institute Press, 1988), pp. 146-47. Robert A. Hart, The Great White Fleet (Boston: Little, Brown, 1965), pp. 272-74.

10. Letters of Theodore Roosevelt: Roosevelt to George Otto Trevelyan, Oct. 11, 1910, pp. 349-51. Wright, United States Policy toward Egypt, pp. 168-69. Vatikiotis, History of Egypt, pp. 203-4. David H. Burton, Theodore Roosevelt: Confident Imperialist (Philadelphia: Univ. of Pennsylvania Press, 1968), pp. 180-85, 191 ("I should have things"). Sheikh Ali Yousuff, "Egypt's Reply to Colonel Roosevelt," North American Review 191 (June 1910): 732-33, 755 ("Down with Roosevelt"), 737 ("when Egypt is").

11. Walter Scholes and Marie Scholes, The Foreign Policies of the Taft Administration (Columbia: Univ. of Missouri Press, 1970), pp. 30-31. Thomas Bentley Mott, Twenty Years as Military Attaché (1937, reprint, New York: Arno Press, 1979), pp. 171-74. DeNovo, American Interests, pp. 46-49, 52 ("an attitude"), 53 ("the veriest folly"), 76. Grose, Israel in the Mind, pp. 59-60. Robert A. McDaniel, The Shuster Mission and the Persian Constitutional Revolution (Minneapolis: Bibliotheca Islamica, 1974), pp. 115, 124-26, 134, 160-61, 170, 198 ("a monumental error").

17. Spectators of Catastrophe

1. Philip Roth, The Plot against America (Boston: Houghton Mifflin, 2004), p. 114. David Fromkin, A Peace to End All Peace: The Fall of the Ottoman Empire and the Creation of the Modern Middle East (New York: Avon, 1989), p. 534. Kinross, Ottoman Centuries, pp. 566-609. Stephen Hemsley Longrigg, Oil in the Middle East: Its Discovery and Development (London: Oxford Univ. Press, 1954), p. 25. Helen Davenport Gibbons, The Red Rugs of Tarsus: A Woman's Record of the Armenian Massacre of 1909 (New York: Century, 1917), pp. 170 ("The only difference"), 179.

2. Grabill, Protestant Diplomacy, p. 38. DeNovo, American Interests, pp. 38, 96. FRUS, 1914, Supplement: Bryan to Morgenthau, Oct. 5, 1914, p. 9 ("I am much gratified").

3. FRUS, 1914, Supplement: Morgenthau to Bryan, Aug. 19, 1914, p. 758; Morgenthau to Bryan, Aug. 25, 1914, p. 75; Bryan to Morgenthau, Aug. 26, 1914, p. 77 ("in the interest").

4. FRUS, 1914, Supplement: Morgenthau to Bryan, Aug. 15, 1914, p. 66

("grave immediate necessity"); Morgenthau to Bryan, Aug. 19, 1914, p. 758 ("reign of military terrorism"); Morgenthau to Bryan, Nov. 7, 1914, p. 139 ("never doubted"); Morgenthau to Bryan, Nov. 8, 1914, p. 781 ("For each Mussulman"); Lansing to Morgenthau, Nov. 18, 1914, p. 771 ("Should organized massacres"); Lansing to Morgenthau, Nov. 20, 1914, p. 771 ("any loss of life"); Bryan to Morgenthau, Dec. 20, 1914, pp. 777-78 ("it would be unsafe"); Morgenthau to Bryan, Dec. 22, 1914, p. 778; 1914-20, Lansing Papers, vol. 1: Rusem to Bryan, Sept. 12, 1914, pp. 70-71 ("who gave the world"); Wilson to Lansing, Sept. 17, 1914, pp. 72-73. See also Robert Trask, The United States Response to Turkish Nationalism and Reform, 1914-1939 (Minneapolis: Univ. of Minnesota Press, 1971), p. 13. Arthur S. Link, Wilson: The Struggle for Neutrality (Princeton: Princeton Univ. Press, 1960), pp. 68-69. Robert L. Daniel, "The Armenian Question and American-Turkish Relations, 1914-1927," Mississippi Valley Historical Review 46 (Sept. 1959): 256.

5. "Missionaries Tell of Terrible Conditions-Raids by Turks," New York Times, Dec. 5, 1914; "20,000 Christians in Peril," Dec. 15, 1914; "Fear of General Massacre in Constantinople" ("There was no room"). Balakian, Burning Tigris, pp. 177-80.

6. Leslie A. Davis, The Slaughterhouse Province: An American Diplomat's Report on the Armenian Genocide, 1915-1917 (New Rochelle: Aristide D. Caratzas, 1989), pp. 46-54, 67-69, 79 ("The Mohammedans"). Statement by the Rev. William A. Shedd, of the American (Presbyterian) Mission Station at Urmia, "Beth Aram-The Aramean homepage in Germany," http://www.beth-

aram.de/dokumente3.html. "Agonies of Armenians Described by Dr. Richard Hill in Letter from Caucuses," New York Times, Feb. 7, 1916. Henry H. Riggs, Days of Tragedy in Armenia (Ann Arbor: Gomidas Institute, 1917), p. 48. Balakian, Burning Tigris, pp. 193-94 ("old men and old"), 346 ("The Government"), 180, 196, 200-201.

7. Jay Winter, ed., America and the Armenian Genocide of 1915 (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 2003), p. 192. Clarence Ussher and Grace Knapp, An American Physician in Turkey (Boston: Houghton Mifflin, 1917), pp. 236-44, 277. John D. Barrows, In the Land of Ararat (New York: Revell, 1916), pp. 128-34. FRUS, 1915, Supplement: Bryan to Gerard, March 12, 1915, p. 964 ("non-combatants"). "Turks Lock 1,000 in Wooden Building and Then Apply the Torch," New York Times, Sept. 3, 1915; "Spare Armenians Pope Asks Sultan," Oct. 13, 1915; "State Department Shows Quarter of a Million Women Violated," Oct. 22, 1915. Samantha Power, A Problem from Hell: America and the Age of Genocide (New York: Basic, 2002), pp. 4-6.

8. Barbara Tuchman, "The Assimilationist Dilemma: Ambassador Morgenthau's Story," Commentary 63, no. 5 (May 1977): 60. Henry Morgenthau III, Mostly Morgenthau: A Family History (New York: Ticknor & Fields, 1991), pp. 102-3, 127. The Papers of Woodrow Wilson, ed. Arthur Link (Princeton: Princeton Univ. Press, 1966-94), vol. 35: From the Diary of Colonel House, May 2, 1913, pp. 384-85; Henry Morgenthau to Woodrow Wilson, June 12, 1913 ("Would prominent Methodists"), p. 513. Central Zionist Archives (henceforth, CZA), A 243/150: Morgenthau to Wise, June

10, 1913; Wise to Morgenthau, Aug. 7, 1913.

9. Balakian, Burning Tigris, pp. 222-23 ("dazzling" and "intrigue, intimidation"). CZA, A 243/150: Morgenthau to Wise, Nov. 28, 1913 ("This is undoubtedly"). Henry Morgenthau Papers, reel 22; undated speech ("few rug merchants"). Henry Morgenthau, All in a Life-Time (Garden City, N.Y.: Doubleday, Page, 1922), pp. 175-76 ("I had hitherto"), 196, 203 ("the American spirit"), 204 ("gospel of Americanism"), 209 ("Here was I"). Henry Morgenthau, The Murder of a Nation (New York: Armenian General Benevolent Union of America, 1974), p. 18.

10. Lansing replaced Bryan, an adamant pacifist, who resigned in protest of Wilson's policies, which, he felt, were drawing America into the war. Balakian, Burning Tigris, pp. 227, 266-70. Merrill D. Peterson, "Starving Armenians": America and the Armenian Genocide, 1915-1930 and After (Charlottesville: Univ. of Virginia Press, 2004), p. 37 ("gigantic plundering"). "Armenians' Own Fault, Benstrof Now Says," New York Times, Sept. 29, 1915. Power, Problem from Hell, p. 6. Israel Charny, ed., Encyclopedia of Genocide (Santa Barbara: ABC-CLIO, 1999), p. 96. Lewis Einstein, Inside Constantinople (London: John Murray, 1917), p. 231. FRUS, 1915, Supplement: Morgenthau to the Secretary of State, July 10, 1915, p. 983 ("race extermination"); 1914-20, Lansing Papers, vol. 1: Lansing to Wilson, Nov. 15, 1916, p. 41.

11. Papers of Woodrow Wilson, vol. 35, p. 349 ("You may be sure"). FRUS, 1914-20, Lansing Papers, vol. 1: Lansing to Wilson, Nov. 21, 1916, p. 42 ("well-known disloyalty"). Winter, America and the Armenian Genocide, p.

104. "Government Sends Plea for Armenia," New York Times, Oct. 4, 1915 ("aroused strong sentiment"). Henry Morgenthau Papers, reel 7: Morgenthau to the Secretary of State, July 16, 1915 ("Nothing short of"). Henry Morgenthau, Ambassador Morgenthau's Story (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1918), pp. 333-34 ("not…as a Jew"). Morgenthau, Murder of a Nation, pp. 64 ("Our people will"), 68 ("They are all dead").

12. Henry Morgenthau Papers, reel 7: Morgenthau to Secretary of State, Aug. 11, 1915 ("It is difficult"). FRUS, 1915, Supplement, Morgenthau to Secretary of State, Sept. 3, 1915, p. 988. USNA, RG 59, Morgenthau to the Secretary of State, Nov. 25, 1915; Morgenthau to the American Consuls at Beiruth and Aleppo, Nov. 29, 1915. James Barton, Story of Near East Relief (1915-1930) (New York: Macmillan, 1930), p. 4. Ralph Elliot Cook, "The United States and the Armenian Question, 1894-1924" (Ph.D. diss., Tufts Univ., 1957), pp. 131-32. Balakian, Burning Tigris, pp. 279-80, 282. Power, Problem from Hell, pp. 9, 11-12. CZA, CM 241/2-roll 44: Clipping from the St. Louis Dispatch, Sept. 15, 1915 ("The United States might be"). Some Americans also opposed Morgenthau's plan for resettling Armenians in the United States. "Nothing is more stupid…than advocating that the solution of the Armenian question…is in emigration en masse to America," wrote the New York Herald correspondent Herbert Gibbons. "Their wholesale emigration…would mark the disappearance of the Armenians as a race and a nation." See Herbert A. Gibbons, The Blackest Page of Modern History (New York: Putnam, 1916), p. 50.

13. Richard Kloian, The Armenian Genocide: News Accounts from the

American Press (Berkeley: Anto Press, 1985), p. 219 ("One group"). Balakian, Burning Tigris, pp. 242-43 ("arms or legs" and "hundreds of bodies"), 246-47. James Barton, ed., "Turkish Atrocities": Statements of American Missionaries on the Destruction of Christian Communities in Ottoman Turkey, 1915- 1917 (Ann Arbor: Gomidas Institute, 1998), p. 9 ("Women [who] escaped").

14. George Horton, The Blight of Asia (1926; reprint, Indianapolis: Bobbs-Merrill, 1953), pp. 54-57. Balakian, Burning Tigris, pp. 254-55. DeNovo, American Interests, p. 39. Morgenthau, Ambassador Morgenthau's Story, pp. 307, 321-22 ("The whole history"), 350. Morgenthau, Murder of a Nation, p. 114 ("I had reached"). See also Marsovan 1915: The Diaries of Bertha B. Morley (Ann Arbor: Gomidas Institute, 2000), p. 15.

15. FRUS, 1916, Supplement: Philip to Lansing, May 21, 1916, p. 851 ("Turkish authorities appear"); Philip to Lansing, July 15, 1916, pp. 932-33 ("In spite of"); Philip to Lansing, July 26, 1916, p. 934; Philip to Lansing, July 26, 1916, p. 935; 1914-20, Lansing Papers, vol. 2: Lansing to Wilson, May 17, 1917, pp. 17-19. Dennis R. Papazian, "Misplaced Credulity: Contemporary Turkish Attempts to Refute the Armenian Genocide," http://www.umd.umich.edu/dept/ armenian/papazian/misplace.html ("unchecked policy of extermination"). Kaplan, Arabists, p. 65 ("The air was filled"). See also Grace D. Guthrie, Legacy to Lebanon (Richmond, Va.: Self-published, 1984), p. 17. Margaret McGilvary, The Dawn of a New Era in Syria (New York: Revell, 1920), pp. 94 ("The whole country"), 110 ("In Syria we were").

18. Action or Nonaction?

1. Papers of Woodrow Wilson, vol. 35: House to Wilson, Nov. 11, 1915, p. 191 ("Anything coming"); House to Wilson, Feb. 3, 1916, p. 124 ("The Central Empire runs"); Woodrow Wilson's State of the Union Address, Dec. 4, 1917, p. 200 ("do not yet stand"). FRUS, 1916, Supplement: Philip to Lansing, March 28, 1916, p. 849; 1914-20, Lansing Papers, vol. 1: Elkus to Lansing, Sept. 26, 1916, p. 782; Elkus to Lansing, March 2, 1917, pp. 787-88 ("What can we expect"); Elkus to Lansing, Feb. 11, 1917, p. 134 ("Our relations with Turkey"); Supplement 2: Secretary of State to Elkus, April 6, 1917, p. 11. See also Isaiah Friedman, The Question of Palestine: British-Jewish-Arab Relations: 1914-1918 (New Brunswick: Transaction, 1992), p. 211.

2. Wilson's request for a congressional declaration of war appears on http://www.classbrain.com/artteenst/publish/article_86.shtml. Cornelius Engert Papers, box 1, folder 11.5: Engert to American Minister at The Hague, Nov. 11, 1917. Papers of Woodrow Wilson, vol. 35: Chambers to Wilson, Dec. 10, 1915, p. 337; vol. 45: Abram Elkus to Wilson, Nov. 14, 1917 ("Turkey is the weakest"). John H. Finley, A Pilgrim in Palestine (New York: Scribner, 1919), p. 55. "Senators Want War on Austria," New York Times, Nov. 27, 1917 ("Turkey's course"); Dec. 7, 1917 ("I should be sorry"). Selections from the Correspondence of Theodore Roosevelt and Henry Cabot Lodge: Lodge to Roosevelt, Oct. 2, 1918. Letters of Theodore Roosevelt: Roosevelt to Lodge, Oct. 23, 1918 ("We ought to declare"); Roosevelt to Paul Shimmon, July 10, 1918 ("surpassed the iniquity").

272-80, 281 ("hot air impressions"), 284 ("wild goose chase"). William Yale, "Ambassador Henry Morgenthau's Special Mission of 1917," World Politics 1, no. 3 (April 1949): 311-15, 320 ("Morgenthau's trip"). Manuel, Realities, pp. 155-58. Chaim Weizmann, Trial and Error: The Autobiography of Chaim Weizmann (Philadelphia: Jewish Publication Society of America, 1949), pp. 196 ("Talk to Morgenthau"), 197-98.

19. An American Movement Is Born

1. Raider, Emergence of American Zionism, p. 12. Feinstein, American Zionism, pp. 99 ("a fatal blow"), 125. Rafael Medoff, Zionism and the Arabs: An American Jewish Dilemma, 1898- 1948 (Westport, Conn.: Praeger, 1997), p. 12 ("of merely being"). Gideon Shimoni, The Zionist Ideology (Hanover: Univ. Press of New England, Brandeis Univ. Press, 1995), p. 137 ("Their entire desire"). Grose, Israel in the Mind, p. 72 ("the most formidable"). Arthur Hertzberg, ed., The Zionist Idea: An Historical Analysis and Reader (New York: Atheneum, 1972), p. 500 ("We believe that"). Melvin I. Urofsky, American Zionism from Herzl to the Holocaust (Garden City, N.Y.: Anchor Press, 1975), p. 98. Oscar Straus Papers, box 4: Straus to Wolf, April 24, 1906.

2. Samuel Halperin, The Political World of American Zionism (Detroit: Wayne State Univ. Press, 1961), pp. 11-12 ("Will the Jews"). Hertzberg, Zionist Idea, p. 499 ("Is the German- American"). H. N. Hirsch, The Enigma of Felix Frankfurter (New York: Basic Books, 1981), p. 44. Michael E. Parrish, Felix Frankfurter and His Times: The Reform Years (New York: Free Press, 1982), pp. 129-30. Ben Halpern, "The Americanization of Zionism,"

3. Papers of Woodrow Wilson, vol. 45: Dodge to Wilson, Dec. 2, 1917, pp. 185-86; Wilson to Dodge, Dec. 5, 1917 ("every word"); vol. 47: Lansing to Wilson, May 8, 1918, pp. 569-70; vol. 48: From the Diary of Colonel House, May 19, 1918, p. 70; Wilson to Lansing, May 24, 1918, p. 136; vol. 49: Sir William Wiseman to Sir Eric Drummond, Aug. 27, 1918, p. 365. DeNovo, American Interests, p. 106 ("I have thought"). Letters of Theodore Roosevelt, vol. 8: Roosevelt to Cleveland, May 11, 1918, pp. 1316-18 ("We are guilty"); Theodore Roosevelt to Andrew Fleming West, Dec. 28, 1918, p. 1418 ("It is rather bitter"). Joseph Grabill, "Cleveland H. Dodge, Woodrow Wilson, and the Near East," Journal of Presbyterian History 48 (Winter 1970): 249-54. Fromkin, Peace to End All Peace, p. 260 ("following its inclination"). See also David E. Cronon, ed., The Cabinet Diaries of Josephus Daniels, 1913-1921 (Lincoln: Univ. of Nebraska Press, 1963), p. 246.

4. FRUS, 1914-20, Lansing Papers, vol. 2: Lansing to Wilson, May 17, 1917, pp. 17-19; 1917, Supplement 2: Morgenthau and Frankfurter to Secretary of State, July 8, 1917, pp. 120-22. Papers of Woodrow Wilson, vol. 43: Memorandum from an interview with Wilson written by Sir William Wiseman, July 13, 1917, p. 172; vol. 45: Morgenthau to Wilson, Nov. 26, 1917, p. 123 ("was the cancer"); Wilson to Lansing, Nov. 28, 1917, p. 147; vol. 49: Dodge to Wilson, Sept. 28, 1918, pp. 151-52 ("in the seventh heaven"). Jehuda Reinharz, Chaim Weizman: The Making of a Statesman (New York: Oxford Univ. Press, 1993), pp. 153-54, 155 ("there was one chance"), 163 ("on no account"), 164-68. Richard Lebow, "The Morgenthau Peace Mission of 1917," Jewish Social Studies 32, no. 4 (Oct. 1970): 271 ("If it succeeds"),

American Jewish History 69, no. 1 (1979): 15-33. Melvin I. Urofsky, A Voice That Spoke for Justice: The Life and Times of Stephen S. Wise (Albany: State Univ. of New York Press, 1982).

3. Raider, Emergence of American Zionism, pp. 21, 25, 27. Grose, Israel in the Mind, pp. 48 ("these so-called dreamers"), 52 ("deep moral feeling"). CZA, A 243/13, Stephen S. Wise Papers: Wise to Frankfurter, Oct. 10, 1936 ("Sanity, soundness"). Ezekiel Rabinowitz, Justice Louis D. Brandeis: The Zionist Chapter of His Life (New York: Philosophical Library, 1968), pp. 14, 31. Evyatar Freisel, "Brandeis' Role in American Zionism Reconsidered," in Jeffrey Gurock, ed., American Jewish History: The Colonial and Early National Periods, 1654-1840 (New York: Routledge, 1998), pp. 42-43, 105. Allon Gal, "In Search of a New Zion: New Light on Brandeis' Road to Zionism," in Gurrock, American Jewish History, pp. 79, 88, 90-91 ("the descendants"). Ben Halpern, A Clash of Heroes: Brandeis, Weizmann, and American Zionism (New York: Oxford Univ. Press, 1987), pp. 94-95, 100-5. Louis D. Brandeis, The Jewish Problem: How to Solve It (New York: Zionist Organization of America, 1919), pp. 19-20 ("There is no inconsistency").

4. USNA, Ducker to the Secretary of the Navy-Report on the Conditions in Palestine with Reference to Zionism, Feb. 10, 1915. Lansing to Brandeis, Feb. 16, 1915 ("general massacre"); Alexandria Palestine Committee to the Secretary of State, Jan. 25, 1915 ("In name of"); FRUS, 1914, Supplement: Morgenthau to Bryan, Aug. 13, 1914, p. 757; 1914-20, Lansing Papers, vol. 1: Elkus to Lansing, Nov. 17, 1916, p. 784. Manuel, Realities, pp. 128-31, 136-40. Ruth L. Deech, "Jacob de Haas: A Biography," in Raphael Patai,

ed., Herzl Year Book 7 (New York: Herzl Press, 1971), pp. 340-41 ("If ever I have").

5. Morgenthau, All in a Life-Time, p. 175 ("Anything you can do"). Manuel, Realities, pp. 120- 25, 126 ("unqualified loyalty"), 141-46. FRUS, 1916, Supplement: Morgenthau to Lansing, Dec. 1915, p. 830; Lansing to Glazebrook, Jan. 14, 1916, p. 925; Lansing to Philip, Sept. 13, 1916, p. 937. USNA, Ducker to the Secretary of the Navy-Report on the Conditions in Palestine with Reference to Zionism, Feb. 10, 1915 ("would long remain" and "undoubtedly one"). CZA, A 243/159, Correspondence on Matters of the Yishuv: Perlstein to Wise, Jan. 16, 1915; A 264/25, Papers of Felix Frankfurter: Primrose to Gaster, March 18, 1915. Alexander Aaronsohn, With the Turks Palestine (Boston: Houghton Mifflin, 1916), p. 85. Leonard Stein, The Balfour Declaration (London: Vallentine, Mitchell, 1961), p. 191 ("America was"). Scuttled by a tsunami in Aug. 1916, with the loss of thirty-eight hands, the Tennessee was mourned by the Jews of Palestine as "an eternal blessing." See Davis, With Eyes toward Zion, vol. 2, pp. 238-39.

6. Grose, Israel in the Mind, p. 68 ("The Jews from every"). Manuel, Realities, p. 83. Letters of Theodore Roosevelt: Roosevelt to Julian H. Miller; Sept. 16, 1918, p. 1372 ("It seems to me"); Roosevelt to Lioubomir Michailovitch, July 11, 1918, p. 1350 ("there can be"). The Intimate Papers of Colonel House, ed. Charles Seymour (Boston: Houghton Mifflin, 1928), vol. 1, pp. 43-44 ("It is all bad"). Ray Stannard Baker, Woodrow Wilson and World Settlement (Garden City. N.Y.:Doubleday, Page, 1923), p. 74 ("fine example"). Fromkin, Peace to End All Peace, pp. 257, 295 ("the English

naturally want"). Stein, Balfour Declaration, p. 156. Elizabeth Monroe, Britain's Moment in the Middle East, 1914-1956 (Baltimore: Johns Hopkins Univ. Press, 1963), p. 40 ("man to man"). Yaakov Ariel, On Behalf of Israel: American Fundamentalist Attitudes toward Jews, Judaism, and Zionism, 1865-1945 (Brooklyn: Carlson, 1991), p. 45 ("the Zionist movement").

7. Grose, Israel in the Mind, pp. 63-66, 67 ("To think that"). Cabinet Diaries of Josephus Daniels, p. 267. Stein, Balfour Declaration, pp. 427-28, 505, 530. The Letters of Louis D. Brandeis, ed. Melvin I. Urofsky and David M. Levy (Albany: State Univ. of New York, 1973): Brandeis to de Hass, April 24, 1917, p. 283 ("I have heard much"), de Hass Memorandum, May 4, 1917, p. 286 ("a publicly assured"); Brandeis to de Hass, May 8, 1917, p. 288 ("I am a Zionist"); Brandeis to Weizmann, Sept. 24, 1917, p. 310 ("entire sympathy"). Richard Lebow, "Woodrow Wilson and the Balfour Declaration," Journal of Modern History 40, no. 4 (Dec. 1968): 501-13. Weizmann, Trial and Error, pp. 193-94, 208 ("one of the most important"). Manuel, Realities, p. 168 ("the many dangers"). Merkley, Politics of Christian Zionism, p. 91 ("The vast mass").

8. Ben Halpern and Jehuda Reinharz, Zionism and the Creation of a New Society (New York: Oxford Univ. Press, 1998), pp. 175-77, 180-82. Robert Silverberg, If I Forget Thee, O Jerusalem: American Jews and the State of Israel (New York: Morrow, 1970), pp. 104, 105-6 ("The Americans brought"), 176. Martin Watts, The Jewish Legion and the First World War (London: Palgrave Macmillan, 2004), pp. 147-48. Elias Gilner, War and Hope: A History of the Jewish Legion (New York: Herzl Press, 1969), pp. 165-67,

170-71, 177.

9. Lansing's remark about Jewish guilt for the death of Christ was later leaked to the press, but the secretary denied having made it. FRUS, 1914-20, Lansing Papers, vol. 2: Lansing to Wilson, Dec. 13, 1917, p. 71 ("many Christian sects"); Lansing Note, Dec. 14, 1917, p. 71 ("very unwillingly"). Selig Adler, "The Palestine Question in the Wilson Era," Jewish Social Studies 10, no. 4 (Oct. 1948): 313 ("polluting and intolerable"). Medoff, Zionism and the Arabs, pp. 21-25. Grose, Israel in the Mind, pp. 70, 83 ("sentimental, religious"). William Yale Oral History, Columbia Univ., pp. 10 ("playboy"), 14 ("brass knucks"). Manuel, Realities, pp. 171, 172 ("400 million Christians"), 176 ("satisfaction" and "in the progress"), 184 ("younger and more hot-headed"), 185 ("young, hot- headed Jews"), 186 ("Religious fanaticism" and "If a Jewish State"), 189 ("disagreeable...type"), 190. Monroe, Britain's Moment in the Middle East, pp. 44-45.

10. Medoff, Zionism and the Arabs, pp. 21-25. Grose, Israel in the Mind, p. 81 ("The Arabs in Palestine").

20. Arise, O Arabs, and Awake!

1. John M. Munro, A Mutual Concern: The Story of the American University of Beirut (Delmar, N.Y.: Caravan Books, 1977), p. 65 ("I know why the Turks"). The study of the origins of Arab nationalism has generated a great many books and articles. See, e.g., Ernest C. Dawn, "The Origins of Arab Nationalism," in Rashid Khalidi, ed., The Origins of Arab Nationalism (New York: Columbia Univ. Press, 1991), p. 3. Ernest C. Dawn, From Ottomanism to Arabism: Essays on the Origins of Arab Nationalism (Urbana: Univ. of

Illinois Press, 1973), pp. 132, 140. Adeed Dawisha, Arab Nationalism in the Twentieth Century: From Triumph to Despair (Princeton: Princeton Univ. Press, 2003), pp. 25-27, 32-34. Bassam Tibi, Arab Nationalism: Between Islam and the Nation-State (New York: St. Martin's, 1997), pp. 102-4. Eliezer Tauber, The Emergence of the Arab Movements (London: Frank Cass, 1993), pp. 15-18. Zeine N. Zeine, The Emergence of Arab Nationalism, 3d ed. (Delmar, N.Y.: Caravan Books, 1973), pp. 45, 79, 106. See also George Antakly, "American Protestant Educational Missions: Their Influence on Syria and Arab Nationalism, 1820- 1923" (Ph.D. diss., American Univ., 1976), pp. 111-12, 115, 120.

2. Neville Mandel, The Arabs and Zionism before World War I (Berkeley: Univ. of California Press, 1976), pp. 42-55, 85-86, 211-12 ("The Jews'…right"). Mary C. Wilson, "The Hashemites, the Arab Revolt, and Arab Nationalism," in Khalidi, Origins of Arab Nationalism, pp. 205, 219. Dawisha, Arab Nationalism, p. 34. Muhammad Y. Muslih, The Origins of Palestinian Nationalism (New York: Columbia Univ. Press, 1988), pp. 54-60, 67, 79, 87.

3. Alixa Naff, The Arab Americans (Philadelphia: Chelsea House, 1999), pp. 14, 33. Alixa Naff, "Arabs in America: A Historical Overview," in Sameer Abraham, ed., Arabs in the New World: Studies in Arab-American Communities (Detroit: Wayne State Univ., 1983), pp. 9-10, 13-19. Philip Keyal and Joseph Keyal, The Syrian-Lebanese in America (Boston: Twayne, 1975), pp. 34, 41, 63, 66, 82. Salom Rizk, Syrian Yankee (Garden City, N.Y.: Doubleday, Doran, 1943), p. 71 ("I could see America"). Because of a misspelling of his name in a Boston grammar school, Khalil Gibran's name is

sometimes rendered Kahlil Gibran. See "Khalil the Heretic" in Gregory Orfalea, ed., Grape Leaves: A Century of Arab American Poetry (Salt Lake City: Univ. of Utah Press, 1988), pp. 24-25. Gibran Khalil Gibran, The Prophet (New York: Knopf, 1952), pp. 48-49. For further reference, see the Gibran Khalil Gibran website, http://leb.net/gibran/.

4. The Ameen Rihani Papers: From an unpublished manuscript, pp. 76 ("other educational institutions"), 111 ("proof of the aptitude"), 115 ("American spirit"), Bliss to Rihani, March 12, 1913 ("It was unfortunate"). Nada Najjar, "The Space In-between: The Ambivalence of Early Arab-American Writers" (Ph.D. diss., Univ. of Toledo, 1999), pp. 77, 96, 123, 126 ("Carry to the East"). Theodore Roosevelt Papers: Rihani to Roosevelt, April 20, 1917. Ameen Rihani, The Path of Vision (Beirut: Rihani House, 1970), pp. 97 ("in a land where"), 124 ("The voice of America"). Ameen Rihani, "Palestine and the Proposed Arab Federation," Annals of the American Academy of Political and Social Science 164 (Nov. 1932): 66 ("The Land of Promise"). Ameen Rihani, The Fate of Palestine (Beirut: Rihani House, 1967), pp. 25, 37, 80, 85 ("without prejudicing"). See also Suheil B. Bushrui, The Thoughts and Works of Ameen Rihani, http://www.alhewar.com/Bushrui_Rihani.html.

5. Laurence Evans, United States Policy and the Partition of Turkey, 1914-1924 (Baltimore: Johns Hopkins Press, 1965), pp. 122 ("I have a kindly"). Stuart Knee, "The King-Crane Commission of 1919: The Articulation of Political Anti-Zionism," in Gurrock, American Jewish History, pp. 182- 88, 188 ("Unitarians of the desert"). Grabill, "Cleveland H. Dodge," p. 254.

Kaplan, Arabists, p. 70 ("the menace"). Frank W. Brecher, Reluctant Ally: United States Foreign Policy toward the Jews from Wilson to Roosevelt (New York: Greenwood, 1991), p. 19. David Philipson, My Life as an American Jew (Cincinnati: John G. Kidd, 1941), pp. 173-74.

21. The First Middle East Peace Process

1. Studies on the origins of Wilsonian diplomacy abound. See, e.g., Thomas J. Knock, To End All Wars: Woodrow Wilson and the Quest for a New World Order (Princeton: Princeton Univ. Press, 1992), pp. 3 ("A boy never gets"), 14, 33, 77. August Heckscher, Woodrow Wilson (New York: Scribner, 1991), pp. 294, 434. Louis Auchincloss, Woodrow Wilson (New York: Penguin, 2000), pp. 74, 92. Arthur Walworth, Woodrow Wilson (New York: Norton, 1978), pp. 343, 344 ("go to the ends"), 345 ("do the thinking"). Ray Stannard Baker, Woodrow Wilson: Life and Letters, 1856-1890 (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1927), pp. 49, 211, 312. Lloyd E. Ambrosius, Woodrow Wilson and the American Diplomatic Tradition (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1987), pp. 1-2, 9. Cooper, Warrior and the Priest, pp. 15, 273, 323. David M. Kennedy, "What 'W' Owes to 'WW,'" Atlantic Monthly, March 2005, p. 36.

2. FRUS, 1919, Paris Peace Conference Papers, vol. 5: Proceedings, April 21, 1919, p. 107; May 13, 1919, p. 584 ("docile people"); vol. 6: June 25, 1919, p. 676 ("cleared out"). Intimate Papers of Colonel House, vol. 1: Diary entry for Dec. 18, 1912, p. 96 ("There ain't going"). Harley Notter, The Origins of the Foreign Policy of Woodrow Wilson (Baltimore: Johns Hopkins Press, 1937), p. 46 ("abnormal"). Walworth, Woodrow Wilson, p. 497

("America believes in helping").

3. FRUS, 1919, Paris Peace Conference, vol. 1: Excerpt from "The Inquiry," Dec. 22, 1917, p. 52; Lippmann to the Secretary of War, May 16, 1918, pp. 97-98. Manuel, Realities, pp. 212, 213-14. William L. Westermann Paris Peace Conference Diaries, entry for Dec. 29, 1918, p. 14 ("thrown in the waste"). Lawrence E. Gelfand, The Inquiry: American Preparations for Peace, 1917-1919 (New Haven: Yale Univ. Press, 1963), pp. 227, 231-32, 244, 248-49, 255 ("fanaticism and bitter"), 256 ("It was the cradle"). Taner Akçam, A Shameful Act: The Armenian Genocide and the Question of Turkish Responsibility (New York: Metropolitan Books, 2006), pp. 227-30.

4. Manuel, Realities, p. 217 ("Will not the Mohammedans"). George Noble, "The Voice of Egypt," Nation 110, no. 2844 (Jan. 3, 1920): 862 ("No people").

5. FRUS, 1919, Paris Peace Conference, vol. 1: Jusserand to Lansing, Nov. 29, 1918, p. 367. Papers of Woodrow Wilson, vol. 47: Memorandum by William Westermann, April 17, 1919, p. 443 ("the great loot"). Link, Wilson, p. 414 ("call through a crack"). Margaret MacMillan, Paris 1919: Six Months That Changed the World (New York: Random House, 2002), pp. 30-32, 386 ("the complete and definite"). Edward House, ed., What Really Happened at Paris (New York: Scribner, 1921), pp. 178-79 ("Not having declared"). Fromkin, Peace to End All Peace, pp. 373 ("The other governments").

6. Grose, Israel in the Mind, p. 84 ("In spite of"). MacMillan, Paris 1919, p. 386 ("knowing in the bottom" and "The obstacle is"). Frederick Palmer, Bliss, Peacemaker (New York: Dodd, Mead, 1934), p. 418 ("Wherever a

mandate"). FRUS, 1919, Paris Peace Conference, vol. 3: Proceedings, Jan. 30, 1919, p. 807 ("I can think of"). Smuts envisaged three types of mandates-A, B, and C, where A mandates were intended for those territories most ready for independence. All of the Middle East mandates were type A. See F. S. Crafford, Jan Smuts: A Biography (Garden City. N.Y.: Doubleday, Doran, 1943), p. 148. H. C. Armstrong, Grey Steel (London: Arthur Barker, 1937), p. 316.

7. Felix Frankfurter Reminisces: Recorded in Talks with Harlan B. Phillips (New York: Reynal, 1960), p. 156 ("Here was little me"). Joseph P. Lash, From the Diaries of Felix Frankfurter (New York: Norton, 1975), p. 26 ("cousins in race"). FRUS, 1919, Paris Peace Conference, vol. 3: Proceedings, Feb. 6, 1919, p. 891; Bliss Address to the Council of Ten on Feb. 13, 1919, pp. 1016- 17; vol. 4: Proceedings, Feb. 27, 1919, p. 169 ("They are intelligent"). Walworth, Woodrow Wilson, p. 500 ("startling resemblance"). John Allen, "Inventing the Middle East," On Wisconsin (Winter 2004): 36-39. Paul C. Helmreich, From Paris to Sèvres: The Partition of the Ottoman Empire at the Peace Conference of 1919-1920 (Columbus: Ohio State Univ. Press, 1974), p. 67. Robert Lansing, The Big Four and Others of the Peace Conference (Boston: Houghton Mifflin, 1921), pp. 163-64 ("ancient seer"), 169 ("His voice seemed"). Manuel, Realities, pp. 221-22, 229 ("prominent American Jews"), 234-35, 238 ("The opposition of the Moslems"), 257 ("Jerusalem will be").

8. Helmreich, From Paris to Sèvres, pp. 22 ("So long as"), 67. Edith Wharton, In Morocco (New York: Scribner, 1920), pp. 79 ("Nothing endures

in Islam"), 266 ("from Persia to Morocco"). Evans, United States Policy, p. 29. James Shotwell, At the Paris Peace Conference (New York: Macmillan, 1937), pp. 130-31, 176-78. Harry N. Howard, The King-Crane Commission (Beirut: Khayats, 1963), pp. 50-51 ("widespread trouble"). MacMillan, Paris 1919, pp. 152-53, 154 ("I cannot imagine"). Walworth, Woodrow Wilson, p. 492 ("America is the only").

9. FRUS, 1919, Paris Peace Conference, vol. 5: Proceedings, March 20, 1919, pp. 10 ("scrap"), 12; vol. 11: Minutes of Meeting, March 27, 1919, p. 133 ("knew nothing about"). Brecher, Reluctant Ally, pp. 19-20. Manuel, Realities, p. 245 ("a very experienced"). Papers of Woodrow Wilson: Feisal to Wilson, vol. 47: April 20, 1919, p. 525 ("I am confident"); vol. 48: Wilson Remark in Paris, May 3, 1919, p. 401 ("Our [Allied] governments"). Felix Frankfurter Reminisces, p. 151 ("A crazy idea"). Howard, King-Crane Commission, pp. 35, 37 ("is about to cheat"), 38-39, 44-45 ("too honest"). William L. Westermann Paris Peace Conference Diaries, entry for Jan. 12, 1919, pp. 19 ("the root of all good"), 24.

10. Thomas Bailey, Woodrow Wilson and the Great Betrayal (New York: Macmillan, 1947), pp. 264-66. Justin McCarthy, Death and Exile: The Ethnic Cleansing of Ottoman Muslims, 1821- 1922 (Princeton: Darwin Press, 1995), p. 263 ("Old men, unarmed"). MacMillan, Paris 1919, pp. 349, 353-54. Fromkin, Peace to End All Peace, pp. 393-95. Howard M. Sachar, The Emergence of the Middle East, 1914-1924 (New York: Knopf, 1969), p. 349. FRUS, 1919, Paris Peace Conference, vol. 5: Proceedings, May 14, 1919, p. 618; May 19, 1919, p. 708; May 22, 1919, p. 812. Grabill, Protestant

Diplomacy, p. 260 ("with all my heart"). William L. Westermann Peace Conference Diaries, entry for May 22, 1919, p. 81. Documents on British Foreign Policy, 1919- 1939, ed. Rohan Butler and J. P. T. Bury (London: Her Majesty's Stationery Office, 1963), vol. 13: Geddes to Curzon, May 11, 1919, pp. 70-71; Geddes to Curzon, May 19, 1919, p. 76. Intimate Papers of Colonel House, vol. 3: entry for May 20, 1919, p. 468 ("something of a scandal").

11. Donald M. Love, Henry Churchill King of Oberlin (New Haven: Yale Univ. Press, 1956), pp. 215-16. Howard, King-Crane Commission, pp. 56, 221 ("Every part of the Turkish"). Manuel, Realities, pp. 249-51 ("Whereas injustice"). FRUS, 1919, Paris Peace Conference, vol. 12; Crane and King to the Commission to Negotiate Peace, July 10, 1919, pp. 749-50 ("A real great lover"); King-Crane Commission, pp. 792, 794 ("be seriously considered" and "It is simply impossible"), 797 ("On account of her" and "no other Power"), 799 ("The people of the area"), 801, 833 ("Constantinopolitan State"). William Yale Oral History, pp. 64, 70. For an overview of the commission, see James Gelvin, "The Ironic Legacy of the King-Crane Commission," in David Lesch, ed., The Middle East and the United States (Boulder: Westview Press, 1999), pp. 13-26.

12. Erik Goldstein, "The Eastern Question: The Last Phase," in Michael Dockrill, ed., The Paris Peace Conference, 1919: Peace without Victory (New York: Palgrave, 2001), p. 145 ("Lloyd George is a cheat!"). MacMillan, Paris 1919, pp. 33 ("God himself was content"), 145.

13. FRUS, 1919, Paris Peace Conference, vol. 11: Proceedings, July 1,

1919, p. 184; July 8, 1919, p. 284 ("perfectly useless proposition"). Lansing, Peace Negotiations, p. 149. Manuel, Realities, p. 255 ("whole disgusting scramble"). Herbert Hoover, The Memoirs of Herbert Hoover (New York: Macmillan, 1957), p. 385. William L. Westermann Paris Peace Conference Diaries, p. 69. Feroz Ahmad, The Making of Modern Turkey (New York: Routledge, 1993), p. 55 ("America, which knows"). James B. Gidney, A Mandate for Armenia (Kent, Ohio: Kent State Univ. Press, 1967), pp. 17, 184-87, 188 ("Here is a man's job"). General James G. Harbord, Conditions in the Near East: American Military Mission to Armenia (Washington, D.C.: GPO, 1920).

14. Papers of Woodrow Wilson, vol. 64: "The President's State of Health," Lansing Memorandum, Nov. 5, 1919, pp. 56-57. Henry Cabot Lodge, The Senate and the League of Nations (New York: Scribner, 1925), p. 184 ("obligation to preserve"). Sachar, Emergence of the Middle East, pp. 349, 361. Heckscher, Woodrow Wilson, p. 609 ("the American people").

15. Marjorie Housepian Dobkin, Smyrna 1922: The Destruction of a City (Kent, Ohio: Kent State Univ. Press, 1988), pp. 101, 103, 112, 166 ("I'll never forget"). Horton, Blight of Asia, p. 113 ("a fittingly lurid"). FRUS, 1923, vol. 2: Child and Grew to Hughes, Dec. 13, 1922, p. 921 ("find [the] means"); Child and Grew to Hughes, Jan. 3, 1923, p. 946; Harding to Hughes, Jan. 15, 1923, p. 950 ("The most ardent"). Documents on British Foreign Policy, 1919-1939: British Secretary's Notes, April 10, 1920, pp. 20-21; April 20, 1920, pp. 60-61. Daniel, "Armenian Question," p. 262.

16. William L. Westermann Paris Peace Conference Diaries, pp. 179-80

("When boldness"). Lansing, Peace Negotiations, p. 175 ("The seeds of discontent"). Palmer, Bliss, Peacemaker, p. 370 ("there never had been"). DeNovo, American Interests, pp. 299-301. Gelvin, "Ironic Legacy of the King-Crane Commission," p. 13 ("It is not possible"). Sachar, Emergence of the Middle East, p. 365.

22. Fantasies Revived

1. One could easily dedicate a book to the innumerable books written about Lawrence of Arabia. See, e.g., David Fromkin, "The Importance of T. E. Lawrence," New Criterion 10, no. 1 (Sept. 1995). John E. Mack, A Prince of Our Disorder: The Life of T. E. Lawrence (Oxford: Oxford Univ. Press, 1990), pp. 221 ("limelight of history"), 265 ("On the whole"), 275. Phillip Knightley and Colin Simpson, The Secret Lives of Lawrence of Arabia (London: Thomas Nelson, 1969), pp. 52-53. Lawrence James, The Golden Warrior (New York: Paragon House, 1993), pp. 272, 276-77. See also Shotwell, At the Paris Peace Conference, p. 131 ("younger successor of Mohammed").

2. Norman Bowen, Lowell Thomas: The Stranger Everyone Knows (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1968), pp. 39-40. Lowell Thomas, Good Evening Everybody (New York: Morrow, 1976), pp. 131-39. Lowell Thomas, With Lawrence in Arabia, pp. 12 (the Uncrowned King" and "one of most picturesque"), 20 ("He walked rapidly"), 22 ("restored the sacred places"), 75 ("united the wandering tribes"), 76 ("reincarnation of a prophet"), 114 ("400 Turks"), 264 ("a great scoop"). Joel Hodson, Lawrence of Arabia and American Culture (Westport, Conn.: Greenwood, 1995), pp. 43, 61, 62 ("quite without intention" and "the George Washington"). Knightley, Secret

Lives, p. 53 ("break up the Islamic"). Knock, To End All Wars, p. 213 ("chuckled in the desert"). Mack, Prince of Our Disorder, pp. 276 ("I saw your show"), 277 ("I don't bear him"). Hodson, Lawrence of Arabia, pp. 30, 43, 66 ("Come with me").

3. Michael North, Reading 1922: A Return to the Scene of the Modern (New York: Oxford Univ. Press, 1999), pp. 21-24. Willa Sibert Cather, My Ántonia (Boston: Houghton Mifflin, 1977), pp. 6 ("more inscribed"), 10 ("the beard of an Arabian"). Little, American Orientalism, pp. 17-18.

23. From Bibles to Dril Bits

1. Harrison, Doctor in Arabia, pp. 24 ("not even their religion"), 30. DeNovo, American Interests, p. 361 ("of little commercial importance"). USNA, Records of the Department of State Relating to Internal Affairs of Saudi Arabia: Brandt to the Secretary of State, May 5, 1930 ("demonstrated that the Arabs"). Eleanor Calverley, My Arabian Days and Nights (New York: Crowell, 1958), p. 7 ("until that moment"). Mary B. Allison, Doctor Mary in Arabia: Memoirs (Austin: Univ. of Texas Press, 1994), p. 25 ("like being born"). Thomas W. Lippman, Inside the Mirage: America's Fragile Partnership with Saudi Arabia (Boulder: Westview Press, 2004,) pp. 10-11 ("I know you are"). Paul L. Armerding, Doctors for the Kingdom: The Work of the American Mission Hospitals in the Kingdom of Saudi Arabia, 1913-1955 (Grand Rapids, Mich.: Eerdmans, 2003), p. 115. See also Miriam Joyce, Kuwait, 1945-1956: An Anglo-American Perspective (London: Frank Cass, 1998), p. xviii, and Thomas Lippman, "The Pioneers," Saudi Aramco World 55, no. 3 (May-June 2004), and Eleanor A. Doumato, Getting God's Ear:

Women, Islam, and Healing in Saudi Arabia and the Gulf (New York: Columbia Univ. Press, 2000), pp. 43-48. According to Doumato, the most common ailment Harrison treated was "inability," i.e., male sexual dysfunction.

2. Anthony Sampson, The Seven Sisters: The Great Oil Companies and the World They Shaped (New York: Bantam, 1991), p. 83. Longrigg, Oil in the Middle East, pp. 38-39. Bryson, American Diplomatic Relations, pp. 103-5. Anthony C. Brown, Oil, God, and Gold: The Story of Aramco and the Saudi Kings (Boston: Houghton Mifflin, 1999), pp. 24-28. Benjamin Shwadran, The Middle East, Oil, and the Great Powers (Jerusalem: Israel Universities Press, 1973), pp. 237-38, 288. H. St. John Philby, Saudi Arabia (London: Ernest Benn, 1955), p. 330.

3. In spite of his seminal role in the establishment of U.S.-Saudi relations, Twitchell has yet to be the subject of a serious study, and the descriptions of him remain fragmentary. See, e.g., William Yale, The Near East: A Modern History (Ann Arbor: Univ. of Michigan Press, 1958), p. 362. D. Van der Meulen, The Wells of Ibn Saud (New York: Praeger, 1957), p. 136. George Kheirallah, Arabia Reborn (Albuquerque: Univ. of New Mexico Press, 1952), pp. 239-40. Moukhtar Ani, Saudi Arabia: Its People, Its Society, Its Culture (New Haven: HRAF Press, 1959), p. 234. 4 Daniel Yergin, The Prize: The Epic Quest for Oil, Money and Power (New York: Touchstone, 1992), pp. 289-91. George Stocking, Middle East Oil: A Study in Political and Economic Controversy (Kingsport, Tenn.: Vanderbilt Univ. Press, 1970), p. 76. Sampson, Seven Sisters, pp. 109-11. Joseph W. Walt, "Saudi Arabia and

the Americans, 1928-1951" (Ph.D. diss., Northwestern Univ., 1960), p. 87 ("Some of these firms"). H. J. B. Philby, Arabian Oil Ventures (Washington, D.C.: Middle East Institute, 1964), p. 124. Philby relates that the king in fact slept through much of the discussions on the agreement and that his-Philby's-advice weighed decisively in favor of the Americans.

5. Sampson, Seven Sisters, p. 111 ("descending from the skies"). Wallace Stegner, Discovery: The Search for Arabian Oil (Beirut: Export Press, 1971), pp. 3-54.

6. Aaron Miller, Search for Security: Saudi Arabian Oil and American Foreign Policy, 1939- 1949 (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 1980), p. 25 ("We should let matters"), 26-27. Irvine H. Anderson, ARAMCO, the United States, and Saudi Arabia: A Study of the Dynamics of Foreign Oil Policy, 1933-1950 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1981), p. 25. Kaplan, Arabists, p. 71 ("the real bulwark"). DeNovo, American Interests, p. 337. Lippman, Inside the Mirage, p. 117 ("Saudi Arabia is presumably"). William Eddy Papers, box 17: Excerpt from Eddy's unpublished memoirs ("We Muslims"). Karl Twitchell Papers, box 5: Twitchell to Cleveland Dodge, March 3, 1932. Stegner, Discovery, p. 65 ("If utter faith").

7. USNA, Records of the Department of State relating to the Internal Affairs of Saudi Arabia, 1930-1944: 890f.00/53, Fish to the State Department, April 12, 1940 ("German ruthlessness"); 890f.00/60, Twitchell to Murray, May 14, 1941; 890f.00/73, Memorandum on conditions in Saudi Arabia based on an interview with a reliable informant (American) returned recently from there Oct. 29, 1941. Parker T. Hart, Saudi Arabia and the United States: Birth of a

Security Partnership (Bloomington: Indiana Univ. Press, 1998), p. 37. Rex J. Casillas, Oil and Diplomacy: The Evolution of American Foreign Policy in Saudi Arabia, 1933-1945 (New York: Garland, 1987), pp. 33, 37, 40. Miller, Search for Security, pp. 33-34 ("It can easily").

8. Shwadran, Middle East, p. 317. Brown, Oil, God and Gold, pp. 106-7 ("extending financial assistance"). USNA, Records of the Department of State relating to the Internal Affairs of Saudi Arabia, 1930-1944: 890f.00/73 Memorandum on Conditions in Saudi Arabia, Oct. 29, 1941; 890f.00/81, Strictly confidential for Secretary and Under Secretary, April 17, 1943 ("Jews had been hostile").

24. An Insoluble Conflict Evolves

1. The study of the origins of the Arab-Israeli conflict has generated innumerable books. Few of these, however, are free of an expressed bias toward one side or the other in the conflict. For a sample of some of the more highly regarded scholarly works on the subject, see Philip Mattar, The Mufti of Jerusalem: Al-Hajj Amin al-Husayni and the Palestinian National Movement (New York: Columbia Univ. Press, 1988), pp. 12-49. Christopher Sykes, Crossroads to Israel, 1917-1948 (Bloomington: Indiana Univ. Press, 1973), pp. 41-232. J. C. Hurewtiz, The Struggle for Palestine (New York: Greenwood, 1968), pp. 3-94.

2. Irwin Oder, "The United States and the Palestine Mandate, 1920-1948: A Study of the Impact of Interest Groups on Foreign Policy" (Ph.D. diss., Columbia Univ., 1956), pp. 75 ("an influential and noisy"), 320. Gideon Biger, "The American View of the Tel Hai Affair," Journal of Israeli History 19, no. 1

(1998): 91-94. Manuel, Realities, pp. 272, 277 ("[We] should avoid"), 280-84, 291-92 ("They would turn Trotsky"), 293-99. Barry Rubin, The Great Powers in the Middle East, 1941- 1947 (London: Cass, 1980), p. 22 ("decidedly anti-Jewish"). See also Knee, "Anglo-American Relations," pp. 13-17.

3. Naomi Cohen, The Year after the Riots: American Responses to the Palestine Crisis of 1929-30 (Detroit: Wayne State Univ. Press, 1988), pp. 22, 23 ("A crowd of savage Arabs"), 27-28, 29 ("ordinary law-abiding"), 33 ("The Jews are always"). USNA, RG 59: Palestine Internal Affairs: Knabenshue to Stimson (n.d.) ("Jewish financial influence"); Knabenshue to Stimson, Aug. 24, 1929 ("provocative acts"); Knabenshue to Stimson, Aug. 26, 1929; Hamilton Fish Jr. to Stimson, Aug. 28, 1929; Knabenshue to Stimson Oct. 19, 1929. CZA, A243/104, Stephen S. Wise Papers: Memorandum of Meeting of SSW with Secretary of State Stimson on the S.S. Leviathan, Sept. 1, 1931. Manuel, Realities, pp. 302-3. "Says Syria Admires Us," New York Times, Jan. 11, 1929; "4th in Jerusalem Brings Out Throngs," New York Times, July 5, 1929. "U.S. Investigates Palestine Consul," Washington Post, Sept. 7, 1929. Oder, "United States and the Palestine Mandate," p. 156.

4. CZA, A 243/178, Stephen S. Wise Papers: Wise to Frankfurter, July 29, 1937; O'Toole to Wise, July 30, 1937; Wise to Felix Frankfurter, Oct. 16, 1938. FRUS, 1937, vol. 4: Memorandum by Wallace Murray, July 12, 1937, p. 893 ("Any disposition"); 1938, vol. 2: Memorandum submitted to the Secretary of State by American Jewish Delegation, Oct. 14, 1938, p. 956 ("radical departure"). USNA, Palestine Internal Affairs: Wadsworth to

Secretary of State, July 7, 1938 ("Palestinian Jews"); Murray to Secretary of State, Feb. 1, 1939 ("In America there is"); Wadsworth to Secretary of State, June 27, 1939. John Fitzgerald Kennedy Presidential Library, President's Office Files, box 135, Series: Special Events, Folder: 1939 ("It seems to me"): Letter Written to His Father following Trip to Palestine. Halperin, Political World of American Zionism, pp. 21-26. Louis Rapoport, Shake Heaven and Earth: Peter Bergson and the Struggle to Rescue the Jews of Europe (Jerusalem: Gefen, 1999), p. 43 ("Americans don't like Jews"). Phillip J. Baram, The Department of State in the Middle East, 1919-1945 (Philadelphia: Univ. of Pennsylvania Press, 1978), pp. 263, 268.

5. The proposal for transferring 300,000 Palestinian Arabs was first tabled by Edward Norman, a non-Zionist Jew and heir to a family fortune made from food concessions from the 1893 world's fair. The cost of the project was estimated at $300 million, to be contributed by the Western powers and wealthy American Jews. Neither Britain nor France, however, showed enthusiasm for the idea and Roosevelt made no real effort to implement it. See Rafael Medoff, Baksheesh Diplomacy: Secret Negotiations between American Jewish Leaders and Arab Officials on the Eve of World War II (Lanham, Md.: Lexington Books, 2001), pp. 3, 140 ("less right there"), 141-43. On Roosevelt's foreign policy in general, and toward Palestine in particular, see Robert Dallek, Franklin D. Roosevelt and American Foreign Policy, 1932-1945 (New York: Oxford Univ. Press, 1979), p. 20 ("a chameleon on plaid"). Willard Range, Franklin D. Roosevelt's World Order (Athens: Univ. of Georgia Press, 1959), p. 8. James MacGregor Burns,

Roosevelt: The Soldier of Freedom (New York: Harcourt Brace Jovanovich, 1970), pp. 108, 397 ("I would put barbed"). Conrad Black, Franklin Delano Roosevelt: Champion of Freedom (London: Weidenfeld & Nicolson, 2003), p. 928. Frederick W. Marks III, Wind over Sand: The Diplomacy of Franklin Roosevelt (Athens, Georgia: Univ. of Georgia Press, 1988), p. 253. William Roger Louis, The British Empire in the Middle East, 1945-1951 (New York: Oxford Univ. Press, 1984), p. 243 ("Holy Gehad"). Memoirs of Cordell Hull, vol. 2 (New York: Macmillan, 1948), p. 1530 ("It is something"). Steiner, Religious Beliefs, pp. 66-67. Grose, Israel in the Mind, pp. 113, 138-39 ("little baksheesh").

6. FRUS, 1936, vol. 3: Secretary of State to Ambassador in the United Kingdom, July 27, 1936, p. 444 ("influential Jewish circles" and "of course presume"); 1937, vol. 2: Memorandum from Secretary of State to the American Ambassador in the United Kingdom to be delivered to the British, p. 890 ("Large sections"). Manuel, Realities, pp. 306-8. PRO, FO 371: Mr. Mallet to British Embassy. Sept. 21, 1936 ("[It] is hardly worth"); Sir R. Lindsay to Viscount Halifax. Nov. 25, 1938. Grose, Israel in the Mind, p. 100. USNA, Palestine Internal Affairs: Knabenshue to Murray, May 25, 1935 ("The White Paper"). Henry L. Feingold, The Politics of Rescue: The Roosevelt Administration and the Holocaust, 1938-1945 (New Brunswick: Rutgers Univ. Press, 1970), pp. 126-31, 135 ("exponents of Communism"), 146 ("was 100%").

7. CZA, L66/22: Letter to Zionist Delegates (n.d.) ("At this time"); Letter to Heads of Organizations (n.d.) ("specializing in delicious"); L66/24: Brainin to

Weisgal, Sept. 20, 1938 ("the most beautiful girl"); L66/59: Memorandum on the Opening of the Palestine Pavilion, May 13, 1939; Brainin to Bloom, June 30, 1939; L66/77: Press Release for Tuesday, Feb. 27, 1940; L66/69: Letter for Palestine Book by F. H. La Guardia (n.d.). See also James L. Gelvin, "Zionism and the Representation of Jewish Palestine at the New York World's Fair, 1939-40," International History Review 22, no. 1 (2000): 37-64. USNA, Palestine Internal Affairs: Wadsworth to Secretary of State, Sept. 11, 1938.

8. Golda Meir, My Life (New York: Putnam, 1975), pp. 30 ("New food"), 74 ("Crowds of beggars"), 81 ("I was profoundly happy"), 140 ("Look, Golda"). Ralph G. Martin, Golda: Golda Meir, the Romantic Years (New York: Scribner, 1988), p. 98 ("I owed America").

9. Edward Wagenknecht, Daughters of the Covenant: Portraits of Six Jewish Women (Amherst: Univ. of Massachusetts Press, 1983), pp. 153-56. Michael Brown, The Israeli-American Connection: Its Roots in the Yishuv, 1914-1945 (Detroit: Wayne State Univ. Press, 1996), pp. 135- 36, 141-45. Marvin Lowenthal, Henrietta Szold: Life and Letters (New York: Viking, 1942), pp. 244, 264. Simon Noveck, Great Jewish Personalities in Modern Times (Washington, D.C.: B'nai B'rith Department of Adult Jewish Education, 1960), pp. 324 ("first lady of Palestine"), 331. Michael Shire, The Jewish Prophet: Visionary Words from Moses to Heschel (London: Frances Lincoln, 2002), p. 93 ("Political scores"). CZA, Szold Papers, Speech before the Zionists of America Administration Committee, Jan. 9, 1936 ("I became a Zionist"). Jewish Women's Archive, "JWA- Henrietta Szold-Building the

Yishuv," http://www.jwa.org/exhibits/wov/szold/yishuv.html (Oct. 6, 2005). See also Baila Round Shargel, "American Jewish Women in Palestine: Bessie Gotsfeld, Henrietta Szold, and the Zionist Enterprise," American Jewish History 90, no. 2 (June 2002).

10. Arthur Goren, Dissenter in Zion: From the Writings of Judah L. Magnes (Cambridge: Harvard Univ. Press, 1982), pp. 4-16, 23-24, 32-40, 276 ("a country of two nations"), 277-78, 279 ("I have learned"). Daniel P. Kotzin, "An Attempt to Americanize the Yishuv: Judah L. Magnes in Mandatory Palestine," Israel Studies 5, no. 1 (2000): 3-18. Neil Caplan, Futile Diplomacy, vol. 2 (London: Frank Cass, 1983), pp. 36-37, 87-90. Susan L. Hattis, The Bi-national Idea in Palestine during the Mandatory Times ([Haifa]: Shikmona, 1970), pp. 65-66, 100, 144-48, 171, 184. Shalom Ratzabi, Between Zionism and Judaism: The Radical Circle in Brith Shalom, 1925-1933 (Leiden: Brill, 2002), pp. 252-53. Hagit Lavsky, Before Catastrophe: The Distinctive Path of German Zionism (Detroit: Wayne State Univ. Press, 1996), pp. 211, 212, 213-17. Michael J. Cohen, "Secret Diplomacy and Rebellion in Palestine, 1936-1939," International Journal of Middle East Studies 8, no. 3 (July 1977): 380, 383, 400-1. Menahem Kaufman, The Magnes-Philby Negotiations, 1929: The Historical Record (Jerusalem: Magnes Press, 1998), pp. 18, 100-1, 113. "Judah Magnes," http://www.wzo.org.il/en/resources/view.asp?id=1349&subject=70, Oct. 11, 2005 ("may have to live" and "We can establish").

11. James R. Kruger, Turning On Water with a Shovel: The Career of Elwood Mead (Albuquerque: Univ. of New Mexico Press, 1992), pp. 103,

107-8, 109 ("wards of the organization"). Robert E. Rook, "An American in Palestine: Elwood Mead and Zionist Water Resource Planning, 1923-1936," Arab Studies Quarterly 22, no. 1 (Winter 2000): 71-79. Elwood Mead, "The New Palestine," American Review of Reviews 70, no. 6 (Dec. 1924): 624 ("promise to be a replica"), 626 ("is as attractive"), 628 ("The Zionist movement").

12. Rook, "Blueprints and Prophets," pp. 91-92, 99 ("morgue of civilizations"), 101-10, 139-40. Walter C. Lowdermilk, Palestine: Land of Promise (New York: Harper, 1944), pp. 6-7 ("most remarkable devotion"), 8-24, 229 ("the lever that will lift"). Nathan Godfried, Bridging the Gap between Rich and Poor: American Economic Development Policy toward the Arab East, 1942- 1949 (New York: Greenwood, 1987), p. 168. Rory Miller, "Bible and Soil: Walter Clay Lowdermilk, the Jordan Valley Project and the Palestine Debate," Middle Eastern Studies 39, no. 2 (April 2003): 56-63. See also Walter C. Lowdermilk, Conquest of the Land through Seven Thousand Years (1948; reprint, Washington, D.C.: U.S. Department of Agriculture, Soil Conservation Service, 1953).

13. Shabtai Teveth, Ben Gurion: The Burning Ground, 1886-1948 (Boston: Houghton Mifflin, 1987), pp. 97-98 ("absurd, resembling cages"), 109-20. Allon Gal, David Ben-Gurion and the American Alignment for a Jewish State (Bloomington: Indiana Univ. Press, 1991), pp. 15 ("bustling, industrious" and "We, who seek"), 16, 21, 103, 149, 196 ("London has not ceased"), 203, 216. See also Michael Bar-Zohar, Ben-Gurion: A Biography, translated by Peretz Kidron (New York: Adama Books, 1977). Dan Kurzman, Ben-Gurion:

Prophet of Fire (New York: Simon & Schuster, 1983), pp. 115-19.

14. David S. Wyman and Rafael Medoff, A Race against Death: Peter Bergson, America, and the Holocaust (New York: New Press, 2004), pp. 19-29, 107 ("Mi samcha"). Rapoport, Shake Heaven and Earth, pp. 35-43, 56-57 ("An army with such").

15. David Shapiro, From Philanthropy to Activism: The Political Transformation of American Zionism in the Holocaust Years, 1933-1945 (Oxford: Pergamon Press, 1994), pp. 71, 84. Silverberg, If I Forget Thee, O Jerusalem, pp. 188-90, 206 ("The more I think"). Raider, Emergence of American Zionism, pp. 205-6 ("battleground"). Halperin, Political World of American Zionism, p. 121. Gal, David Ben-Gurion, p. 69 ("Right now"). Walter Laqueur, A History of Zionism (New York: Simon & Schuster, 1989), pp. 546-47. For a detailed discussion of the New York Times treatment of the Holocaust, see Laurel Leff, Buried by the Times: The Holocaust and America's Most Important Newspaper (New York: Cambridge Univ. Press, 2005), pp. 2-3, 13, 42.

25. A Torch for the Middle East

1. A Pocket Guide to North Africa (Washington, D.C.: War and Navy Department, 1942), pp. 14, 19, 23, 28, 34, 39-41. William L. Langer and S. Everett Gleason, The Undeclared War, 1940- 1941 (Gloucester: P. Smith, 1968), pp. 380-81, 590, 592 ("We in the United"), 778 ("We should not get"). Michael J. Cohen, "American Influence on British Policy in the Middle East during World War Two: First Attempts at Coordinating Allied Policy on Palestine," American Jewish Historical Quarterly 67, no. 1 (Sept. 1977):

51-52 ("Our reputation"). Robert Murphy, Diplomat among Warriors (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1964), p. 66-68, 91 ("The vice consuls"). George F. Howe, Northwest Africa: Seizing the Initiative in the West (Washington, D.C.: Center of Military History, 1991), pp. 57-58. FRUS, 1941, vol. 3: British and Free French Invasion and Occupation of Syria and Lebanon; Good Offices of the United States in Arranging Armistice: Personal to the President, June 7, 1941, pp. 725-26.

2. Dallek, Franklin D. Roosevelt, pp. 346-49, 262. Mark W. Clark, Calculated Risk (New York: Harper, 1950), pp. 50 ("Why stick your head"), 107. Rick Atkinson, An Army at Dawn: The War in North Africa, 1942-1943 (New York: Henry Holt, 2002), pp. 12-13, 14 ("indirect contribution"), 16 ("was now our principal objective"), 17-18, 46-47. Hale, "'General' Eaton," p. 28. George S. Patton, War as I Knew It (Boston: Houghton Mifflin, 1995), p. 16. Pocket Guide to North Africa, pp. 4-5.

3. Arthur L. Funk, "Negotiating the 'Deal with Darlan,'" Journal of Contemporary History 8, no. 2 (April 1973): 81-117. Atkinson, Army at Dawn, pp. 3 ("North Africa was"), 287-88. Brown, Oil, God, and Gold, pp. 104-5 ("sons of the Mughreb"). Carleton S. Coon, A North Africa Story: The Anthropologist as OSS Agent (Ipswich, Mass.: Gabmit Press, 1980), p. 14. Howe, Northwest Africa, pp. 108-9. Clark, Calculated Risk, pp. 155 ("I had constantly"), 269.

4. A. J. Liebling, The Road Back to Paris (Garden City, N.Y.: Doubleday, Doran, 1944), pp. 225 ("as examples"), 290 ("a wild competition"). Kenneth G. Crawford, Report on North Africa (New York: Farrar and Rinehart, 1943),

pp. 45-46 ("warriors fighting"). Richard Breitman, "The Allied War Effort and the Jews, 1942-1943," Journal of Contemporary History 20, no. 1 (Jan. 1985): 140-41, 142 ("Arabs don't mind Christians"). The Conferences at Washington, 1941-1942, and Casablanca, 1943 (Washington, D.C.: GPO, 1968): Conversation between President Roosevelt and General Nogués, Jan. 17, 1943, p. 608 ("eliminate…the understandable"). Carlo D'Este, Eisenhower: A Soldier's Life (New York: Henry Holt, 2002), p. 356 ("Many things done here"). There were few exceptions to the general Arab opposition to removing the wartime restrictions on Jews; see Robert Satloff, "In Search of 'Righteous Arabs,'" Commentary 118, no. 1 (July 2004).

5. Gaddis Smith, American Diplomacy during the Second World War, 1941-1945 (New York: Knopf, 1985), pp. 96 ("A century"), 100-10. Stephane Bernard, The Franco-Moroccan Conflict, 1943-1953 (New Haven: Yale Univ. Press, 1968), p. 3. Annie Lacroix-Riz, Les Protectorats d'Afrique du Nord entre la France et Washington: Du débarquement à l'indépendance, Maroc et Tunisie, 1942-1956 (Paris: L'Harmattan, 1988), pp. 11-21. Benjamin Rivlin, "The United States and Moroccan International Status, 1943-1956: A Contributory Factor in Morocco's Reassertion of Independence from France," International Journal of African Historical Studies 15, no. 1 (1982): 64-65, 74. Egya N. Sangmuah, "Sultan Mohammed ben Youssef's American Strategy and the Diplomacy of North African Liberation, 1943-61," Journal of Contemporary History 27, no. 1 (Jan. 1992): 130. Kenneth Pendar, Adventure in Diplomacy: The Emergence of General de Gaulle in North Africa (London: Cassell, 1966), pp. 142, 146-47. Elliott Roosevelt, As He

Saw It (New York: Duell, Sloan and Pierce, 1946), pp. 110 ("differ sharply), 111 ("French and British financiers"), 112 ("A new future" and "Glowering"). Ernie Pyle, Here Is Your War (New York: Henry Holt, 1943), p. 44 ("Arab farmers"). FRUS, 1944, vol. 5: Mayer to the Secretary of State, Jan. 5, 1944, pp. 527-29.

6. FRUS, 1945, vol. 8: Henderson to Truman, Nov. 10, 1945, p. 10 ("friendly disinterest"). Russell Buhite, Patrick J. Hurley and American Foreign Policy (Ithaca: Cornell Univ. Press, 1973), pp. 6-15, 27, 113 ("certain very rich"), 313. Don Lohbeck, Patrick J. Hurley (Chicago: H. Regnery, 1956), pp. 188-89, 190 ("Our President"), 191 ("My job"), 193 ("America could not"), 195 ("starvation was the easiest"), 210-11 ("the economy of colonial"). Franklin Delano Roosevelt Papers, Office Files, 1933-1945, pt. 4: Subject Files, reel 19; Hurley to Roosevelt, May 5, 1943 ("exploitation and imperialism"); Hurley to Roosevelt, June 9, 1943 ("similar to those embodied"). Abbas Milani, "Hurley's Dream," Hoover Digest, no. 3 (2003): 149 ("It is the purpose" and "free governments"), 150 ("unselfish American policy"). T. H. Vail Motter, The Persian Corridor and Aid to Russia (Washington, D.C.: Office of the Chief of Military History, 1952), pp. 6-7. See also Mark Hamilton Lytle, The Origins of the Iranian-American Alliance, 1941-1953 (New York: Holmes & Meier, 1987), pp. 48-59, 60 ("messianic globaloney"). William R. Louis, Imperialism at Bay, 1941-1945: The United States and the Decolonization of the British Empire (Oxford: Clarendon Press, 1977), p. 226 ("the colonial system").

7. FRUS, 1943, vol. 4: Secretary of State to Wiley, Nov. 12, 1943, p. 1045;

1944, vol. 5: Morris to the Secretary of State, Oct. 9, 1944, p. 455. Phillip Baram, "Undermining the British: Department of State Policies in Egypt and the Suez Canal before and during World War II," Historian 40, no. 4 (Aug. 1978): 633-37, 641-45. Thomas A. Bryson, Seeds of the Mideast Crisis: The United States Diplomatic Role in the Middle East during World War II (Jefferson, N.C.: McFarland, 1981), pp. 85-89, 98-99. Rubin, Great Powers, pp. 141-42. Walter L. Browne, The Political History of Lebanon, 1920-1950, vol. 2 (Salisbury, N.C.: Documentary Publications, 1977), pp. 271, 386-87. Louis, Imperialism at Bay, p. 169. Steven L. Spiegel, The Other Arab-Israeli Conflict: Making America's Middle East Policy, from Truman to Reagan (Chicago: Univ. of Chicago Press, 1985), p. 13 ("New Deal" and "you will be"). On America's prewar refusal to encourage Egyptian nationalists, see Erez Manela, "Friction from the Sidelines: Diplomacy, Religion and Culture in American-Egyptian Relations, 1919-1939," The United States and the Middle East: Diplomatic and Economic Relations in Historical Perspective (New Haven: Yale Center for International and Area Studies, 2000), pp. 28-35. On Hooker Doolittle's contribution to Tunisian independence, see David . Newsom, "The Unsung Diplomat," Christian Science Monitor, April 12, 2000.

8. FRUS, 1944, vol. 5: Roosevelt to Landis, March 6, 1944, p. 2. James M. Landis Papers, box 164: Excerpt from a "Round Table" at the Univ. of Chicago entitled "The Middle East: Zone of Conflict?" July 22, 1945 ("The trouble is"). Donald A. Ritchie, James M. Landis: Dean of the Regulators (Cambridge: Harvard Univ. Press, 1980), pp. 3 ("I've been called"), 121-23, 124 ("A diffusion of power"), 126, 130. Robert Vitalis, "The New Deal in

Egypt: The Rise of Anglo- American Commercial Competition in World War II and the Fall of Neocolonialism," Diplomatic History 20, no. 2 (Spring 1996): 213, 220-24. Martin W. Wilmington, The Middle East Supply Centre (Albany: State Univ. of New York Press, 1971), pp. 4-7, 62-72, 167. Peter L. Hahn, The United States, Great Britain, and Egypt, 1945-1956: Strategy and Diplomacy in the Early Cold War (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 1991), pp. 14-17. Godfried, Bridging the Gap, pp. 483-90. Arthur C. Millspaugh, Americans in Persia (Washington. D.C.: Brookings Institution, 1946), pp. 55, 64, 84-85 ("The Persian government").

9. Oder, "United States and the Palestine Mandate," pp. 326-27. On the Millspaugh and Schwarzkopf Missions, see FRUS, 1944, vol. 4: Ford to Secretary of State, Feb. 2, 1944, p. 391; Ford to Secretary of State, April 11, 1944, p. 395; Morris to Secretary of State Oct. 11, 1944, p. 430. James Bill, The Eagle and the Lion: The Tragedy of American-Iranian Relations (New Haven: Yale Univ. Press, 1988), pp. 24-25, 27. Michael K. Sheehan, Iran: The Impact of United States Interests and Policies, 1941-1943 (Brooklyn: Theo Gaus' Sons, 1968), pp. 16-17. Lytle, Origins of the Iranian-American Alliance, pp. 112-16.

10. Wilmington, Middle East Supply Centre, p. 167 ("the time has come"). FRUS, 1942, vol. 4: Welles to Kirk, Feb. 26, 1942, p. 564; 1943, vol. 4: Secretary of State to the Secretary of the Interior, Nov. 13, 1943, p. 942 ("the oil of Saudi Arabia"); 1944, vol. 5: Hull to Winnant, Oct. 17, 1944, p. 666 ("a covert contest"); Davies to Murray, Dec. 27, 1944, p. 9; 1944, vol. 5: Murray to the Under Secretary of State, Nov. 23, 1944, pp. 35-36. David Long, The

United States and Saudi Arabia (Boulder: Westview Press, 1985), pp. 14-15, 76. Bryson, Seeds of Mideast Crisis, p. 39. Miller, Search for Security, pp. 30-31, 43 ("Just how we could"), 51-55, 60-63, 71, 121, 237. Hart, Saudi Arabia, p. 29. Lytle, Origins of the Iranian-American Alliance, pp. 64, 71. Longrigg, Oil in the Middle East, pp. 133-34. Shwadran, Middle East, pp. 330-33.

11. Cecil Brown, Suez to Singapore (New York: Random House, 1942), p. 12 ("This is Baghdad"). Erasmus Kloman, Assignment Algiers: With the OSS in the Mediterranean Theater (Annapolis: Naval Institute Press, 2005), p. 17 ("never-never land"). Patton, War as I Knew It, p. 10 ("a city which combines"). Norman Schwarzkopf, It Doesn't Take a Hero (New York: Bantam, 1992), p. 11 ("magical, faraway"). Roger Cohen and Claudio Gatti, In the Eye of the Storm: The Life of General H. Norman Schwarzkopf (New York: Farrar, Straus and Giroux, 1991), pp. 48-49. Humphrey Wynn, Desert Eagles (Osceola, Wis.: Motorbooks International, 1993), pp. 9 ("certainly a dirty place"), 10 ("the last place"), 13 ("Even the beer"). Ernest D. Whitehead, World War II: An Ex- Sergeant Remembers (Kearney: Morris Publishing, 1996), 36 ("What are we doing"). The Papers of Dwight David Eisenhower, ed. Alfred Chandler (Baltimore: Johns Hopkins Univ. Press, 1970), vol. 2: Dwight Eisenhower to John Eisenhower, Nov. 20, 1942, p. 746 ("beautiful and picturesque"). Clark, Calculated Risk, p. 157 ("like illustrations"). Liebling, Road Back to Paris, p. 243 ("This is exactly"). "Hey, Jack, which way to Mecca?" appears in Peter Arno, Peter Arno (New York: Perennial Library, 1990). A Short Guide to Iraq (Washington, D.C.: War and

Navy Departments, 1944), pp. 3-4 ("you have seen").

12. Atkinson, Army at Dawn, pp. 124 ("Scrofulous, unpicturesque"), 169 ("useless, worthless" and "If they could have"), 255, 462 ("they were open"). D'Este, Eisenhower, p. 400 ("I would rather"). Patton, War as I Knew It, pp. 5, 47 ("the morning edition"), 49 ("the utter degradation"). Whitehead, World War II, pp. 41, 44 ("The Arab men"). World War II Diary of Jean Gordon Peltier (Groveland, Calif.: Perfect Art, 2000), pp. 37 ("The men spend"), 38 ("the animals lived"). Howard Wriggins, Picking Up the Pieces from Portugal to Palestine: Quaker Refugee Relief in World War II (Lanham, Md.: Univ. Press of America, 2004), p. 79 ("That may be so"). K. Ray Marrs, I Was There When the World Stood Still (Bloomington: 1st Books, 2003), p. 301 ("Their long flowing" and "kill the Arab"). David Rame, Road to Tunis (New York: Macmillan, 1944), pp. 14-15, 36. Liebling, Road Back to Paris, pp. 279, 291. Stars and Stripes (Cairo edition), July 2, 1942 ("Nobody ever taught"); July 30, 1943 ("buxom"), Oct. 8, 1943 ("sayeeda").

13. The White House Papers of Harry Hopkins, ed. Robert Sherwood, vol. 2 (London: Eyre and Spottiswoode, 1949), p. 860 ("horseplay"). Burns, Roosevelt, pp. 395-96 ("The mills of the gods"). FRUS, 1943, vol. 4: Ibn Saud to Roosevelt, May 11, 1943, pp. 773-74 ("Jews have no right"); 1944, vol. 5: Stettenius to Roosevelt, p. 649 ("It would seriously prejudice"), Berle to the Secretary of State, Jan. 28, 1944, pp. 561-62 ("opened for the free entry"); Satterthwaite to Secretary of State, Aug. 3, 1944, p. 607 ("moral as well as material"); Secretary of State to Roosevelt, Dec. 13, 1944, p. 649 ("economic concessions") Secretary of State to Roosevelt, p. 655 (n.d.);

Tuck to Secretary of State, Nov. 21, 1944, p. 640 ("Democratic America"). Manuel, Realities, pp. 310-12.

14. Jim Bishop, FDR's Last Year (New York: Morrow, 1974), pp. 441, 443 ("the Moslem will not permit"), 435, 445 ("this prosperity" and "short of war"). John S. Keating, "Cruise of the USS Flying Carpet," True 33, no. 199 (Dec. 1953): 108-9, 110 ("lean and dark"), 111 ("serious damage"). William Eddy, F.D.R. Meets Ibn Saud (New York: American Friends of the Middle East, 1954), pp. 21, 30, 31 ("my most precious"), 34-35 ("Make the enemy"), 44-45 ("most precious pearl"). Black, Franklin Delano Roosevelt, p. 1068 ("whole party"). W. Barry McCarthy, "Ibn Saud's Voyage," Life, March 19, 1945, pp. 62-64. FRUS, 1944, vol. 5: Secretary of State to Jidda, April 18, 1944, p. 687 ("thoughts, wants, needs"). Range, Franklin D. Roosevelt's World Order, p. 149. Burns, Roosevelt, pp. 378-79, 578. White House Papers of Harry Hopkins, pp. 860-61 ("horseplay" and "overly impressed"). Manuel, Realities, pp. 314 ("I will never rest"), 316-17 ("malicious misrepresentation").

26. The Middle East and the Man from Missouri

1. Walter Isaacson and Evan Thomas, The Wise Men: Six Friends and the World They Made (New York: Touchstone, 1986), pp. 255-56. Deborah Welch Larson, Origins of Containment: A Psychological Explanation (Princeton: Princeton Univ. Press, 1985), pp. 126-29, 134-35. Alonzo L. Hamby, Man of the People: A Life of Harry S. Truman (New York: Oxford Univ. Press, 1995), pp. 404-6. David McCullough, Truman (New York: Simon & Schuster, 1992), pp. 349 ("great, great tragedy"), 350, 353 ("I felt

like the moon"), 597. Merle Miller, Plain Speaking: An Oral Biography of Harry S. Truman (New York: Putnam, 1974), p. 215 ("It wasn't just"). Michael T. Benson, Harry S. Truman and the Founding of Israel (Westport, Conn.: Praeger, 1997), pp. 29-33, 34 ("God has created us"), 35-38, 39 ("a matter of faith"), 53-54.

2. FRUS, 1945, vol. 8: Henderson to Matthews, Nov. 13, 1945, p. 1208; Acting Secretary of State to the Ambassador in France, May 23, 1945, p. 1092; 1946, vol. 7: Stettinius to Secretary of State, Feb. 7, 1946, p. 763; Secretary of State to Stettinius, Feb. 9, 1946, p. 766; Henderson to Truman, Nov. 10, 1945, pp. 10-11. Hahn, United States, Great Britain, and Egypt, pp. 20-21 ("the most deserving"), 26-29. David Lesch, Syria and the United States: Eisenhower's Cold War in the Middle East (Boulder: Westview Press, 1992), p. 17. G. W. Sand, ed., Defending the West: The Truman-Churchill Correspondence, 1945-1960 (Westport, Conn.: Praeger, 2004), pp. 92-93, 94. H. W. Brands, Inside the Cold War: Loy Henderson and the Rise of the American Empire, 1918-1961 (New York: Oxford Univ. Press, 1991), pp. 132 ("Your country has"), 134 ("Our refusal"). Robert Laffey, "United States Policy toward and Relations with Syria, 1941-1947" (Ph.D. diss., Univ. of Notre Dame, 1981), pp. 85-86. Irene L. Gendzier, Notes from the Minefield: United States Intervention in Lebanon and the Middle East, 1945-1958 (Boulder: Westview Press, 1999), p. 51.

3. Geoff Simons, Libya and the West: From Independence to Lockerbie (Oxford: Centre for Libyan Studies, 2003), p. 18. William Roger Louis, "American Anti-colonialism and the Dissolution of the British Empire,"

International Affairs 61, no. 3 (Summer 1985): 403-9. Scott L. Bills, The Libyan Arena: The United States, Britain, and the Council of Foreign Ministers, 1945-1948 (Kent, Ohio: Kent State Univ. Press, 1995), pp. 8, 12, 24, 32. Ronald Bruce St. John, Libya and the United States: Two Centuries of Strife (Philadelphia: Univ. of Pennsylvania Press, 2002), pp. 40, 42-43.

4. FRUS, 1945, vol. 8: Morris to the Secretary of State, Jan. 4, 1945, p. 359; Minor to Acheson, June 2, 1945, p. 376; Henderson to the Secretary of State, Aug. 23, 1945, pp. 27-28. Bruce R. Kuniholm, The Origins of the Cold War in the Near East: Great Power Conflict and Diplomacy in Iran, Turkey, and Greece (Princeton: Princeton Univ. Press, 1980), pp. 157-65. Lytle , Origins of the Iranian-American Alliance, pp. 120-68. John Gaddis, The United States and the Origins of the Cold War (New York: Columbia Univ. Press, 1992), pp. 200, 310-11 ("Now we'll give"). Barry Rubin, Paved with Good Intentions: The American Experience and Iran (New York: Penguin, 1981), pp. 33-36. Louise L. Fawcett, Iran and the Cold War: The Azerbaijan Crisis of 1946 (Cambridge: Cambridge Univ. Press, 1992), pp. 122-29, 139. Robert J. Donovan, Conflict and Crisis: The Presidency of Harry S. Truman, 1945-1948 (New York: Norton, 1977), pp. 194-95. Willian Hillman and Harry Truman, Mr. President: The First Publication from the Personal Diaries, Private Letters, Papers, and Revealing Interviews of Harry S. Truman, Thirty-second President of the United States of America (New York: Farrar, Straus and Young, 1952), pp. 22-23: Truman to Byrnes, Jan. 5, 1946 ("We ought to protest").

5. FRUS, 1945, vol. 8: Harriman to the Secretary of State Moscow, March

21, 1945, p. 1220; Wilson to the Secretary of State, Sept. 25, 1945, pp. 1249; 1947, vol. 5: Smith to the Secretary of State, Jan. 8, 1947, pp. 2-3; MacVeagh to the Secretary of State, Feb. 11, 1947, p. 17; Report of the State-War-Navy Coordinating Committee (n.d.), pp. 76-77 ("There is, at the present"). Joseph C. Satterthwaite, "The Truman Doctrine: Turkey," Annals of the American Academy of Political and Social and Science 401 (May 1972): 74-84. Robert Frazier, "Acheson and Formulation of the Truman Doctrine," Journal of Modern Greek Studies 17, no. 2 (1999): 229-51. John Gaddis, The Cold War: A New History (New York: Penguin, 2005), p. 28. Kuniholm, Origins of the Cold War, p. 425. Fawcett, Iran and the Cold War, p. 128. Donovan, Conflict and Crisis, p. 251 ("Greece and Turkey"). Lawrence S. Kaplan, "The Monroe Doctrine and the Truman Doctrine: The Case of Greece," Journal of the Early Republic 13, no. 1 (Spring 1993): 2 ("Our foreign policy"). Laffey, "United States Policy," p. 71 ("star rising"). The text of Truman's speech to Congress is available online, through Yale Law School's Avalon Project.

6. James M. Burns and Susan Dunn, The Three Roosevelts: Patrician Leaders Who Transformed America (New York: Grove Press, 2001), p. 516 ("I cannot bear"). McCullough, Truman, p. 597 ("Everyone else"). Grose, Israel in the Mind, pp. 189 ("My sympathy"), 200 ("One is led"). Arnold Offner, Another Such Victory: President Truman and the Cold War, 1945-1953 (Palo Alto: Stanford Univ. Press, 2002), p. 275 ("to make the whole world"). Louis, British Empire in the Middle East, p. 240 ("I have to answer").

7. Truman's policymaking on Palestine is one of the most lavishly researched subjects in modern Middle Eastern history. Notes relating to the episode contain a representative, but scarcely exhaustive, selection of these sources. Benson, Harry S. Truman, pp. 64-65 ("grievous harm"). Grose, Israel in the Mind, pp. 203 ("to the head"), 204 ("because they did not"). Zvi Ganin, Truman, American Jewry, and Israel, 1945-1948 (New York: Holmes & Meier, 1979), p. 39 ("firmly believe"). David Schoenbaum, The United States and the State of Israel (New York: Oxford Univ. Press, 1993), p. 44.

8. Peter L. Hahn, Caught in the Middle East: U.S. Policy toward the Arab-Israeli Conflict, 1945-1961 (Chapel Hill: Univ. of North Carolina Press, 2004), pp. 33-36. Michael J. Cohen, Palestine and the Great Powers, 1945-1948 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1982), pp. 96-112, 113 ("the further development"). Ganin, Truman, American Jewry, and Israel, p. 80 ("For the Jews"). Harry S. Truman, Memoirs, vol. 2: Years of Trial and Hope (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1956), p. 57 ("the promised Jewish homeland"). Grose, Israel in the Mind, p. 206 ("Jesus Christ"). Truman Presidential Library: President's Secretary File: Jacobson to Truman, Oct. 7, 1947 ("Harry, my people"). Benson, Harry S. Truman, p. 96 ("Terror and Silver"). The Anglo-American Committee of Inquiry report is available on the Avalon Project website. See also Michael J. Cohen, ed., The Anglo-American Committee on Palestine, 1945-46, vol. 35 of The Rise of Israel: A Documentary Record from the Nineteenth Century to 1948 (New York: Garland, 1987).

9. FRUS, 1947, vol. 7: Memorandum of Fraser Wilkins, Jan. 14, 1947, pp.

1003-4; Marshall to the Embassy in the U.K., Jan. 14, 1947, pp. 1005-6; Memorandum of Dean Acheson, Jan. 21, 1947, pp. 1008-11. Grose, Israel in the Mind, pp. 202 ("more concerned"), 214 ("sacrificial labors" and "the title deeds"). Dean Acheson, Present at the Creation: My Years in the State Department (Toronto: George-McLeod, 1969), p. 175 ("the most disliked power"). Benson, Harry S. Truman and the Founding of Israel, pp. 81 ("not in the light"), 93 ("crackpots"). Hahn, Caught in the Middle East, pp. 29, 34, 36 ("underground guerrilla warfare"), 40. The Forrestal Diaries (New York: Viking, 1951), pp. 180, 245, 303-4, 342, 345. Offner, Another Such Victory, p. 274 ("sixty-four dollar question").

10. Martin Gilbert, Israel: A History (London: Black Swan, 1998), p. 147 ("the thousands of years"). Cohen, Palestine and the Great Powers, p. 266 ("Zionist beachhead"). Manuel, Realities, p. 324 ("stuck his neck out"). Sykes, Crossroads to Israel, p. 325 ("relentless war"). Forrestal Diaries, p. 376. Mattar, Mufti of Jerusalem, p. 110. The minority UNSCOP plan was submitted by Iran, India, and Yugoslavia; the majority plan by Australia, Canada, Czechoslovakia, Guatemala, the Netherlands, Peru, Sweden, and Uruguay.

11. Truman Presidential Library: President's Diaries File, July 21, 1947 ("The Jews, I find"). FRUS, 1947, vol. 5: Marshall to Truman, April 29, 1947, p. 1080; Marshall to Certain Diplomatic Officers, June 13, 1947, p. 1103; Henderson to Marshall, Sept. 22, 1947, p. 1153; Memorandum of Paul Alling, Sept. 26, 1947, p. 1159; Wadsworth to Mattison, Nov. 13, 1947, p. 1257. Cohen, Palestine and the Great Powers, pp. 293-94, 295 ("get busy").

Hahn, Caught in the Middle East, pp. 39-41, 48.

12. FRUS, Vol. V, 1948: Kennan to Lovett, Feb. 12, 1948, pp. 589-92; Austin to Marshall, March 17, 1948, p. 736; Henderson to Lovett, April 22, 1948, pp. 841-42 ("decide once and for all"). Truman, Years of Trial and Hope, pp. 161, 164, 171, 173. Hahn, Caught in the Middle East, p. 46 ("British bullheadedness"). Truman Presidential Library: President's Secretary's File: Truman to Jacobson, Feb. 27, 1948 ("The situation has been"). Benson, Harry S. Truman, pp. 127 ("Harry"), 128 ("You win" and "bank"). McCullough, Truman, pp. 610-11 ("liar and a double-crosser"). Cohen, Palestine and the Great Powers, p. 358 ("shocking reversal" and "surrender to Arab terror"). Dan Kurzman, Genesis 1948: The First Arab-Israeli War (New York: Da Capo Press, 1992), pp. 83, 97. On Zionist fundraising efforts in the United States, see Yossi Melman and Dan Raviv, Friends in Deed: Inside the U.S.-Israel Alliance (New York: Hyperion, 1994), pp. 40-45.

13. FRUS, 1948, vol. 5: Rusk to Marshall, March 22, 1948, p. 751; Gross to Lovett, May 11, 1948, p. 959. Elsey Papers, May 12, 1948, p. 977 ("a very transparent attempt" and "pig in the poke"), State Department to Truman, Aug. 19, 1948, p. 1324 ("are destitute"). Howard M. Sachar, A History of Israel: From the Rise of Zionism to Our Time (New York: Knopf, 1970), pp. 309, 310 ("What will happen"). Donovan, Conflict and Crisis, p. 383 ("If the President"). Grose, Israel in the Mind, pp. 290-91, 292 ("I will cross that bridge"), 293 ("What do you mean"). "34 Jews are Slain in Hospital Convoy," New York Times, April 14, 1948. Larry Collins and Dominique Lapierre, O Jerusalem (New York: Simon & Schuster, 1972), p. 278 ("there were

bodies"). The number of Arab victims of the Deir Yassin massacre remains a source of historical controversy. I have relied on Matthew Hogan, "The 1948 Massacre at Deir Yassin," in Historian 63, no. 2 (2001).

27. Harmony and Hegemony

1. Brian Urquhart, Ralph Bunche: An American Life (New York: Norton, 1993), pp. 103, 122, 164. Charles P. Henry, Ralph Bunche: Model Negro or American Other? (New York: New York Univ., 1999), p. 145. Shabtai Rosenne, "Bunche at Rhodes: Diplomatic Negotiator," in Benjamin Rivlin, ed., Ralph Bunche: The Man and His Times (New York: Holmes & Meier, 1990), p. 178. Eytan Walter, The First Ten Years: A Diplomatic History of Israel (London: Weidenfeld & Nicolson, 1958), p. 31 ("Have a look").

2. Acheson, Present at the Creation, pp. 654-55. The CIA's support of the Free Officers is discussed in a number of sources. See, e.g., Miles Copeland, The Game of Nations: The Amorality of Power Politics (New York: Simon & Schuster, 1969), and Wilbur Crane Eveland, Ropes of Sand: America's Failure in the Middle East (New York: Norton, 1980). See also Anwar El Sadat, Revolt on the Nile (London: A. Windgate, 1957), pp. 117-18. Mohammad Naguib, Egypt's Destiny: A Personal Statement (London: Gollancz, 1955), p. 121. Sayed Ahmed, Nasser and American Foreign Policy, 1952-1956 (London: LAAM, 1987), pp. 39-47. Holland, America and Egypt, p. 26 ("a Moslem Billy Graham").

3. Sources on Mossadegh and Operation Ajax abound. See, e.g., Rubin, Paved with Good Intentions, pp. 54-61, 62 ("Whether it is in Indo-China"), 63-90, and Mark Hamilton Lytle, The Origins of the Iranian-American

Alliance, 1941-1953 (New York: Holmes & Meier, 1987), pp. 192-209. See also Stephen Kinzer, All the Shah's Men: An American Coup and the Roots of Middle East Terror (Hoboken, N.J.: John Wiley, 2003).

4. FRUS, 1955-57, vol. 18: NSC 5436/1 United States Policy on French North Africa, June 1, 1955, pp. 92-93 ("we cannot give"). Matthew Connelly, A Diplomatic Revolution: Algeria's Fight for Independence and the Origins of the Post-Cold War Era (New York: Oxford Univ. Press, 2002), pp. 45, 50 ("The French are operating"), 52-58, 123 ("having gone so far"), 153-54. Matthew F. Holland, America and Egypt: From Roosevelt to Eisenhower (Westport, Conn.: Praeger, 1996), p. 30. Frederick Quinn, The French Overseas Empire (New York: Praeger, 2000), p. 227 ("a vast conspiracy").

5. Dwight David Eisenhower Papers, White House Correspondence, box 3: Eisenhower to Dulles, June 16, 1953; Whitman File, International Series, box 15: Eisenhower to Churchill, April 7, 1953 ("From Foster's personal"). PRO, FO371/102732/14: Report of Lord Salisbury's Conversation with Mr. Dulles, July 11, 1953 ("The old colonial attitude"). Evelyn Shuckburgh, Descent to Suez: Diaries, 1951-1956, ed. John Charmley (New York: Norton 1986), p. 229. Hahn, United States, Great Britain, and Egypt, pp. 161-64.

6. I have written extensively on Alpha, Gamma, and the search for Arab-Israeli peace in the 1950s. See, e.g., The Origins of the Second Arab-Israel War: Egypt, Israel, and the Great Powers (London: Frank Cass, 1992); "Escalation to Suez: The Egypt-Israel Border War, 1949-56," Journal of Contemporary History 24, no. 3 (1989); "Secret Efforts to Achieve an Egypt-Israel Settlement prior to the Suez Campaign," Middle Eastern Studies

26, no. 3 (1990); "The Diplomatic Struggle for the Negev," Studies in Zionism 2, no. 1 (1989). On Omega, see FRUS, 1955-1957, vol. 15: Memorandum from the Secretary of State to the President, March 28, 1956, p. 410; Diary Entry by the President, March 28, 1956, p. 425. Salim Yaqub, Containing Arab Nationalism: The Eisenhower Doctrine and the Middle East (Chapel Hill: Univ. of North Carolina, 2004), pp. 42-45. On King Saud's visit to the United States, see Nathan J. Citino, From Arab Nationalism to Opec: Eisenhower, King Sa' d, and the Making of U.S.-Saudi Relations (Bloomington: Indiana Univ., 2002), pp. 122-23, 135, and Rachel Bronson, Thicker Than Oil: America's Uneasy Partnership with Saudi Arabia (Oxford: Oxford Univ., 2006), pp. 74-75.

7. PRO, CAB 128/30, July 27, 1956. USNA, 974.7301/7-2756: Paris to Department, July 27, 1956; 974.7301/6-158: Suez Canal Problem, 1954-58, June 1, 1958. Philip Ziegler, Mountbatten (London: Collins, 1985), pp. 537-38. Anthony Gorst and Scott W. Lucas, "Suez 1956: Strategy and the Diplomatic Process," Journal of Strategic Studies 23, no. 1 (1988): 399-400. Robert Rhodes James, Anthony Eden (London: Weidenfeld & Nicolson, 1986), p. 166 ("My object"). Bernard Ménager et al., eds., Guy Mollet: Un camarade en république (Lille: Presses Universitaires de Lille, 1987), p. 476 ("totally dependent").

8. DDE, Dulles Papers, Subject Series, Telephone Calls, box 5: Allen Dulles to Secretary Dulles, Oct. 30, 1956; Dulles to Eisenhower, Oct. 30, 1956; The Secretary to Allen Dulles, Oct. 30, 1956. PRO, PREM 11/1105: Washington to Foreign Office Oct. 30, 1956. DDF, III, 1956, 93-95.

9. British Broadcasting Company: Summary of World Broadcasts, pt. 4, The Arab World, Israel, Greece, Turkey, Persia: Voice of the Arabs, Jan. 9, 1957; Voice of the Arabs, Jan. 18, 1957. Yaqub, Containing Arab Nationalism, pp. 71-90, 205-12, 221-23, 224, 225-36. Alan Dowty, Middle East Crisis: U.S. Decision-Making in 1958, 1970 and 1973 (Berkeley: Univ. of California Press, 1984), pp. 27-35, 56, 80. See also Michael B. Oren, "Israel, the Great Powers, and the Middle East Crisis of 1958," Studies in Zionism 12, no. 2 (1992). For insights into the film Ben-Hur, I am indebted to one of my Harvard students, John Taylor Hebden.

10. Warren Bass, Support Any Friend: Kennedy's Middle East and the Making of the U.S.- Israel Alliance (Oxford: Oxford Univ. Press, 2003), pp. 4, 73, 79 ("immense satisfaction"), 100, 111, 128. Douglas Little, "The New Frontier on the Nile: JFK, Nasser, and Arab Nationalism," Journal of American History 75, no. 2 (1988): 500 ("somehow represented yesterday"), 502, 504, 510-13, 521-24. Robert Dallek, An Unfinished Life: John F. Kennedy, 1917-1963 (Boston: Little, Brown, 2003), p. 222 ("The single most important"). Michael B. Oren, Six Days of War: June 1967 and the Making of the Modern Middle East (New York: Oxford Univ. Press, 2002), p. 14.

11.Bass, Support Any Friend, pp. 145-49, 158, 185-90. Avner Cohen, Israel and the Bomb (New York: Columbia Univ. Press, 1998), pp. 99-107, 108 ("A woman should not"), 155 ("seriously jeopardized"). Mordechai Gazit, President Kennedy's Policy toward the Arab States and Israel: Analysis and Documents (Tel Aviv: Tel Aviv Univ., 1983), pp. 18, 33, 42, 46-47. Spiegel, Other Arab-Israeli Conflict, pp. 110-12. Oren, Six Days of War, pp. 16-17.

The transcript of the Kennedy- Ben-Gurion meeting at the Waldorf is available online at http://www.jewishvirtuallibrary.org/jsource/US-Israel/FRUS05_30_61.html.

12. William J. Burns, Economic Aid and American Policy toward Egypt, 1955-1981 (Albany: State Univ. Press of New York, 1985) , p. 159 ("go drink"). Richard B. Parker, The Politics of Miscalculation in the Middle East (Bloomington: Indiana Univ., 1993), p. 105. P. J. Vatikiotis, Nasser and His Generation (New York: St. Martin's, 1978), pp. 202-12. Mahmoud Riad, The Struggle for Peace in the Middle East (New York: Quartet Books, 1981) , pp. 15-17.

13. Lyndon Baines Johnson Presidential Library, National Security file, Middle East, Israel boxes 140, 141: Conflicting U.S. Attitudes toward Military Aid to Israel, April 20, 1967; U.S.-Israel Relations, Nov. 3, 1967. USNA, Middle East Crisis files, 1967, Lot file 68D135, box 1: United States Statements on Israel: Johnson Statements, June 1, 1964. William B. Quandt, "The Conflict in American Foreign Policy," in Itamar Rabinovich and Haim Shaked, eds., From June to October: The Middle East between 1967 and 1973 (New Brunswick: Transaction, 1978), pp. 5-6. I. L. Kenen, Israel's Defense Line: Her Friends and Foes in Washington (Buffalo: Prometheus, 1981), p. 173 ("You have lost"). Douglas Little, "The Making of a Special Relationship: The United States and Israel, 1957-68," International Journal of Middle East Studies 25, no. 4 (Nov. 1993): 274-75. Michael Karpin, The Bomb in the Basement: How Israel Went Nuclear and What That Means for the World (New York: Simon & Schuster, 2006), p. 243 ("Take care of the

Jews" and "If Israel is destroyed").

14. USNA, Middle East Crisis, Chronology June 4th-7th, box 15: Memorandum for the Middle East Task Force, May 29, 1967 ("Let us not forget"). LBJ, National Security File, History of the Middle East Conflict, box 17: Memorandum for the Record, The Arab-Israeli Crisis, May 27, 1967 ("If Israel fires first"); box 20: United States Policy and Diplomacy in the Middle East Crisis, May 15-June 10, 1967, pp. 56-59 ("Israel will not be alone" and "I failed"); History of the Middle East Conflict; box 19: Memorandum for the Record, Washington-Moscow "Hotline" Exchange, Oct. 22, 1968; Kosygin to Johnson, June 10, 1967 (10:00 a.m.); Johnson to Kosygin (10:58 a.m.); Movements of Sixth Fleet, June 10, 1967; The President in the Middle East Crisis, Dec. 19, 1968; Richard Helms Oral History; Llewellyn Thompson Oral History. Oren, Six Days of War, pp. 102-16, 164 ("Our goal"), 262-71.

15. Craig A. Daigle, "The Russians Are Going: Sadat, Nixon and the Soviet Presence in Egypt, 1970-1971," Middle East Review of International Affairs 8, no. 1 (March 2004): 3 ("The difference between"). William B. Quandt, Peace Process: American Diplomacy and the Arab-Israeli Conflict since 1967, 3d ed. (Washington, D.C.: Brookings Institution Press, 2005), pp. 67-68. Nadav Safran, Israel: The Embattled Ally (Cambridge: Belknap Press, 1978), p. 441. Thomas Wheelock, "Arms for Israel: The Limit of Leverage," International Security 3, no. 2 (1987): 124-26. FRUS, 1969-76, vol. E-5, Documents on Africa, 1969-72: Buchanan to the President, Feb. 18, 1970 ("Israel is the current"), on http://www.state.gov/r/pa/ho/frus/nixon/e5/54756.htm.

16. Quandt, Peace Process, pp. 77, 89-102. Daigle, "Russians Are Going," pp. 4 ("You would be mistaken"), 7 ("There is no reason"). Henry A. Kissinger, Diplomacy (New York: Simon & Schuster, 1994), pp. 738-39. Henry A. Kissinger, White House Years (Boston: Little, Brown, 1979), pp. 596, 603, 622-23, 626.

17. George Washington University, National Security Archive, "The October War and U.S. Policy," Document 63: Secretary's Staff Meeting, Oct. 23, 1973, p. 6 ("We could not make"), http://www.gwu.edu/~nsarchiv/NSAEBB/NSAEBB98/. Henry A. Kissinger, Crisis: The Anatomy of Two Major Foreign Policy Crises (New York: Simon & Schuster, 2003), pp. 43, 291, 317 ("It was a tremendous"), 340 ("We may have to take"). Alexander M. Haig Jr., with Charles McCarry, Inner Circles: How America Changed the World: A Memoir (New York: Warner, 1992), pp. 409, 411 ("Whatever it takes"), 412-17.

18. Anwar El Sadat, In Search of Identity: An Autobiography (New York: Harper & Row, 1977), pp. 292-95. Abba Eban, Personal Witness: Israel through My Eyes (New York: Putnam, 1992), pp. 570-72. Kenneth W. Stein, Heroic Diplomacy: Sadat, Kissinger, Carter, Begin, and the Quest for Arab-Israeli Peace (New York: Routledge, 1999), pp. 146-63, 175-79. George Washington University, National Security Archive, "The October War and U.S. Policy," Document 63: Secretary's Staff Meeting, Oct. 23, 1973, p. 7 ("The Europeans behaved"), http://www.gwu.edu/~nsarchiv/NSAEBB/NSAEBB98/. Rashid Khalidi, Resurrecting Empire: Western Footprints and America's Perilous Path in the

Middle East (Boston: Beacon, 2005), pp. 43 ("covert action"), 131.

19. Bill Adler, ed., The Wit and Wisdom of Jimmy Carter (Secaucus, N.J.: Citadel, 1977), pp. 68, 139 ("significant moral principle"). Jimmy Carter, Living Faith (New York: Three Rivers Press, 2001), pp. 22-24, 36 ("fellowship of faith"). Zbigniew Brzezinski, Power and Principle: Memoirs of the National Security Adviser, 1977-1981 (New York: Farrar, Straus and Giroux, 1983), p. 27 ("After a couple of hours"). Douglas Brinkley , The Unfinished Presidency: Jimmy Carter's Journey beyond the White House (New York: Viking, 1998), p. 114. Seyom Brown, The Faces of Power: Constancy and Change in United States Foreign Policy from Truman to Reagan (New York: Columbia Univ., 1983), pp. 454-56. Jimmy Carter, The Blood of Abraham: Insights into the Middle East, new ed. (Fayetteville: Univ. of Arkansas Press, 1993), pp. 29, 193 ("The blood of Abraham").

20. Brown, Faces of Power, pp. 482-83, 489, 502. Quandt, Peace Process, pp. 188-90, 198- 203. Brzezinski, Power and Principle, pp. 83, 87, 100, 105, 110-11, 117, 237-38, 242, 254-71, 284 ("You are probably"). Jimmy Carter, Keeping Faith: Memoirs of a President (New York: Bantam, 1982), pp. 279, 293, 296-97, 496 ("The Camp David Accords"). Saadia Touval, The Peace Brokers: Mediators in the Arab-Israeli Conflict, 1948-1979 (Princeton: Princeton Univ. Press, 1982), pp. 291-314. Moshe Dayan, Breakthrough: A Personal Account of the Egypt-Israel Peace Negotiations (New York: Knopf, 1981), pp. 17, 89-99, 117, 126. On Carter's relationship with evangelical Christians, see Donald Wagner, "Evangelicals and Israel: Theological Roots of a Political Alliance," Christian Century, Nov. 4, 1998, p. 1024 ("The time

has come").

21. The lyrics for "Midnight at the Oasis," written by David Nichtern, can be found at http://www.webfitz.com/lyrics/Lyrics/1974/131974.html. Said, Orientalism, pp. 27, 204, 59-60, 316, 319, 322. Edward W. Said, "Islam through Western Eyes," Nation, March 26, 1980. Meir Litvak and Joshua Teitelbaum, "Students, Teachers and Edward Said: Taking Stock of Orientalism," Middle East Review of International Affairs 10, no. 1 (March 2006): 3 ("to discover"). Bernard Lewis, What Went Wrong: The Clash between Islam and Modernity in the Middle East (New York: Perennial, 2003), pp. 151 ("Compared with its millennial"), 152-53. "Orientalism: An Exchange," New York Review of Books, Aug. 12, 1982, pp. 44 ("willful political assertions"), 46 ("beneath the umbrella"), 48 ("a genuine problem").

22. Mark Bowden, Guests of the Ayatollah: The First Battle in America's War with Militant Islam (New York: Atlantic Monthly, 2006), pp. 33, 38, 69 ("undermined the political"), 115 ("island of stability"), 125 ("The people of the United States"), 211, 218, 287, 313 ("Death to the Three"), 360, 479, 563, 564. Kenneth M. Pollack, The Persian Puzzle: The Conflict between Iran and America (New York: Random House, 2004), pp. 153-80. Brown, Faces of Power, pp. 515 ("Our relations with"), 524, 560 ("An attempt by"). Carter, Keeping Faith, pp. 458 ("It's almost impossible"), 466-67, 569.

28. The Thirty Years' War

1. Ronald Reagan, Reagan, in His Own Hand, ed. Kiron K. Skinner, Annelise Anderson, and Martin Anderson (New York: Simon & Schuster, 2001), p. 213. Ronald Reagan, An American Life (New York: Simon & Schuster,

1990), p. 518 ("He's not only a barbarian"). Alexander M. Haig Jr., Caveat: Realism, Reagan, and Foreign Policy (New York: Macmillan, 1984), pp. 182-84. "Israeli Jews Destroy Iraqi Atomic Reactor; Attack Condemned by U.S. and Arab Nations," New York Times, June 9, 1981, p. 1.

2. Reagan, American Life, pp. 442, 423 ("We're walking a tightrope"), 424 ("No matter how villainous"), 425-28, 430. Haig, Caveat, pp. 180-81, 186. Quandt, Peace Process, pp. 251, 252, 253-59. Spiegel, Other Arab-Israeli Conflict, pp. 416-26. Fred Lawson, "The Reagan Administration in the Middle East," MERIP Reports, no. 128 (Nov. 1984): 32. On the Arafat evacuation, see Barry Rubin and Judith Colp Rubin, Yasir Arafat: A Political Biography (Oxford: Oxford Univ., 2003), pp. 77, 86-89. On the role of the USS New Jersey, visit the battleship's website at http://www.battleshipnewjersey.org/history.html.

3. Reagan, American Life, pp. 496 ("Once again"), 497-507, 518 ("Any nation victimized"). Terry A. Anderson, Den of Lions: Memoirs of Seven Years (New York: Crown, 1993). Numerous websites document the terrorist attacks against the United States in the 1980s; see, e.g., "Target America," http://www.pbs.org/wgbh/pages/frontline/shows/target/etc/cron.html, and "Lebanon: The Hostage Crisis," http://www.country-data.com/cgi-bin/query/r-8105.html.

4. Lawrence E. Walsh, Iran-Contra: The Final Report (New York: Times Books, 1994), pp. 1- 3, 10-24. Reagan, American Life, pp. 505-6 ("We wouldn't be shipping"), 516 ("I did not think"). Douglas A. Borer, "Inverse Engagement: Lessons from U.S.-Iraq Relations, 1982-1990," Parameters

33, no. 2 (2003): 52 ("No one had any doubts"), 53-56. Dana Priest, "Trip Followed Criticism of Chemical Arms' Use," Washington Post, Dec. 19, 2003, p. 42. Steve Coll, Ghost Wars: The Secret History of the CIA, Afghanistan, and Bin Laden, from the Soviet Invasion to September 10, 2001 (New York: Penguin, 2005), p. 229 ("nation of beasts"). Numerous documents on American support for Saddam have been posted on the Web; see, e.g., "Saddam's Iron Grip: Intelligence Reports on Saddam Hussein's Reign," http://www.gwu.edu/~nsarchiv/NSAEBB/NSAEBB167/.

5. Kathleen Christison, "The Arab-Israeli Policy of George Shultz," Journal of Palestine Studies 18, no. 2 (1989): 29-47. Quandt, Peace Process, pp. 367-80. David Ignatius, "The Secret History of the U.S.-PLO Terror Talks," Washington Post, Dec. 4, 1988.

6. On Bush's comparisons of Saddam to Hitler and the protests they provoked from Jewish groups, see Allison Kaplan, "U.S Apologizes for Hitler Remark," Jerusalem Post, Nov. 7, 1991. Michael Kelly, Martyrs' Day: Chronicle of a Small War (New York: Vintage, 1993), pp. 120-21 ("I've been in the army"). H. Norman Schwarzkopf, with Peter Petre, It Doesn't Take a Hero: The Autobiography (New York: Bantam, 1992), p. 319 ("Saddam was what"). Colin Powell, with Joseph E. Persico, My American Journey (New York: Random House, 1995), pp. 461-71, 511-13. James Mann, The Rise of the Vulcans: The History of Bush's War Cabinet (New York: Penguin, 2004), pp. 185-91, 193 ("Our practical intention"). Coll, Ghost Wars, p. 229 ("It is not the world"). James A. Baker III and Thomas M. Defrank, The Politics of Diplomacy: Revolution, War and Peace, 1989- 1992 (New York: Putnam,

امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں 1776 سے 2003 تک
نوٹس

1995), pp. 262-63, 272-73, 277 ("What the President did"). "The Religion of George H. W. Bush," http://www.adherents.com/people/pb/George_HW_Bush.html ("Americans are the most religious"). Bush's "New World Order" speech is available online at "Bab-An Open Door to the Arab World," http://www.al-bab.com/arab/docs/pal/pa110.htm.

7. Dennis Ross, The Missing Peace: The Inside Story of the Fight for Middle East Peace (New York: Farrar, Straus and Giroux, 2004), pp. 68, 71-81. Baker and Defrank, Politics of Diplomacy, pp. 488 ("a rich tale"), 512 ("Like the walls"). David Horovitz, "Blunt Baker Urges Israel to Talk Peace," Jerusalem Post, June 14, 1990.

8. Aladdin lyrics, original and altered, appeared on http://www.angelfire.com/movies/ disneybroadway/aladdin.html. Martin Kramer, Ivory Towers on Sand: The Failure of Middle Eastern Studies in America (Washington, D.C.: Washington Institute of Near East Policy, 2001), pp. 1, 5. Samuel P. Huntington, The Clash of Civilizations and the Remarking of World Order (New York: Simon & Schuster, 1996), pp. 217-18 ("The underlying problem").

9. Coll, Ghost Wars, pp. 249-56. "Text of Clinton Statement on Iraq, Feb. 17, 1998," http://www.cnn.com/ALLPOLITICS/1998/02/17/transcripts/clinton.iraq/ ("unholy axis"). Bill Clinton, My Life: The Presidential Years (Westminster, Md.: Knopf, 2005), p. 40 ("I was pleased"). Laurie Mylroie, "U.S. Policy toward Iraq," Middle East Intelligence Bulletin 3, no. 1 (Jan. 2001).

10. Clinton, My Life: The Presidential Years, pp. 78-79, 100-1 ("Now the horns"), 102-3, 104 ("Shalom, salaam, peace"), 244-45, 281 ("We had become friends"). Bill Clinton, My Life: The Early Years (Westminster, Md.: Knopf, 2005), p. 466 ("God will never"). David Horovitz, ed., Yitzhak Rabin: Solider of Peace (London: Peter Halban, 1996), pp. 115-22. Shimon Peres, Battling for Peace: Memoirs, ed. David Landau (London: Weidenfeld & Nicolson, 1995), pp. 335-37, 343-44. Dennis Ross, Missing Peace, pp. 101-21. Quandt, Peace Process, pp. 327-31. Connie Bruck, "The Wounds of Peace," New Yorker, Oct. 14, 1996.

11. Clinton, My Life: The Presidential Years, pp. 448-49 ("fanatics and killers"), 634-35 ("I am not a great man"), 642-46. Madeleine Albright, with Bill Woodward, Madam Secretary (New York: Miramax, 2003), pp. 289, 291, 294-95, 317, 490-91, 497. Douglas Waller, "A Frantic Hunt for Peace," http://www.cnn.com/ALLPOLITICS/time/2000/10/16/peace.html ("Close the gate!"). See also Robert Malley and Hussein Agha, "Camp David: The Tragedy of Errors," New York Review of Books, Aug. 9, 2001. Coll, Ghost Wars, pp. 329, 376-77, 379, 380 ("Every Muslim"), 395-96, 405-15, 436 ("We are at war").

12. Richard Bernstein et al., Out of the Blue: The Story of September 1 , 2001, from Jihad to Ground Zero (New York: Times Books, 2002), pp. 7, 25-26, 120-21, 131-39, 184 ("Please have fun"). CNN Breaking News, Sept. 11, 2001, Transcript # 091174CN, p. 4 ("these are Islamic terrorists").

13. Bob Woodward, Plan of Attack (New York: Simon & Schuster, 2004), pp. 26, 89, 112, 132, 154, 293, 317. Michael R. Gordon and Bernard E. Trainor,

Cobra II: The Inside Story of the Invasion and Occupation of Iraq (New York: Pantheon, 2006), pp. 14-19, 36-40, 50-53, 93-94, 104, 108, 160-65. "Bush Delivers Graduation Speech at West Point," http://www.whitehouse.gov/news/releases/2002/06/20020601-3.html. Bush's statement on the Senate and House vote authorizing the war in Iraq can be found on the White House website, http://www.whitehouse.gov/news/ releases/2002/10/20021016-11.html. Powell's Feb. 5 testimony to the Security Council appears on the U.S. State Department website, http://www.state.gov/secretary/former/ powell/remarks/2003/17300.htm.

14. Gordon and Trainor, Cobra II, pp. 436-37. John Keegan, Iraq War: The Military Offensive, from Victory in 21 Days to the Insurgent Aftermath (Westminster, Md.: Knopf, 2005), pp. 204-10, 428, 448-50, 457-61, 475, 484-85, 493. L. Paul Bremer III, My Year in Iraq: The Struggle to Build a Future of Hope (New York: Simon & Schuster, 2006), pp. 14, 39-42, 57. "President Outlines Steps to Help Iraq Achieve Democracy and Freedom," http://www.whitehouse.gov/news/ releases/2004/05/20040524-10.html."Iraqi Smart Culture Card," http://cryptome.org/iraq- culture.htm. A Short Guide to Iraq (Washington, D.C.: War and Navy Departments, 1943), p. 5. Brian Turner, "What Every Soldier Should Know," Here, Bullet (Farmington, Me.: Alice James Books, 2005), reprinted with the permission of Alice James Books. Fouad Ajami, "Heart of Darkness," Wall Street Journal, Sept. 28, 2005. Francis Fukuyama, America at the Crossroads: Democracy, Power, and the Neoconservative Legacy (New Haven: Yale Univ. Press, 2006), p. 181 ("a self-fulfilling prophecy"). Christopher Hitchens, "The Perils of

امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں 1776 سے 2003 تک

Withdrawal," Slate, Nov. 29, 2005. Thomas L. Friedman, "Budgets of Mass Destruction," New York Times, Feb. 1, 2004.